انقلابِ عظیم

انقلابِ عظیم

چسٹر باؤلز

انقلاب عظیم

مصنفہ

چیسٹر باؤلز

تحریروں اور تقریروں کا انتخاب

مرتب کردہ

ہنری اسٹیل کومیجر

مترجمہ

محترمہ ایس۔جی زیدی

پبلشرز

انڈین اکیڈیمی ۲۹ ۔ نریندرا پیلس نئی دہلی

THE CONSCIENCE OF A LIBERAL by Chester Bowles,
Originally published by Harper and Row, Brothers.

بار اول

قیمت تین روپے

یونین پریس، دھلی ۶

ڈی ۔ایس۔بی کے نام

میرے وطن کو بیدار ہونا نصیب کر

جہاں ذہن خوف سے آزاد ہے اور سر بلند رہتا ہے
جہاں علم آزاد ہے
جہاں دُنیا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے
جہاں الفاظ حقیقت کی گہرائی سے نکلتے ہیں
جہاں ان تھک کوشش تکمیل کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے
جہاں عقل کا شفّاف چشمہ بخیتہ عادات کے ریگستان میں جاکر گم نہیں ہوتا۔
جہاں تو ہمارے دماغ کی وسعت پذیر فکر و عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے
آزادی کی اسی بہشت کے اندر، اے میرے مالک، تو میرے وطن کو
بیدار ہونا نصیب کر

رابندر ناتھ ٹیگور کی "گیتانجلی" سے اقتباس[1]

[1] ٹیگور ریڈر مرتبہ ڈاکٹر امیا چکرورتی، دی میک ملن کمپنی

فہرست مضامین

حصہ دوم: معاشی امداد کیسے دی جاتی ہے

حصہ سوم: ترقی پذیر برّاعظم

ایشیا

افریقہ

لاطینی امریکہ

حصہ چہارم : کمیونسٹ چیلنج

باب دوم: امریکی خواب کی تعبیر

تعارُف

آج ہم دنیا میں ایک ایسا انقلاب — رونما ہوتے دیکھ رہے ہیں جس کا مقابلہ پندرھویں صدی اور سولھویں صدی میں صرف نشاۃ ثانیہ کے انقلاب اور "نئی دنیا" کی دریافت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ یہ انقلاب اتنا عظیم الشان ہے کہ اس نے پورے کرۂ ارض کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ تقریباً پچاس نئی قومیں تاریخ کے مطلع پر نمایاں ہو رہی ہیں۔ کروڑہا مرد اور عورتیں جنھیں اب تک نظر انداز اور رد کیا جاتا رہا تھا، وہ آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، اپنے سروں کو بلند کر رہے ہیں اور اپنی حیثیت منوانے کے طلب گار ہیں۔

قوت کے نئے اور عظیم تصورات اُبھر کر مغرب میں قوت کے پُرانے مرکزوں کو چیلنج کر رہے ہیں۔ ان نئی قوتوں میں چین، ہندوستان، لاطینی امریکہ اور عرب ممالک شامل ہیں اور بہت جلد ان میں افریقہ بھی شامل ہونے والا ہے۔ اس سب کے معنیٰ یہ ہیں کہ قوت کے تاریخی محوراب بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل کی طرف، شمالی نصف کرے سے جنوبی نصف کرے کی طرف یورپی دنیا سے غیر یورپی دنیا کی طرف اور سفید فام دُنیا سے رنگین دُنیا کی طرف منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔

کرۂ ارض کا تین چوتھائی حصہ یورپ والے ایک چوتھائی حصے کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہے —— اور ہم یعنی امریکہ والے اسی چوتھائی یورپی خطے میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم اس عظیم بغاوت کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں تو ہم اس کی عجیب و غریب نوعیت دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، کیوں کہ مغرب کے خلاف یہ بغاوت ان ہتھیاروں، ان اداروں اور ان نظریات کی مدد سے کی جا رہی ہے جنھیں پچھلی پانچ صدیوں میں خود یورپ والے ہی وجود میں لائے ہیں۔ یہ جنگ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہتھیاروں کی مدد سے لڑی جا رہی ہے، اسے تغیر اور ترقی کے مغربی نظریات سے تقویت حاصل ہو رہی ہے اور اسے مغرب کی غیر معمولی ایجاد یعنی

قوم پرستی کے نام پر چلایا جارہا ہے۔

اس قصے کی ایک بڑی بوالعجبی اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے وہ آلات جن سے غیر یورپی دنیا کی تعمیر نو کا کام لیا جارہا ہے، اپنی جگہ بہت عام اور عالمگیر ہیں، وہاں قوم پرستی کا سیاسی حربہ اس کے بالکل برعکس محدود اور انتہائی تفرقہ انداز ہے۔ وہ تمام آلات جو ایک سماجی، تمدنی اور انسانی انقلاب لانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، اتحاد کا باعث بنتے ہیں! اور وہ تمام عوامل جو سیاسی انقلاب لاتے ہیں، تفریق پیدا کرتے ہیں۔

عظیم انقلابی دور سے گزرنے والی یہ غیر یورپی دنیا اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ وہ ایک ہی جست میں یورپی دنیا کے مقابل آجائے۔ اس خلا کو ایک ہی نسل کی مدت میں پُر کرنے جس نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیشتر حصے کو زندگی کے ان اعلیٰ معیاروں سے صدیوں تک دور رکھا ہے، جن سے یورپ والے اتنے عرصے تک فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ نئی قومیں نسلی، مذہبی اور نظریاتی خلفشار کو واقعی طور پر دور کئے بغیر آزادی حاصل کر کے اپنے یہاں ضروری اصلاحات کر لیں گی؟ آج ہم سب کے سب، سمجھداری یا ناسمجھی کے ساتھ ایک اندھا دھند دوڑ میں مبتلا ہیں —— ایک ایسی دوڑ میں جو اتحاد، ترقی اور خوش حالی کی طرف بڑھنے والی مددگار اور کریم النفس قوتوں اور تفریق، جنگ اور تباہی کی طرف لے جانے والی بدنفس اور بدباطن قوتوں کے درمیان جاری ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ انجام کار مغرب سے آزادی کی خواہش زیادہ قوی ثابت ہوتی ہے۔ یا مغربی امداد حاصل کرنے کی آرزو؟ سیاسی علیحدگی کی جدوجہد زیادہ قوی ثابت ہوتی ہے یا تعاون اور اتحاد کی؟ کیا عمل کی خوفناک قوتیں تشدد آمیز انقلاب کی شکل اختیار کر کے تدریجی ارتقاء کے طویل عمل کو ناکام اور ناکارہ بنا دے گی؟ یہ وہ خوفناک سوالات ہیں۔ جو کرۂ زمین پر ہر ملک کے رہنماؤں کے ذہنوں میں گردش لگا رہے ہیں۔

ان میں سے بہت سے مسائل کے لئے مغربی دنیا خود ذمہ دار ہے —— وہ ان مسائل سے اچھی طرح واقف ہے اور اسی کو ان سے دوچار ہونا ہے۔ مستقبل کے خدوخال کا انحصار اس تدبر، بصیرت اور فراخدلی پر ہے جس سے تاریخ کے اس نازک دور میں مغربی دنیا کام لے گی۔

اس سلسلہ میں امریکہ کو ایک خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ یورپ کی بیشتر قوموں نے ایشیا اور افریقہ میں نوآبادیات قائم کیں اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے ان دونوں براعظموں سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن خوش قسمتی سے امریکہ سامراجیت اور نوآبادیات سے دور رہا۔ کم از کم شمالی اور جنوبی امریکہ سے باہر تو یہی کیفیت رہی۔

لہٰذا امریکہ کے لوگ نہایت مؤثر خ روئی کے ساتھ تاریک براعظموں کے ان باشندوں کے پاس جا سکتے ہیں ــــــــــ یہی نہیں بلکہ امریکی عوام کے پاس حکومت خود اختیاری کا زیادہ طویل تجربہ ہے۔ آزادی کی زیادہ طویل روایت اور عوام الناس کی روشن خیالی کی ایک ایسی طویل داستان ہے جو کوئی دوسری قوم مشکل ہی سے پیش کر سکے گی۔ یہی وہ چیزیں ہیں، جو ایشیا اور افریقہ کے عوام کی اُمیدوں کا باعث بنی ہوئی ہیں اور ان کے جذبۂ عمل کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

ہم اپنی دولت، اپنی ذہانت اور تدبر، حکومت خود اختیاری میں اپنے تجربے، اپنی نیک خواہشات اور تاریخ کی بہت سی تباہ کن قوتوں سے اپنی برأت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یورپ کی کسی قوم کے مقابلے میں کہیں زیادہ امداد کر سکتے ہیں۔

لیکن اس کام میں بہت سی مشکلات بھی حائل ہیں۔ جنھیں ہم کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ علیحدگی پسندی نے اس روایت کو تقویت بخشی، کہ "ہمیں کیا"۔ "سامراجیت کی قدیم ملکیتوں سے ہماری برأت نے ہم کو دنیا کی سب سے زیادہ روشن خیال سامراجیت کا بھی مخالف بنا دیا اور ہمارے لئے اس بات کو مشکل کر دیا کہ ہم اپنی "پرانی دنیا" کے بہت سے ساتھیوں کے مسائل اور دشواریوں کو سمجھ سکتے۔ دوسری طرف ہماری طرف سے ماضی میں سامراجیت کی مخالفت کی وجہ سے ریڈ انڈین اور حبشیوں کے ساتھ ہمارے سلوک کے سلسلہ میں ہمارے اوپر ریاکاری اور حیلہ سازی کے الزامات عائد کئے گئے۔ حتیٰ کہ ہماری خوش حالی اور ثروت بھی بعض اوقات ہمارے لئے دشواری کا باعث بننے لگتی ہے۔ کیوں کہ اس کی بدولت نہ صرف کم خوش حال قومیں ہماری طرف رشک وحسد اور شکوک وشبہات کی نظر سے ہی دیکھنے لگتی ہیں، بلکہ خود ہمیں بھی یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو طاقت حاصل نہ کر سکتی ہو یا جسے دولت نہ خرید سکتی ہو۔

پھر بھی آج یہ بات ہر طرح سے واضح ہے کہ امریکہ کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اور وہ جنگ کے بعد کی دنیا میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی تنہا وہ قوم ہے جو دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک مالدار اور طاقت ور قوم کی حیثیت سے باقی رہی تھی اور جس کے وسائل اور جس کے سیاسی اور انتظامی عملہ میں کسی قسم کی خرابی نہیں آئی تھی۔ صرف وہی ایک ایسی حیثیت میں تھی کہ تاریخ کے اس نازک دور میں دنیا کی قیادت سنبھال سکتی۔

آج جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس صورت میں

مغربی دنیا ـــــ بلکہ تمام دنیا کا کیا انجام ہوتا ـــــ اگر بقول چرچل "نئی دنیا" پرانی دنیا کی مدد اور اس کی آزادی کی حفاظت کے لئے نکل کر نہ آئی ہوتی"۔ اگر امریکہ نے مارشل پلان بنا کر مارشل امداد نہ دی ہوتی، اگر اس نے مغربی یورپ کی جنگ سے تباہ شدہ قوموں کو اس وقت تک امداد جاری نہ رکھی ہوتی جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوگئیں، اگر اس نے برلن میں فوجیں نہ اُتاری ہوتیں ـــــ جو ایک ایسا واقعہ ہے جو دورِ جدید کی تاریخ میں نفسیاتی اعتبار سے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اگر وہ مشرقِ قریب میں برطانیہ کے پیدا کردہ خلا کو پُر کرنے کے لیے آگے نہ بڑھی ہوتی، اگر اس نے کوریا کی نازک صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے موثر اور فیصلہ کن اقدام نہ کیا ہوتا، اگر وہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں دُنیا کے بہت سے محصور لوگوں کی حفاظت کرنے کے لئے آگے نہ بڑھی ہوتی تو تاریخ کے خدوخال اس سے کہیں زیادہ مختلف ہوتے جو آج ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا مستقبل خواہ کچھ بھی ہو، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ کے اس نازک دور میں اس نے حالات کا نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنے تدبر، اپنے وسائل اور اپنی جرأت کی بدولت مغربی دنیا کے لئے اس بات کو ممکن بنا دیا کہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھتے ہوئے اتنی طاقت حاصل کرے جو ان کاموں کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے جو ان کے سامنے موجود ہیں۔

برطانیہ کو عالم گیر طاقت بننے کے لئے سو سال کا عرصہ درکار ہوا تھا اور غالباً اس کے علاوہ "پرانی دنیا" کی کسی اور طاقت نے یہ درجہ حاصل ہی نہیں کیا ـــــ اسپین، فرانس، جرمنی، روس اور جاپان میں سے کسی کو یہ بات نصیب نہ ہو سکی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکہ نے اپنے بے شمار وسائل کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کشادہ دلی کی لامتناہی صلاحیتیں بھی پیدا کر لیں۔

ذرا اندازہ لگائیے کہ اس نے بیس سال سے کم کی مدت میں کیسی کیسی بصیرتیں حاصل کر لی ہیں۔

یہ کہ دُنیا فی الواقع ایک دنیا ہے۔ کوئی قوم صرف اپنے تک محدود نہیں ہے۔ اور یہ کہ ہم دنیا کے تمام لوگوں کے آلام و مصائب، ناکامیوں اور پریشانیوں اور ان کی فلاح و بہبودی میں کچھ نہ کچھ حصہ بٹانے کے لئے ذمہ دار ہیں۔

یہ کہ یورپی دنیا، یعنی سفید دنیا یا عیسائی دُنیا خدا کی طرف سے کسی طرح فائق و برتر قرار نہیں دی گئی ہے۔

یہ کہ دنیا کو دو ٹوک طور پر امریکی اور روسی دو بلاکوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو طاقت کی متعدد حدتوں میں تقسیم کرنا ہوگا اور کوئی بھی حکمت عملی جس کا انحصار دو دنیاؤں پر ہوگا، اس کی ناکامی یقینی ہے۔

یہ کہ ہم اپنی خواہشات کو دوسری قوموں پر نہیں تھوپ سکتے۔ حتیٰ کہ ان قوموں پر بھی نہیں تھوپ سکتے جو کمزور ہیں۔ اور یہ کہ ہم دوسری قوموں سے یہ توقع بھی نہیں کر سکتے کہ وہ اقتصادیات اور سیاسیات میں ہمارے نظریات کو اپنائیں گی، یا کم از کم ان کی تائید ہی کریں گی۔

یہ کہ ہم کو غیر جانبدار قوموں کو کسی ایک طرف شامل ہونے کے لئے مجبور کرنے کی بجائے ان کی غیر جانبداری کو سمجھنا اور اسے قبول کر لینا چاہیئے۔

یہ کہ ہم کو بین الاقوامی اداروں کے توسل سے کام کرنا چاہیئے اور امداد اور آبادکاری کے اہم کام میں دوسری قوموں ——— حتیٰ کہ اپنے مخالفین کے ساتھ بھی ——— تعاون کرنا چاہیئے۔

یہ کہ تقریباً تمام صورتوں میں فوجی امداد کے مقابلے میں اقتصادی، سماجی اور تمدنی امداد زیادہ موثر اور کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ کہ طاقت، حتیٰ کہ ایٹمی طاقت کی بھی کچھ نہ کچھ حدود ہیں۔ اور یہ کہ فوجی طاقت میں بجائے خود بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں مضمر ہیں۔

یہ کہ ہم سب خارجہ پالیسی کے پابند ہیں اور بحیثیت قوم کے ہمارا اس طرح پابند ہونا اپنی جگہ قطعی اور مکمل ہے۔ یہ کہ اس دور میں امن کا فقدان اور فتنہ و فساد معمولات میں شامل ہیں۔ اور یہ کہ جو بحران ایک عرصہ دراز سے روئے زمین کے لوگوں کی قسمت بن چکے ہیں امریکہ ان سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

آج ان میں سے بہت سی چیزوں کو ہم بلا کسی دلیل اور حجت کے تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے خارجہ معاملات کی تاریخ اور غالباً ہماری پوری تاریخ میں یہ انداز نظر اس سے پہلے اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

اس نئی صورت حال کا ایک دلچسپ پہلو جس میں ہم سب ناقابل مفر طریقے پر شریک ہیں ایک نئی قسم کے سرکاری افسر کا وجود میں آنا ہے ——— ایک بین اقوامی سرکاری افسر کا جو ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم پر آسانی کے ساتھ آتا جاتا ہے، جو ہندوستان، بولیویا، کانگو اور ٹانگانیکا کے مسائل سے اسی طرح واقف ہے جس طرح اس سے پہلے کے سیاست داں

سابجوسٹ، الاباما، منیسوٹا اور گن کے مسائل سے واقف ہوتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو کسی ایک مخصوص مفاد، یا اقتصادیات، یا سیاسی نظام کے نمائندہ نہیں سمجھتا بلکہ انسان کے مفادات کا نمائندہ سمجھتا ہے۔

اس سے پہلے بھی خصوصاً اٹھارھویں صدی میں ایسے لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً بینجمن ٹامسن، جنھوں نے مساوی کامیابی کے ساتھ بیک وقت رائل انسٹی ٹیوٹ آف لندن کے صدر اور باویریا کے وزیراعظم کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ پارا ینڈرسن برنسڈاف جو جرمن ریاستوں کے درباروں سے ڈنمارک کے دربار میں آسانی کے ساتھ آیا جایا کرتے تھے۔ اسی طرح والتئیر یا کنڈرسے، فرنیکلن اور ٹامس پین وغیرہ ایسی عظیم ہستیاں تھیں جو خود کو انسانیت کے خادم سمجھتے تھے لیکن دنیا کے بیشتر حصوں میں جدید قوم پرستی نے ان سب چیزوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

اب ایک بین الاقوامی اسکالر، ایک بین الاقوامی سائنسداں، ایک بین الاقوامی سیاستداں جو دوسروں کی خدمت کے ذریعہ اپنے ملک کی خدمت کرتا ہے، ایک بار پھر منظر عام پر آ رہا ہے۔ نالسنین ناروے میں تو اسپاک بیلجیم میں، جین، مونے فرانس میں تو چرچل برطانیہ میں۔ اسی طرح ہیمرشولڈ، مردل، بائیڈ اور او۔ تھانٹ، میڈم پنڈت، چارلس ملک، الینور روز ویلٹ اسٹونسن —— یہ ان مردوں اور عورتوں کی وہ نئی نسل ہے جو اس دنیا کی رہنمائی کریں گے جو آج ہماری نگاہوں کے سامنے تشکیل پا رہی ہے۔

اِس نئے سرکاری افسر کی خصوصیات کیا ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مقامی قوم پرستی کے تعصبات اور کوتاہیوں سے آزاد رکھتے ہوئے، دور دراز قوموں اور عوام کے دل و دماغ میں ہمدردانہ طریقے پر جگہ پیدا کر سکتا ہے۔ وہ صرف نظریاتی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی تمام نسلوں اور قوموں کی مساوی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ ان مفادات، عادات واطوار، طور طریقوں اور تہذیبوں کی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ فاصلے پر واقع ہیں جس میں کہ خود اس نے پرورش پائی ہے۔

دوسری بات یہ کہ وہ خود اپنے ماضی حتیٰ کہ حال کے ساتھ بھی مطابقت کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ اور سائنس کے ان دھاروں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے جو آج کی دنیا کی تشکیل کر رہے ہیں۔ وہ ان دھاروں کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہے جو سامراجیت اور اور نو آبادیات خواہی کی آخری نشانیوں اور ایک نسل اور ایک براعظم کے لوگوں کے دوسری نسل اور دوسرے براعظم کے

لوگوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے سلسلہ کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ واقعیت پسندی کے ساتھ، اگر غیر جانبداری کے ساتھ نہیں، اس نئے متغیر ماحول میں، جو پورے کرۂ ارض پر تشکیل پا رہا ہے، خود اپنی قوم کا مقام تلاش کر لیتا ہے۔

تیسرے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ تاریخ اور سیاسیات مل کر ایک ایسا تانا تیار کرتی ہیں جس کے سلسلے ایک گاؤں اور شہر سے دوسرے گاؤں اور شہر تک، ایک ملک سے دوسرے ملک تک، اور ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم تک پہنچتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ علٰیحدگی پسندی، خواہ وہ نظریاتی اور اخلاقی ہو اور خواہ اقتصادی اور سیاسی، ماضی کی چیز ہے۔ اور یہ کہ برما یا کانگو میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کنکٹیکٹ اور پارک شائر کے لوگوں کو بھی متاثر کرتا ہے، یہ کہ ہم سب کے سب ان لوگوں کے لئے خوراک، دوا، آلات، مشینری، اسکول، لائبریریاں، اسپتال اور یونیورسٹیاں فراہم کرنے کے ایک عظیم کام میں لگے ہوئے ہیں، جن کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ آزادی بھی ایک ایسے ہی تانے بانے کی مانند ہے اور یہ کہ ہم جو کچھ اپنی قوم کے چند آدمیوں کے ساتھ کرتے ہیں وہی کل بنی نوعِ انسان کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور یہ کہ آزادی اور جمہوریت کی آزمائش یہی ہے کہ ہم اس پر اپنے ملک میں عمل کرنے اور بیرون ملک اس کی حمایت کرنے کے لئے رضامند ہوں۔

چوتھے، وہ اپنی تمام تصوریت کے باوجود ایک عملی آدمی ہے، ایک عملی منتظم اور ایک سخت گیر اور مستقل مزاج آدمی ہے ـــــ اور اگر اس کو زندہ رہنا ہے ـــــ تو وہ ایک بے حس آدمی بھی ہے۔ اس کو روزمرّہ کے انتظامی معاملات کے تجربے کی ضرورت ہے۔ اس کو اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دھواں دھار تقریریں اور لمبے چوڑے دعوے عملی طور پر کوئی کام کرنے اور اس کے نتائج سامنے لانے کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

اس قسم کے بین الاقوامی کارکن کی چیسٹر باؤلز سے بہتر کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے "کالج کے ایک سینئر طالب علم کی حیثیت سے میں نے ۱۹۲۴ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنی زندگی سرکاری کاموں کے لئے وقف کر دوں گا۔"

وہ ہم کو یہ بھی بتاتے ہیں اور یہ ایک بصیرت افروز بات ہے ـــــ کہ ۱۹۲۴ء میں وہ ییل یونی ورسٹی کے ایسے تین یا چار طالب علموں سے ایک تھے جنھیں سرکاری خدمات سے دلچسپی تھی۔ حالات نے شروع شروع ان کی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا لیکن اسے بالکل ختم بھی نہیں کیا۔ ۱۹۴۱ء میں جب امریکہ کو جنگ میں شامل ہونا پڑا تو مسٹر باؤلز بھی کاروباری دائرے سے نکل کر سرکاری حلقے میں آ داخل ہوئے اور پچھلے بیس سال سے اپنی قوت اور اپنی صلاحیتوں

مساچوسٹ، الاباما، منیسوٹا، اورگن کے مسائل سے واقف ہوتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو کسی ایک مخصوص مفاد، یا اقتصادیات، یا سیاسی نظام کے نمائندہ نہیں سمجھتا بلکہ انسان کے مفادات کا نمائندہ سمجھتا ہے۔

اس سے پہلے بھی خصوصاً اٹھارھویں صدی میں ایسے لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً بنجمن ٹامسن، جنھوں نے مساوی کامیابی کے ساتھ بیک وقت رائل انسٹی ٹیوٹ آف لندن کے صدر اور باویریا کے وزیراعظم کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ یا رابیڈر سن برنسٹارف جو جرمن ریاستوں کے درباروں سے ڈنمارک کے دربار میں آسانی کے ساتھ آیا جایا کرتے تھے۔ اسی طرح والٹیئر یا کنڈورسے، فرینکلن اور ٹامس پین وغیرہ ایسی عظیم ہستیاں تھیں جو خود کو انسانیت کے خادم سمجھتے تھے لیکن دنیا کے بیشتر حصوں میں جدید قوم پرستی نے ان سب چیزوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

اب ایک بین الاقوامی اسکالر، ایک بین الاقوامی سائنسداں، ایک بین الاقوامی سیاستداں جو دوسروں کی خدمت کے ذریعہ اپنے ملک کی خدمت کرتا ہے، ایک بار پھر منظر عام پر آ رہا ہے۔ نانسنین ناروے میں تو اسپاک بیلجیم میں، جین مونے فرانس میں تو چرچل برطانیہ میں۔ اسی طرح ہیمرشولڈ، مردل، بائیڈ اور اد- تھانٹ، میڈم ہیڈٹ، چارلس ملک، الینور روز ویلٹ اسٹونسن —— یہ ان مردوں اور عورتوں کی وہ نئی نسل ہے جو اس دنیا کی رہنمائی کریں گے جو آج ہماری نگاہوں کے سامنے تشکیل پا رہی ہے۔

اِس نئے سرکاری افسر کی خصوصیات کیا ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مقامی قوم پرستی کے تعصبات اور کوتاہیوں سے آزاد رکھتے ہوئے، دور دراز قوموں اور عوام کے دل و دماغ میں ہمدردانہ طریقے پر جگہ پیدا کر سکتا ہے۔ وہ صرف نظریاتی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی تمام نسلوں اور قوموں کی مساوی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ ان مفادات، عادات واطوار، طور طریقوں اور تہذیبوں کی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ فاصلے پر واقع ہیں جن میں کہ خود اس نے پرورش پائی ہے۔

دوسری بات یہ کہ وہ خود اپنے ماضی حتیٰ کہ حال کے ساتھ بھی مطابقت کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ اور سائنس کے ان دھاروں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے جو آج کی دنیا کی تشکیل کر رہے ہیں۔ وہ ان دھاروں کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہے جو سامراجیت اور اور نو آبادیات خواہی کی آخری نشانیوں اور ایک نسل اور ایک برِّاعظم کے لوگوں کے دوسری نسل اور دوسرے برِّاعظم کے

لوگوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے سلسلہ کو ختم کر دینا چاہتے ہیں ۔ واقعیت پسندی کے ساتھ، اگر غیر جانبداری کے ساتھ نہیں، اس نئے متغیر ماحول میں، جو پورے کرۂ ارض پر تشکیل پا رہا ہے، خود اپنی قوم کا مقام تلاش کر لیتا ہے ۔

تیسرے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ تاریخ اور سیاسیات مل کر ایک ایسا تانا تیار کرتی ہیں جس کے سلسلے ایک گاؤں اور شہر سے دوسرے گاؤں اور شہر تک، ایک ملک سے دوسرے ملک تک، اور ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم تک پہنچتے ہیں ۔ وہ جانتا ہے کہ علیحدگی پسندی، خواہ وہ نظریاتی اور اخلاقی ہو اور خواہ اقتصادی اور سیاسی، ماضی کی چیز ہے ۔ اور یہ کہ برما یا کانگو میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کنکٹیکٹ اور پارک شائر کے لوگوں کو بھی متاثر کرتا ہے ۔ یہ کہ ہم سب کے سب ان لوگوں کے لئے خوراک، دوا، آلات، مشینری، اسکول، لائبریریاں، اسپتال اور یونیورسٹیاں فراہم کرنے کے ایک عظیم کام میں لگے ہوئے ہیں، جن کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں ۔ وہ جانتا ہے کہ آزادی بھی ایک ایسے ہی تانے بانے کی مانند ہے اور یہ کہ ہم جو کچھ اپنی قوم کے چند آدمیوں کے ساتھ کرتے ہیں وہی کل بنی نوعِ انسان کے ساتھ کرتے ہیں ۔ اور یہ کہ آزادی اور جمہوریت کی آزمائش یہی ہے کہ ہم اس پر اپنے ملک میں عمل کرنے اور بیرونِ ملک اس کی حمایت کرنے کے لئے رضامند ہوں ۔

چوتھے، وہ اپنی تمام تصوریت کے باوجود ایک عملی آدمی ہے، ایک عملی منتظم اور ایک سخت گیر اور مستقل مزاج آدمی ہے ——— اور اگر اس کو زندہ رہنا ہے ——— تو وہ ایک بے حس آدمی بھی ہے ۔ اس کو روزمرّہ کے انتظامی معاملات کے تجربے کی ضرورت ہے ۔ اس کو اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دھواں دھار تقریریں اور لمبے چوڑے دعوے عملی طور پر کوئی کام کرنے اور اس کے نتائج سامنے لانے کا نعم البدل نہیں ہو سکتے ۔

اس قسم کے بین الاقوامی کارکن کی چیسٹر باؤلز سے بہتر کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی ۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے "کالج کے ایک سینئر طالب علم کی حیثیت سے میں نے سنہ ۱۹۲۴ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنی زندگی سرکاری کاموں کے لئے وقف کر دوں گا"

وہ ہم کو یہ بھی بتاتے ہیں اور یہ ایک بصیرت افروز بات ہے ——— کہ سنہ ۱۹۲۴ء میں وہ ییل یونی ورسٹی کے ایسے تین یا چار طالب علموں سے ایک تھے جنھیں سرکاری خدمات سے دلچسپی تھی ۔ حالات نے شروع شروع ان کی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا لیکن اسے بالکل ختم بھی نہیں کیا ۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں جب امریکہ کو جنگ میں شامل ہونا پڑا تو مسٹر باؤلز نجی کاروباری دائرے سے نکل کر سرکاری حلقے میں آ داخل ہوئے اور پچھلے بیس سال سے اپنی قوت اور اپنی صلاحیتوں

کو اسی حلقے کی خدمت میں صرف کر رہے ہیں۔

مسٹر باؤلز کی زندگی میں چار واقعات خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلا واقعہ اس وقت رونما ہوا جب جنگ کے دوران لوگوں کو سرکاری خدمات کی دعوت دی گئی تھی۔ مسٹر باؤلز نے پہلے صدر روزویلٹ کے ماتحت پرائس ایڈمنسٹریٹر اور بعد میں اقوام متحدہ میں ٹرگوے لی کے معاون خصوصی کی حیثیت سے سیاسیات اور حکومت کے کاموں کے بعض دشوار تجربات حاصل کئے۔ ان خدمات کے سلسلہ میں ان کو دنیا کے ایسے دور دراز اور طویل سفر اختیار کرنے پڑے جنھوں نے انھیں تقریباً ہر براعظم اور تقریباً ہر ملک میں ایک جانی پہچانی شخصیت بنا دیا اور جن کی بدولت انھوں نے ۱۹۴۷ء میں وہ معرکہ آراء مقالہ لکھا جس میں انھوں نے مارشل پلان کی پیش بینی کی تھی، جسے میں نے اس مجموعے میں شامل کیا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ وہ ہے جب انھیں کنکٹیکٹ کے گورنر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کی بدولت انھیں ایک روزمرہ اور جانے پہچانے انداز میں بنیادی جمہوریت اور بنیادی حریت پسندی کی اہمیت کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کی بدولت ان پر مقامی اور قومی معاملات نیز مقامی اور بین الاقوامی معاملات کے باہمی تعلق کی نوعیت بھی واضح ہو گئی۔ اس کی بدولت انھیں کھیتوں اور دیہاتوں، کارخانوں اور دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ جس کے ذریعے بہت سے ممالک میں مختلف قسم کے سامعین کے ساتھ ان کا ایک مستقل رابطہ پیدا ہو گیا ہے۔

ان کی زندگی کا تیسرا اہم واقعہ ان کا ہندوستان میں سفیر کی حیثیت سے مقرر ہو کر جانا تھا۔ اس کی بدولت انھیں ایک اور تہذیب اور ایک اور دنیا میں روشناس ہونے اور ایک بین الاقوامی سرکاری کارکن کی حیثیت سے اپنے تجربات میں اضافہ کرنے کا موقع ملا۔ اس سے مسٹر باؤلز کی طبیعت کی لچک اور نرمی کا اظہار ہوتا ہے کہ انھوں نے غیر معمولی تدبّر سے کام لیتے ہوئے خود کو اپنی اس نئی ذمہ داری اور ہندوستان کے عقلی اور سماجی ماحول کے ساتھ ہم آہنگ بنا لیا اور ایک ایسے طریق کار کی بنیاد ڈالی جس پر ان کی سفارت کے زمانے کے بعد سے تمام امریکی ترجمان کاربند رہتے چلے آئے ہیں۔

اس کی بدولت انھیں امریکہ میں ہندوستان اور اس کے پڑوسی ممالک کے بارے میں سب سے زیادہ پُر معلومات شخصیت کی حیثیت سے سامنے آنے کا موقع ملا۔ اور انھوں نے ایک ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان دنیا کی صفِ اول کی قوت کی حیثیت سے اُبھر کر آ رہا تھا، ہندوستان اور امریکہ کے درمیان ایک مصالحت کنندہ کا کردار ادا کیا۔

چوتھا واقعہ ۱۹۶۰ء میں کنکٹیکٹ سے کانگریس کی رکنیت کے دوسرے سال میں پیش آیا جب کہ مسٹر باؤلز کو سنیٹر کنیڈی کے خارجہ پالیسی کے ایڈوائزر کی حیثیت سے اور اس کے بعد ڈیموکریٹک نیشنل کنونیشن کی پلیٹ فارم کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔

اس اعلیٰ مرتبے پر پہنچ کر انھوں نے ڈیموکریٹک نظام العمل کے خارجہ پالیسی سے متعلق بہت سے اصول، مثلاً سول رائٹس کے اصول اور بہت سے اقتصادی اصول وضع کئے۔ اس پلیٹ فارم کے بارے میں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ داخلی حیثیت سے اور اپنے عالمگیر نتائج کے اعتبار سے سب سے زیادہ آزاد نظام العمل ہے جسے ڈیموکریٹک پارٹی نے منظور کیا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس نظام العمل کو بہت معمولی بحث و تمحیص کے بعد عام رضامندی اور جوش و خروش کے ساتھ منظور کیا گیا تھا۔

اس کامیابی کے لئے مسٹر باؤلز کچھ کم مبارکباد کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ مسٹر باؤلز کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اس نظام العمل کی پالیسیوں کی عوام کی طرف سے حمایت ہوتے، اور ان کے بڑے حصے کو حکومت کی طرف سے منظور ہوتے دیکھا، جس میں انھوں نے شروع میں نائب سکریٹری محکمہ خارجہ کی حیثیت سے کام کیا اور اب افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے امور خارجہ پر صدر امریکہ کے مشیر اور نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں[1]۔ ان کے کام کا میدان بہت وسیع ہے اور وہ اس کو نہایت سمجھداری، خندہ پیشانی، خیر خواہی اور کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

اپنی بیس سالہ سرکاری خدمات کے دوران مسٹر باؤلز اپنے نظریات کے اظہار میں قطعاً صاف اور واضح رہے ہیں۔ اس مدت میں انھوں نے سات کتابیں لکھی ہیں جن میں انھوں نے ملکی ——— اور خصوصاً ——— غیر ملکی پالیسی کے متعلق اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ امریکہ کی قومی زندگی میں غالباً کوئی اور ایسا شخص نہیں ہے جس نے پچھلی ایک دہائی میں امریکی عوام کے ساتھ خارجہ پالیسی پر ان سے زیادہ گفت و شنید کی ہو۔ انھوں نے ۴۱ ریاستوں ۲۰ یونیورسٹیوں نیز ری پبلکن اور ڈیموکریٹک دونوں پارٹیوں کے اجتماعات میں اپنی قوت اظہار کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کیا ہے۔

نتیجہ کے طور پر مضامین اور تقریروں کا صحیح معنوں میں ایک سیلاب تھا جو ان کے انتھک دماغ سے جاری رہا۔ ان میں سے بعض مضامین وقیع جرائد کے لئے لکھے گئے تھے، بعض ایسے دلائل قاطع کی شکل میں ہیں جو اراکین کانگریس یا خارجہ پالیسی کے ذمہ دار حضرات کے سامنے

---

[1] آج کل مسٹر باؤلز ہندوستان میں امریکہ کے سفیر ہیں۔

پیش کئے گئے تھے۔ بعض نیم سرکاری روداد یں، بعض محض وقتی اور تقریباتی خطبات اور بعض دوسرے بیانات ہیں جو کسی ایک مخصوص موضوع پر نہیں ہیں۔

اس کتاب میں ہم ان کے بعض ایسے مضامین اور خطبات کا انتخاب پیش کر رہے ہیں جو ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے تھے۔

پہلے تو میرا ارادہ یہ تھا کہ میں اس کتاب میں شائع کئے جانے والے مضامین و مقالات کا سلسلہ اس وقت سے شروع کروں گا جب کہ ۱۹۴۳ء میں مسٹر باؤلز نے فیڈرل پرائس ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ایک عظیم اور خراب حال محکمہ کا کام سنبھالا تھا۔ اور کمال خوبی سے پرائس ایڈمنسٹریشن کے دفتر کو افراطِ زر کی راہ میں ایک سخت کوش، مستعد اور مسلسل سدِ راہ بنا کر کھڑا کر دیا۔

زمانۂ جنگ کے اس مواد کے مطالعہ کے دوران، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ — ہر چند کہ اس میں دورِ مابعد جنگ کے ادراک و بصیرت کا ثبوت بھی ملتا ہے —— اس کا بیشتر حصہ اسی زمانے سے متعلق تھا۔ نتیجہ کے طور پر میں نے یہ طے کیا کہ میں اس کتاب کو مسٹر باؤلز کی بعداز جنگ کی تحریرات سے ہی شروع کروں گا۔

میں نے اس تمام مواد کو دو بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے: اول وہ مضامین جو امور خارجہ کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے وہ مضامین جن کا بیشتر تعلق داخلی معاملات سے ہے۔

چونکہ حال میں مسٹر باؤلز کی سب سے زیادہ خدمات خارجہ پالیسی کے سلسلہ میں رہی ہیں، اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ کتاب میں شامل کیا جانے والا زیادہ مواد اسی موضوع سے تعلق رکھتا ہو۔ پھر خارجہ پالیسی کے مواد کو بھی اپنی جگہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں اول عام مسائل، اقتصادی ترقی کے مسائل، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی "نئی" قوموں کے مسائل اور دوسرے کمیونسٹ چیلنج سے دفاع کے مسائل ہیں جو کرۂ ارض کے ہر گوشے سے ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔

داخلی معاملات سے متعلق مواد بھی مناسب موضوعات کے مطابق تقسیم کر دیا گیا ہے جو ہمارے معاشرے کی اقتصادیات، ریاستی حکومت کی ذمہ داریوں اور شہری آزادیوں اور شہری حقوق سے متعلق ہیں۔

مواد کی یہ تقسیم سہولت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ اور اس میں ان کی جداگانہ حیثیت کا اعتراف شامل نہیں۔

اگر ان مضامین کا اسی ترتیب کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، جس میں کہ وہ شائع کئے گئے ہیں، تو اس سے ہمیں اس تسلسلِ خیال اور فلسفیانہ وحدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو لوگ ان کے قومی زندگی کے میدان میں قدم رکھنے کے وقت سے ہی مسٹر باؤلز کے لئے مشعلِ راہ بنی رہی ہے۔

اس تمام مواد کو یکجا کرنے کے سلسلے میں مجھے مسٹر باؤلز کی طرف سے اس میں مناسب ترمیمات کرنے اور اس کے بعض حصوں کو مختصر کرنے کی اجازت حاصل تھی اور میں نے اس کا خوب اچھی طرح استعمال کیا ہے۔ ایسا کرنے میں میں نے بعض ضروری نظریات کی اہمیت پر زور دیا ہے جن کی مسٹر باؤلز نے برسوں کے غور و فکر کے بعد تشکیل کی ہے، اور جن کو وہ مختلف صورتوں میں استعمال کرتے ہیں۔

مسٹر باؤلز کے پچھلے بیس سال کے غور و فکر کا کچھ حصہ قومی پالیسیوں اور قوانین کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کے بیشتر حصے کو آج قومی مباحث کے بنیادی موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ کچھ مضامین بعض ایسے فیصلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو ہنوز ہمارے سامنے نہیں آئے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے بحیثیت ایک قوم کے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کی کوشش کی تو ہم کو ضرور ان سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب فکر و عمل کے تعلق باہمی یعنی ایک انقلابی دنیا میں نظریات کی بے پایاں قوت کا مظاہرہ کرتی ہے۔

ان برسوں میں جیسے مسٹر باؤلز ایک مقامی شخصیت سے ترقی کر کے قومی اور بین الاقوامی شخصیت بن گئے ہیں۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے قومی مقاصد کے تعین اور قومی فکر کی تشکیل کے لئے محنت اور بے لوثی کے ساتھ کام کیا ہے۔ اور اپنی قوم کو بار بار اس بات کا احساس دلایا ہے کہ یہ دنیا میں بڑائی حاصل کرنے کا بہترین موقع ہے۔ اور وہ خود بھی انھیں لوگوں میں سے ایک ہیں جن پر پیریکلز کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں کہ "یہ جانتے ہوئے کہ خوشی کا راز آزادی اور آزادی کا راز زندہ دلی ہے، وہ دشمن کے حملے کو دیکھ کر تماشائی کی حیثیت سے کھڑا نہ رہ سکا۔"

ہنری اسٹیل کومیجر

ایمہرسٹ، مساچوسسٹ
۱۵ / جون ۱۹۶۲ء

حصّہ اوّل

ریاستہائے متحدہ اور عالمی انقلاب

باب اول پر ایک ذاتی نوٹ

میں اپنی جنگ کے بعد کی تحریروں اور تقریروں کے اس انتخاب کی ادارت کے لئے پروفیسر کومیجر کا ممنونِ احسان ہوں۔

باب اول ہمارے عالمگیر مقاصد سے متعلق میرے اپنے نظریات اور ان کے حصول کے لئے جو چیزیں میرے نقطۂ نگاہ سے ضروری ہیں، ان کی وضاحت کرتا ہے۔ ایک سلسلہ کے طور پر، یہ مضامین خارجہ پالیسی کے بہت سے اہم مسائل پر ایک قومی ذو جماعتی اتفاق اور مطابقت رائے کی طرف ہماری تدریجی ترقی کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

اس مطابقت رائے میں ظاہر اور پوشیدہ دونوں قسم کی جارحیت کی مخالفت اور معقول دفاعی انتظامات کی ضرورت، جس کے ساتھ بین الاقوامی سلامتی کے مؤثر انتظامات اور ساتھ ہی ساتھ بڑھتی ہوا اسلحے کی دوڑ کے متعلق گہری قومی تشویش کا احساس بھی شامل ہوگا۔ اس کے علاوہ اس میں اقوام متحدہ کی اہمیت سے اتفاق، عالمی تجارت کو وسعت دینے کا وعدہ اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی اہمیت کا اقرار بھی شامل ہے جہاں بنی نوعِ انسان کی اکثریت آباد ہے۔

پھر بھی آج جب میں ان صفحات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ترقی پذیر اقوام کے سلسلہ میں مقاصد اور تقدمات پر اپنے طویل اختلافات اور اپنی قومی اتفاق رائے کو نئے حالات پر منطبق کرنے میں ہمارا تساہل یاد آجاتا ہے۔

مثال کے طور پر "معاہدہ ترقی"، ہمارے لاطینی امریکہ کے پڑوسیوں کی طرف ہماری بیس سالہ بے توجہی کا ایک ایسا متبادل ہے جو کافی دیر کے بعد بروئے کار آیا۔ آج بھی اندرون ملک بہت سے مفروضات اور غیر ممالک میں حالات موجودہ کو قائم رکھنے کے متعلق ہماری بہت سی یقین دہانیاں ایسی ہیں جو ایشیا میں ہماری آزادیٔ عمل کی راہ میں مزاحم بنی ہوئی ہیں۔

اب بھی ہمیں کانگریس کی اکثریت سے اس بات کو منوانے کے لئے ہر سال جان توڑ کوشش کرنی ہوتی ہے کہ روس کی مبینہ چٹان کو تراشنے اور آزاد دنیا کو وسعت دینے کے لئے آزاد قوموں کا اقتصادی، سماجی اور سیاسی نشوونما ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ اپنی صد سالہ غیر جانبداری اور علیحدگی پسندی کو ترک کر کے خاصی تیزی کے ساتھ اور خاصی دور نکل آئے ہیں۔ لیکن کیا واقعی ہم کافی تیزی کے ساتھ اور کافی دور نکل آئے ہیں۔؟ کیا ہم اپنی غیر معمولی قومی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کر رہے ہیں؟

اور سب سے زیادہ بنیادی بات یہ کہ کیا ہماری جیسی کوئی متمول اور خوش نصیب قوم کسی ایسی انقلابی جدوجہد میں سرگرم شریک بن سکتی ہے جس کا مقصد امن اور دنیا کے تمام انسانوں کے لئے انصاف مہیا کرنا ہو؟

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ہمارے ان سوالوں کے جوابات سے اس صدی کے باقی حصہ کی دنیا کی تشکیل ہو گی۔

چیسٹر باؤلز

حصّہ اوّل

ہمارے عالم گیر مقاصد

ہم ہیں سے کم بُزدل لوگ جو کم سے کم کر سکتے ہیں وہ یہ کہ موجودہ نسل کے سامنے جاکر دورِحاضرہ کے لازمی حقائق کی حمایت کریں: یعنی اس بات کی کہ زمین پر انسان کے مستقبل کو تاریک نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ کہ ہمیں خود کو بے یاری و مددگاری کے عالم تباہی کا شکار نہ بنا لینا چاہیئے۔ یہ کہ ہماری سُوجھ بُوجھ اب بھی ہم کو تباہی سے بچا سکتی ہے۔ یہ کہ ہمارے اخلاقی معیار بدستور موجود ہیں۔ یہ کہ بعض چیزیں مثلاً جنگ اور ناانصافی گو بظاہر ابدی معلوم ہوتی ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ چیزیں ابدی حیثیت ہرگز نہیں رکھتی اور ابد ہی تک ان کے خلاف جنگ جاری رہے گی، اور بالآخر ایک روز ان پر فتح نصیب ہو گی۔

۲۶ رجولائی ۱۹۵۴ء

۱- موقع ہے کہ ہم حالات کا رخ تبدیل کر دیں

ذیل میں مسٹر چیسٹر باؤلز کی ایک تقریر پیش کی جاتی ہے جو انھوں نے فریڈم ہاؤس ولکی میموریل بلڈنگ نیویارک میں ۱۷ رجنوری ۱۹۴۷ء کو کی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے غیر ترقی یافتہ قوموں کو طویل مدت اقتصادی اور تکنیکی امداد دینے اور ایک نئے متحد یورپ کے قیام کی اولین تجاویز میں سے ایک تجویز پیش کی ہے۔

اگر امریکی عوام آئندہ بیس سال تک ہر سال اپنی مجموعی آمدنی کا ۲ فی صدی حصہ کم ترقی یافتہ ممالک کی تعمیر و ترقی پر خرچ کرنے کی تجویز کی حمایت کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو ہم تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل سکتے ہیں۔
یہ رقم غیر ممالک میں لگائے جانے والے نجی سرمائے کے ساتھ مل کر روئے زمین کے بہت سے بڑے بڑے دریاؤں کی قوت سے کام لینے، سیلابوں کو روکنے، برقی توانائی سے چلنے والے بڑے بڑے کارخانوں کی تعمیر اور ذرائع آبپاشی کے مہیا کرنے میں مدد دے سکتی ہے جس سے کروڑہا آدمی مستفید ہوں گے۔ اس کی بدولت تمام مشرقی دنیا، جنوبی امریکہ اور یورپ میں جدید ذرائع نقل و حمل کا جال بچھانے میں بھی زبردست مدد ملے گی۔
سرمائے کے اس استعمال کی بدولت امریکی عوام دنیا کے مختلف حصوں میں پُرامن صنعتوں کو طرزِ جدید پر لانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں جو اپنی جگہ یورپ، ایشیا، ہندستان، جنوبی امریکہ اور افریقہ کے معیارِ زندگی کو کافی حد تک اونچا کرنے میں مددگار ثابت ہوگا اور بے شمار لوگوں کو ایک دوسرے کے ممالک کی اور خود امریکی اشیاء کی خرید و فروخت میں مدد دے گا۔

ہماری قومی آمدنی کا دو فی صدی حصہ —— یعنی چار ارب ڈالر —— فارغ پر ہمارے موجودہ مصارف کا صرف ایک تہائی حصہ ہے۔ اور اس رقم کا محض نصف ہے جو ہم پر ہر ماہ نازیوں اور فاشسٹوں کے خلاف لڑنے پر صرف کرتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم کو یقین ہے کہ بہت سے لوگ اس کو اسرافِ بیجا اور فضول خرچی قرار دے کر اس کی مذمت کریں گے اور چچا سام کے "خون آشام" میں تبدیل ہو جانے کی ایک اور مثال قرار دیں گے۔
لیکن اس قسم کی رائے زنی کرنے والوں کا مطمح نظر درست نہیں ہے اور میری خواہش

ہے کہ لوگ اسے تسلیم نہ کریں۔ سرمایہ کا یہ استعمال امریکی عوام کے سرمایہ لگانے کی ایک ایسی مثال ہوگی جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس کی بدولت دنیا کے کروڑہا انسانوں کو بے اندازہ اقتصادی استفادہ نصیب ہوگا۔ یہ امریکی طرز زندگی کی اس خوبی کا زندہ ثبوت ہوگا کہ وہ نہ صرف ہمارے لئے ایک اعلیٰ معیار زندگی مہیا کر سکتا ہے بلکہ دُنیا کے دوسرے لوگوں کی ایک زیادہ پُر وقار انداز میں ایک زیادہ خوش حال زندگی بسر کرنے کی طرف بھی رہنمائی کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے لئے امن کی ارزاں ترین ضمانت ہے۔ سرمایہ کا یہ استعمال کسی اعتبار سے مشروط یا معمولی سیاسی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم کو پولینڈ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ اور مشرقی یورپ کی جنگ کی بدولت تباہ ہو جانے والی قوموں، نیز یورپ، ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے دوسرے ممالک کو قرضہ دینے کی بھی حمایت کرنی چاہیئے۔

البتہ ہم کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ یہ سرمایہ زیادہ سے زیادہ کارآمد طریقے پر استعمال میں لایا جائے۔ مثلاً قدرتی وسائل، ملکی حدود کے پابند نہیں ہوتے۔ لہذا قدرتی وسائل کا بہتر استعمال جو اعلیٰ معیار زندگی کے لئے ضروری ہے، دنیا میں زیادہ بڑے پیمانے پر علاقائی منصوبہ بندی کا متقاضی ہے۔

امریکہ میں ہمیں یہ فائدہ حاصل ہے کہ یہ جغرافیائی اعتبار سے ایک بہت بڑا علاقہ ہے جہاں بڑی بڑی منڈیوں کو ترقی دینے کے کافی مواقع موجود ہیں جو بڑھتی ہوئی صنعتی پیداوار کے لئے انتہائی ضروری ہیں۔ روس کو بھی کچھ اسی قسم کے مواقع، اسی قسم کی وجوہات کی بنا پر حاصل ہیں۔ اگر دنیا میں امن و امان رہا اور اس امن کے ساتھ ساتھ باقاعدہ طریقے پر اقتصادی ترقی اور سیاسی نشوونما بھی جاری رہی تو اسی قسم کے زیادہ سے زیادہ مواقع باقی دنیا کو بھی حاصل ہوتے رہیں گے۔

یورپ اس قسم کی اقتصادی ہم آہنگی کے امکانات کی ایک اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ یورپ کی اقتصادی افزائش اور بالآخر سیاسی نشوونما کی رفتار میں اضافہ کرنے کے خیال سے آج ہم جو اخراجات برداشت کر رہے ہیں، اس ہم آہنگی کی ہمت افزائی کرنے کے خیال سے ہم اسے یورپ کے کسی اقتصادی ادارے کی معرفت کرنا ہوگا۔ اس ادارے کو کل براعظم یورپ کے لئے ایک اقتصادی منصوبہ تیار کرنا ہوگی وسائل کی تقسیم اور اس منصوبہ پر عمل درآمد کی کوشش کرنی ہوگی۔ اس منصوبے میں یورپ کی برقی توانائی، ذرائع رسل و رسائل، نقل و حمل نیز زراعت اور فولاد کی صنعتوں کا ارتقاء شامل ہے۔

امریکہ کو یورپ کے اس اقتصادی ادارے کی فراخ دلی کے ساتھ مدد کرنی چاہیئے۔

بشرطیکہ یورپی اقوام اور خود ہمارے اور یورپ کے درمیان محصولات ختم کر دیئے جائیں یا ان میں
اس درجہ کمی کر دی جائے کہ ایک بار پھر ان سب ممالک کے درمیان آسانی کے ساتھ اشیاء کی درآمد
برآمد ہونے لگے۔ اس سرمایہ کو اس طرح استعمال میں لانا چاہیئے کہ اس کی بدولت یورپ کے تقریباً
تیس کروڑ انسانوں کے معیار زندگی میں، جن میں ہمارے سابقہ دشمن بھی شامل ہیں، تیزی کے
کے ساتھ اضافہ یقینی ہو جائے اور اس ادارے کی تنظیم کچھ اس طرح ہونی چاہیئے کہ جمہوری کے
جارحیت کی راہ پر گامزن ہونے کی فوجی ترقی کے امکانات ہمیشہ کے لئے مسدود ہو جائیں۔

اقتصادی اداروں کے قیام کے اسی قسم کے منصوبے جنوبی امریکہ اور افریقہ کے کچھ علاقوں،
جنوب مشرق اور جنوبی ایشیا اور مشرق قریب کے لئے بھی بننے چاہئیں اور انھیں امریکہ کی مالی
امداد کی بنیاد پر کام کرنا چاہیئے۔

دنیا میں دائمی امن کے قیام کے سلسلے میں ہماری اولین کوششوں میں علاقائی منصوبہ
بندی کی بنیادوں پر امریکی ٹیکنالوجی اور صنعتی ساز و سامان کی زیادہ سے زیادہ برآمد شامل ہونی
چاہیئے تاکہ دوسرے ممالک کے معیار زندگی کو رفتہ رفتہ اونچا اٹھایا جا سکے۔

یہ سوچنا یقیناً ایک حماقت ہوگی کہ آئندہ دس سال میں یا آئندہ نسل کے وجود میں
آنے تک عالمی بھائی چارے کا کوئی مبارک دور پیش آ جائے گا۔ لیکن صرف ایک راستہ جو
عالمی امن اور انسانی آزادی کے حصول کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے اس پر سینہ سپر ہو کر گامزن
ہو جانے میں دیر کرنا کر اس سے بھی بڑی حماقت ہوگی۔

۲ امریکی خارجہ پالیسی کے اخلاقی، اقتصادی اور سماجی پہلو

ذیل کے مضمون میں مسٹر باؤلز نے ایک نئی اور انقلابی دنیا میں ایک خارجہ پالیسی
کے اخلاقی، اقتصادی اور سماجی پہلوؤں پر زیادہ زور دینے کی حمایت کی ہے۔

نیویارک ٹائمز میگزین ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء

اس وقت امریکہ کے باشندوں کی کل تعداد صرف چودہ کروڑ پچاس لاکھ ہے اور ہم دو
ارب انسانوں کی انقلابی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں دائمی امن کی بنیاد کے قیام کے
سلسلے میں ہماری کامیابی کا انحصار بیشتر ہمارے نظریات کی قوت اور دنیا کے دوسرے آزاد

ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات پر ہے۔

باوجود اس کے کہ کچھ عرصہ پہلے ہماری فوجوں کی تعداد ان کی موجودہ تعداد سے دوگنی تھی، قوت یا قوت کے استعمال کی دھمکیوں کے ذریعہ اپنی برتری کو دوسرے پر مسلط کرنے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ ہم مستقبل کی دنیا کو صرف اس حالت میں متاثر کر سکتے ہیں جب کہ لوگوں کو ہم پر اعتماد ہو۔ اور ان کو اس وقت تک ہم پر اعتماد نہیں ہو سکتا جب تک انھیں اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ ہم ان کے مخلص رفیق اور دوست ہیں۔ ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم ان کو سمجھیں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ اقتصادی تحفظ کی قسم کی کسی چیز کے لئے ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کو سمجھیں۔

اگر ہم ان ممالک کے عوام سے قطع نظر ان کی حکومتوں کو سامنے رکھ کر سوچنا شروع کریں اور ان خیالات اور تصورات کو چھوڑ کر جو عوام الناس میں تحریک کا باعث بنتے ہیں، فوجی مصالح کو اپنے تمام فیصلوں کی بنیاد بنائیں تو یقیناً ہم ایک دشوار صورت حالات میں پھنس کر رہ جائیں گے۔

ایک اوسط درجہ کا امریکی باشندہ صرف سیاسی جمہوریت ہی پر یقین نہیں رکھتا بلکہ اقتصادی جمہوریت پر بھی یقین رکھتا ہے۔ امریکہ کی آج تک کی طویل تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وہ مخصوص اقتصادی مفادات کے غلبہ کے خلاف ہمیشہ لڑتا رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس کو اس جنگ میں شاندار کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ زمین کے بڑے بڑے قطعات کی ملکیت، کم سے کم اُجرت کے قوانین، لیبر یونینوں، کوایریٹو سوسائٹیوں، سوشل سیکیورٹی، انکم ٹیکس، بچوں سے کام لینے کے متعلق قوانین، سرکاری اسکولوں اور دوسرے سینکڑوں طریقوں سے ہم نے اس منزل کی طرف بہت کافی پیش قدمی کی ہے جو صدر روزویلٹ نے ایکانامک بل آف رائیٹس میں متعین کی تھی۔

پھر بھی جب ہم بین الاقوامی معاملات میں "جمہوریت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، تو ہمارا مفہوم بظاہر سیاسی جمہوریت تک محدود نظر آتا ہے۔ ہم نے اقتصادی جمہوریت — یعنی کاشتکار کے زمین پر حق ملکیت، شہر میں کام کرنے والے مزدوروں کے اپنی خوراک اور رہائش کے لئے معقول معاوضہ مانگنے کے حق اور ملک کے گوشہ گوشہ کے لوگوں کے اچھی قسم کی تھوڑی بہت تعلیم اور اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے حقوق — کی اہمیت کو واضح نہیں کیا ہے۔ کمیونسٹوں نے خود کو ایک ایسی واحد طاقت ظاہر کر کے جو دنیا کے کروڑہا مفلسوں کے مفادات کے لئے فکرمند ہو، ہماری اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ کمیونسٹ رہنما نہایت زور

شور کے ساتھ لیکن مؤثر طریقہ پر اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ "کمیونزم اقتصادی جمہوریت کا علمبردار ہے جس کا مطلب سرکاری منصوبہ بندی کے ذریعہ لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنا ہے۔ امریکہ سیاسی جمہوریت کا مدعی ہے جس سے آپ کا پیٹ نہیں بھر سکتا اور نہ ہی وہ آپ کے رہنے سہنے کے لئے مکان مہیا کر سکتی ہے"

اقتصادی جمہوریت جسے کمیونسٹ رہنما سرکاری منصوبہ بندی، سرکاری ملکیت اور زرعی اصلاحات کے ذریعہ قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ ان کے اغراض و مقاصد کے انتہائی پُرفریب ہونے کے باوجود ان کروڑہا انسانوں کے لئے ایک براہ راست کشش کا باعث بن جاتی ہے جنھوں نے اس سے پہلے افلاس اور بدحالی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا ہوتا۔

کمیونزم کا استبدادی پہلو، جو مغرب کی سیاسی جمہوریتوں میں پلنے بڑھنے والے ہم لوگوں کے لئے انتہائی نفرت انگیز ہے، وہ ایشیا، افریقہ، مشرقی یورپ اور جنوبی امریکہ کے باشندوں کے لئے نسبتاً کم اہمیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی جبر و تشدد کسی نہ کسی انداز میں ہمیشہ سے ان کی زندگی کا ایک قابل قبول جزو بنا رہا ہے۔

پچھلے دو سالوں میں کمیونزم کو بہت سی فتوحات نصیب ہوئی ہیں اور اگر ہم نے دورِ جدید کی تاریخ کی تراش خراش کرنے والی قوتوں کے سلسلے میں اپنی پالیسیوں میں ضروری تبدیلیاں نہ کیں تو آئندہ برسوں میں اس کو مزید فتوحات نصیب ہوں گی۔

مجموعی حیثیت سے یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں دو ایسی قوتیں ہیں جو عالمی کمیونزم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ اوّل جاگیردارانہ طرز کے زمیندار، نیم شائستہ صنعت گر اور قدیم امراء جو کمیونزم کے خلاف اس لئے نہیں لڑ رہے ہیں کہ وہ آمریت کے مخالف ہیں بلکہ اس لئے کہ کمیونسٹ آمریت خود ان کی قوت اور ان کے جاہ و جلال کے لئے مضرت رساں ہے۔ دوسرے، وہ حریت پسند جمہوری قوتیں ہیں جو کمیونزم کے ساتھ اس لئے برسرپیکار ہیں کیونکہ وہ پولیس اسٹیٹ کے جبر و تشدد کو نہ برداشت کر سکتی ہیں اور نہ کریں گی۔

لہٰذا دوسرے ممالک میں بڑے پیمانہ پر کمیونزم کی مخالفت کی صرف اس طرح تنظیم کی جا سکتی ہے کہ ان جمہوری عناصر کی مستقل طور پر حمایت کی جائے جو انسانی آزادی کے ہمارے تصور کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ اور اس میں ہم اکثر ناکام رہے ہیں ـــــ بعض اوقات اس لئے کہ یہ عناصر خود بہت کمزور تھے۔ بعض اوقات اسلئے کہ ہم ان کے اقتصادی تصورات کے، جنھیں ہم "سوشلزم کی طرف مائل" سمجھتے تھے، مخالف رہے اور بعض اوقات فوجی مصلحتوں کی بنا پر،

اس سلسلے میں ہم نے بعض موقعوں پر رجعت پسندوں کی بھی صرف اس لئے حمایت کی کہ وہ بھی کمیونزم کے اتنے ہی مخالف تھے جتنے کہ ہم، بلکہ اس کی مخالفت میں قوت کے استعمال کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں کمیونسٹوں نے جو پروپیگنڈہ کیا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ دنیا کے لاکھوں کروڑوں انسان ہم کو ان قوتوں کا حامی اور مددگار سمجھنے لگے جنھیں وہ اپنے محفوظ مستقبل کے درمیان بنیادی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے لئے اس سلسلہ کی متبادل صورتیں کیا ہیں؟ ہم ان دو ارب آدمیوں کے ساتھ اپنی فوجی حیثیت کو کس طرح مستحکم رکھ سکتے ہیں جو شمالی امریکہ میں نہیں رہتے ہیں؟ جنگ کو درگذر کرنے کی بہترین صورت کیا ہے؟ اور اگر ہماری ان تمام کوششوں کے باوجود جنگ چھڑ جائے تو ہم زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنے کا کس طرح یقین کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں ہم بہت سی صورتیں اختیار کر سکتے ہیں۔

ہم اپنی بات کی ابتدا زیادہ سے زیادہ اقتصادی ضمانت کے لئے لڑنے والے ہنگری کے عوام اور دنیا بھر کے ظلم رسیدوں کے متعلق اپنی غیر مبہم پالیسی سے کریں گے۔

ہم ان کو باور کرائیں گے کہ ہم اقتصادی اور سماجی اصلاحات کے جنھیں اب سے بہت پہلے وجود میں آجانا چاہیئے تھا، صدق دل سے حامی ہیں اور یہ کہ ہماری مدد سے وہ اعلیٰ معیار زندگی اور سیاسی آزادی دونوں چیزیں حاصل کر سکتے ہیں۔

بین الاقوامی بینک کے ذریعہ ہم ٹگرس، یوفریٹس اور جارڈن جیسے دریاؤں پر T.V.A کے طرز کی دریائی وادیوں کو ترقی دے سکتے ہیں۔ ہم اس علاقے کے حکمرانوں کو ان کے عوام کی زندگی، تعلیم اور صحت کے معیاروں کو بلند کرنے کے سلسلے میں ضروری اصلاحات کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں جن کی عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

یورپ کی بحالی کا منصوبہ ہم کو یورپ میں ایک غیر معمولی موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک انقلابی نظریہ ہے جس کے لئے سکریٹری مارشل مبارکباد کے مستحق ہیں۔

لیکن سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ہماری اس امداد کو کس طرح استعمال کیا جائے گا؟ کیا ہماری ان کوششوں کا نتیجہ جارحانہ قوم پرستی کے اس روایتی تصور کی صورت میں نکلے گا جس نے یورپ کو سلطنت روما کے زمانے سے لے کر آج تک میدان کارزار بنایا ہوا ہے؟ یا اس سے ہم کو ایسی قابل عمل راہوں کے تلاش کرنے میں مدد ملے گی جن پر چل کر یورپ کی ریاستہائے متحدہ کی تعمیر کی جا سکتی ہے، جس کے ریاستہائے متحدہ سے دوستانہ تعلقات ہوں گے اور جو ہمارے ساتھ مل کر ایک پُرامن دنیا کی تعمیر کے لئے کام کرنے کو تیار ہوگی؟

اسی طرح ہم جنوبی امریکہ کے لاکھوں مظلوم انسانوں کو خصوص شرائط کے ماتحت ان کے معیار زندگی کو اونچا اُٹھانے کے لئے اپنی امداد پیش کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم نہ صرف جنوبی امریکہ بلکہ پوری دُنیا میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔

یہی طریقہ کار ہندوستان کے معاملے میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور وہ صرف کمیونزم کو اس وقت روکنے کے لئے نہیں جب کہ اس کے تھوڑے بہت قدم جمنے لگیں بلکہ کمیونزم کے آغاز سے پہلے ہی اختیار کرنا ہوگا۔ اگر ان ابتدائی دشوار برسوں میں معتد بہ مادی امداد اور امریکی ماہرین کی صورت میں ہندوستان کی مدد کی گئی تو ہندوستان کے ان باشندوں کے معیار زندگی بلند کرنے میں مدد ملے گی جنھیں گاندھی اور نہرو نے گہری نیند سے جگایا ہے۔

بہر حال مادی امداد کی پیش کش ہی کافی نہ ہوگی۔ اس امداد کے ساتھ ساتھ ہماری روشن خیال قیادت کی بھی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں کمیونزم کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے اور دائمی امن کی بنیاد رکھنی ہے تو ہمارے لئے کاہلی، اور بدعنوانی یا پھر رجعت پسندی اور فاشزم کو برداشت کرنا ناممکن ہوگا۔

ہم کو اس بات کا مظاہرہ کرنا چاہیئے کہ ہم یعنی امریکی عوام نہ صرف استبداد کی ہر شکل کے ہی مخالف ہیں بلکہ ان تیز رفتار اقتصادی اور سماجی اصلاحات کے زبردست حامی بھی ہیں جن کی عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور جن کا فقدان آج کمیونسٹوں کو نہایت سہل الحصول مواقع فراہم کر رہا ہے۔

تاریخی اعتبار سے دُنیا کی بڑی بڑی قومیں اپنی قائدانہ حیثیت کو اس لئے کھو بیٹھی ہیں کہ خوش حالی اور فارغ البالی کے حصول کے بعد وہ اپنی جگہ خاموش ہو کر بیٹھ گئیں اور اس دنیا کے ساتھ اپنا رابطہ منقطع کر لیا جو ہمیشہ جدوجہد میں مصروف رہتی ہے۔ باقی دنیا سے رابطہ منقطع کر لینے کے بعد اپنے تحفظ کے بارے میں خود ان کے اندیشوں میں اضافہ ہونے لگا اور اندیشوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ پہلے سے زیادہ بڑی قدامت پسندی وجود میں آئی جس نے رفتہ رفتہ انتہا درجہ کی رجعت پسندی کی شکل اختیار کر لی۔

تاریخ آج ہمارے یعنی امریکی باشندوں کے اوپر ایک زبردست ذمہ داری عائد کرتی ہے۔ اگر ہمیں اپنی موجودہ عظمت اور قومی وقار کو برقرار رکھنا ہے تو ہم کو اقتصادی، سماجی اور سیاسی جمہوریت کے ایک انقلابی اور عالمگیر منصوبے کی حمایت کرنی ہوگی اور اس کا نہایت سمجھداری کے ساتھ ادراک کر کے اسے نہایت سختی کے ساتھ عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ صرف اسی طرح ہمارا ملک دو ارب انسانوں کی دنیا میں ایک مثالی حیثیت سے ترقی کر سکتا ہے۔ جو کسی حالت میں رجعت پسندی کو گوارا نہیں کر سکتے۔

۳- ایک اور مباحثۂ عظیم کی تجویز

نیو یارک ٹائمز میگزین کے ۲۸ فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اس مضمون میں چیسٹر باؤلز نے امریکی وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس کے جوابی حملے کی پالیسی کے خلاف اپنے قوی اور قاطع دلائل پیش کئے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے آج تک خارجہ پالیسی پر ہونے والے "عظیم مباحثوں" کی فہرست تیار کرنا امریکہ کے ان تاریخی اقدامات کی یاد دلاتا ہے جو اس نے اپنے اوپر عائد کی جانے والی عالمی ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے کئے تھے۔ ان میں ٹرومین نظریہ، مارشل پلان، نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی۔ یورپ میں فوجوں کا بھیجا جانا، چین پر حملہ کرکے کوریا کی جنگ کو وسعت دینے سے انکار —— یہ سب بنیادی نوعیت کے فیصلے تھے اور ان کو بہت کافی بحث و تمحیص کے بعد قبول کیا گیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب ایسے ہی ایک "عظیم مباحثے" کے لئے مناسب وقت آگیا ہے۔ ہمارے لئے "اس تجویز" یعنی فوری جوابی کارروائی" کی —— نام نہاد ڈلس تجویز —— پر فوری بحث کرنے کا وقت آگیا ہے۔

۱۲ جنوری ۱۹۵۴ء کو فارن ریلیشنز کونسل کے سامنے تقریر کرتے ہوئے وزیر خارجہ مسٹر ڈلس نے ہماری عالمی پالیسی کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک ایسی بات کا انکشاف کیا ہے جو ہماری خارجہ پالیسی میں ایک دوررس تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے۔ آیئے مسٹر ڈلس کی اس تجویز کی اصل غرض و غایت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

ان کی تقریر کے بعض ایسے حصّوں سے جن پر انھوں نے بہت زور دیا ہے، یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ مقامی مدافعت یعنی محدود جنگ کے تصور کو سرے سے خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں وسیع مزاحمتی قوت پر زیادہ سے زیادہ اور مقامی دفاعی قوت پر کم سے کم انحصار کرنے پر زور دیا ہے۔

پہلے ایک بار انھوں نے کہا تھا "ہمارے لئے آرکٹک اور استوائی خطّوں، ایشیا، مشرق قریب اور یورپ میں، سمندر، خشکی اور ہوا، ہر جگہ اپنے نئے اور پرانے ہتھیاروں کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار رہنا ضروری ہے۔" اب اس بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ "اپنی پسند کے ہتھیاروں اور اپنی پسند کی جگہوں پر فوری جوابی حملہ کرنے کی عظیم صلاحیت پر انحصار کرنے کے ..... بنیادی فیصلے" کی بدولت اس ضرورت میں تبدیلی آگئی ہے۔

"فوری جوابی حملے" کی اصطلاح ہمیشہ ایٹمی حملے کے سلسلے میں استعمال کی جاتی رہی ہے۔ "اپنی پسند کی جگہوں"، پر جوابی حملے سے مراد ان علاقوں سے ہے جو جارحیت کے علاقے سے دور ہیں، کیونکہ یہ علاقہ دشمن کا انتخاب کردہ ہے۔

ان سب باتوں سے حکومت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں دنیا کے کسی بھی غیر کمیونسٹ علاقے میں روس یا چین کی مسلح جارحیت کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے بشتر کمیونسٹ ممالک کے بڑے بڑے شہروں پر ایٹمی حملے کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ہماری اس وضاحت کو اعلیٰ سرکاری ذرائع کے اس بیان سے بھی تقویت نصیب ہوتی ہے کہ "مسٹر ڈلس نے آج تک جو بیانات دیئے ہیں، یا ان کے آئندہ جو بیانات دینے کی توقع ہے۔ ان میں یہ اہم ترین بیان ہے"۔

اگر ہماری نئی پالیسی یہی ہے تو ہم کو دیکھنا ہوگا کہ اول جارحیت کو روکنے دوم اگر جارحیت کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے تو اس کو دبانے کے سلسلے میں اس کی کامیابی کے کہاں تک امکانات ہیں؟ کیا واقعی، جیسا کہ مسٹر ڈلس کا خیال ہے، اس پالیسی سے ہم کو "کم قیمت پر زیادہ تحفظ نصیب ہو سکے گا"؟

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مغربی یورپ میں یہ پالیسی نہ تو نئی ہے اور نہ ہی غیر آزمودہ ہے۔ روس بلاشبہ ایک عرصہ سے اس بات کو جانتا ہے کہ ہم یورپ پر ہونے والے کسی حملے کو خود اپنے اوپر حملہ تصور کریں گے، اور یہ کہ اس حملے کے جواب میں ہم ایٹم بم کا استعمال کریں گے۔ خواہ اس کے نتیجے میں پیش آنے والی ایک بڑی جنگ خود ہمارے ملک میں بڑے پیمانے پر ایٹمی اسلحے کی تباہی کا باعث ہی کیوں نہ ثابت ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا امریکہ ایشیا میں افغانستان، برما، ایران یا انڈونیشیا جیسے ممالک میں مقامی جارحیت کو روکنے کے لئے ایسے عظیم خطرات مول لینے کے لئے تیار ہوگا؟ کوریا کی جنگ اور انڈونیشیا میں اس سے بھی زیادہ محدود پیمانے پر حصہ لینے کے تلخ تجربات ہم کو یہی بتاتے ہیں کہ ہم اس کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

بہرحال سوال یہ ہے کہ چین جیسے وسیع اور لامرکزی ملک پر ایٹمی حملہ کر کے ہم اسے کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ سوویت یونین کے برعکس چین میں کوئی بڑا صنعتی مرکز نہیں ہے۔ منچوریا کے فولاد کی کل پیداوار دلادیر میں امریکہ کے فولاد کے کارخانے کی پیداوار کے نصف سے زیادہ نہیں ہے۔

چین کی اقتصادیات کا انحصار ذرائع رسل و رسائل یا نقل و حمل کے کسی باقاعدہ سلسلے پر ہے۔ چینی فوجیں غیر اتامتی ہیں جن کو گوریلا جنگ کی تربیت دی گئی ہے اور وہ مغربی

فوجوں جیسے بہم رسانی اور کمک کے منظم سلسلوں کے بغیر کام کرتی ہیں۔

لہذا ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ چین کے شہروں کو اٹمی حملے کے ذریعہ تباہ کرنے کا نتیجہ ایک طویل، مسلسل اور غیر فیصلہ کن تصادم کے علاوہ کچھ نکل سکتا ہے جس کے نتیجے میں چین کی سب سے بڑی دولت یعنی اس کی آبادی ایشیا کے بیشتر حصہ پر قابض ہو سکتی ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا اس نئی پالیسی میں ایک اور بڑا مسئلہ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک بنیادی اخلاقی مسئلہ مضمر نہیں ہے جس پر ہمیں اچھی طرح غور کرنا چاہیئے؟ ہم مذہبی لوگ ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ انسان کو خدا نے ایک بڑی واجب التعظیم چیز بنایا ہے۔ ہمارے جمہوری عقائد میں فرد کی جو اہمیت اور قدر و قیمت ہے، ہم اس پر فخر کرتے ہیں اور یہی وہ عقائد ہیں جو ہمارے فلسفہ حیات کو کمیونسٹوں کے فلسفہ حیات سے ممتاز کرتے ہیں۔

اس کے باوجود اگر ہم چین کے شہروں پر اٹیم بم پھینکنے کی دھمکی دیتے ہیں تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ ہم چین کے ان لاکھوں مرد، عورتوں اور بچوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں جو روس کے شہروں کے برعکس ایسے شہروں میں آباد ہیں جہاں معقول فوجی یا صنعتی ٹھکانوں کا یکسر فقدان ہے۔ کیا ہم ان حکمرانوں کو سزا دینے کے لئے جو ان لوگوں پر حکومت کرتے ہیں، بے یار و مددگار لوگوں کی اس عظیم تعداد کو نیست و نابود کر دینے کے لئے تیار رہیں؟

کمیونسٹوں کے اس پروپیگنڈہ نے ایشیا کے لاکھوں باشندوں کو اس بات کا یقین دلا رکھا ہے کہ ہم نے جرمنی کو چھوڑ کر جاپان پر اس لئے اٹیم بم ڈالا تھا کہ ہم ایشیا والوں کو گھٹیا درجے کے لوگ سمجھتے ہیں۔ اگر چین کے غیر محفوظ شہروں کو اٹمی حملے کے ذریعہ تباہ کیا گیا اور روس کے شہر جوں کے توں باقی رہے تو کیا ایشیائی ممالک ہمارے بدترین دشمنوں کی صورت میں تبدیل نہ ہو جائیں گے؟

اور یورپ کا کیا ہو گا؟ کیا مسٹر ڈلس کی نئی پالیسی ہمارے اس نازک ترین سفارتی مسئلے کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے جس کی بدولت یورپی اقوام کا اتحاد قائم ہے اور اس کی تقویت کا باعث ہے؟ کیا مسٹر ڈلس کی اعلان کردہ نئی پالیسی ہمارے یورپی دوستوں میں ہمارے ساتھ متحد رہنے کے لئے تھوڑا بہت اشتیاق پیدا کرے گی؟

ہو سکتا ہے کہ امریکہ باشندے تیسری عالمگیر جنگ کے اس سو فیصدی یا پھر خارج از بحث خطرہ کو مول لینے کے لئے تیار ہو جائیں جو "اٹمی جوابی حملے" کی نئی پالیسی میں مضمر ہے۔ لیکن ہمارے جنگ کے مارے ہوئے یورپی حلیف جو روسی اڈوں سے صرف چند

سو میل کے فاصلے پر موجود ہیں، ان کو جوابی اٹمی حملے کی صورت میں ہم سے زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ اور یہ شک کہ اس نئی پالیسی میں تیسری عالم گیر جنگ کے غیر ضروری خطرات مضمر ہیں، یورپ کے دفاع کے انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں ان کی گرمجوشی کو شدید صدمہ پہنچا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اٹمی توانائی کے بین الاقوامی کنٹرول کے بارے میں جو تھوڑی بہت امید آج پائی جاتی ہے اس پر نئی پالیسی کا کیا اثر ہوگا؟

ہم نے اپنے نصب العین کے بارے میں اعتماد پیدا کرانے کے لئے جو اہم ترین اقدامات کئے ہیں ان میں سے ایک اقدام یہ ہے کہ ہم نے اقوام متحدہ کے ماتحت اٹمی ہتھیاروں پر ایک قابل عمل بین الاقوامی کنٹرول قائم کرنے کی تجویز کی صدق دلی سے حمایت کی ہے۔

اگر ہم امن کے قیام کے سلسلے میں اٹمی اسلحے پر پورا پورا انحصار کریں گے تو گویا ہم اٹمی اسلحہ بندی کے اس خواب کا سلسلہ درہم برہم کردیں گے جس کے لئے بنی نوع انسان اٹمی دور کے آغاز سے لے کر آج تک برابر کوشاں چلی آرہی ہے۔

اس کے علاوہ ایک مسئلہ جس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے گا وہ ہماری حکومت کے بنیادی ڈھانچے سے تعلق رکھتا ہے۔ آئین کی رو سے کانگریس، اور صرف کانگریس ہی اعلان جنگ کرنے کی مجاز ہے۔

فرض کیجئے کہ چینی فوجیں ہند چینی پر حملہ کرتی ہیں، ایسی صورت میں کیا صدر امریکہ چین پر جوابی حملہ اٹمی حملہ کرنے سے قبل کانگریس کی منظوری لیں گے؟ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو یہ جوابی حملہ "فوری" کیسے کہلایا جاسکتا ہے؟ اور کیا اس میں یہ خطرہ مضمر نہیں ہے کہ اس عرصے میں جب کہ کانگریس ان سب چیزوں پر غور و خوض کر رہی ہو، روس پیش بندی کے طور پر امریکن شہروں پر وحشیانہ اٹمی حملے شروع کردے؟

یا اس قسم کے امکانات کے پیش نظر کیا وہ اپنے صدارتی اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے جوابی حملے کا حکم جاری کردیں گے اور کانگریس کو اس کے آئینی اختیارات کے استعمال کا موقع دیئے بغیر تیسری عالم گیر جنگ کی ابتدا کردیں گے یا دوسروں کو اس کی ابتدا کرنے کی دعوت دیں گے؟

اس کے علاوہ ایک اور سوال بھی ہے اور وہ یہ کہ حالات حاضرہ کا خالص فوجی طاقت اور وہ بھی ایک مخصوص قسم کی فوجی طاقت کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے کیا ہماری نئی پالیسی کمیونسٹ خطرے کی اہمیت اور اس کی وسعت کو حد درجہ کم نہیں کردیتی ہے۔

سرد جنگ کے بارے میں ایک انتہائی اہم بات یہ ہے کہ کمیونسٹوں نے کسی جگہ بھی روسی فوجوں کے اقدامات کو ظاہر نہیں ہونے دیا ہے۔ صرف کوریا میں البتہ آہنی پردے کی حدود کو خارجی فوجی حملے کے ذریعے تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس کے برعکس ہمیں روس کے بہت سے مؤثر طور طریقوں کا تجربہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ایران میں روسیوں نے ایران کے شمالی صوبوں میں ایک بغاوت کی پشت پناہی کی تھی جس کے بارے میں یہ طے ہے کہ یہ بغاوت روس کے اشارے پر ایران کی کمیونسٹ پارٹی نے برپا کرائی تھی۔

اس کے علاوہ یونان، برما، ملایا، ہند چینی، انڈونیشیا، فلپائن اور خود چین میں لڑائیوں کا سلسلہ اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ یا اعلیٰ درجہ پر منظم مقامی سپاہیوں یا گوریلوں کے ذریعہ جاری رہا جنھیں اکثر روسی اسلحہ اور روسی ماہرین کی خدمات حاصل ہوتی تھیں۔

ہر اس ملک میں جن کی حکومتوں کو اس کے عوام کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا کمیونسٹوں کی ریشہ دوانیوں کو کامیابی کے ساتھ مزاحمت کر کے شکست دے دی گئی، لیکن جن علاقوں میں نوآبادیاتی قوتیں باقی تھیں، جیسا کہ ہند چینی میں، یا جہاں کمیونسٹوں کی مخالفت ایسے آدمیوں نے کی جن پر سے عوام کا اعتماد اٹھ چکا تھا، وہاں مغرب کی زبردست فوجی اور اقتصادی امداد حتیٰ کہ مغربی افواج کی مداخلت بھی آج تک کارگر ثابت نہ ہو سکی۔

بعض دوسری صورتوں میں مثلاً چیکوسلواکیہ میں سوویت یونین نے مقامی کمیونسٹ پارٹیوں کی انتہائی منظم تخریبی سرگرمیوں پر انحصار کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کریملن نے عالمی بالادستی کے حصول کی کوشش میں ہمیشہ انتہائی لچک دار طریقہ سے کام لیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہماری نئی پالیسی ان کثیر التعداد کمیونسٹ خطرات کا کس طرح مقابلہ کرے گی جو خارجی حملے کی صورت اختیار نہیں کرتے ہیں؟

اس کے علاوہ ماسکو بعض اور معاملات میں بھی مداخلت کرتا نظر آرہا ہے۔ مثلاً اس بات کی جملہ شہادتیں موجود ہیں کہ روس اپنی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی پیداوار کو ایک جارحانہ قسم کی تجارت کا آغاز کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے جس کا مقصد نہ صرف روسی اقتصادیات کو تقویت پہنچانا ہی ہے، بلکہ مغربی دنیا کے اندر بعض نئے اختلافات پیدا کرانا اور ایشیا کی نئی حکومتوں کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کرانا بھی ہے۔

حتیٰ کہ روس کے ایک نئے چار نکاتی پروگرام کے بارے میں بھی کچھ خبریں سننے میں آرہی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ سیاسی، اقتصادی اور پارلیمانی ذرائع کی مدد سے دیئے جانے والے

روس کے اس مختلف النوع چیلنج کی موجودگی میں کیا ہمارے لئے خود کو اٹمی جنگ کے خطرے میں مبتلا کر دینا مناسب ہوگا؟

مثال کے طور پر کیا ہم نے ایشیا کی ان آزاد اور ترقی پذیر قوموں کی نشوونما کی امید اور اس کے لئے کام کرنا ترک کر دیا؟ جو ہمارے لئے نہیں بلکہ خود اپنے آزاد رہنے کے حق کے لئے لڑ رہی ہیں؟

خود ہمارے سست رفتار چار نکاتی پروگراموں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جن کی طرف مسٹر ڈلس صرف اشارہ کر کے رہ گئے ہیں؟

ہمارے دفاعی انتظامات اور اخراجات کے اندر کسی معتد بہ کمی کا انحصار کرۂ ارض کے ان مختلف علاقوں کی مقامی قوت کی نشوونما پر ہے جنھیں کمیونسٹوں کی تخریبی کارروائیوں یا کمیونسٹ حملے کا خطرہ درپیش ہے۔ اور یہ مقامی قوت اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب کہ اسے صحیح معنوں میں آزاد حکومتوں اور صحت مند اور ترقی پذیر اقتصادیات کی پشت پناہی حاصل ہو۔

اگرچہ ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ یہ حکومتیں ہمارے نظریات کے ساتھ اتفاق کریں گی لیکن روزمرہ معاملات میں ہمارے ساتھ اتفاق کرنا ان کے خود اپنے ایک ٹھوس نظریے اور عقیدے کو وجود میں لانے کے مقابلے میں انتہائی کم اہمیت رکھتا ہے، جس کے لئے ضرورت پڑنے پر وہ ہر مزاحمت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں گی۔

اٹمی حملے کی قوت ایک مرکزی اور مسلسل عمل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کے باوجود یہ تصور کرنا ایک حماقت ہوگی کہ یہ قوت ایشیا کے پُر ترغیب خلاؤں میں کمیونسٹ حملوں، تخریبی کارروائیوں اور اندرونی انقلابات کے خلاف ایک ضمانت پیش کرتی ہے۔

مثال کے طور پر جب ہم دنیا کے سامنے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم ہند چینی کے معاملے میں کسی حالت میں براہ راست کوئی حصہ نہیں لیں گے تو گویا ہم کمیونسٹوں کے لئے اس سے کہیں زیادہ پُر ترغیب صورت حالات میں پیدا کر دیتے جتنی کہ ہم نے کسی زمانے میں کوریا میں کی تھی۔

اوسط درجے کے گشتی فوجی دستے جن کے متعلق دنیا یہ جانتی ہے کہ ہم انھیں کسی قسم کے تصادم کی صورت میں استعمال کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں وہ ایسے حالات میں جارحیت کی حوصلہ شکنی کرنے کے سلسلے میں اس سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں جتنا کہ بڑے پیمانے پر اٹمی حملے کی دھمکیاں جن کے متعلق آہنی پردے کی دونوں اطراف کا ہر واقف کار شخص یہ جانتا ہے کہ وہ اس وقت تک ممکن نہ ہو سکے گا جب تک کہ ہمارے یورپی حلیفوں پر براہ راست کوئی حملہ نہ ہو۔

لہٰذا ہماری پالیسی دنیا کی ان انقلابی قوتوں کے سلسلے میں نہایت واضح اور ممکن العمل ہونی چاہئے جن سے دنیا کے مستقبل کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اس کو اس درجہ مستعد ہونا چاہئے کہ یہ

وہ دور دراز کمیونسٹ دنیا کے اندرونی اختلافات کا ادراک کر کے ان سے فائدہ اُٹھا سکے۔
اس کو کمیونسٹ ممالک کے اقدامات کی بدولت مجہول بن کر رہ جانے کے خطرے کو ختم کر دینا چاہیئے اور دنیا کے تمام لوگوں کی آزادی کی خواہشات کی ہر امکانی حد تک حمایت کرنی چاہیئے۔
اور سب سے اہم یہ کہ اسے اس رجحان کو باقی رکھنا چاہیئے جسے ہمارے آباء اجداد نے "اعلان آزادی" میں "بنی نوعِ انسان کے خیالات کے احترام" سے تعبیر کیا ہے۔
ان اہم مسائل پر ایک بڑے مباحثے کی مدد سے ہم ایسے متوازن حل تلاش کر سکیں گے جو اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ہمارے لئے مددگار ثابت ہوں گے۔ اس قسم کا مباحثہ جس میں کانگریس اور عوام دونوں شرکت کریں۔ کسی جمہوری ملک میں خارجہ حکمت عملی کے ارتقار کا واحد معقول اور مناسب ذریعہ ہے۔

۴۔ کیا ہمارے پاس ناامیدی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟

۱۹۵۴ء میں جب دنیا پہلی بار ہائیڈروجن بم کی تباہ کاریوں سے روشناس ہوئی تھی، اس وقت مسٹر باولز نے بعض مفید متبادل صورتیں پیش کی تھیں جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ ایک سرگرم قومی قیادت کے ماتحت ہمارے سامنے موجود ہیں۔ نیو لیڈر۔ ۲۶ جولائی ۱۹۵۴ء میں شائع ہونے والے ایک مضمون سے اقتباس۔
ایڈمنڈ برک نے ایک بار پارلیمنٹ میں اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا تھا کہ "جب خراب آدمی یکجا ہونے لگیں تو اچھے لوگوں کو بھی متحد ہو جانا چاہیئے ورنہ وہ ایک ایک ہو کر ختم ہونے لگیں گے۔ اور یہ ایک انتہائی قابل نفرت جدوجہد کے دوران ایک ناقابل رحم قربانی ہو گی۔"
اس بات سے کہ ہم کو جس جدوجہد کا خدشہ محسوس ہو رہا ہے وہ کوئی ایٹمی یا قطعی جدوجہد ہو سکتی ہے، اس کے قابل نفرت ہونے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ۔ سوال یہ ہے کہ اچھے لوگ اس خطرے کو رفع کرنے کے لئے کس طرح متحد ہو سکتے ہیں؟ ہمارے سامنے کیا متبادل صورتیں موجود ہیں۔؟
پچھلے اٹھارہ ماہ کے دوران ہمارے سامنے بہت سی ناممکن متبادل صورتیں آتی رہی ہیں۔ ان میں سے بہت سی صورتیں محض نعرے بن کر رہ گئیں اور ان کے کوئی معنی نہ تھے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں "امتناعی جنگ" اور "چاپلوسی" کے درمیان "روک تھام" اور "نجات" کے درمیان،

"امدادی پروگراموں" اور "امداد کی بجائے تجارت کے پروگراموں" اور "ملکی وسائل کے اندر اندر"، گھریلو نظام معیشت اور "عملی دیوالیہ پن" میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے۔

یہ کہنا نہایت بزدلی کی بات ہوگی کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں اچھی چیزوں کے انتخاب کے مواقع ختم ہو چکے ہیں۔ سچے ضمیر والے لوگ اس وقت تک ایسے مقام پر پہنچنے کا اعتراف کریں گے، حتیٰ کہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے اس وقت تک ایسا نہیں کہیں گے جب تک کہ واقعی طور پر بم گرنے نہ شروع ہو جائیں۔

اس موضوع پر اگر ہم محض اپنے کندھے اُچکا دیں اور دوسروں کو خطاوار قرار دینے کی کوشش کریں تو ہم میں سے کوئی بھی اس تاریخی غداری کی انفرادی اور اخلاقی ذمہ داری سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے گا۔ مستقبل کی ہائیڈروجن بم والی دُنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ اُمید افزا متبادل صورتیں موجود ہیں ایسی متبادل صورتیں جو ہماری روایات اور ہمارے اصولوں کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہیں۔

یہ متبادل صورتیں نئی نہیں ہیں۔ یہ صرف پُرانے اور عالمگیر اصولوں کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں جن سے ہمیں کام لینا ہے۔ ہائیڈروجن بم جیسی نئی اور وحشت انگیز چیز نے صرف یہی کیا ہے کہ بنی نوعِ انسان کی بعض قدیم دشواریوں اور اُلجھنوں کو ایک ڈرامائی شکل اور ایک فوری اہمیت دیدی ہے۔ ان دشواریوں اور مشکلات کے اندر مضمر اخلاقی پہلو کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

جب ہمارے بجٹ تراش حضرات "پوائنٹ فور کا گلا گھونٹنے بیٹھتے ہیں تو وہ اپنے اقدام کو ایک اقتصادی فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔

جب مہاجرین کو امداد دینے کا ایمرجنسی پروگرام افسرانِ حکومت اور قواعد کے چکر میں آ پھنستا ہے اس طرح کہ اس کی بدولت اس قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہونے لگے تو یہ صرف کوئی انتظامی مسئلہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی مسئلہ بھی ہوتا ہے۔

جب ہم کسی اقلیتی طبقے کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ ہم ایک ایسے مخصوص اختیار کا ہی استعمال کرتے ہیں جس سے ہم آئندہ کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ بلکہ ہم یہ بھی طے کرتے ہیں کہ ہمارے ایک ہم جنس انسان کی کمتری کی اخلاقی حیثیت کیا ہے۔

جب مقامی جوشیلے اقوام متحدہ کے خلاف مظاہرۂ غیض کرتے ہیں تو وہ صرف تنگ دلانہ عصبیت کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ اخلاقی عدم توازن کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان خیالی چیزوں کا پیچھا نہ کرتے ہوئے جو آزادی اور تحفظ کے سلسلے میں قطعاً مددگار ثابت نہیں ہو سکتیں، انسانی مسائل کی ان اندرونی راہوں کو تلاش کرنے میں اپنی قوت اور وقت صرف کریں، جن کی کوئی اہمیت ہے۔

ہائیڈروجن بم ایک ایسے زمانے میں وجود میں آیا ہے جب کہ دنیا موجودہ صورت حال میں ایک انقلاب لانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ انقلاب متعدد شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ مثلاً ایشیا اور افریقہ میں قوم پرستی اور نوآبادیات خواہی کی مخالفت، یورپ میں سرد جنگ سے شدید بیزاری۔ امریکہ میں دوسرے درجہ کے حقوق شہریت کے خلاف حبشیوں کی جدوجہد اور جملہ غیر ترقی یافتہ معاشروں میں زرعی اصلاحات اور صنعتوں کو فروغ دینے کی جدوجہد کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

کمیونسٹوں نے ان مسائل کو پیدا نہیں کیا ہے، وہ صرف ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہمارا یہ کہنا کہ ہم "اعلانیہ جارحیت" کا مقابلہ فوجی اقدام سے کریں گے اپنی جگہ بالکل صحیح اور ضروری ہے۔ لیکن یہ اندرونی عوامی کشمکش اور پُر آشوب حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ ان سے کمیونسٹ نہایت عمدگی کے ساتھ فائدہ بھی اٹھاتے اور موقع پڑنے پر ان کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کی جڑیں مصیبت، خستہ حالی اور افلاس کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں ہماری حالیہ ناکامیاں اسی ایک ضروری نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

کریملن جب تک عالمگیر انقلاب کے نصب العین پر قائم ہے اس وقت تک سوویت بلاک کے ساتھ کسی بنیاد پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں ایک قابل عمل ایٹمی کنٹرول، قابل عمل تخفیف اسلحہ اور ایک قوی تر ادارہ اقوام متحدہ کے لئے کوئی منصوبہ پیش کرنے سے بھی باز رہنا چاہیئے۔

ہمیں اس نفسیاتی گرفت سے آزاد رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس میں روس نے بظاہر ہمیں جکڑ دیا ہے۔ ہمیں ان بنیادی مسائل کے حل کرنے کی کوشش میں لگا رہنا چاہیئے جو دنیا کے مصائب کا اصل سبب ہیں، قطع نظر اس کے کہ روس کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

ایسے بہت سے تعمیری کام ہیں جو روس کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ مثلاً روس کسی یونائیٹڈ نیشنز ورلڈ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے خلاف حق استرداد کو استعمال نہیں کر سکتا، نہ ہی وہ یو، این، او کی ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، فوڈ اینڈ ایگریکلچرل آرگنائزیشن، یونیسکو، چلڈرنس فنڈ اور خود جنرل اسمبلی میں اپنے اس حق کو استعمال کر سکتا ہے۔

روس ایٹمی توانائی کے کسی ایسے اجتماع میں اس حق کو استعمال نہیں کر سکتا جہاں وہ قومیں موجود ہوں جو روس کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔

روس یا واشنگٹن کی روشن خیال قیادت یا امریکی عوام کی نیک خواہشات کے خلاف اس حق کو استعمال نہیں کر سکتا۔

امریکہ، جس کے ساتھ کسی زمانہ میں تاریخ کی اُمیدیں وابستہ تھیں، پچھلے چند سالوں میں دنیا کے دوارب انسانوں کے خلوص اور محبت کے مقابلے میں ان کی بہت کم خدمت کرتا رہا ہے۔ ہم وہ سب باتیں کیوں نہیں کہہ رہے جنھیں کہنے کے لئے امریکہ پیدا ہوئے ہیں؟ ہم لوگ جنھوں نے پہلی بار ایشیا میں ایٹم بم پھینکے تھے، اب اپنے نئے بموں کا تجربہ کرنے کے لئے اس طرف کیوں نہیں رجوع ہو رہے ہیں۔ ہم یہ بات دوسروں کے لئے کیوں چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ بنی نوعِ انسان کی طرف سے جاپانی ماہی گیروں سے معذرت خواہ ہوں جو محض بے گناہ تماشائی تھے۔؟

ہم نے اپنی عظیم ترین افتتاحیہ صدارتی تقریر کے ان الفاظ کو حالیہ سیلون کانفرنس میں مسٹر نہرو کے الفاظ میں وضاحت ہونے کے لئے کیوں چھوڑ دیا: "کسی شخص سے کینہ رکھے بغیر اور ہر شخص سے نرم دلی کے ساتھ"۔ ایسے اندرون اور بیرونِ ملک، خود لنکن کے ہم وطنوں کی زبان پر کیوں نہیں آتے؟

حتیٰ کہ ماسکو کے نہایت تند خو افراد نے بھی مفلسوں اور ناداروں ہی پر اپنا جادو چلایا ہے۔ انھوں نے ہمارے نعروں کو چرایا ہے اور ہمارے اصولوں کی شکل کو مسخ کیا ہے۔ ان کے لئے ایسا کرنا ایک نہایت بدنما چال ہے۔ لیکن عرصۂ دراز کے بعد یہ چیز نہایت فائدہ مند بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم اس الہامی جادو، غیر طبقاتی معاشرے کے اس کھوکھلے تصور، اخوت کے اس خالی خولی نعرے اور انصاف پر مبنی ایک معاشرے کو وجود میں لانے کے کھوکھلے دعوے کو زیادہ عرصے تک نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ہمارے لئے اس چیلنج سے پہلو تہی کسی طرح ممکن نہیں ہے اور نہ ہمیں پہلو تہی کرنی چاہیے ہمیں کمیونسٹوں کی ریاکاری کو صرف اسی ایک طریقے سے طشت از بام کرنا چاہیے جو ہمارے لئے ممکن ہے۔ یعنی خود اپنی ریاکاری کو ختم کر کے۔

ہم میں سے کم بزدل لوگ کم سے کم جو کر سکتے ہیں وہ یہ کہ وہ موجودہ نسل کے سامنے جاکر دورِ حاضرہ کے لازمی حقائق کی حمایت کریں۔ یعنی اس بات کی کہ زمین پر انسان کے مستقبل کو تاریک نہیں سمجھ لینا چاہیے! ہمیں خود کو بے یاری و مددگاری کے عالم میں تباہی کا شکار نہ بنا لینا چاہیے ہماری سوجھ بوجھ ہمیں اب بھی تباہی سے بچا سکتی ہے، اور یہ کہ ہمارے اخلاقی معیار بدستور موجود ہیں۔ بعض چیزیں مثلاً جنگ اور ناانصافی بظاہر ابدی نوعیت کی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ چیزیں ابدی طور پر غلط ہیں، ابدی تک ان کے خلاف جنگ جاری رہے گی اور بالآخر ایک روز ان پر فتح نصیب ہوگی۔

۵۔ عوام اور نظریات کی قوت

نیول وار کالج میں ایک تقریر کے دوران مسٹر باولز نے صرف فوجی طاقت پر روایتی
انحصار کی مذمت کی تھی اور نظریات اور عوام کی اس صلاحیت پر زور دیا تھا کہ وہ ایک انقلاب اور
تبدیلی وجود میں لا سکتے ہیں۔ نیو پورٹ، روڈ آئی لینڈ، ۷ رجون ۱۹۵۶ء۔

ایک بار واشنگٹن میں رات کے کھانے پر میں نے درجن بھر دوستوں سے دریافت کیا کہ
وہ "قوت" کی کس طرح تعریف کریں گے — ان لوگوں میں کچھ فوجی افسران، کچھ ممبران کانگریس اور
محکمہ خارجہ کے چند ممبران تھے۔

"جب ہم قوت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے فی الواقع ہماری کیا مراد ہوتی ہے؟"
میں نے سوال کیا۔

انھوں نے یکے بعد دیگرے جو اجزائے ترکیبی بیان کئے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ قوت
سے ان کی مراد مرکب قوت سے ہے۔ اس مرکب فہرست میں بحری، ہوائی اور بری افواج، فولاد سازی
کی صلاحیت، صنعتی پیداوار کی صلاحیت، جغرافیہ، سمندر پار کے اڈے اور اسی قسم کی دوسری
چیزیں شامل تھیں۔

قوت کی یہ تعریف دورِ حاضرہ کی ایک ٹھوس حقیقت کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ پچھلے آٹھ سال
کی قلیل مدت میں ۱ر۱ ارب لوگوں — یعنی دنیا کی آدھی آبادی نے ہماری اس محدود تعریف
والی "قوت" کی طرف توجہ کئے بغیر اپنی طرزِ حکومت کو تبدیل کر دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان میں ہر ملک روایتی انداز کی قوت ان ہی لوگوں کی طرف تھی جو حالت
موجودہ کو قائم رکھنے کے حامی تھے۔ یہ بات بار بار ثابت ہو چکی ہے کہ یہ قوت حد درجہ غیر مؤثر ہے۔
ان ملکوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انھوں نے اس قوت کے غیر مؤثر ہونے کا واضح ثبوت
مہیا کر دیا۔

چین اسی قسم کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ یہاں ماؤ سی تنگ نے صرف دو سو انقلابی،
ایک ہزار آدمیوں اور کمیونسٹ کلیت کیشی کے ایک تصور کے ساتھ، جو قدیم چینی معاشرے میں مؤثر
ہونے کی صلاحیت ضرور رکھتا تھا، اپنی جد و جہد کا آغاز کیا اور اسے ایک ایسی عوامی تحریک کی شکل

دیدی جسے بیس سال کے بعد قومی فتح نصیب ہوئی۔ اگرچہ چین میں روایتی فوجی اور صنعتی قوت نے اکثر و بیشتر کومنتانگ کی حمایت کی، اس کے باوجود ماؤسی تنگ اور کمیونسٹ، چین کے آقا بن گئے۔

ہند چینی میں ہمیں ایک بار پھر نظریئے کی قوت کا اندازہ ہوا ہے جو اس بار قوم پرستی کے ساتھ وابستہ تھا۔ ہند چینی کی آزادی کے مطالبے کے سلسلے میں چونکہ فرانسیسیوں کی طرف سے مثبت ردعمل نہیں ہوا، اس لئے کمیونزم اور نیشنلزم ایک نہایت ٹھوس اور ناقابل تسخیر قوت کی صورت میں متحد ہو کر سامنے آئے۔ چین کی طرح جنوب مشرقی ایشیا میں بھی ٹینکوں، ہوائی جہازوں اور فوجی قوت کے دیگر روایتی اجزائے ترکیبی نے حالت موجودہ کو برقرار رکھنے میں مدد دی۔ فرانسیسیوں کے پاس اعلیٰ درجہ کی فوج تھی ـــــ جو دنیا کی بہترین افواج میں شمار کی جاتی تھی ـــــ اور ہم نے ان کی مدد کے لئے ان کو تین ارب ڈالر کی مالیت کا ساز و سامان بھی دیا۔ اس کے باوجود فرانسیسیوں کو شکست نصیب ہوئی اور ان کے ساتھ ہم کو بھی۔

ہندوستان میں ہم ایک تعمیری جمہوری نظریئے کو کامیاب ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ گاندھی جی کا عدم تشدد کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کا نظریہ ہندوستانی عوام کے مزاج اور خواہشات کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا۔ گاندھی جی نے اپنے سیاسی تدبر اور انتظامی صلاحیت کی مدد سے اس معمولی سی تکنیک سے کچھ اس طرح کام لیا کہ برطانیہ کو ہندوستان، پاکستان، سیلون اور برما کو خیرباد کہنے پر مجبور ہونا پڑا۔

برطانیہ کے پاس، جہاں تک اس روایتی مفہوم کا تعلق ہے زبردست فوجی قوت موجود تھی۔ وہ دنیا کی تیسری بڑی قوت شمار ہوتا تھا۔ اس کے باوجود وہ گاندھی جی کے اس نظریئے کا مقابلہ نہ کر سکا۔

اسی طرح انڈونیشیا میں ولندیزیوں کے پاس شرمن ٹینک، ۴۸-پی ہوائی جہاز اور جدید مشین گنیں تھیں۔ اس کے باوجود آزادی کے نظریئے کو کامیابی نصیب ہوئی۔

ان سب باتوں سے ہم کو جو سبق ملتا ہے وہ بالکل صاف اور واضح ہے۔ یعنی حقیقت پسندی ہمیں اس بات کے لئے مجبور کر دیتی ہے کہ "قوت" کی تعریف میں "عوام کی قوت" اور "نظریات کی قوت" کو بھی شامل کیا جائے۔ آج کی نئی اور انقلابی دنیا میں یہی وہ فیصلہ کن قوتیں ہیں جن کی مدد سے ایسے کروڑہا انسانوں کو، جو عظیم تر مواقع اور آزادی کے خواہاں ہیں، ایسی تحریکوں میں منظم کیا جا سکتا ہے جو موجودہ زمانے کی حکومتوں پر بہت کافی دباؤ ڈال سکتی ہیں۔

بدقسمتی سے ہم نے اس بات کو مصلحت وقت خیال کرتے ہوئے ان حکومتوں کے پیچھے اپنی قومی

عزت اور وقار کی بازی لگائے رکھی، جو ایسے حالات میں جب کہ ان کے کروڑہا انسان "تغیر"
کو بھیک کہہ چکے تھے، اپنے "ماضی" کے تحفظ کا بیڑہ اٹھائے ہوئے تھیں نتیجہ کے طور پر ہمیں اکثر حالتوں
میں خسارہ اٹھانا پڑا۔

اسی طرح روس کی پالیسی کو بھی متعدد موقعوں پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی سب
سے بڑی وجہ اسٹالن کی اس بات سے ناواقفیت تھی کہ ایشیا اور افریقہ کے لوگ، اصل میں کیا چاہتے
ہیں؟ ہم جن بنیادی، اور کارفرما قوتوں کا ادراک کرنے میں اکثر ناکام رہے تھے، روس ان کا ادراک
کرنے میں اور بھی زیادہ ناکام رہا ہے۔

جنگ شروع ہونے کے چند سالوں کے بعد، ان کی حملہ تخریبی کارروائیوں اور پروپیگنڈہ
کے باوجود روسیوں کو یورپ میں اتنا ہی علاقہ مل سکا جو سرخ افواج کی پیش قدمی کی بدولت ملا
اس کے آگے ایک مربعہ میل زمین بھی لینا انھیں نصیب نہ ہو سکا۔ ایشیا میں بھی روس کو اسی قسم
کی ایک ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا جو اپنی جگہ غیر معمولی نوعیت کی تھی۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں چین کے صدر سن یات سین کو جو اپنی نئی اور انقلابی حکومت کو استحکام بخشنے
کے لئے امریکہ سے مالی امداد لینے میں ناکام رہے تھے، آخیر میں مجبور ہو کر روس کی طرف رجوع کرنا
پڑا۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ لینن اور سوویت عوام کے اندر ضم ہوئے بغیر ان سے کچھ نظریات،
کچھ تکنیکیں اور سرمایہ حاصل کر سکیں گے۔

سن یات سین کی اس غلطی سے چین کے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی وجہ اسٹالن کی بعض
غلطیاں ہیں۔ بورو ڈن مشن چینی حکومت کی دعوت پر اس بات کے مظاہرے کی غرض سے چین آیا
تھا کہ دور حاضرہ کی ایک غیر ترقی یافتہ قوم کو کس طرح منظم اور بیسویں صدی کے حسب حال
بنایا جا سکتا ہے۔ نئی قائم شدہ سوویت ریاستوں کے لئے یہ کتنا نادر موقعہ تھا۔
اس کے باوجود اس مشن کو ناکامی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ اس کے اراکین اس نظریئے کو
لے کر آگے بڑھے تھے کہ انقلاب برپا کرنا شہری مزدوروں اور طلبا کا کام ہے، انھوں نے لینن
کی اس نصیحت کو قطعاً نظر انداز کر دیا کہ کسی زراعتی معاشرے میں کلیدی رول کسانوں کا
ہوتا ہے۔

ماؤ سے تنگ نے روس کی زیر ہدایت چلائی جانے والی اس مہم کی خامی کو بھانپ لیا، اور
شہروں کی طرف سے منہ موڑ کر کسانوں کو منظم کرنے کے لئے دیہاتوں کا رخ کیا اور مدت دراز سے
ہوتی چلی آنے والی ناانصافیوں کے نام پر اپنا کام شروع کر دیا۔
اس کا نظریہ ٹھوس اور پرکشش تھا۔ اس نے اعلان کیا "زمینداروں اور ساہوکاروں

کو نیست و نابود کردو، بس تم آزاد ہو" بیس سال کے اندر اندر ماؤسی تنگ اور اس کے وفادار ساتھی لیے اس نظریئے کو تمام چین میں پھیلا دینے میں کامیاب ہو گئے۔

اس اثنا میں چین کو اس کی ناکامی سے جو سبق حاصل ہوئے تھے ان سے اسٹالن نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اس نے پورے ایشیا میں اپنی جدوجہد اور کوششوں کو بدستور طلبا اور ایک بڑی حد تک غیر موجود مزدور طبقے پر قائم رکھا اور ان کسانوں کو نظرانداز کر دیا جو عوام الناس کے اسی فیصدی حصے پر مشتمل تھے اور سیاسی اعتبار سے کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔

اس لغو طریقہ کار کے نتائج ۱۹۴۹-۵۰ء تک ہندوستان میں کمیونسٹوں کی جدوجہد سے ظاہر ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء کے اختتام پر آ کر حیدرآباد میں کسانوں نے ایک زبردست بغاوت کی تھی۔ یہ بغاوت "منحرف" کمیونسٹوں کی ایک جماعت نے برپا کی تھی۔ ان کمیونسٹوں نے دیہی علاقوں میں مجتمع ہو کر اسٹالن کی پالیسی سے انحراف کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کئی ہزار دیہاتوں پر اپنا تسلط جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوستانی فوج بڑی دشواری کے ساتھ اور بہت کافی نقصان برداشت کر کے ہی اس بغاوت کو دبانے میں کامیاب ہو سکی۔

یہ "منحرف" کمیونسٹ جتھوں نے ماسکو کے احکامات کی خلاف ورزی اور خود ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے ماؤسی تنگ کی تعلیمات کی پیروی کی تھی کامیابی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اگر اس موقع پر ہندوستانی کمیونسٹ جماعتی طور پر بھی اعلانیہ ان کی حمایت کر دیتے تو یہ لوگ ہندوستان میں اپنی کارروائیوں کو جاری رکھنے کے لئے ایک مستقل بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ ہمارے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ کرملین نے کسانوں کی سیاسی اہمیت کا ادراک نہ کرتے ہوئے اُن کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

اسٹالن کی موت کے بعد سے روس کے کام کرنے کے طور طریقوں میں ایک عظیم تبدیلی آگئی ہے۔ عالمگیر غلبے کے مقصد میں کوئی ذرا بھی تبدیلی کئے بغیر روس کی حکومت اقتصادی مفاد کے نام پر یورپ، ایشیا اور افریقہ کے ساتھ روابط قائم کر رہی ہے۔

ان کے سیاسی مقاصد میں اگرچہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی ہے، اس کے باوجود ان مقاصد کو نہایت سمجھ داری کے ساتھ پس منظر میں رکھ دیا گیا ہے۔ وہ بظاہر چند بنیادی اصلاحات پر زور دیتے ہیں جن کے متعلق ہر شخص یہ اعتراف کرتا ہے کہ ان کو ہونا چاہیئے۔ لیکن ان کا اصل مقصد دھیرے دھیرے ایشیا کو روس کے حلقۂ اثر میں لے آنا ہے۔

یہ نئے طور طریقے ہمارے مفادات کے لئے زبردست خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہم اپنی صنعتوں کے لئے جو خام مال درآمد کرتے ہیں اس کا تقریباً پچاس فی صد حصہ اب ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ

سے آتا ہے پہلی رپورٹ کے اندازے کے مطابق ۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان یہ شرح ستر فی صد تک پہنچ سکتی ہے۔

اگر روس کی اس نئی پالیسی کے نتیجے میں ہم کو ان بڑے بڑے براعظموں سے نکلنا پڑا تو ہم دیکھیں گے کہ اس سے ہماری فوجی قوت کو صدمہ پہنچے گا اور ہمارے رہن سہن کے معیار میں بھی فرق آسکتا ہے۔

یہی وہ خاص نتیجہ ہے جو ہمیشہ سے روس والوں کے ذہن میں پوشیدہ رہا ہے۔ البتہ اب ان کے طور طریقے زیادہ سے زیادہ پُرفریب ہوتے جارہے ہیں۔ اس کا ایک پہلو خود ہمارے پالیسی سازوں کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے یعنی یہ کہ یہ ایک قدرتی انسانی ہمدردی کی بات ہے کہ ہم ان قوموں کی حمایت کریں جو ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں اور ان کی مذمت کریں جو ایسا کرنے سے انکار کرتی ہیں۔

اس سب کے باوجود امریکہ کے لئے وفاداری خریدی نہیں جاسکتی۔ ہم ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے باشندوں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ امریکہ کے معیار زندگی کو مزید ترقی دینے کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ تمام بنی نوع انسان کی طرح وہ بھی صرف اپنے ملک کے لئے قربانی دے سکتے ہیں، یا پھر اس چیز کے لئے جسے وہ خود اپنا مفاد سمجھتے ہیں۔

لہٰذا ہمیں اپنے اور ان کے مفادات کو مشترک سمجھنا چاہیئے۔ اور ہمیں یہ بات محض زبانی ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرنی چاہیئے۔ ہمیں ان مشترکہ مقاصد کی توسیع اور تحفظ کے لئے تیار رہنا چاہیئے جن کو وہ اہم سمجھتے ہیں۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے یعنی امریکہ کے باشندوں کے لئے ان مقاصد کو سمجھنا اور قبول کرنا آسان ہے۔ ان مقاصد میں نوآبادیاتی غلبے سے آزادی، بلاامتیاز رنگ نسل اور عقیدے کے ہر شخص کے لئے انسانی وقار اور بڑھتے ہوئے اقتصادی مواقع شامل ہیں۔

۶ ـ ہم حقیقت پسند کہاں تک رہے ہیں

غیر ممالک میں ہماری پالیسیوں کے "نظریاتی کھوکھلے پن" کی شدید مذمت کرتے ہوئے ذیل میں مسٹر باؤلز معاملات کی اہمیت میں ایک بڑی تبدیلی اور ایک نئے

طریقہ کار کی تجویز پیش کرتے ہیں، جو امریکہ کی شان کے شایان ہو۔
نیویارک ٹائمز میگزین۔ ۲۰ رمئی ۱۹۵۶ء

امریکہ کی موجودہ خارجہ پالیسی پر مستقبل میں تبصرہ کرنے والے اس کے ایک ایسے پہلو پہلو پر اپنی توجہ مبذول کریں گے جس پر آج بہت کم توجہ دی جارہی ہے ——— یعنی ایک وسیع مشرب مقصد کا فقدان اور اس کا نظریاتی کھوکھلا پن۔
بہت سے ری پبلیکن، اور ڈیموکریٹ بھی ہماری خارجہ پالیسی پر نظرثانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور کافی سختی کے ساتھ کر رہے ہیں۔
لیکن اگر یہ نظرثانی محض بجٹ اور ہمارے طریق کار پر ایک تبصرے تک محدود رہی تو ناکافی ہوگی۔ خارجہ پالیسی بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ایک وسیلہ ہے جس کی مدد سے ایک قوم اپنی حدود کے اس پار اپنے قومی مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔
اس سے ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ امریکہ کا قومی مقصد کیا ہے؟ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ اور وہ اپنی طرف سے اس سلسلہ میں کیا کچھ کرنے کے لئے تیار ہے؟ ہم کو صرف اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اپنے فوجی پروگرام، اپنے اتحادات اور اپنی غیر ملکی امداد کے پروگرام کا پھر سے جائزہ لیں بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ اپنے تعلقات، عالمی معاملات میں اپنے صحیح رول اپنے قومی مقاصد اور خواہشات کا جائزہ لیں۔
یہ بات بین الاقوامی معاملات میں نظریاتی دیوالیہ پن کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو شخص اپنی زبان سے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ امریکہ کی خارجہ پالیسی میں اصولوں کو ایک معقول درجہ حاصل ہے، اس پر حقیقت سے دور ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔
ان کا کہنا ہے کہ اصول صرف ذاتی معاملات میں اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن خارجہ پالیسی اس سے کہیں زیادہ دشوار کام ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں قوت کے ایک تندخو نظریے کے بارے میں سب سے زیادہ فکر ہونی چاہیئے۔
میں نہیں کہہ سکتا کہ قوت کا میگی نوٹ لائن والا نظریہ جس کو بہت سے لوگ بین الاقوامی "دحقیقت لپندی" میں ایک حتمی چیز سمجھتے ہیں، کہیں وہی تو ہماری آج کی علت غائی تو نہیں ہے؟ آیئے لمحہ بھر کے لئے ان چند خطرناک مقامات کا جائزہ لیں، جہاں ہماری اس تنگ نظری نے ہمیں پہنچا دیا ہے۔

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں ہم کس درجہ حقیقت شناس تھے جب ہم نے یہ فرض کیا تھا، کہ
قوم پرست چین کی بوسیدہ بنیادوں پر قائم حکومت جس کا انحصار جاگیردارانہ دور کے زمینداروں
اور ایک ایسی قیادت پر تھا جو چینی عوام کے ساتھ اپنا رابطہ کھو چکی تھی، وہ ماؤزے تنگ کے لائے ہوئے
انقلاب کا مقابلہ کر سکے گی؟

ہم کس درجہ حقیقت شناس تھے جب ہم نے یہ فرض کر لیا تھا کہ کمیونسٹوں کو انڈوچائنا میں
روکا جا سکتا ہے اور ایک اعلیٰ درجہ کی تربیت یافتہ فوج کے ذریعہ اس مقصد کی تکمیل اس صورت
میں بھی کی جا سکتی ہے جب کہ کمیونسٹوں کے جملہ کارروائیوں کا انحصار دم توڑتے ہوئے فرانسیسی
سامراج پر ہو جو ایک پرانے طرز کے زراعتی نظام کے ساتھ وابستہ، اور مقامی بدعنوانیوں سے
مسموم تھا۔؟

ہم کس درجہ حقیقت پسند تھے جب ہم نے یہ سمجھ کر اقوام متحدہ کی فوجوں کی ۳۸ ویں خط متوازی
کی طرف رہنمائی کی تھی، کہ پیکنگ کی دھمکی محض ایک گیدڑ بھبکی ہے، اور یہ کہ چین جنگ کودنے کی ہمت
نہ کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو اسی خط متوازی پر تین سال کے بعد عارضی صلح نامہ پڑا؟

ہم نے یہ فرض کر کے کیسی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا کہ اگر ہم اپنے دوست یعنی پاکستان کو
اسلحہ دے کر جنوبی ایشیا میں توازن طاقت کو درہم برہم کر دیتے ہیں، جس سے فی الواقع افغانستان
نے خوفزدہ ہو کر روس کی امداد قبول کر لی اور ہندوستان نے خود اپنی فوجی طاقت میں زبردست
اضافہ کیا، تو اس سے اہم ترین خطہ کے تحفظ کے امکانات وسیع ہو سکیں گے؟

ہم کتنے حقیقت پسند تھے جب ہم نے اپنے مغربی سامراجی دوستوں کے ساتھ کسی بدمزگی کے
پیدا ہو جانے کے ڈر سے افریقہ میں قوم پرستی کی ایک نہایت قوی اور ناگزیر تحریک کو نظر انداز
کر دیا تھا؟

سوچنے اور سمجھنے کے اس انداز سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے پالیسی ساز حضرات
عالمگیر انقلاب کے اس دور میں نظریات اور عوام کی قوت سرے سے نظر انداز کر چکے ہیں۔
جب تک نظریات انسانوں کے دماغوں کو متاثر کرتے رہیں گے اور جب تک انسان اور
ان کی خواہشات قوت کا ایک جزو ترکیبی بنی رہیں گی اس وقت تک اچھے اور بُرے دونوں قسم کے
نظریات قوموں کو پریشان کرتے رہیں گے، فوجوں کی راہ میں مزاحم ہوتے رہیں گے اور تاریخ لکھنے میں
مدد دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ قوت کے اس ایک اہم پہلو کو جدید "حقیقت پسندی" کے نام سے
موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ولسن اور ایف۔ ڈی روزویلٹ نے اس حقیقت کو سمجھا تھا ہماری
نسل کے رہنماؤں نے اکثر اسے نظر انداز کیا ہے۔

ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ نظریات اور دفاع کا درمیانی توازن ہے۔ یعنی ایک طرف تو روئے زمین کے ان لوگوں کو جو ہمارے ہی جیسے مقاصد یعنی حق اختیاری، انسانی وقار اور وسعت پذیر مواقع کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ——— اور آج کل ایسے لوگوں کی اکثریت ہے ——— ایک مسابقت جوئی آزادی کے جھنڈے کے نیچے جمع کرنا اور دوسری طرف ایک زبردست اور ناقابل تسخیر دفاعی قوت فراہم کرنا جس کے پسِ پردہ ان مقاصد کے حصول کے لئے پُرزور طریقے پر کوشش کی جا سکے۔

اگر آج ہم اپنے مفادات کو اس تغیر پذیر اور انقلابی دنیا کو مدنظر رکھتے ہوئے پرکھنے کی کوشش کریں جس میں کہ ہم رہتے ہیں، تو ہمیں یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ ہمارے مفادات دوسروں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

ایک سال پہلے کی بات ہے جب بنڈونگ میں ایشیا اور افریقہ کی ۲۸ قوموں نے بیٹھ کر اپنے چار بنیادی مقاصد کا ایک خاکہ تیار کیا تھا۔ ان مقاصد میں نوآبادیاتی بالادستی سے آزادی؛ فرد کا وقار بلا امتیاز نسل، عقیدہ اور رنگ کے؛ وسعت پذیر اقتصادی مواقع اور امن شامل تھے۔

یہ تصورات مارکسی نہیں بلکہ مغربی اور امریکی تصورات ہیں ——— جو ان دو وسیع براعظموں میں اس مسلسل امریکی انقلاب کی ایک جھلک کو ظاہر کرتے ہیں جس کے لئے جیفرسن، لنکن، ولسن اور روزویلٹ نے انتہائی فصاحت اور خوش بیانی سے کام لیا تھا۔

اگر اس دنیا میں ہمارا کوئی مقصد ہے ——— اور مجھے یقین ہے کہ ——— تو وہ کل روئے زمین پر ایک ایسے آزاد جمہوری جذبے کی حفاظت اور بالآخر اس کو فروغ دینا ہے جس میں انسانی وقار اور سالمیت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہو۔

یہ مسئلہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت میں ایک بڑی تبدیلی اور امریکہ کے تحفظ، ترقی اور نشوونما کے مسائل کے سلسلہ میں ایک نئے اندازِ فکر کا متقاضی ہے۔

میں نے امریکہ کے شمال، جنوب، مشرق، مغرب ہر جگہ اپنے سفر کے دوران امریکیوں کو پوری دیانت داری اور تندہی کے ساتھ محرومئ قسمت کا لبادہ اُتار کر فکر اور ہدایت کے ایک نئے جذبے کو اپناتے دیکھا ہے۔

اگر عوام کو امریکہ کے عالمی کردار میں کسی جگہ کوئی بڑی کمی یا کوتاہی نظر آتی ہے تو وہ صرف اس لئے کہ ہماری دونوں سیاسی جماعتوں کے رہنما امریکہ کے کردار کی اس وسعت اور فراخی کو عوام کے سامنے لانے میں ناکام رہے ہیں جسے امریکہ کے عظیم رہنماؤں نے ہماری تاریخ کے ابتدائی پُرآشوب

ادوار میں ہمارے سامنے پیش کیا تھا۔

۷۔ یورپ میں ہمارا ___ اور روس کا ___ نصب العین

مسٹر بالڈونز کا خیال ہے کہ یورپ کے قلب سے افواج کی بتدریج کمی سے دونوں اطراف کو فائدہ ہوگا۔ ۱۲ر مئی ۱۹۵۸ء کے نیویارک ٹائمز میں شائع شدہ اس مضمون میں مسٹر بالڈونز نے اپنی اس رائے کے سلسلہ میں مسٹر خروشچیف کے ردعمل سے بحث کی ہے۔

یورپ میں ہمارے یعنی امریکیوں کے اصل اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ ہمارا بنیادی حفاظتی مقصد اس بات کی دیکھ بھال رکھنا ہے کہ یورپ کی صنعتی اور فوجی طاقت کسی طرح ہمارے خلاف منظم نہ ہو سکے۔

برطانیہ نے کسی ایک قوت یا قوتوں کے کسی مجموعے کو یورپ پر غلبہ پانے سے روکنے کے لئے پانچ بڑی بڑی جنگیں لڑی ہیں۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ کی فوجی طاقت میں انحطاط آجانے کے بعد بعض دوربین امریکی رہنماؤں نے اس خلا کو پورا کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔

چنانچہ ۱۹۴۷ء میں بحرِ متوسط میں روس کے دباؤ سے مجبور ہو کر امریکہ نے وہ عظیم قدم اُٹھایا جو "ٹرومین نظریہ" کے نام سے مشہور ہے۔ روس کے اس انکار نے کہ وہ وسطی اور مشرقی یورپ سے اپنی فوجیں نہیں نکالے گا، ہمیں جرمنی میں بڑی تعداد میں اپنی فوجیں جمع کرنے اور ناٹو کے دفاعی خط کو منظم اور مسلح کرنے میں مدد دینے پر مجبور کر دیا۔

اور چونکہ ہم یورپ کی فارغ البالی اور اس کے سیاسی استحکام کے باہمی اور قریبی رشتے سے خوب اچھی طرح واقف تھے اس لئے ہم نے یورپ میں کروڑہا ڈالر صرف کر کے اول جنگ کے نقصانات کی تلافی کرنے اور اس کے بعد یورپ کی قابل دید اقتصادی ترقی کے لئے ایک ٹھوس بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی۔

بہرحال امریکہ کے بیشتر باشندے یورپ کو محض جغرافیائی سیاست کی ایک مشق سے زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔ یورپ کے ساتھ ہمارے تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور نظریاتی رشتے بہت قریبی ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم میں سے نوے فی صدی لوگ یورپی نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ مشرقی یورپ کی قومیں ۱۹۴۵ء سے روس کے زیرِ اثر چلی آرہی ہیں، اس

کم نصیب علاقے کے لوگوں کے ساتھ جن کے لاکھوں دوست اور رشتہ دار امریکہ میں موجود ہیں، ہماری ہمدردی جائز طور پر بدستور چلی آرہی ہے۔

رفتہ رفتہ ہمیں اس بات کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ امریکہ اور یورپ کے مقاصد کو باہمی اتحاد اور وفاق کی مدد سے زیادہ اچھے طریقے پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جس میں بالآخر مشرقی یورپ کی اقوام بھی شامل ہو سکیں گی۔ جوں جوں یورپ میں اتحاد پیدا ہوگا، اس کے عوام میں ایک نیا اعتماد اور ایک نئی مقصدیت پیدا ہونے لگے گی۔ اس طرح یورپ میں برطانیہ، فرانس اور دوسری نو آبادیاتی طاقتیں اپنی اس عالمی اقتدار کے نقصان کی تلافی کر سکیں گی جو صدیوں تک انھیں حاصل رہا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کے متعلق روس کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ ۲۰ رفروری کو ماسکو میں مسٹر خروشچوف نے میرے ساتھ اپنی دو گھنٹے کی گفتگو کے دوران روسی نقطہ نظر کا خاکہ مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا تھا۔

۱۔ وسطی یورپ میں موجودہ "غیر فطری" صورت حال سوویت یونین، امریکہ اور یورپ کے عوام کے مفاد کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ناٹو" اور روس کی فوجیں کسی وقت بھی کسی غیر متوقع حادثہ کی بدولت ایک ایسے تصادم میں اُلجھ سکتی ہیں جسے فریقین میں سے کوئی بھی پسند نہ کرتا ہوگا۔

۲۔ باوجود اس کے کہ سوویٹ یونین اور امریکہ میں سے کوئی بھی جرمنی کے سیاسی اور اقتصادی مستقبل کا تعین نہیں کر سکتا، تاہم مشرقی جرمنی میں روس کے زیر تربیت اُبھرنے اور وجود میں آنے والے "اقتصادی اداروں" کے تحفظ کی غرض سے جرمنی کے اتحاد کو تدریجاً عمل میں آنا چاہیئے۔

۳۔ روس اپنی تمام افواج کو اپنی سرحدوں تک واپس بلا لینے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ امریکہ اور برطانیہ بھی اپنی افواج کو اپنی حدود تک واپس بلا لینے کے لئے رضامند ہو جائیں۔ مسٹر خروشچوف نے کہا کہ اس کے بعد "ناٹو" اور وارسا پیکٹ کی اقوام کے درمیان ایک معاہدہ کی مدد سے یورپ میں امن کی ضمانت دی جا سکتی ہے، جس میں انتہا سے زیادہ اسلحہ سازی کے خلاف بھی ضمانت موجود ہوگی۔ روس اس بات کو پسند کرے گا کہ ان دونوں اداروں کو ختم کر کے ان کی جگہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں روس اور امریکہ دونوں شامل شامل ہو سکیں۔ لیکن انھوں نے اس بات پر زیادہ زور نہیں دیا۔

۴۔ مسٹر خروشچوف نے اس بات پر زور دیا کہ وزیر اعظم بلگانن نے صدر آئزن ہاور کو

بتدریج فوجیں واپس بُلانے کی جو تجویز پیش کی ہے وہ سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ امریکی حکومت اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ اس کی وجہ انھوں نے "کروڑپتی اسلحہ سازوں" کا دباؤ قرار دیا جو ان کے خیال میں سرد جنگ میں ذرا بھی کمی نہیں آنے دینا چاہتے۔

جواب میں میں نے ان سے کہا کہ اپنی ذاتی حیثیت میں میں ان کو یقین دلا سکتا ہوں کہ امریکہ کی دونوں سیاسی جماعتوں کے اراکین یورپ کو اس کی مرضی کے مطابق ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جرمنی میں ہماری فوجوں کی موجودگی اور "ناٹو" جیسے معاہدات کے وجود میں آنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ روس نے جنگ کے بعد سرخ فوج کو اپنی حدود کے اندر واپس بلا لینے سے انکار کر دیا تھا

موجودہ پُرآشوب حالات میں روسی رہنماؤں کے لئے ہم سے یہ توقع کرنا حقیقت سے بعید معلوم ہوتا تھا کہ ہم تین ہزار میل کے فاصلہ پر سمندروں پر سے اپنی فوجوں کو گزار کر واپس لے جائیں جب کہ روسی افواج کو اپنی سرحدوں تک جانے کے لئے صرف چند سو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے ان کے پاس اعلیٰ درجے کی سڑکیں بھی موجود تھیں۔

مسٹر خروشچوف ہم سے اس وقت تک اس بات کی توقع نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ اس بات کے لئے تیار نہیں ہو جاتے کہ وہ اپنی افواج اور اسلحہ کو اپنی مغربی سرحد کے مشرق کی جانب کچھ فاصلہ پر اکٹھا کر کے اقوام متحدہ کے مشاہدین کو اس علاقے میں معائنہ کے کلی اختیارات دے دیں۔

نہ ہی مسٹر خروشچوف ہم سے اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ ہم دنیا کے دوسرے حصوں میں اپنے ہوائی اڈوں کے سلسلے کو ختم کر دیں گے تاوقتیکہ ملٹری ٹیکنالوجی میں کوئی عظیم تبدیلی واقع نہ ہو یا عالمگیر تخفیف اسلحہ کا کوئی معاہدہ نہ ہو جائے۔

میں نے ان کو بتلایا کہ بہت سی ایسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر بیشتر امریکیوں کے لئے اس بات پر یقین کرنا محال ہو گا کہ مسٹر خروشچوف اور ان کے ساتھی جب اس آخری اور فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچیں گے تو وہ اپنی افواج کو یورپ میں ان کے موجودہ ٹھکانوں سے ایسی شرائط کے ماتحت واپس بلانے کے لئے تیار ہوں گے جو امریکہ اور "ناٹو" میں اس کے ساتھیوں کے لئے قابل قبول ہوں گی۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مشرقی جرمنی، ہنگری اور پولینڈ کے واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مشرقی جرمنی سے روسی افواج کے واپس چلے جانے کے بعد اس علاقہ میں روس

کے سیاسی اور اقتصادی اثر اور رسوخ میں تیزی کے ساتھ کمی واقع ہونے لگے گی۔

مثال کے طور پر مشرقی جرمنی کے معیار زندگی مغربی جرمنی والوں کے مقابلہ میں نہایت پست ہیں۔ پھر بھلا وہ ایک ایسے اقتصادی نظام کے ساتھ کیوں چمٹے رہیں گے جو مغربی جرمنی کے نسبتاً زیادہ آزاد نظام کے مقابلہ میں کم منافع بخش ثابت ہوا ہے۔؟

سرخ فوج کے ایک بار واپس چلے جانے کے بعد مسٹر خرشچوف جرمنی کے باشندوں کو اپنے متحدہ ملک کو اپنی مرضی کے مطابق ترقی دینے سے کس طرح باز رکھ سکیں گے؟

علاوہ ازیں روسی افواج کی واپسی کے بعد ایک متحدہ یورپ کے قیام کا قوی امکان ہے۔ جس میں مشرقی یورپ کا علاقہ مغربی یورپ سے زیادہ قریب ہو جائے گا۔

مسٹر خروشچوف نے جواب دیا کہ روسی رہنما ان تمام مسائل پر اچھی طرح غور کر چکے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ متحدہ یورپ، امریکہ، برطانیہ یا فرانس کے طویل المدت مفاد کے حق میں مفید ثابت نہ ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسے یورپ پر جرمنی کا غلبہ ہوگا اور وہ "امن کے زمانے میں ان تمام تر مقاصد کو حاصل کرے گا جنھیں وہ جنگ کے ذریعہ حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔"

میں نے سوال کیا کہ اگر مشرقی اور مغربی یورپ کا اتحاد اس طرح عمل میں آنے لگے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تو کیا روس اس کی مزاحمت کرنے کے لئے میدان جنگ میں کود پڑے گا؟۔ "ہرگز نہیں" انھوں نے جواب دیا۔ "تاوقتیکہ ہمارے یورپی پڑوسی خود لڑائی کے لئے آمادہ نہ ہو جائیں۔"

پچھلے چند ہفتوں میں، میں اس گفتگو کے متعلق چند ایسے لوگوں کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتا رہا ہوں جو برسوں سے سوویٹ یونین کا مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں اور جن میں سے کئی لوگ موجودہ سوویٹ رہنماؤں سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ ان لوگوں میں صرف ماسکو میں مقیم غیر ملکی سیاست داں ہی نہیں بلکہ پولینڈ اور یوگوسلاویہ کی حکومتوں کے اراکین، ماسکو، بلگریڈ، برلن اور دوسرے مقامات پر مقیم امریکی افسران اور خود امریکہ میں موجود روسی طلبا اور طالبات بھی شامل ہیں۔

اگرچہ ان میں سے بیشتر آدمیوں کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ مسٹر بلگانن اور خروشچوف نے اپنے دل کی بات کہی ہے۔ تاہم وہ سب اس معاملے میں متحد الخیال ہرگز نہیں تھے۔

ایک بااثر غیر ملکی فوجی رہنما نے، جسے روسی ارباب اقتدار سے واقفیت کا موقع ملا تھا، اس کے جواب میں ایک دلچسپ نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "میں نہیں سمجھتا کہ مسٹر خروشچوف کے ذہن میں کیا ہے؟ لیکن میں اس کا ضرور اندازہ لگا سکتا ہوں کہ مارشل ژوکوف اپنے ذہن میں

کیا سوچ رہے ہیں۔ میں ان سے مندرجہ ذیل انداز میں سوچنے کی توقع کر سکتا ہوں۔

"مشرقی جرمنی میں میرے پاس ۲۲ روسی ڈویژن یورپ کے قلب میں موجود ہیں۔ ان کا سلسلۂ مواصلات پولینڈ اور ہنگری سے ہو کر گزرتا ہے اور ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ ان تینوں ممالک کے باشندے ہماری مخالفت کے لئے آمادہ ہیں۔

"ہم یعنی سرخ فوج کے سپاہی اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ مشرقی یورپ میں ہماری تمام پالیسیاں ناکام رہی ہیں۔ ہمارے سیاسی رہنما تیرہ سال تک اس علاقے کو روس کے حلقۂ اثر میں لے آنے اور اس کے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہے ہیں۔ لیکن اس میں انھیں شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی اسی ناکامی کی بدولت مجھے اس بات کے لئے مجبور کیا گیا کہ میں روسی سپاہیوں کو حکم دوں کہ ہنگری کے ہزارہا شہریوں کو بڈاپسٹ کی سڑکوں پر قتل کر دیں۔

"لیکن ہماری فوجی مشکلات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتیں۔ پچھلے تیرہ سال کی مدت میں ہم نے مشرقی یورپ کے ممالک میں ساٹھ ڈویژن سے زیادہ فوج منظم کر کے اسے جدید ترین روسی بندوقوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے مسلح کیا ہے لیکن بڈاپسٹ میں جو منظر ہمیں نظر آیا، اور پولینڈ اور جرمنی میں جو آثار ہمیں نظر آرہے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر جنگ کی صورت پیدا ہوئی تو یہ ناقابلِ تسخیر فوجیں خود ہماری مخالف ہو جائیں گی۔ ان حالات میں سوویٹ یونین کے لئے کوئی معاہدہ انتہائی مفید ثابت ہوگا جو مشرقی اور وسطی یورپ کی فوجی قوت کو کافی حد تک محدود کر دیتا ہو۔

"اس کے علاوہ مسئلہ کا اقتصادی پہلو بھی ہے۔ جنگ کے بعد سے ہم روس کو استحکام بخشنے کی غرض سے ہر سال کروڑہا روبل، نقد، سامان اور خام مال کی شکل میں مشرقی یورپ سے حاصل کرتے رہے ہیں۔ اگر ہمیں ان علاقوں کی دشواریوں کو دور کرنا ہے تو ہمیں سرمائے کے اس بہاؤ کا رُخ بدل دینا چاہیئے۔ کیا ہمارے لئے یہ عقلمندی کی بات نہ ہوگی کہ ہم اس سرمائے کو ایشیا اور افریقہ میں استعمال کریں جہاں ہمارے کام کرنے کے لئے بالکل صاف میدان موجود ہے۔؟

"یہ درست ہے کہ ہمارے پروپیگنڈے کے ماہرین کو اس لائق ہونا چاہیئے کہ وہ جرمنی سے افواج کی کسی پیش کش کو توڑ مروڑ کر ہمارے سیاسی مفاد کے حق میں کر دیں۔ لیکن کیا وہ اس بات کا مظاہرہ نہیں کر سکتے کہ ہم وہ لوگ ہیں جو کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟۔ اگر امریکہ والے اس بات سے انکار کرتے ہیں تو وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ یورپ

کی تقسیم کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں'۔"

جب میرے یورپین فوجی دوست مارشل زوکوف کے ذہن کا یہ خاکہ پیش کر چکے تو انھوں نے تنبیہہ کی کہ "آخری فیصلہ خروشچوف اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ہے' زوکوف کے ہاتھوں میں نہیں۔

جب تک روسی رہنماؤں کو اس بات کی توقع ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک شروع میں اقتصادی اور سیاسی رشتوں کے ذریعہ ماسکو کے ساتھ وابستہ ہوں گے اور بالآخر روس کے حلقۂ اثر میں آجائیں گے' اس وقت تک میں اس بات کا یقین نہیں کر سکتا کہ روس کسی معقول عالمگیر سمجھوتے کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ گفت وشنید کرنے کے لئے تیار ہوگا۔

بہر حال نہ تو روس اور نہ ہی خود ہمارے حق میں یہ بات مفید ثابت ہو سکتی ہے کہ وسطی یورپ میں وہ صورت حال برقرار رہے گی جو کسی ذرا سے حادثہ کی بدولت ایٹمی جنگ کی صورت میں اختیار کر سکتی ہے جس سے دونوں فریق بچنا چاہتے ہیں۔

۸ - یورپ کے متعلق ایک نئی پالیسی

مسٹر باڈلز کا کہنا ہے کہ یورپ ایک نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ اگر امریکہ اس کے نتائج سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنے مقاصد اور اپنے طور طریقوں کا پھر سے جائزہ لینا ہوگا۔

نیو یارک ٹائمز میگزین' ۲۰ دسمبر ۱۹۵۹ء

صدر آئزن ہاور' وزیراعظم میکملن' صدر ڈیگال اور چانسلر ایڈینور پیرس میں چوٹی کانفرنس سے قبل کے مذاکرات میں مصروف ہیں۔ یہ مذاکرات یورپ میں امریکہ کی پالیسی کے متعلق بڑھتے ہوئے اضطراب کے سلسلہ میں کئے جا رہے ہیں۔

صدر امریکہ کے کامیاب دورے سے ہمارے فوری ارادوں کے بارے میں شکوک و شبہات کو دور کرنے میں مدد ملی ہے۔ لیکن ہماری بصیرت' ہماری صلاحیت اور یورپ کے اس نئے اور پہلے سے قطعاً مختلف دور میں ہماری قوت کارکردگی اور ہمارے ارادوں کے بارے میں شبہات بدستور موجود ہیں۔

لہٰذا ہماری قلیل مدت اور طویل مدت مقاصد کا پھر سے جائزہ لیا جانا ضروری ہوگیا

ہے۔ ہماری یورپین پالیسی کی بنیادیں مغربی یورپ کے ممالک ساتھ ہمارے قریب ترین سیاسی، اقتصادی اور فوجی روابط یہ بدستور جاری رہنی چاہئیں۔ لیکن آج دنیا میں جو نئے حالات تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں اگر ہمیں ان سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہے تو ہمیں .... ان پالیسیوں کو ایک نیا رنگ، نیا انداز اور ایک نئی قوت بخشنی ہوگی۔

مسٹر خروشچوف نے سرد جنگ کے سخت گیر طور طریقوں کی جگہ گفت و شنید اور اقتصادی مقابلہ کی تجاویز پیش کر کے ایک اہم ذاتی، سیاسی خدمت انجام دی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے ارادے خواہ کچھ بھی ہوں یہ ماننا پڑے گا کہ ان تجاویز نے ملک اور بیرون ملک میں بڑی بڑی توقعات پیدا کر دی ہیں۔ ایسی توقعات جن کو وہ خود یا کوئی اور شخص تیزی اور آسانی کے ساتھ ختم نہیں کر سکتا۔

چین کی بڑھتی ہوئی باغیانہ روش روس کے لئے یقیناً ایک پریشان کن چیز ہے۔ چین کا کشیدگی اور کھچاؤ کو بڑھاتے رہنے کا عزم صمیم روس کی نئی پالیسی کے خلاف ہے۔ روس اور چین کی دوستی کو برقرار رکھنا مستقبل قریب تک فریقین کے لئے انتہائی ضروری ہوگا۔ لیکن "شریک خورد" چین کے جارحانہ طرز عمل سے جس کی آبادی روس کی آبادی سے تین گنی ہے، روس کے رہنماؤں کو انتہا درجہ کی پریشانی کا لاحق ہونا ضروری ہے۔

اگر اسلحہ کی ٹیکنا لوجی اور جنگ کے تصورات کا یہ بڑھتا ہوا انقلاب بدستور جاری رہا تو آئندہ چند سال میں دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو انتہائی عظیم مصارف، خطرات اور کشیدگیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے باوجود فرانس اور دوسری قوتیں ایٹمی طاقتوں کے زمرے میں شامل ہوتی جا رہی ہیں اور ایک قابل اعتماد کنٹرول سسٹم کے حصول کے ذرائع پیچیدہ سے پیچیدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ خود یورپ کے اندرونی اور یورپ و امریکہ کے باہمی اقتصادی اور سیاسی تعلقات میں بھی ایک تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

مغربی یورپ کی معاشی افزائش کی شرح ہماری اپنی معاشی افزائش کی اوسط سالانہ شرح سے، جو ۱۹۵۳ء میں ۲ء۶۵ تھی، تین گنا زیادہ ہے۔ موازنہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ مغربی یورپ اس وقت صنعتی ترقی کے عروج پر ہے جب کہ امریکہ کی صنعتی ترقی کی رفتار میں سست روی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

ان تمام حالات کے پیش نظر ہمارے بیشتر موجودہ تصورات اور طور طریقے اب

فرسودہ اور ناقابل عمل ہو گئے ہیں۔ اب ہم دور مابعد جنگ کے اختتام پر پہنچ گئے ہیں اور اعتدال، آزمائش اور تعاون کے ایک نئے دور کا آغاز کر رہے ہیں۔

یورپ میں امریکہ کی پالیسی کے اغراض و مقاصد جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ تین ہیں:-

۱۔ ہمیں برلن جیسے پُرآشوب مقامات پر پھر سے اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دینا ہو گا۔

۲۔ ہمیں ایک ایسے آزاد یورپی معاشرے کے قیام اور اس کے ارتقا کی حمایت کرنی ہوگی جو ہم سے دوستانہ تعلقات رکھنے کے ساتھ ساتھ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

۳۔ ہم کو ایک پُرامن اور طویل المدت تصفیہ کے لئے دنیا کی تمام قوموں کے عوام کی دلی خواہشات کو ذہن میں رکھنا چاہیئے اور اس مقصد کے لئے ایسی قابل عمل تجاویز مرتب اور پیش کرنی چاہئیں جو مستقبل میں کسی وقت کسی ایسے تصفیہ کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ "ناٹو" کے معاہدے کو کمزوری اور غلط فہمی کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔ جب تک تقریباً تیس سودیٹ ڈویژن روس کی سرحدوں کے مغرب کی جانب موجود ہیں اُس وقت تک ہمارے لئے یورپ میں اپنے دفاعی انتظامات کو، جو پہلے ہی ناکافی ہیں، مزید کمزور کرنا عقلمندی کی بات نہ ہو گی۔

یورپ میں مقیم ہماری بری اور ہوائی فوجوں میں یک طرفہ کمی کرنے کی جو لغو تجویز حال ہی میں حکومت کی طرف سے پیش کی گئی ہے، اس کی خود ہمارے کمانڈر انچیف کو مخالفت کر دینی چاہیئے۔ یہ اقدام برلن کے سلسلہ میں ہماری ثابت قدمی اور مضبوط حیثیت کی بحالی کے سلسلہ میں پہلا ضروری اقدام ہو گا۔

جرمنی کی موجودہ صورت حال سے اس وقت کوئی بھی شخص مطمئن نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہ ایک خطرے کا باعث ہے، روسیوں کے لئے انتہائی تشویشناک ہے اور برلن کے جیسے عالی حوصلہ شہریوں بلکہ تمام جرمنوں کے لئے حوصلہ شکن ہے۔ اس کے باوجود جب تک وسطی یورپ کی موجودہ صورت حال برقرار ہے، اس وقت تک کسی دباؤ میں آکر روسیوں کو خوش کرنے کے لئے برلن کے متعلق کسی قسم کا کوئی فیصلہ کرنے کا نتیجہ ہمارے حلیفوں کو خوفزدہ کرنے اور روس کے مطالبات میں اضافہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا۔

مثال کے طور پر برلن میں اتحادی افواج کے دس ہزار سپاہیوں کی تخفیف کے کسی امکان پر بحث و تکرار کرنے سے ہمیں مطلق کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ ان کی تعداد کا جہاں تک تعلق ہے وہ فوجی اعتبار سے ہمارے اور روسیوں دونوں کے لئے خارج از بحث ہے۔ کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں

کر سکتا کہ روسی حملہ کی صورت میں کامیابی کے ساتھ شہر کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کی اس مقام پر موجودگی ہمارے قبضے کے حقوق کا ایک ٹھوس ثبوت ہے۔

لہذا ہماری فوجوں میں تخفیف کرنے کے سلسلہ میں روس کی طرف سے جو زور دیا جا رہا ہے اس کا واحد مقصد برلن اور جرمنی کے باشندوں کو یہ بات ذہن نشین کرانا ہے کہ جرمنی میں امریکہ کے اثر و رسوخ اور قوت میں کمی آ رہی ہے۔

اگر اس قسم کے معاملات میں مغرب کی کسی سخت پالیسی کے ردعمل کے طور پر روس برلن اور اس کے گرد و پیش کے علاقوں میں اپنے حملہ اختیارات واقعی طور پر اپنے ایجنٹوں یعنی مشرقی جرمنی کے باشندوں کے حوالے کر دیتا ہے تو ہم بھی اپنے ایجنٹوں کی حیثیت سے مغربی جرمنی کے باشندوں کو حملہ اختیارات سونپ دینے کے متعلق سوچ سکتے ہیں۔ ہم صرف اس پر اکتفا کرنے کے لئے تیار ہوں گے کہ شہر پر قبضے کا ہمارا قانونی حق قائم رہے اور ہم وہاں اپنی فوجیں بھی رکھ سکیں۔

بڑے بڑے مسائل کے سلسلہ میں سختی اور ثابت قدمی دکھلانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے معاملات کے ساتھ اپنے روابط میں کسی قسم کی سختی سے کام لیں۔ ۱۹۵۲ء کے صدارتی انتخابات کی مہم کے دوران مشرقی یورپ کی اقوام کو "آزاد" کرانے کا وعدہ، جس کا مقصد پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری کی حمایت حاصل کرنا تھا، سراسر ایک خود فریبی پر مبنی تھا۔

روس کے مفادات سے صحیح صحیح واقفیت اور امریکہ کی قوت کا صحیح صحیح اندازہ رکھتے ہوئے اگر امریکی پالیسی پر معقول طریقے سے عمل درآمد کیا جائے تو اس سے کہیں زیادہ ٹھوس اور مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ سفارتی تعلقات، باہم دگر تبادلہ، افہام و تفہیم، اقتصادی امداد اور ہماری زرعی فاضل پیداوار مشرقی یورپ میں ہماری پالیسی کے اس بنیادی مقصد کے حصول میں مدد دے سکتی ہے جسے ہم اس علاقے کی اقتصادیات و سیاسیات میں ترمیم و اصلاح قرار دے سکتے ہیں۔

اس ترمیم و اصلاح کے نتیجہ میں ایک فضا پیدا ہو سکتی ہے جو دنیا کے اس بدقسمت علاقے کے لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ آزادی کے حصول کو ممکن بنا دے۔ ہمارا مقصد ہنگری میں کسی قسم کی ابتری یا تباہی پیدا کرانا نہیں ہے بلکہ ایک ایسے قومی انقلاب کی قسم کی چیز کو وجود میں لانا ہے جو پولینڈ کے غیر خونیں انقلاب کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی اور جس نے حکومت کی بعض حالیہ شکستوں کے باوجود ان لوگوں کے لئے اس سے کہیں زیادہ آزادی مہیا کر دی ہے جتنی کہ انھیں اسٹالن کے ماتحت نصیب ہو سکتی تھی۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے یورپی نظریے کی کامیابی کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ

امریکی اثر و رسوخ کو ہر اثر و رسوخ کو ہر ممکن اور مناسب موقع پر استعمال کیا جائے۔ اس کی کامیابی کے راستہ میں جو عظیم دشواریاں حائل ہیں ان سے قطع نظر، ایک متحدہ یورپ کا نظریہ جس کے وہ تمام لوگ، حامی ہیں جو اپنے آپ کو یورپی تصور کرتے ہیں، امریکہ کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔

اس طرح کولڈ اینڈ اسٹیل کمیونٹی، یوریٹم اور کامن مارکیٹ کی زبردست اہمیت اور نمایاں ہو جاتی ہے، جس میں فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی، بیلجیم، نیدرلینڈز اور لکسبرگ شامل ہیں۔ یہ نئے ادارے اب رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے شریک کار ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی سیاسی اور اقتصادی ہم آہنگی کی رفتار اس سے بلا شبہہ کہیں زیادہ ہے جتنی کہ امریکہ کے بیشتر باشندے تصور کرتے ہیں۔

اگر یہ چھ اقوام اور برطانیہ مع اپنی جملہ عظیم صنعتی صلاحیتوں کے متحد ہو جائیں تو وہ ایک ایسی ریاستہائے متحدہ یورپ کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں جو بعد کو ایسی تعمیری اور ٹھوس قوت میں تبدیل ہو جائے گی جو بالآخر یورپ کو دائمی طور پر منقسم ہونے سے بچا سکے گی۔

خاص طور پر چونکہ امریکہ کی فوجی پالیسی کا "ناٹو" کے ساتھ مطابقت رکھنا ضروری ہے اس لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ ہم اس اتحادی تحریک کی حوصلہ افزائی کریں اور بات کی کوشش کریں کہ یہ تحریک بحیرۂ بالٹک سے بحیرۂ اسود تک موجودہ فوجی تقسیم کو سخت نہیں بلکہ لچکدار بنانے میں نمایاں خدمات انجام دیتی ہے۔ ہمیں امید کرنی چاہیئے کہ یہ اتحاد ایک ایسے انداز میں رونما ہو گا کہ اس کی ابتداء خواہ کتنی ہی معمولی اور سرسری طور پر ہوئی ہو، یہ باقی تمام یورپ کو جن میں نیم آزاد ممالک بھی شامل ہیں، ہمیشہ اپنے اندر ضم ہونے کی دعوت دیتا رہے گا۔ مثال کے طور پر کامن مارکیٹ میں یونان اور ترکی کی مشترکہ رکنیت مستقبل میں یوگوسلاویہ کی شرکت کو بھی ممکن بنا سکتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں اس نئے ادارے کے دروازے بند نہیں بلکہ کھلے ہونے چاہئیں۔ — صرف یوگوسلاویہ کے لئے نہیں بلکہ پولینڈ، ہنگری، چیکوسلاواکیہ، رومانیہ اور بلغاریہ کے لئے بھی — اس کی بدولت ایسی فضا بھی، پیدا ہو سکتی ہے جس میں بالآخر برلن اور مشرقی جرمنی کے مسائل طے پا جائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے اور روس کے قلیل مدت مفادات اس بات کے متقاضی ہیں کہ جرمنی کو متحد نہ کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں جرمنی کا اتحاد ممکن بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر اس تمام مسئلے پر ایک وسیع نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایک منقسم جرمنی

ایک منقسم یورپ کے مسئلے کی ایک اضافی صورت ہے اور اسی طرح ایک منقسم برلن منقسم جرمنی کے مسئلہ کی اضافی صورت ہے۔ یہ تقسیم اور بٹوارے ہر اس شخص کے لئے جن کا ان سے کچھ تعلق ہے، ایک خطرے کو ظاہر کرتے ہیں۔

متحدہ جرمنی کا وجود صرف متحدہ یورپ ہی کے اندر ممکن ہے اور صرف اسی قسم کے جرمنی اور صرف اسی قسم کے یورپ میں برلن دنیا کے ایک عظیم شہر کا منطقی رول ادا کر سکتا ہے۔ اس طرح اس بات کی ٹھوس شہادت کہ متحدہ یورپ کا قیام عمل میں آ رہا ہے، مشرقی جرمنی، پولینڈ اور مشرقی یورپ کے دوسرے ممالک کے لوگوں کے لئے ترغیب کا باعث ہو سکتی ہے۔

اور اگر اس بات کی نسبتاً زیادہ بڑے پیمانہ پر کوشش کی گئی اور امریکہ نے بڑی سے بڑی کسی امکانی غیر محدود یورپین مارکیٹ کی حمایت کی پالیسی اختیار کی تو اس ترغیب میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔ اگر یورپ میں کسی آزاد مارکیٹ کا قیام عمل میں آتا ہے تو ہم کو اسے کسی خطرے کی بجائے مفید خیال کرنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر کامن مارکیٹ صرف ایک معاہدے کی مدد سے ہمیں درآمدی پابندیوں کو آسان کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس کے لئے ہمیں چھ مختلف ممالک سے علیحدہ علیحدہ بات چیت نہیں کرنی پڑتی۔ اور چوں کہ تجارتی معاملات میں ہماری حیثیت کافی مضبوط ہے اس لئے ہمیں اس صورت حال کو کوشش کر کے اس مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس بات کی بھی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے کہ مغربی یورپ کی خوش حال قومیں دنیا کی کم ترقی یافتہ قوموں کی مشترکہ اعانت پر مائل ہوں۔ اس قسم کی اعانت صرف ایسے افریقی ممالک تک ہی محدود نہیں ہونی چاہیئے جو یورپ کی متعلقہ قوموں کے ساتھ وابستہ ہیں، بلکہ ان میں اور خاص طور پر جرمنی کے معاملے میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ان ممالک تک بھی پہنچنی چاہیئے جنھیں اس کی ضرورت ہے اور وہ اسے استعمال کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

یورپ کی اندرونی اقتصادی ہم آہنگی، افلاس اور اقتصادی ناانصافیوں کے ان مسائل کو حل کرنے بھی مدد دے سکتی ہے جو ابھی تک حل نہیں ہوئے۔ ان اقتصادی ناانصافیوں کو دور کرنے کے لئے کوئی موثر قدم اٹھانا، خاص طور پر جنوبی یورپ کی اقوام کے لئے اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔

مغربی اور جنوبی یورپ کے تمام ممالک میں "اقتصادی بحالی" کی بدولت نہایت عظیم الشان عمارتیں، صاف اور سجی ہوئی دکانیں اور نئی نئی مصنوعات کی ایک طویل اور شہرت یافتہ فہرست وجود میں آئی ہے، لیکن ان میں سے بہت سے ممالک میں تقسیم، حصہ داری اور انصاف کی اس سے زیادہ اہم فہرستیں ان سے کہیں زیادہ کم متاثر کن ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ غریب اور امیر کی تفریق ابھی

باقی چلی آتی ہے، اور سیاسی بٹوارے پہلے ہی کی طرح آج بھی کافی گہرے ہیں۔

جنگ کے خاتمہ کے چودہ سال کے بعد اس بار بھی اٹلی کے سینتیس فی صدی باشندوں نے کمیونسٹوں یا کمیونسٹ نواز امیدواروں کے حق میں ووٹ دیئے ہیں۔ فرانس میں کمیونسٹ ووٹوں کا تناسب ۲۱ فی صدی ہے۔ یونان میں خانہ جنگی اور کمیونسٹ پارٹی کے خلاف قانون قرار دیے جانے کے باوجود، کمیونسٹوں کے زیر اثر کام کرنے والی جماعت "یونین آف دی ڈیموکریٹک لیفٹ" کو پچھلے انتخابات میں تقریباً ۲۵ فی صدی ووٹ حاصل ہوئے تھے

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اٹلی، فرانس اور یونان کے تقریباً ایک چوتھائی باشندے کمیونزم پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن بائیں بازو کی پارٹیوں کو مسلسل اتنے کثیر ووٹوں کا ملنا ان ممالک کی حکومتوں کی اس پالیسی کے خلاف عوام کے احتجاج کو ظاہر کرتا ہے جس کی رو سے وہ عوام کے مقابلہ میں مالدار اور طاقتور لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرتی ہیں۔ بہر حال اس پیمانے پر یہ مسلسل احتجاجات اصلاح کی فوری، اور اہم ضرورت کو ظاہر کرتے ہیں۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ اس وقت بہت سی یورپی اور غیر یورپی اقوام کسی ایسی جرأت مندانہ تجویز کو ماننے کے لئے تیار ہیں جو کریملین کی رضامندی حاصل ہوجانے کی صورت میں ہمارے لئے ایک زیادہ پُرامن مستقبل کے امکانات پیدا کرسکتی ہے۔ لیکن یہ کوئی معقول اور یقین کے قابل تجویز ہونی چاہیئے کہ یورپ میں ہماری فوجی یقین دہانیوں میں کسی قسم کا فرق آئے بغیر سوویٹ یونین اس کو گفت و شنید کی بنیاد تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایسی کوئی تجویز ہے جو ہمارے اس مقصد پر پوری اُترتی ہو، جو خصوصاً عظیم تر یورپ پر حاوی ہو، جس کی بدولت "ناٹو" کے معاہدات میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوتا ہو، جس میں تخفیف اسلحہ کے قدیم نظریات کی مسلّمہ خامیاں موجود نہ ہوں، اور جو ان تمام باتوں کے باوجود نئے سرے سے گفت و شنید کی ایک تعمیری کوشش کی بنیاد ثابت ہوسکے؟ کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ ایسی کوئی تجویز موجود ہے، یا یہ کہ ایسی کوئی تجویز کیا ہوسکتی ہے؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی کوئی قابلِ قبول بات صدر ڈیگال اور چانسلر اڈینور نے گزشتہ موسم بہار میں کہی تھی۔

۲۵ مارچ کو صدر ڈیگال نے کہا تھا" اگر تخفیف اسلحہ کا کام ایک ایسے علاقے میں عمل میں نہیں آتا ہے جو یورال سے اتنا ہی نزدیک ہے جتنا کہ اٹلانٹک سے تو ہم کسی جارحانہ قوت کو جرمنی پر سے گزر کر یا اُڑ کر آنے سے کس طرح روک سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہم ہر قسم کے جنگی ہتھیاروں پر پابندیاں عائد کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان تمام اقدامات کو.... ایک ایسے علاقے پر

بھی حاوی ہونا چاہیئے جو فرانس کی پہنچ سے باہر ہے اور جس کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔"

دو ہفتے کے بعد چانسلر ایڈینور نے بون میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ان الفاظ کا اضافہ کیا۔" ذمہ دار فوجی اداروں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اس کو عمومی انداز میں بیان کرتے ہوئے جنرل ڈیگال نے ایک نام نہاد کم کشیدگی والے علاقے کے طول و عرض اور اس کی نوعیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی تائید میں میں یہ کہوں گا.... کہ ایسے کسی علاقے کا کوئی مفید نتیجہ اسی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے جب کہ تخفیف اسلحہ کا کام اٹلانٹک سے یورال تک کے پورے علاقے میں انجام دیا جائے۔"

اتنی اعلیٰ پیمانہ کی محدود فوجی سرگرمیوں کے ایک ایسے علاقے کا ایک ایسے خطے کے اندر موجود ہونا، جو عظیم تر یورپ کے تحفظ کو براہ راست متاثر کرتا ہو، مزید گفت و شنید کے لئے ایک امکانی بنیاد بن سکتا ہے۔ راکٹوں، میزائیلوں اور دیگر ایٹمی ہتھیاروں کے اڈوں اور ٹھکانوں اور عام قسم کی فوجوں کی بڑی جمعیتوں کو بتدریج کمی کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ معائنہ اور دیکھ بھال کی جملہ سہولیات ہم کو جارحانہ اور مدافعتی صلاحیتوں کے درمیان ایک انتہائی دشوار فرق کو واضح کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ اس کو تخفیف اسلحہ کے ایک عالمگیر سمجھوتے کی صورت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور ایک مقامی اور محدود انداز میں بھی۔

عظیم تر یورپ میں افواج کی اس کمی کی بدولت روس اور امریکہ دونوں کو اس بات کا موقع مل جائے گا کہ ہم چین کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے تشویشناک مسئلہ کو نظرانداز کر سکیں جس نے کم از کم فی الوقت تخفیف اسلحہ کے ایک عالمگیر معاہدہ کے امکانات کو معدوم کر دیا ہے۔ اس تجویز کے اندر ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی رو سے براعظم یورپ سے تمام غیر ملکی افواج کی واپسی ضروری نہیں قرار پاتی۔ نہ ہی کسی ایک ملک یا ممالک کو غیر فوجی بنانا ضروری ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں نظریات موجودہ حالات میں مسائل کو حل کرنے سے زیادہ ان میں پیچیدگی پیدا کر دیں گے۔

اس سلسلہ میں روس کا ردعمل خواہ کچھ بھی ہو، لیکن اگر اس تجویز پر مسلسل زور دیا جاتا رہے تو اس سے اتنا ضرور ہوگا کہ لوگوں کے دلوں کا خوف و ہراس اُمید سے بدل جائے گا، اور دنیا کو اس بات کا یقین ہوگا کہ امریکن ڈپلومیسی پوری طرح باخبر اور مستعد اور امن عالم کے قیام کے ہر واقعی امکان سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک بار پھر آمادہ ہے۔

۹- ہمیں پھر سے پیش قدمی کرنی چاہیئے

مسٹر باؤلز کا کہنا ہے کہ صرف اس خیال میں کھوئے رہنا کہ روس آئندہ کیا قدم اُٹھانے والا ہے امریکہ کی روایات کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں انھوں نے مینسیوٹا فارن پالیسی ایسوسی ایشن کے سامنے ایک مقالے میں امریکی فارن پالیسی کے لئے بعض نئے اور قوی ہدایتی نکتے پیش کئے تھے۔

مسٹر خروشچوف آئندہ کیا کرنے والے ہیں؟

مسٹر خروشچوف کی دھمکیاں، ان کے ناز و غمزے، داؤ پیچ اور تقریریں آئے دن ہمارے اخبارات اور ٹیلی ویژن اور ہمارے سیاسی رہنماؤں کے دل و دماغ پر مسلط رہتی ہیں اور ہماری خارجہ پالیسی کی تشکیل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

جس طرح سامنے سے آنے والی کار کی روشنی سے خرگوش کی آنکھیں مبہوت ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح ہم لوگ بھی آج تک روسی وزیر اعظم کی ہر نقل و حرکت پر ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔

تاریخ داں یقیناً ہمارے انداز کو غلط قرار دیں گے۔ وہ سوال کریں گے کہ بیسویں صدی کے امریکہ کو اپنے لائق ترین عوام، اپنے ایک باقاعدہ صنعتی نظام، اپنے لاانتہا وسائل اور انسانی آزادی کے سلسلہ میں اپنی شاندار روایات کے باوجود ہر دم اس خیال میں کیوں غرق رہنا چاہیئے کہ روس کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے؟

یہ صورت حال نئے لیڈروں اور نئے نظریات کی ضرورت کو واضح کرتی ہے یہ ایک ایسی نئی قیادت کی ضرورت کو واضح کرتی ہے جو ہمارے قومی زاویۂ نگاہ کو کریملن کی طرف سے ہٹا کر ان عظیم مواقع کی طرف مرکوز کر دے جو ہمیں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دینے کی دعوت دے رہے ہیں۔

ذیل میں، میں ایسی چند تجاویز پیش کروں گا جن پر ہمارے نئے رہنما قطع نظر اس کے کہ خروشچوف کیا کہتے ہیں، آئندہ جنوری میں غور و فکر اور عمل درآمد کر سکتے ہیں۔

۱- ہمیں اپنے دفاعی انتظامات کو بہتر طریقے پر ترتیب دینا چاہیئے۔ ہماری فوجی قوت کے اندر اتنا توازن ہونا چاہیئے ایک طرف وہ ایٹمی ضرب لگانے کی ایسی صلاحیت رکھتی ہو جسے

اچانک حملے کرکے مسدود نہیں کیا جا سکتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسی سرگرم اور متحرک بری افواج بھی ہونی چاہئیں جو کسی مقامی تصادم ہو جانے کی صورت میں، جیسا کہ پہلے ہوتا رہا ہے، اس پر قابو پانے میں مدد دے سکیں۔

ہماری موجودہ دفاعی پالیسیوں نے ہمارے لئے ایک صورت حال پیدا کر دی ہے جس میں ہم صرف ایک ہی قسم کی لڑائی لڑ سکتے ہیں جسے لڑنے کا فی الحقیقت ہمیں کبھی لڑنے کا موقع ہی نہ آئے گا۔ یعنی ہماری طرف سے شروع کی جانے والی ایٹمی جنگ۔

۲ اس کے ساتھ ہی ساتھ اور بہت بڑے پیمانے پر ہم تخفیف اسلحہ کے سلسلہ میں اپنی جملہ کوششوں کو تیز تر کر سکتے ہیں۔ نئے ارباب حکومت کو دفاع اور تخفیف اسلحہ کے مسائل کو ایک دوسرے سے مختلف اور ایک دوسرے کا حریف نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیوں کہ وہ دو مختلف مسائل نہیں بلکہ آنے والے دور میں عالمی استحکام کی دو مشترکہ اور ضروری شرائط ہیں۔

نئی حکومت کو اپنے قول و فعل کے ذریعہ اس بات کو واضح کر دینا چاہئے کہ ہم زندگی اور موت کے نئے تصورات سے بخوبی واقف ہیں۔ اور یہ کہ ہم ایٹمی دہشت کے توازن پر قائم امن کی ناپائیداری کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور یہ کہ ہم نے ان نئی راہوں کی تلاش کا بیڑہ اٹھایا ہوا ہے، جو خواہ اس کو ختم نہ کر سکیں، لیکن وہ تخفیف اسلحہ کی موجودہ پیچیدگیوں کو کم ضرور کر دیں گی۔

ان نئی راہوں میں اسلحہ پر پابندیاں لگانے کی بعض ایسی نئی تجاویز شامل ہونی چاہئیں جو باقاعدہ تحقیق پر مبنی حفاظتی اقدامات کے تحت عمل میں آئی ہوں اور جن پر نہایت صبر و تحمل اور تدبر کے ساتھ بات چیت کی جائے۔

۳۔ ہم بحر اوقیانوس کے آس پاس واقع ممالک کے چالیس کروڑ انسانوں کے ساتھ مل کر جن کی اور ہماری سیاسی اور تمدنی روایات مشترک ہیں، ایک موثر محاذ بنا سکتے ہیں۔

خروشچوف کے متعلق ہماری باہمی تشویش غالباً وہ تنہا واحد عنصر ہے جس نے "ناٹو" کے معاہدے کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ مسٹر خروشچوف کے چہرے پر نظر آنے والی تیوریوں، اور مسکراہٹوں کے ساتھ ساتھ "ناٹو" کی سرگرمیوں میں بھی تیزی اور کمی آنے لگتی ہے۔

ہمارے یورپی دوستوں کے ساتھ ہمارے دیرینہ تعلقات کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں یہ باہمی تشویش ناکافی ہے۔ لہٰذا ہمیں ان تعلقات کی بنیادوں پر غور کرنا چاہیئے اور ان سیاسی، اقتصادی اور تمدنی روابط کو وسیع تر بنانا چاہیئے جن کے ذریعہ ہم ایک دوسرے

کے ساتھ وابستہ ہیں۔
بحر اوقیانوس کے آس پاس کے ممالک میں باہمی تعاون کے اس کام کو دنیا نئے ارباب حکومت کا اولین کام ہونا چاہیئے۔

۴۔ ہمیں اپنے اقتصادی امداد کے پروگراموں پر نظر ثانی اور ان کی دوبارہ تشکیل کرنی چاہیئے۔
ان پروگراموں کو ایسے نئے معیاروں کی ضرورت ہے جو ایسے نئے ممالک کے لئے زیادہ سے زیادہ امداد دینے کی ضمانت دیتے ہوں جو ہماری امداد کو انتہائی سلیقہ کے ساتھ کر سکتے ہیں اور جو خود اپنی فلاح اور بہبود کے لئے ہر ضروری قربانی دینے کے آمادہ ہیں۔
جن علاقوں کے لئے طویل مدت بنیادوں پر امداد کی یقین دہانی ضروری اور مناسب ہے وہاں اس کی یقین دہانیاں کر کے ہم ایک باضابطہ اور کم خرچ منصوبہ بندی کی ہمت افزائی کر سکتے ہیں۔

۵۔ ہم یو۔این۔او میں امریکہ کو سرد جنگ اور دشنام دہی میں شمولیت سے باز رکھ کر ایشیا اور افریقہ میں باضابطہ، سیاسی اور اقتصادی ترقی کی طرف اس کی توجہ مبذول کرا سکتے ہیں۔
یو۔این۔او ان براعظموں میں ایک کلیدی رول ادا کرتی ہے جہاں اس کی سرگرمیوں کو سول سروس سے لے کر اقتصادی امداد اور تخفیف اسلحہ سے لے کر تعلیم تک زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہونا چاہیئے۔

۶۔ لاطینی امریکہ کے بارے میں بعض تجاویز کو بادل ناخواستہ قبول کر کے ہم اس کے ساتھ اس امتیاز برتنے کے سلوک کو ختم کر سکتے ہیں۔ اور اس کی جگہ مسٹر روز ویلٹ کی "اچھے پڑوسی" کی پالیسی کو آج کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔
اس کے اندر آرگنائزیشن آف امریکن اسٹیٹس کو تقویت پہنچانا اور نئے "ایکٹ آف بوگوٹا" کو عملی جامہ پہنانا شامل ہے۔
روس اور امریکہ کے درمیان اسلحہ پر پابندی کے سلسلہ میں آج تک کوئی کامیابی نہ ہونے کی صورت میں ہم کم از کم تخفیف اسلحہ کی مقامی کوششوں کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔ اور اس کام کی ابتدا کے لئے لاطینی امریکہ بہترین جگہ ہے۔

۷۔ ہمیں چین کے متعلق ایک زیادہ حقیقت پسندانہ نظریہ پیش کرنا چاہیئے۔ جب تک پیکنگ کی حکومت ایشیا کے امن کو خطرہ لاحق ہے اور وہ فارموسا کے اوپر اپنا دعویٰ جتاتی ہے

اس وقت تک اس کا تسلیم کیا جانا خارج از بحث ہے۔

اسی اثنا میں یو۔این۔او میں چین کی نمائندگی، جاپان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ چین کی تجارت، نیز چین اور روس کے باہمی تعلقات چین کے مسئلہ کے اہم ترین پہلوؤں کی صورت میں سامنے آئیں گے۔ جن کی طرف نئی حکومت کو توجہ کرنی ہوگی۔

باوجود اس کے کہ ہم چین کی طرف اپنے سخت رویہ کے متعلق بہت کچھ سن چکے ہیں، اس کے باوجود یہ خطرہ کہیں زیادہ بڑا ہے جتنا کہ آئزن ہاور حکومت خیال کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت ہمیشہ ان خطرات کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے میں ناکام رہی ہے جو اس سارے قصے کی بنیاد ہیں۔

ہم چین کی توسیعی مہم کا صرف اس صورت میں کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں جب کہ ہم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ چین کا یہ رویہ محض چینی کمیونزم کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ چین کی سامراجی روایات اور اس کے رقبہ، تیل اور دیگر قدرتی وسائل کی کمی کو بھی اس میں بڑا دخل ہے۔

مشرقی ایشیا کے متعلق کسی حقیقت پسندانہ پالیسی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک صحیح قسم کی قوت یعنی اقتصادی اور سیاسی نیز فوجی قوت کی فضا دکرے جو چین کے پڑوسیوں کو اس ۶۵ کروڑ انسانوں سے متاثر ہونے سے بچا سکتی۔

جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان اور فارموسا سے لے کر ہندوستان اور پاکستان تک سیاسی آزادی اور باضابطہ اقتصادی ترقی کے لئے ایک بنیاد قائم کرنے میں ہم کو جو کامیابی ناکامی حاصل ہوئی ہے وہ آزاد ایشیا کے مستقبل میں زبردست اہمیت رکھتی ہے۔

۸۔ آخری بات یہ کہ ایسی بے شمار چیزیں ہیں جو ہم امریکی قیادت کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں خود اپنے لئے انجام دے سکتے ہیں۔

ہم اپنی اقتصادی افزائش کی رفتار کو تیز تر کر سکتے ہیں جس کی بدولت ہمیں عوام، پیداوار اور مشینیں، غرضیکہ وہ سب چیزیں حاصل ہو جائیں گی جو دورِ حاضرہ کی تشویشناک لیکن نہایت امید افزا دنیا کے تقاضوں کا سامنا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔

ہم جدید طرز کے اسکول اور یونیورسٹیاں قائم کر سکتے ہیں اور ایسے لائق استادوں کو رکھ سکتے ہیں جو ہر امریکی لڑکے اور لڑکی کے لئے اتنی تعلیم کی ضمانت دلانے کے لئے ضروری ہیں جس کے وہ متحمل ہو سکتے ہیں۔

ہم اپنے گندے علاقوں کو صاف کر کے نئے شہروں کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

ہم بہتر اور زیادہ قابل رسائی ہسپتال اور علاج و معالجے کی دیگر سہولیات مہیا کر سکتے ہیں۔
ہم اپنے کھیتوں کی فاضل پیداوار کو پوری دنیا میں اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد بنا سکتے ہیں
ہم پورے امریکہ سے مساوی عزت اور وقار کی رکاوٹوں کو دور کر کے دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں کہ ہم "اعلانِ آزادی" کے اس دعوے پر آج بھی پورا پورا یقین رکھتے ہیں کہ تمام انسان پیدائشی اعتبار سے برابر ہیں۔

یہ ایسی چند صورتیں ہیں جن کا آج ہمیں مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن ان کی تعداد کسی حالت میں اتنی ہی نہیں ہے۔ ان تمام اہم علاقوں میں مسٹر خروشچوف نے ہم کو کسی بات سے باز نہیں رکھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ ہماری ذہنی ابتری، دماغی تعطل اور موجودہ حکومت کی قیادت پر اعتماد کا فقدان ہے۔

۱۰۔ پانچ فیصلے جو موجودہ صدی کی نشوونما میں مدد دے سکتے ہیں

مسٹر باؤلز کا خیال ہے کہ ہم ان میں سے دو فیصلوں میں کامیاب ہوئے ہیں، دو میں ناکام ہوئے ہیں اور پانچواں درمیان میں لٹکا ہوا ہے۔ ذیل میں امریکن بک سیلرز ایسوسی ایشن، واشنگٹن کے سالانہ جلسے منعقدہ ۱۲ جون ۱۹۶۱ء کے سامنے باؤلز کے خطبے کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

آج کی رات میں مصنفین کی ایک آئندہ نسل یعنی مستقبل کے مورخین کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ہماری قوم، دنیا کے ساتھ اس کے روابط اور دنیا کے بڑھتے ہوئے استحکام کے سلسلہ میں امریکہ کی خدمات کی صحیح صحیح تاریخ قلمبند کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ یہ مورخین بیسویں صدی کے وسط میں پیش آنے والے حالات پر امریکہ کے اثرات کے بارے میں کیا کہیں گے؟

وہ ہماری غیر معمولی اور نئی صنعتی صلاحیت کو امن عالم اور وافر پیداوار کے سلسلہ میں استعمال کرنے میں ہماری کامیابی یا ناکامی کے بارے میں کیا کہیں گے؟

بیسویں صدی کی ابتدائی سات دہائیوں کے متعلق جہاں تک میرا خیال ہے وہ اپنی توجہ پانچ چیزوں پر مرکوز کر دیں گے۔ ان میں سے دو کے متعلق وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ہم ناکام ہوئے

ہیں اور پانچواں ابھی ادھر میں لٹکا ہوا ہے۔

یہ پانچ فیصلے کیا ہیں۔؟

یہ فیصلہ ۱۹۱۹ء میں انجمن اقوام متحدہ میں شامل ہو کر یورپ میں قائم ہونے والے نئے نئے امن کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں اپنی قوت اور اثر و رسوخ کو استعمال میں لانے میں ہماری المناک ناکامی تھی۔

ہماری دوسری ناکامی ۱۹۱۲ء میں مانچو سلطنت کے زوال کے بعد چین میں انقلابی جدوجہد اور مستقبل میں ہمارے تحفظ کے ساتھ اس کے تعلق کو سمجھنے میں ہماری ناکامی تھی۔

تیسری بات مغربی جرمنی میں نازی حملہ کا مقابلہ کرنے میں ہماری کامیابی تھی۔

اور چوتھے یورپ میں جنگ کے بعد اقتصادی اور سیاسی ابتری اور بدحالی کا نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔

پانچواں اور آخری مسئلہ جو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ایشیا، افریقہ، مشرق وسطیٰ اور لاطینی امریکہ میں آباد دنیا کے دو تہائی انسانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کے سلسلہ میں ہمیں درپیش ہے۔ یہ مسئلہ ایسے لوگوں کے ساتھ تعلقات کے سلسلہ میں درپیش ہے، جن کی بہتر معیار زندگی کے لئے بڑھتی ہوئی امیدوں اور ضرورتوں نے نسل انسانی کی طویل اور پُر واقعات تاریخ میں ایک انتہائی طویل اور انتہائی پُرخطر لیکن انتہائی امید افزا انقلاب برپا کر دیا ہے۔

اس پانچویں مسئلہ کے اندر صرف امریکی حکومت کی ہی نہیں بلکہ امریکی عوام کی بھی ایک ایسی دور رس یقین دہانی پوشیدہ ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور جس کی پہلے کہیں کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آئی۔

آیئے ہم ان میں سے ابتدائی چار فیصلوں پر اپنے ردعمل کا جائزہ لیں، اس امید کے ساتھ کہ اس سے ہمیں پانچویں مسئلہ کے حل کرنے میں کسی نئی راہ کا پتہ لگے گا۔

۱۔ انجمن اقوام میں شمولیت میں ہماری ناکامی

۱۹۱۹ء میں انجمن اقوام میں شامل ہونے میں ہماری ناکامی کے متعلق سرسری سا تذکرہ کافی ہے۔

ولسن نے ہمیں بار بار تنبیہ کی تھی کہ اگر ہم نے ان کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور دنیا کی ابھرتی ہوئی قوموں سے خود کو الگ تھلگ رکھا تو اس طرح نہ صرف یہ کہ ہم "دنیا کا دل ہی توڑ دینگے"،

بلکہ ہمیں اپنی اس ناکامی کے لئے خون بھی دینا ہوگا ۔

اس کے باوجود ہماری علیحدگی پسندگی کی عادت بدستور جاری رہی ۔ اور اس کے حامی بدستور اپنے خیال پر قائم رہے ۔ ان کی رائے تھی کہ ہمارا " یورپ کے مسائل کو حل کرنے کے لئے " اپنے جوانوں اور اپنے ڈالروں کو سمندر پار کی دنیا میں بھیج دینا ہی ہماری فیاضی کا کافی بڑا ثبوت ہے ۔

چنانچہ وڈرو ولسن کی بات کی نفی کر دی گئی اور ان کی انجمن اقوام کو ٹھکرا دیا گیا ۔ اس طرح ہمارے آبا کی نسل نے جو ایک عالمی نظم و ضبط کی ابتدا کے لئے ضروری اجزا کی فراہمی میں مدد دے سکتی تھی، مستقبل کی طرف سے پیٹھ موڑ لی ۔ میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۹ء کی ایک عالمی ذمہ داری سے امریکہ کے منہ موڑ لینے کے متعلق ۲۰۰۰ء کے مورخین نہایت سخت رائے کا اظہار کریں گے ۔

۲ ۔ چینی انقلاب کا چیلنج

ہمارا دوسرا بڑا فیصلہ اس صورت حال سے متعلق ہے جو چینی انقلاب کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آئی ۔ جمہوریہ چین کے قیام کے موقع پر ہم نے نئے اور ابھرتے ہوئے چین کی مادی ، اور نفسیاتی ضروریات کو اچھی طرح سمجھا اور چین کے اقتصادی اور سیاسی حالات پر بہت کافی اور فیصلہ کن اثرات ڈالے تھے ۔

اس کے باوجود ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں جب سن یت سین نے چین کے اتحاد اور اس کی اقتصادی ترقی کے لئے بھاری رقمیں بطور قرض طلب کیں تو ہم نے ان کی درخواست کو بری طرح رد کر دیا ۔ اس وقت صرف ایک مٹھی بھر دور اندیش امریکیوں نے اس بات کو سمجھا تھا کہ ہمارے اس فیصلہ نے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے ۔

اور جب مغربی یورپ کے ممالک نے بھی اس کی درخواست کو رد کر دیا تو سن یت سین نے مایوس ہو کر ماسکو کی نئی کمیونسٹ حکومت سے وہ امداد طلب کی جسے اوقیانوس قوموں نے اسے دینے سے انکار کر دیا تھا ۔

۱۹۲۲ء میں واشنگٹن میں منعقدہ تخفیف اسلحہ کانفرنس میں ہارڈنگ ایڈمنسٹریشن نے ہماری اس ناکامی میں اور اضافہ کر دیا ۔ جاپان کے اپنی فوجوں میں معمولی سی کمی قبول کر لینے کے بدلے میں ہمارا خود کو اپنے نئے بحریہ کے ایک بڑے حصے سے محروم کر دینے کے نتیجہ میں بحرالکاہل کے مغربی حصے میں ہماری قوت کو شدید صدمہ پہنچا اور اس کی بدولت جارحانہ حملوں کا وہ سلسلہ شروع

ہوگیا جس کے نتیجے میں ۱۹ سال کے بعد پرل ہاربر جیسا ہولناک واقعہ پیش آیا۔

لیکن اس کے بعد بھی ہم سے بہت سی ایسی ہی باتیں اور غلطیاں سرزد ہوئیں۔ ۱۹۲۷ء میں جب سن یت سین کا جانشین، چیانگ کائی شیک کمیونسٹوں کی مخالفت پر کمربستہ ہوا اور اس نے ایک جدید غیر کمیونسٹ ریاست کے قیام کا منصوبہ بنایا، تو اس وقت ہمیں اپنی پچھلی غلطیوں کے ازالہ کا ایک اور موقع ملا تھا۔ لیکن امریکہ چوں کہ نہایت متمول، مطمئن، باقی دنیا سے بہت دور اور محفوظ ملک ہے اس لئے وہ ایک بار پھر اس چیلنج کو سمجھنے میں ناکام رہا۔

۱۹۳۱ء میں جاپانی فوج منچوریا میں داخل ہوگئی۔ اگر اس وقت امریکہ کی طرف سے کوئی موثر کارروائی کی جاتی تو اس وقت بھی یہ بات ممکن تھی کہ وہ جاپانی حملہ کو مسدود کرکے چین کو ایک آزاد اور سیاسی اعتبار سے ایک طاقت ور قوم کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع دیتا۔ لیکن بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہم خود اپنے مسائل میں پھنسے ہوئے تھے اور قطعاً اس حیثیت میں نہیں تھے کہ جاپان کی بحری طاقت کے ساتھ کوئی جھگڑا مول لیتے یا چین کی ڈگمگاتی ہوئی حکومت کو وہ امداد دے پاتے جس کی اسے شدید ضرورت تھی۔

کوئی شخص صحیح صحیح نہیں بتلا سکتا کہ چین میں رونما ہونے والے واقعات پر اثر انداز ہونے کی اپنی صلاحیت کو ہم بالآخر کس وقت کھو بیٹھے تھے۔ بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ ۱۹۴۱ء تک بھی امریکہ کی فوجی، سیاسی اور اقتصادی نوعیت کی ایک جامع سعی کمیونزم کا کوئی موثر جمہوری متبادل پیش کرنے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ جنگ کے اختتام پر اگرا لبتہ یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ اب بڑے پیمانہ پر امریکہ کی فوجی مداخلت کے علاوہ کوئی چیز واقعات کا رُخ نہیں بدل سکتی۔

لیکن اس زمانہ میں چونکہ لوگ جنگ اور جمود سے تنگ آچکے تھے اور دونوں سیاسی جماعتوں کے رہنما فکر کے اس فطری بہاؤ کا لحاظ کرتے تھے اس لئے قسم کی کوئی ضروری کارروائی معرض بحث میں بھی نہ آسکی۔

اس طرح ہم اس صدی میں خارجہ پالیسی کے دوسرے بڑے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں بھی ناکام رہے۔

۳۔ نازی جرمنی کی مخالفت

تیسرا چیلنج وہ ہے جسے ہم نے دیر میں لیکن موثر طریقہ پر سمجھا اور اس کا مقابلہ کیا۔
فرینکلن ڈلانو روزویلٹ، جو زبردست تاریخی بصیرت کے مالک تھے، انھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اگر یورپ پر نازیوں نے غلبہ پالیا تو اس سے خود امریکہ کی آزادی کو ایک

ایک بنیادی خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ ۱۹۳۷ء میں رفتہ رفتہ انھوں نے امریکی عوام کو بھی اس حقیقت کو سمجھنے کی طرف آمادہ کرنا شروع کیا۔

لیکن ہماری عقل نے سب سے پہلے ہمیں یہ بات سمجھائی کہ ہم روزویلٹ کی بات کو رد کر کے باقی دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں۔ غیر جانب داری کا قانون جس کی رو سے مغربی یورپ کی اقوام کے لئے امریکہ کے مال سے لدے ہوئے جہازوں پر پابندیاں لگائی تھیں، وہ ہمارے قومی اندازِ فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔

اس کے باوجود خود کفالت کے قدیم معروضات کی حقیقت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ بہت کافی وقت گزرنے کے بعد اب ہم اقوام کے ایک دوسرے پر انحصار کرنے کی اس ضرورت کو تسلیم کرنے لگے تھے جسے ایک عرصہ قبل وڈرو ولسن نے ہم سے تسلیم کرنے کی سفارش کی تھی۔ اس طرح برطانیہ کی تاریخ کے تاریک ترین اور بہترین لمحات میں ہم اس کی مدد کو آئے۔

۴۔ جنگ کے بعد از سرِ نو تعمیر کا چیلنج

یہ تھا چیلنج یورپ میں جنگ و جدل کے خاتمہ کے فوراً بعد ہی متشکل ہونے لگا تھا۔

مغربی یورپ کے شہر برسوں کی بمباری اور گلی کوچوں کی لڑائی کے بعد محض کھنڈرات کی شکل میں رہ گئے تھے۔ خوراک، ایندھن اور تعمیرات کا سامان ناکافی تھا۔ ہر جگہ افراطِ زر کا دور دورہ تھا اور پورے یورپ کی اقتصادیات دم توڑنے کے قریب تھی۔

اسی دوران میں چند سو میل کے فاصلہ پر مشرقی جرمنی اور پولینڈ میں تقریباً دو سو ڈویژن روسی فوج تیار کھڑی تھی جس کے اندر یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ رودبار انگلستان تک بلا مقابلہ دندناتی چلی آئے۔

ابتدا میں روس کی نگاہیں یونان اور ترکی پر پڑ رہی تھیں۔ برطانیہ، جس نے دو سو سال تک ایک ایسے سیاسی تدبر اور فوجی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا جس نے مؤثر طریقے پر روس کو بحرِ متوسط میں اپنے قدم جمانے سے باز رکھا، وہ اب اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔

ساتھ ہی ساتھ تمام مغربی یورپ کی کمیونسٹ پارٹیاں جو نازی ازم کی خفیہ مزاحمت کے ساتھ باقاعدہ طریقہ پر وابستہ تھیں، وہ انتشار اور ابتری پیدا کرنے، متحدہ محاذ بنانے اور بالآخر اقتدار حاصل کر لینے کے لئے میدان میں آ گئیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایسے نازک دور میں ہمارے وزیر خارجہ جنرل جارج مارشل تھے جن کی شخصیت تدبر اور ذہانت کا مجسمہ تھی۔ ہیری ٹرومین ایک ایسے صدر تھے جن کا جرأتمندانہ

استقلال اور جن کی اولوالعزمانہ مقصدیت ہمارے دَور کی تاریخ میں ان کو ایک امتیازی مقام پیش کرے گی۔

اس طرح یہ بحران اور ایسے لائق لوگ ایک ہی وقت میں اُبھر کر سامنے آئے، جس کے نتیجہ میں ایک ایسی عظیم الشان تخلیقی قومی تحریک وجود میں آئی جس نے روس کے فوجی، سیاسی اور اقتصادی خطرہ کو مسدود کر دیا، ایک نئے آزاد یورپ کی بنیاد رکھی اور ہمیں قریب قریب ایک تیسری عالمگیر جنگ کا سامنا کرنے سے بچا لیا۔

یونان اور ترکی کے دفاع کے لئے ٹرومین نظریہ کے بعد مغربی یورپ کی اقتصادی، اور سیاسی بحالی کے لئے مارشل پلان وجود میں لایا گیا۔ اس کے بعد مغربی یورپ کے فوجی دفاع کی غرض سے نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن وجود میں آئی اور برلن کی ڈرامائی اڑان کا واقعہ پیش آیا جس کے ذریعہ ہم نے یہ واضح کر دیا کہ ہم یعنی امریکہ کے باشندے قوت اور وسائل دونوں کے مالک ہیں۔

۱۹۴۹ء میں جب نئی نئی آزاد شدہ، انتہائی مفلوک الحال اور غیر ترقی یافتہ قوموں نے منظر عام پر آنا شروع کیا تو ہم نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں تعمیری کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے پوائنٹ فور پروگرام کے ذریعہ ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔

یہ زمانہ ایک ایسے چیلنج کے مقابلہ کے خلاف، جس کی اس سے پہلے کوئی مثال دیکھنے میں آئی، ایک نہایت شاندار تخلیقی اور غیر جانب دارانہ ردعمل کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں ہمارے رہنماؤں نے رہنمائی کی اور امریکہ کے بیدار مغز اور باخبر عوام نے نہایت ذہانت اور تندہی کے ساتھ ان سے تعاون کیا جو ایک بڑی قوم ہونے کی علامت ہے۔

۵۔ انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں امریکی قیادت کا چیلنج

اب ہم اس اہم ترین سلسلۂ واقعات کے پانچویں اور سب سے بڑے چیلنج کی طرف آتے ہیں۔ جس نے اس صدی کے نصف اوائل میں ہم امریکیوں کی خوب اچھے طریقے سے آزمائش کی ہے۔

انیسویں صدی اور بیسویں کی ابتدائی دہائیوں میں امن عالم کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا انحصار کلی طور پر یورپ کے توازن طاقت پر ہوتا تھا، لیکن دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد سے اس صورل حال میں بنیادی تبدیلی آگئی۔

ایشیا اور افریقہ کے کروڑہا باشندے جو کسی زمانے میں لندن، پیرس، اور ہیگ

کے اشارہ دں پر چلتے تھے، اب انھوں نے آزادی حاصل کر لی ہے۔ ان نئی اور کم ترقی یافتہ قوموں کے اس طرح وجود میں آنے کی بدولت امریکی حکومت اور عوام کے لئے ایک قطعاً نیا چیلنج پیدا ہو گیا ہے۔

اس نئی اور انتہائی وسیع پہلوؤں والی صورت حال میں اس بات سے اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے کہ یہ انقلابی صورت حال ٹھیک ایسے وقت پر ظہور میں آئی ہے جب کہ جدید ٹیکنالوجی بحر اوقیانوس کے آس پاس آباد دولت مند سفید فام اقلیت اور بیشتر جنوبی نصف کرہ میں آباد مفلوک الحال رنگین اکثریت کے درمیان خلا کو، جو پہلے ہی کافی گہرا تھا، تیزی کے ساتھ وسعت بخش رہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ عالمی امور کی سطح پر ایک نیا چینی دیوزاد آگے کی طرف بڑھ رہا ہے جو راتوں رات اپنی صنعتوں کو ترقی دینے کا خواہش مند ہے، جسے ۶۵ کروڑ محنتی اور مستعد انسانوں کا تعاون حاصل ہے جس کی قیادت صاحب نظریات لیکن جارحیت پسند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، جس کے وسائل ناکافی ہیں، جسے جنوب مشرق ایشیا میں، جس کی زمین زرخیز اور تیل کے خزانوں سے مالا مال ہے اور جس کی چین کو فوری اور شدید ضرورت ہے، قوت کا ایک پرترغیب خلا نظر آرہا ہے۔

پھر آخر میں سوویٹ یونین ہے جس کی فولاد کی پیداوار چھ کروڑ ٹن اور جس کی صنعتی افزائش کی سالانہ شرح ہماری اپنی افزائش سے تین گنی ہے، جو ہر سال ہم سے دو گنے انجنیئر اور سائنٹسٹ پیدا کر رہا ہے اور اٹیمی اسلحہ اور عام فوجی حیثیت سے ایک زبردست قوت ہے۔

دور حاضرہ میں آکر روسی رہنماؤں نے کم ترقی یافتہ علاقوں کی اہمیت کے بارے میں کچھ نئے ڈھنگ سے سوچنا شروع کیا ہے، اور ان ممالک کے ساتھ ان کے برتاؤ میں ایک نیا لوچ ایک نئی دقیقہ سنجی اور ایک اقتصادی اور سیاسی تدبر دیکھنے میں آتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ تمام واقعات ہمارے سامنے ایک ایسا بڑا چیلنج پیش کرتے ہیں جس کا آج تک کسی معاشرے نے سامنا نہ کیا ہو گا۔ یہ ہماری قدروں، ہماری جرأت اور ذہانت آزمائش ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری صلاحیتوں کی اس حتمی آزمائش کے متعلق ہمارا قومی ردعمل کیا ہو گا؟ آئیے ذرا اور اختصار کے ساتھ دیکھیں کہ ہم کو کیا کرنا ہے؟

سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ ہم ان قوتوں کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں، جو پرانے نظام کو درہم برہم کر رہی ہیں، پرانے معاشروں میں انتشار پیدا کر رہی ہیں، نیا ولولہ اور نئی امیدیں پیدا کر رہی ہیں، جن سے اکثر امن کو خطرہ پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ اس کے ساتھ

ہی ساتھ کروڑہا انسانوں کو ایک بہتر مستقبل کا یقین بھی دلاتی ہیں۔

اس انقلاب کی تہہ میں وسیع تر انسانی وقار کی عالمگیر توقع، فرد کے نئے عظیم تر مواقع اور انصاف کا ایک عظیم تر پیمانہ پوشیدہ ہے۔ اگرچہ اس کے کام کے طور طریقے اکثر تشدد آمیز، بظاہر غیر معقول اور تباہی خیز ہوتے ہیں، یہ انقلابی اُمید بعض انسانی قدروں پر قائم ہے جو روئے زمین کے تقریباً ہر حصے میں پائی جاسکتی ہیں۔

سوویٹ یونین نے اگرچہ اس انقلابی تحریک کو جنم نہیں دیا ہے لیکن وہ اس کو اپنی مقصد براری کے لئے استعمال کرنے کی کوشش ضرور کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں سوویٹ یونین کو بعض بڑی سہولیات بھی حاصل ہیں۔

کریملین ان انقلابی قوتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس کے اوپر نسلی تصادمات یا دنیا کے گہری رنگت والے لوگوں کے خلاف امتیازی سلوک کی قسم کے کوئی داغ دھبے نہیں ہیں۔ وہ اپنی سخت گیر حکومت کے ذریعہ اپنے تعلیمی، صنعتی، اقتصادی اور سیاسی وسائل کو روسی اغراض و مقاصد کی اعلیٰ ترین کامیابی کے خیال سے جہاں چاہے مرکوز کرسکتا ہے اور ان کا استعمال عموماً کسی قوم کے اندرونی ڈھانچے میں کمزور ترین مقام پر کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود روس کی کامیابی کے راستے میں بہت سی بڑی بڑی رکاوٹیں آئی ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ سوویٹ یونین کے اعلان کردہ قومی نظریات پر قوم پرستی کے اس نئے تصور کے قطعاً خلاف ہیں جو ایشیا اور افریقہ کی نئی اقوام اور لاطینی امریکہ کی اُبھرتی ہوئی قوتوں کے لئے ایک قوت متحرکہ ثابت ہوا ہے۔ اور چونکہ سوویٹ یونین قوم پرستی کے نظریہ کا مخالف ہے اس لئے وہ ایک مؤثر اقوام متحدہ کا بھی مخالف ہے جس کی بدولت ان نئی قوموں کو ایک ایسے عالمگیر ادارے میں شرکت کا موقع ملا ہے جہاں وہ اپنے خیالات کا اظہار کرسکتی ہیں۔

اس کے علاوہ سوویٹ یونین مذہب کا بھی مخالف ہے اور اسے عوام کے لئے "افیون" قرار دیتا ہے۔ یہ آزادی کے اس وسیع تر مفہوم کے حق میں نہیں ہے جس کی تمام دنیا متلاشی ہے بلکہ فرد کو ریاست کے مفاد کا مطیع بنانا چاہتا ہے۔

آیئے اب ذرا امریکہ کی کمزوریوں پر بھی ایک نگاہ ڈالیں۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے اس عظیم چیلنج کا مقابلہ کرنے سلسلے میں ہمارے سامنے کئی نمایاں کمزوریاں ہیں۔ سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ امریکی عوام اور نئی کانگریس اس مقصد کی ضروریات سے پوری طرح باخبر نہیں۔ وہ اس مسئلہ کی نوعیت کے متعلق مشکوک و شبہات میں مبتلا ہیں اور خود اپنے مستقبل کے لئے اس کے معانی کو سمجھنے سے انکاری ہیں۔

اس کے علاوہ ہم نے ایک عرصہ تک نسلی امتیاز کی پالیسی کو روا رکھا ہے۔ اور آخری بات بات یہ کہ اگرچہ ہماری اقتصادیات کچھ وقفہ کے بعد اب رفتہ رفتہ بحال ہو رہی ہے، اس کے باوجود ہم اپنی صلاحیتوں کے مطابق پیدا نہیں کر پا رہے ہیں۔

باوجود اس کے کہ یہ دشواریاں اوسط درجہ کی ہیں، ہمارا اپنی عظیم صلاحیتوں کو ہیچ مقدار سمجھنا بڑی شدید غلطی ہوگی۔ ہمارا سب سے بڑا سرمایہ یہ ہے کہ ہم ایک عظیم الشان انقلابی قیادت کے تحت ایک انقلابی قوم کی حیثیت سے پیدا ہوتے تھے۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ اس انقلاب کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

ہمارے لئے سب سے بڑی آسانی وہ ہے جس سے ہم لوگ بہت ہی کم واقف نظر آتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہم ان نئی اُبھرتی ہوئی اقوام کے لیے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ عین وہی ہے جو یہ لوگ خود چاہتے ہیں۔

ہماری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے کہ دنیا کی کچھ قوموں کو اپنا تابع فرمان بنائیں۔ یا کچھ محکوم علاقے ہماری چاپلوسی کریں، یا ہماری ہاں میں ہاں ملائیں۔ ہم ٹانگانیکا، بولیویا، برما کوریا اور دوسری قدیم اور جدید اقوام کے لئے وسیع تر اقتصادی مواقع، عظیم تر وقار اور انصاف، بیماروں کی دیکھ بھال کے لئے زیادہ تعداد میں ڈاکٹروں، بھوکوں کے لئے زیادہ مقدار میں خوراک، جہالت کو دور کرنے کے لیے زیادہ تعداد میں اور بہتر اسکولوں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے بہتر مواصلات اور اپنی پسند کے معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق عبادت کرنے، آزادانہ گھومنے، بولنے، تجارت کرنے اور سفر کرنے کے حقوق کے خواہشمند ہیں۔

اغراض و مقاصد کی یہ ہم آہنگی پُرامن، خوش اور غیر کمیونسٹ عالمی اتحاد کے قیام کے سلسلہ میں امریکہ کے لئے ایک بنیادی فوقیت کی صورت رکھتی ہے۔ اور یہ بات کہ ان نئی اقوام کے سوویٹ یونین کے نظریات ان اقوام کے اپنے نظریات کے ساتھ بنیادی اختلاف رکھتے ہیں، روس کی ایک بنیادی خامی کو ظاہر کرتی ہے۔

اس کے باوجود یہ مرکزی مسئلہ باقی رہتا ہے اور وہ یہ کہ کیا ہم اس چیلنج کا مقابلہ کرنے اور اس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی غرض سے اپنی جملہ قوتوں کو مجتمع کر کے اس نظریہ کو تقویت پہنچا سکتے ہیں۔

ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ جو مورخین ۲۰۰۰ء میں دنیا کی تاریخ لکھیں گے وہ موجودہ صدی کے پانچ اہم ترین فیصلوں میں سے اس آخری اور اہم ترین فیصلہ کے متعلق امریکہ کے ردعمل کو جرأتمندانہ، ہمدردانہ اور ہر اعتبار سے صحیح قرار دیں گے۔

١١ - اقوام متحدہ کو کن کن معاملات میں کامیابی نصیب ہوئی ہے

ذیل میں مسٹر باؤلز کی ایک تقریر پیش کی جاتی ہے جو انھوں نے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۱ء
کو واشنگٹن میں یوم اقوام متحدہ کے موقع پر ایک لنچ کے دوران بین الاقوامی تعاون
کے اس عظیم ترین تجربے کا جائزہ لیتے ہوئے کی تھی۔

اس وقت ہم دو انتہائی طاقتور ایسے قومی دھاروں کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں جو
ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں بہہ رہے ہیں۔ ان دونوں دھاروں کا باہمی اختلاف بعض اوقات
اس درجہ شدت اختیار کر لیتا ہے کہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے ایک حقیقت اور دوسرا
افسانہ ہے۔

ایک طرف سرد جنگ کا نہایت قوی دھارا ہے۔ اس کے اندر جہاں دیکھیے کانٹے دار
تار، پتھر کی دیواریں، جنگل میں ایک دوسرے پر چھپ چھپ کر حملے اور ایٹمی تباہی کے خطرات نظر آتے
ہیں۔ یہ ایک تشدد پسند دنیا ہے جس میں بے اعتمادی اور خوف کا دور دورہ ہے اور ایٹمی راکھ اڑتی اور
گرتی نظر آتی ہے۔ سرد جنگ کا یہ قوی دھارا ۱۹۴۶ء سے اخبارات کی سرخیوں کا موضوع بنا ہوا ہے جب
اسٹالن نے پہلی بار یونان اور ترکی کو دھمکی دی تھی۔

اس کے علاوہ اسلحہ بندی کی دوڑ کے ساتھ ساتھ، عام لوگوں کی توجہ سے بہت دور اور
عالمی کشیدگی کے ساتھ اپنا وجود قائم رکھنے والا ایک اور دھارا ہے جو آزادی، امید اور اقوام اور
لوگوں کے درمیان بڑھتے ہوئے ربط و ضبط اور انصاف کی طرف بڑھ رہا ہے۔

انسانی جدوجہد کے اس کم ڈرامائی لیکن اہم ترین دھارے کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟
پہلی چیز قومی آزادی کی جدوجہد ہے جس کے ذریعہ ایشیا اور افریقہ کے ۹۰ کروڑ انسانوں
نے قدیم یورپی تجارت پیشہ سلطنتوں کی غلامی کا لبادہ اتار پھینکا ہے اور ۱۵ سال کی مدت میں ۴۰
نئے ممالک میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ آزادی کی اس لہر کو دورِ حاضرہ کی تاریخ میں یقیناً سرد جنگ
سے زیادہ جگہ ملے گی۔

اس امید افزا دھارے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ آج دنیا میں بھوک، بیماری اور ناامیدی
کو ختم کرنے کا، جو صدیوں تک کم ترقی یافتہ دنیا کے لوگوں کی اکثریت کا مقسوم بنی رہی ہیں، ایک عالمگیر

جذبہ پایا جاتا ہے۔

نئی اقوام نے ان مسائل سے دوچار ہونے کے سلسلہ میں نہایت شاندار ابتدائی ہے۔ اگرچہ بعض علاقوں میں ترقی کی رفتار سست ہے، بعض دوسرے علاقوں میں ہمیں منصوبہ بندی، اصلاحات نافذ کرنے اور اپنے گھریلو وسائل کو منظم کرنے کی غیر معمولی صلاحیت نظر آتی ہے۔

ابھی حال تک ریاست ہائے متحدہ ان مٹھی بھر غیر نوآبادیاتی قوموں میں سے ایک تھیں لیکن آج تقریباً ۱۵ صنعتی قومیں کم ترقی یافتہ علاقوں کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے ضروری سرمایہ اور فنی مہارت مہیا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس قسم کی بیشتر امداد کو آج مقامی اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعہ منظم کیا جا رہا ہے۔

اس طرح آج ہمارے پاس اس بات کی قطعی شہادت موجود ہے کہ امید کا یہ جوابی دھارا بین الاقوامی امور میں نہایت استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ بہہ رہا ہے۔

ایک تیسری امید افزا بات آزاد ممالک کے بعض نئے بین الاقوامی اتحادات کا تیزی کے ساتھ وجود میں آنا ہے جو افزائش اور تحفظ کے مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے آزادانہ طور پر مل جل کر کام کرنے کے تجربہ کو اپنا رہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے لوگوں میں قومی حدود سے باہر نکل کر کام کرنے کا جذبہ پرورش پا رہا ہے، بین الاقوامی تعاون کی نئی ہیئتوں کی تلاش کی جا رہی ہے اور ایک غیر منظم اور کسی قدر غیر متشکل قسم کے عالمی معاشرے میں نئے نئے ادارے تیزی کے ساتھ وجود میں آ رہے ہیں۔

یہی تین ایسے اجزاء ہیں جو امید کے دھارے کی تشکیل کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اقوام متحدہ کو ان واقعات کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اور ہمیں اقوام متحدہ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟

ہمارے ارد گرد کی بیشتر انجانی اور پیچیدہ دنیا سے ہمیں جو مایوسی ہوئی ہے اس کے نتیجہ میں ہمارے انتہائی پر معلومات اور صائب الرائے لوگ بھی مسئلہ کی انتہائی نوعیتوں کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔ درمیانی صورتیں امریکہ کے بیشتر باشندوں کے لئے انجانی، غیر خوش آئند اور غیر اطمینان بخش بنتی جا رہی ہیں۔

ایک ایسی عظیم قوم بننے کے سلسلہ میں ہمیں جو تجربہ حاصل ہوا ہے اس کی بنا پر ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہر مسئلہ کے صرف دو پہلو ہوتے ہیں، ایک صحیح اور ایک غلط۔ اور یہ کہ اگر مسائل کا کوئی وجود ہے تو ان کے حل بھی یقیناً موجود ہیں۔ یہ کہ اگر کسی جگہ کھلم کھلا تصادم ہوتا ہے تو فریقین میں سے ایک کو مکمل فتح اور دوسرے کو شکست فاش نصیب ہوتی ہے۔

لیکن نئی دنیا جس کے ساتھ ہم اس وقت دوچار ہیں اس درجہ پیچیدہ اور دشوار ہے کہ اس کے اندر سیدھے سادے حل بمشکل ہی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم بنی نوع انسان کے چھ فیصدی حصہ کی ترجمانی کرتے ہیں اور اپنی اس عظیم صنعتی اور فوجی قوت کے باوجود ہم جو کچھ کر سکتے ہیں اس پر شدید پابندیاں عائد ہیں۔

یہ بات لازمی ہے کہ امریکہ کے وہ باشندے جو ان دشواریوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں جن سے اقوام متحدہ کو دوچار ہونا ہے، وہ یہ الزام لگائیں گے کہ یہ عالمی ادارا اس مقصد کے حصول میں ناکام رہا ہے جس کے تحت اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔

پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے قوی ترین اراکین میں سے ایک کی باقاعدہ اور ڈٹے شدہ مخالفت کے باوجود اقوام متحدہ اور اس کی مخصوص مقاصد کی ایجنسیوں نے بہت سے میدانوں میں اپنی قوت کارکردگی اور ذہانت سے کام لیتے ہوئے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

مثال کے طور پر عالمی صحت کا ادارہ انسداد ملیریا کی ایک عالمگیر مہم میں مصروف ہے، ایک ایسی بیماری کے انسداد میں جس کی بدولت تاریخ میں سب سے زیادہ اموات اور کام کا سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک اور مہم بھی شروع کر رکھی ہے جس کا مقصد دنیا کے ایک ایک گاؤں میں صاف پانی پہنچانے میں مدد دینا ہے۔

پچھلے سال اقوام متحدہ کے چلڈرنس فنڈ نے، جس میں ۹۸ اقوام شامل ہیں ساڑھے ۵ کروڑ حاملہ اور دودھ پلانے والی ماؤں کی دیکھ بھال میں مدد کی۔ اس کے علاوہ اس نے تقریباً ساڑھے سات کروڑ بیمار بچوں کے علاج معالجے میں بھی مدد کی اور اس کام پر اوسطاً پندرہ سینٹ فی کس خرچ آیا۔

عالمی موسمیاتی ادارہ اطلاعات بہم پہنچانے کے ایک عالمگیر سلسلہ کو وجود میں لانے کے لئے منصوبہ تیار کر رہا ہے۔ انٹرنیشنل ٹیلی کمیونیکیشن یونین آج تمام دنیا کے لئے ریڈیائی لہریں فراہم کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ تقریباً ہر میدان میں علاقائی اقتصادی اور معاشرتی تعاون کے سلسلہ میں جو دو قومی یا بین الاقوامی معاہدات ہو رہے ہیں اور جن کی طرف میں اس سے قبل اشارہ کر چکا ہوں، وہ بھی اقوام متحدہ کی ان مؤثر اور تخلیقی علاقائی ایجنسیوں کے ارتقا کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں جن میں "اکانومک کمیشن فار ایشیا اینڈ دی فار ایسٹ" اور "دی اکانومک کمیشن فار لیٹن امریکہ" شامل ہیں۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے مثبت سیاسی اور اقتصادی عمل کی صلاحیت کا جہاں تک

تعلق ہے اس کا مظاہرہ نہایت عظیم الشان طریقے پر پچھلے سال کانگو میں ہو چکا ہے۔
اس کے علاوہ کانگو سے امن اور تحفظ کے لئے ایک زیادہ ٹھوس بنیاد کے قیام کے سلسلہ میں اقوام متحدہ کی صلاحیتوں کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ کا ۲۸ ممالک سے تقریباً ۲۰ ہزار فوج جمع کر کے کانگو میں بھیجدینا اس امر کی ایک حالیہ ڈرامائی مثال ہے۔ قیام امن کے لئے کام کرنے والی ایک بڑی فوج کا اس طرح تھوڑے سے وقفہ میں اکٹھا کر کے کانگو میں بھیجنا اور اس کی کمان کرنا، عام توقعات سے زیادہ تھا۔ علاوہ ازیں ایران، یونان، فلسطین، سوئز، اور کوریا میں اقوام متحدہ کی قیام امن کی کوششیں بھی ناقابل فراموش ہیں۔
اقتصادی اور سماجی ترقی کے کاموں اور امن وامان کے قیام کے سلسلہ میں مدد دینے کے علاوہ اقوام متحدہ نے قوموں کے باہمی تنازعات کو دور کرنے کے سلسلہ میں بھی ایک بین الاقوامی ادارے کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ باوجود اس کے بدنام کرنے والے اس کام کے سلسلہ میں اس کو محض تقریر بازی قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کے اندر ہونیوالی تقریریں، باوجود اس تمام تلخی اور فتنہ انگیزی کے جو اکثر ان میں دیکھنے میں آتی ہے، اپنی جگہ انتہائی اہم ہیں۔ اقوام متحدہ کے سامنے آنے والے تنازعات تاریخ کے قدیم ترین اور انتہائی دشوار تنازعات ہوتے ہیں، جنھیں کسی اور ماحول میں اس سے زیادہ موثر طریقے پر حل نہیں کیا جا سکتا۔
پھر ہم ۱۹۶۱ء کی دنیا میں اقوام متحدہ کی قدر وقیمت کا کس طرح جائزہ لے سکتے ہیں؟
ظاہر ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے جنگ کے خطرے کو ختم کر دیا ہے یا دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیانی خلا کو کس حد تک پُر کر دیا ہے۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس ادارے نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ کئی حیثیتوں سے قابل قدر ہے۔
باوجود اس کے کہ ایک شدید نظریاتی کش مکش نے جو ہر آزاد قوم کے لوگوں کی صلاحیتوں پر حاوی ہے، اقوام متحدہ کے کام میں بھی کافی رکاوٹیں پیدا کیں، پھر بھی یہ ادارہ پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ امید کے دامن کو پکڑے رہا اور بالآخر ترقی کی اس منزل کو پہنچا۔
جہاں کہیں انصاف کے بڑے بڑے مسائل پیش، وہاں اس ادارے نے کل بنی نوع انسان کے اظہار رائے کے لئے ایک اجلاس گاہ کا کام دیا۔
جہاں کہیں تشدد کی صورت سامنے آئی تو اس نے بارہا لوگوں کے خیالات تبدیل کر کے امن وامان قائم کرنے کے سلسلہ میں اپنی بڑھتی ہوئی صلاحیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔
جہاں کہیں لوگ افلاس کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف ہوئے وہاں اس نے بنی نوع انسان کے مسائل کو دور کرنے کے سلسلے میں ناگزیر تعاون کی نت نئی راہیں کھولدیں۔

آج ہم ایک نہایت پُرآشوب، مضطرب اور بدخصلت دنیا کے اندر سانس لے رہے ہیں جس میں امید وبیم ایک دوسرے کے ساتھ موجود ہوں۔ سرد جنگ کے تصادم کے ساتھ ساتھ امریکیہ اور ایشیا، افریقیہ اور لاطینی امریکیہ کے درمیان باہمی امداد وتعاون کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ وہ اُبھرتی ہوئی دنیا ہے جو اقوام متحدہ کی نمود پذیری میں مدد دیتی ہے اور جس کو خود اپنی نمود پذیری میں اُس سے مدد ملتی ہے۔

اب آخر میں، میں ایک بات اور کہوں گا، میں اُس شخص کی خدمت میں خراج تحسین ادا کئے بغیر اپنی بات ختم نہ کروں گا جس نے موجودہ نسل کے کسی بھی شخص سے زیادہ اقوام متحدہ کو ایسا بنانے کی کوشش کی جیسا کہ سب اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس ادارے کو اپنی آخری رپورٹ میں ڈاگ ہیمرشیلڈ نے، جو خود اس ادارے کی آواز اور اُس کا ضمیر بن چکا تھا، نرم الفاظ میں تنبیہ کی تھی:

"اس ادارے کے ذریعہ کوئی ایسا راستہ تلاش کرنے کی کوشش، جس کے ذریعہ کُل بنی نوع انسان، اس ادارے کے منشور کے اندر رہتے ہوئے رفتہ رفتہ ایک منظم بین الاقوامی تعاون کے اندر تبدیل ہو جائے، یا آگے بڑھے گی یا پھر پیچھے کی طرف ہٹے گی۔ جن لوگوں کا ردِ عمل اس ادارے کی ترقی کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے یا اس کے عمل کی اثر آفرینی کے امکانات کو مسدود کرتا ہے، انھیں پھر سے ایسے حالات پیدا کر دینے کے لئے ذمہ دار قرار دیا جائے گا، جو پہلی جنگ عظیم کے بعد اقوام عالم کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہو چکے ہیں۔"

ڈاگ ہیمرشیلڈ ایک عملی سیاست داں کی دو خاص خوبیوں یعنی تخلیقی تصورات اور اعلیٰ درجہ کی فہم وفراست کا حسین امتزاج تھے۔ ۱۹۶۱ء کی اصل دنیا ٹھیک وہی دنیا تھی جس سے ان کو علاقہ تھا اور اسی دنیا کے اندر انھوں نے اقوام متحدہ کو نہایت موثر طریقہ پر کام کرنے کی صلاحیت بخش دی تھی۔

ہم لوگ جو ان کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہمارے لئے اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں ہے جو وہ ہمیں دکھلا گئے ہیں۔ ہمیں اپنے ذہن میں اس تصور کو باندھے رہنا چاہیے جس کی اقوام متحدہ نے ہمیشہ سے خواہش کی ہے۔ صرف اسی صورت میں ہم اقوام متحدہ کو عالمگیر اخوت کے لئے ایک آلۂ کار بنا سکتے ہیں جیسا کہ اس کے بانی اس کو بنانا چاہتے تھے۔

۱۲۔ جدید علیٰحدگی پسندی

ذیل میں مسٹر باؤلز نے امور خارجہ کے متعلق انتہا پسند دائیں بازو کے مشہور نظریہ اور اس کی بدولت قومی مفادات کو لاحق ہونے والے خطرات کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ تجزیہ انھوں نے ۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو واشنگٹن میں ہونے والی نیشنل اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے سامنے تقریر کے دوران پیش کیا تھا۔

آج جو نئی دنیا ابھر کر ہمارے سامنے آرہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ پیچیدہ ہی ہے بلکہ بے انتہا وسیع بھی ہے اور ہم یعنی امریکہ کے باشندے کل بنی نوع انسان کی محض ایک ادنیٰ اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ ہماری دانشمندانہ اور جرأت مندانہ حکمت عملی ہم کو عالمی امور کی نشو ونما پر اثر انداز ہونے میں مدد دے سکتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نظر آرہا ہے کہ ہم عالمی امور پر کسی طرح غلبہ نہیں پا سکتے۔ ہم میں سے بہت سوں کے لئے یہ ایک نیا تجربہ ہے۔

کیا اس میں کوئی حیرت کی بات ہے کہ نئے مسائل اور نئی قوتوں سے مایوس اور پراگندہ ہو کر ہمارے چند نہایت لائق اور معزز شہری بعض آڑے ترچھے راستوں کی تلاش کرنے لگے ہوں؟

آج امریکہ میں علیٰحدگی پسندانہ فکر کی کم از کم تین ایسی قسمیں موجود ہیں جن میں اس قسم کی مایوسی کی جھلک نظر آتی ہے۔

ان میں اول وہ لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ جلد یا بدیر جنگ بہر حال ہو کر رہے گی۔ یہ سب سے زیادہ خطرناک قسم کی شکست پسندی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہم جنگ کے امکان سے دور رہ کر امن کے قیام میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ تخفیف اسلحہ کی کوئی منظم صورت اور قانون کے تحت بین الاقوامی انصاف کے بارے میں کسی بات پر پوری طرح سمجھوتہ نہ ہو جائے اُس وقت تک ہماری فوجی قوت کا باقی رہنا انتہائی ضروری ہے، صرف ہمارے اپنے قومی تحفظ کے لئے ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی اُس عظیم مقصدیت کے لئے بھی جو کمیونسٹ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے۔

موجودہ دور میں ہم اپنی دفاعی قوت کو جس طرح استحکام بخش رہے ہیں اس سے جنگ کا ناگزیر ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس یہ ایک ایسی ضروری دیوار کا کام دیتا ہے جس

کے پیچھے ہماری تخلیقی قوتیں ایک معقولیت پسند عالمی معاشرے کی بنیاد رکھنے کا کام انجام دے سکتی ہیں۔

دورِ حاضرہ کے علیحدگی پسندانہ اندازِ فکر کی دوسری شکل یہ ہے کہ امریکہ کے بیشتر باشندوں نے بیرونِ ملک کے عظیم تر چیلنج کو نظر انداز کر کے امریکہ کے مٹھی بھر کمیونسٹوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا ہے۔

ہر صاحبِ عقل آدمی دنیا میں ایک عالمگیر کمیونسٹ سازش کے وجود سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور اس بات سے بھی کہ دنیا کے ہر ملک میں جن میں امریکہ بھی شامل ہے روس کے ایجنٹ موجود ہیں۔

لیکن اندرونِ ملک کے تخریب کاروں کے متعلق ضروری کارروائی کے دوران ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم غلط نشانے پر وار نہ کرنے لگیں۔ امریکہ کے بعض باشندے مایوسی کے عالم میں غالباً یہ کہتے ہیں کہ کمیونزم سوشلزم کا پیدا کردہ ہے، جو خود اپنی جگہ حریت پسندی کی پیداوار ہے، اور حریت پسندی اپنی جگہ ان جمہوری نظریات کی پیداوار ہے جن کو ٹامس جیفرسن نے "اعلانِ آزادی" کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا تھا لیکن اس نظریہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

کمیونسٹ چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر ہمارے پاس فی الواقع کوئی جواب موجود ہے تو وہ کم نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ جمہوریت اور ترقی پسندی ہے، صرف امریکہ ہی میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر مقام پر۔

علیحدگی پسندوں کا تیسرا اور غالباً سب سے زیادہ ناخوش طبقہ وہ ہے جو شاید یہ کہتا سنائی دے" ذرا دنیا کی اس گاڑی کو روک لیجئے، میں اترنا چاہتا ہوں"۔ اگر ان کو اپنی خواہش کو پورا کرنے کا موقع دے دیا جائے تو ہم عالمی امور سے کنارا کش ہو جائیں گے۔ اور مستقبل کو اس خیال سے دوسروں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں گے کہ آخر کار ہم خود کو انسانی تاریخ کے مد و جزر سے علیحدہ کر سکتے ہیں۔

کیا کوئی صاحبِ فکر انسان اس قسم کی حکمتِ عملی کے لازمی نتائج کے بارے میں کوئی حجت یا استفسار کر سکتا ہے؟ کیا یہ من و عن وہی حکمتِ عملی نہیں ہے جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہم نے اختیار کی تھی اور اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے تھے۔ مجھے جو چیز بار بار پریشان کر رہی ہے وہ یہ ملامت انگیز سوال ہے کہ آیا ہم نے اس تجربے سے اچھی طرح اور پورا پورا سبق حاصل کر لیا ہے؟۔

آج پھر ہمیں ان پُر خلوص لیکن گمراہ لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں جن کا کہنا ہے کہ ہمیں تاریخ کے اسباق کو نظر انداز کر دینا چاہیئے، اقوام متحدہ کی واضح اہمیت کو ذہن سے نکال

دینا چاہیے، درآمد برآمد کے محاصل میں دل کھول کر اضافہ کر دینا چاہیے، غیر ملکی امداد میں کمی کر دینی چاہیے، اپنے دوست ممالک کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے، کسی بھی قوم پر، جسے ہم پسند نہیں کرتے حملہ کر دینا چاہیے، اور کسی نہ کسی طرح اس کے نتائج سے محفوظ رہنا چاہیے۔

میں ان کے خلوص کی داد دیتا ہوں اور سیدھے سادے جوابات کے لئے ان کی دیانتدارانہ خواہش کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ان کی اس مسلمہ حب الوطنی اور نیک خواہشات کی بدولت اس تباہی اور بربادی میں ذرہ برابر بھی کمی آئے گی جس کا ان کی مجنونانہ ہدایت پر عمل کرنے کی صورت میں بپا ہونا یقینی ہے۔

دنیا کا یہ چیلنج جس کی اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی اور جس سے آج ہمیں دوچار ہونا پڑ رہا ہے، وہ غیر ملکی امداد سے پیدا نہیں ہوتا، نہ بین الاقوامی تجارت سے پیدا ہوتا ہے، نہ اقوام متحدہ میں ہونے والی بحث کے نشیب و فراز سے پیدا ہوتا ہے، نہ ہمارے ان پڑوسیوں کے نظریات کی بدولت پیدا ہوتا ہے جن سے ہمیں اختلاف ہے، بلکہ دورِ حاضرہ کی ان انقلابی قوتوں کی بدولت پیدا ہوتا ہے جن سے اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ان طاقتور قوتوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لئے بہت کافی قوت، صبر و استقلال اور تدبر کی ضرورت ہے اس مقصد کے لئے ان تمام بہترین ہتھیاروں کی ضرورت پیش آئے گی جو ہمارا معاشرہ پیش کر سکتا ہے: مثلاً سفارتی تدبر، انفرادی تعلقات کی گرمی، اقتصادی اور ٹیکنیکل امداد اور فوجی نوعیت کے حفاظتی اقدامات۔

اس کے باوجود، ایک ضروری شرط کے ساتھ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ہم اس چیلنج کا کامیابی کیساتھ مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس شرط کو سادہ طریقہ پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کیا ہم اس جد و جہد کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں؟

تاریخ کے اس نازک مرحلہ میں وہ کیا چیز ہے جس کے ہم یعنی امریکہ کے باشندے متلاشی ہیں؟

بعض لوگ اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ ہمارا قومی مقصد بالکل بدیہی ہے۔ یعنی ہم امریکی فلسفۂ حیات کی حفاظت کے خواہشمند ہیں۔ لیکن کیا آج کی دنیا میں بھی جب کہ ہر شخص دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لئے مجبور ہے یہ جواب معقول معلوم ہوتا ہے۔

لمحہ بھر کے لئے فرض کیجئے کہ آپ موہن چودھری سے باتیں کر رہے ہیں جو دریائے برہم پتر کے کنارے پر آباد ایک شہر میں ایک نوجوان ہندوستانی اسکول ٹیچر ہے۔ ممکن ہے وہ آپ سے یہ سوال کرے کہ "ہم ہندوستانیوں کو کمیونزم کے خلاف لڑنے میں امریکہ والوں کے ساتھ کیوں شامل ہونا چاہیے؟"

اور فرض کیجئے کہ اس کے جواب میں آپ کہتے ہیں "کیوں کہ ہمیں امریکی فلسفۂ حیات کی حفاظت کے لئے تمہاری مدد کی ضرورت ہے" تو کیا اس کے نتیجے میں آپ شدید مایوسی کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع کر سکتے ہیں۔

موہن چودھری جو ایک سیدھا سادا ہندوستانی اسکول ٹیچر ہے اسے کیا پڑی ہے کہ وہ بارہ ہزار میل دوری پر بسنے والے دنیا کے متمول ترین انسانوں کے آرام و آسائش کو برقرار رکھنے کی غرض سے اپنی جان کو خطرے میں ڈالے؟

بعض لوگ غالباً یہ کہیں گے کہ امریکہ کے قومی مقاصد کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جانا چاہیئے۔ وہ آپ سے سوال کریں گے کہ "کیا ہمارا اصل نصب العین یہ نہیں ہے کہ امریکہ کی اقتصادی امداد اور سیاسی سوجھ بوجھ کو دوسری اقوام کو امریکہ کی زیر قیادت لانے کے لئے استعمال کریں؟"

لیکن کیا ہم میں سے کوئی انتہائی کم عقل آدمی بھی اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ ہماری حکومت دوسری اقوام کی وفاداری کو خرید سکتی ہے۔؟

یہ اس قسم کی دلائل ہیں جن کا دنیا کے بیشتر انسانوں کو یقین نہیں آسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارے قطعاً حسب حال نہیں ہیں۔ پھر آخر امریکہ کے اصل اغراض و مقاصد کیا ہیں، اور ہم ان کو وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے کس طرح رکھ سکتے ہیں؟۔

ظاہر ہے کہ یہ چیلنج نوع انسان کی، اس خوش نصیب اقلیت کیلئے ہی نہیں ہے جس کو مادی اعتبار سے سب سے زیادہ نقصان برداشت کرنا ہے۔ بلکہ یہ ان تمام انسانوں کے لئے ہے جو آزادی اور اپنے مخصوص انداز میں اور اپنی تاریخ و تمدن کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے مستقبل کو بنانے کے حق کے دلدادہ ہیں۔

آیئے تھوڑی دیر کے لئے پھر برہم پتر کے کنارے واقع اس گاؤں میں چلیں جہاں موہن چودھری ہم سے یہ سوال کر رہا ہے۔ "ہم ہندوستانیوں کو کمیونزم کے خلاف لڑنے میں امریکہ والوں کے ساتھ کیوں شامل ہو جانا چاہیئے؟"

اور فرض کیجئے کہ اس کا آپ یہ جواب دیتے ہیں "اگرچہ مادی اعتبار سے آپ اور ہم ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہیں پھر بھی بعض ایسے عالمگیر اعتقادات ہیں جن میں ہم ایک دوسرے کے شریک ہیں، جن کے لئے ہمارے آبا و اجداد کو لڑنا پڑا تھا، جن کی ہم آج حفاظت کرنے کے لئے تیار ہیں، اور جن کے لئے گاندھی جی نے اپنی جان تک قربان کر دی تھی۔

لہٰذا ہم آپ سے اور ان عقائد پر یقین رکھنے والے تمام انسانوں سے یہ کہتے ہیں: "ہم کو ایک ایسی دنیا کی تعمیر کے لئے مل جل کر کام کرنا چاہیئے جس میں انسان خود کو استبداد کے پنجے سے آزاد سمجھ

سکے جس سے ان بنیادی انسانی قدروں کی نفی ہوتی ہے ؟

جب ہم ایسے آفاقی اور عالمگیر انداز میں بات کریں گے تو مختلف نسلوں، عقیدوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے کروڑہا انسانوں کے چہرے ایک نئے اعتماد اور یقین کی بدولت چمک اُٹھیں گے۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہمارا تاریخی رول ہمیشہ واضح رہا ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم ملک اور بیرون ملک میں اس کا اعادہ کریں۔

۱۳۔ انقلاب جو کُل بنی نوعِ انسان کے لئے ہے

کیا ہمارے جیسی کوئی خوش حال اور فارغ البال قوم، دنیا کی کم ترقی یافتہ قوموں کے اندر ایک عالمگیر اور پُرامن انقلاب لانے کی کسی مہم کی قیادت کر سکتی ہے۔ مسٹر باؤلز کا خیال ہے کہ کر سکتی ہے؟ —— بشرطیکہ ہم خود اپنی انقلابی روایات کے تئیں سچے ثابت ہوں —— نیویارک ٹائمز میگزین کے ۱۰ دسمبر ۱۹۶۱ء کے شمارے سے اقتباس۔

کیا ہمارے جیسی کوئی خوش حال اور فارغ البال قوم کسی عالمگیر اور پُرامن انقلاب کی تحریک میں ایک رہنما اور ایک ساتھی کی حیثیت سے شامل ہو سکتی ہے؟ یا پھر ہماری قسمت میں یہ ہے کہ ہم اپنے خدشات اور اپنی ہچکچاہٹوں کی بدولت عضوِ معطل ہو کر رہ جائیں۔ یا پھر کسی کونے میں بیٹھے ایک تماشائی کی حیثیت سے یہ سب کچھ دیکھتے رہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں جو امریکہ کی خارجہ پالیسی کو پیش آنے والے چیلنج کے اندر پوشیدہ ہیں۔ مجھے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں جہاں کہیں سفر کا اتفاق ہوا ہے، ہر جگہ مجھے اس دشوار مسئلہ کی تہہ میں ایک ہی بات نظر آئی اور وہ یہ کہ کیا ہم دنیا کے واقعات کو سمجھ سکتے ہیں، کیا ہم ان میں کوئی تبدیلی لا سکتے ہیں، اور کیا ہم موثر طریقے پر کوئی قدم اُٹھا سکتے ہیں۔؟

پچھلے چار مہینوں میں بیرونی ممالک میں ہمارے سفارت خانوں کی دوبارہ تنظیم اور دسلایا میں کولمبو پلان کے سالانہ اجلاس میں اپنی حاضری کی بدولت مجھے یورپ کو چھوڑ کر باقی ہر براعظم میں گھومنے کا موقع ملا۔ اور ہر جگہ یہی سوالات بار بار میرے ذہن میں اُبھر کر آتے رہے۔ نئے افریقی ممالک میں ہمارے سفیروں کو پیش آنے والے مسائل میں، لاطینی امریکہ میں ہماری اقتصادی امداد کے منتظمین کو پیش

آنے والی دشواریوں میں، اور جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کی حکومتوں میں موجود ہمارے نکتہ چینیوں اور بہی خواہوں کے شکوک و شبہات اور توقعات میں مجھ کو یہی مسائل کارفرما نظر آئے۔

اس بات سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ آج ہم ایک انقلابی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ کیا کوئی ایسی خوش حال اور مادی وسائل سے مالا مال قوم ہے جس نے اپنا کوٹ اُتار کر ایک طرف رکھ دیا ہو اور آستین چڑھا کر کسی ایسے انقلاب میں ایک مدد و معاون کی حیثیت سے شامل ہو گئی ہو؟ جہاں تک میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، مجھے ایسی کوئی مثال نظر نہیں آئی۔

پھر کیا امریکہ تاریخ میں اس قسم کی پہلی مثال ثابت ہو سکتا ہے؟ یہ بات قطعاً درست ہے کہ اس سوال کا جواب نہ صرف ہمارے اپنے مستقبل بلکہ آنے والی نسلوں کی تہذیبی نہج کا بھی یقین کرے گا۔

افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے کروڑہا باشندے پُرانے نظام کے خلاف جد و جہد میں مصروف ہیں۔ یعنی جاگیردار اور مزارعہ کے قدیم اقتصادی نظام کے خلاف، مالک اور ملازم کے قدیم سماجی نظام کے خلاف اور حاکم و محکوم کے سیاسی نظام کے خلاف۔

ان ترقی پذیر براعظموں میں سے ہر ایک میں سب سے زیادہ خطرناک خلا جو ابھی تک بدستور چلا آ رہا ہے وہ انتہائی امیر اور انتہائی غریب کا درمیانی خلا ہے۔ اس کے پس منظر میں ہم امریکی باشندے ہیں، جو دنیا میں امارت اور تمول کی سب سے زیادہ درخشاں اور قابل دید مثال پیش کرتے ہیں — اور ہمارے کام میں ایک اور بڑی دشواری یہ آ جاتی ہے کہ ہم بیشتر ایک سفید قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس کی دو تہائی آبادی رنگ دار ہے۔

اس طرح یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کوئی قوم ایک عالمگیر انقلاب کے اندر کس طرح دنیا کا ساتھ دے سکتی ہے؟ جس شخص کے گیراج میں دو موٹر کاریں کھڑی ہوں وہ کسی ایسے آدمی سے کس طرح بات کر سکتا ہے جو اپنی پہلی بائیسکل کے خواب دیکھ رہا ہو؟ ایک خاتون جو بڑی حرارت کے بارے میں سوچنے کی عادی ہو، وہ کسی ایسی عورت سے کیا بات چیت کرے گی جس کے بچے بھوکے بیٹھے ہوں؟

باوجود اس کے کہ ہماری کامیابی کے راستے میں بڑی رُکاوٹیں حائل ہیں ہمیں اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں چند آسانیاں بھی حاصل ہیں۔ ان میں سے پہلی خود ہماری امریکی انقلاب کی تاریخ ہے۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہم یہ جذبہ لے کر پیدا ہوئے تھے کہ ہم سب سے پہلے قومی آزادی حاصل کریں گے اور اس کے بعد اپنے ملک کے تمام باشندوں کے لئے زیادہ سے زیادہ انصاف اور اقتصادی اور سماجی مواقع کے حصول کے لئے ہر ضروری کارروائی کریں گے۔

ہماری انقلابی جدوجہد ہمارے اپنے براعظم تک بھی محدود نہیں رہی، ہمارے بانیوں نے شروع ہی سے نہایت وسیع النظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ جیفرسن نے علی الاعلان کہا تھا "امریکی انقلاب کل بنی نوع انسان کے انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے" انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "بنی نوع انسانی چند صاحب حیثیت انسانوں کے لئے اپنی پیٹھ پر زینیں کسے، پیدا نہیں ہوئی تھی کہ چند آراستہ اور پیراستہ لوگ جب چاہیں خدا کے حکم سے اس کی پیٹھ پر سوار ہو جائیں"

جیفرسن کے جمہوری انقلاب کا وہ تصور جس کے فوائد سے کل بنی نوع انسان کو مستفید ہونا تھا" ہماری آج تک کی تاریخ میں ہمارے پیش نظر رہا ہے۔ ایک کے بعد ایک صدر اپنے انقلاب انگیز اقوال اور افعال کے ذریعہ انسان کے جوہر باطن کو جلا بخشتے رہے ہیں۔

لنکن نے ایک بار کہا تھا" انقلاب کا حق ایک مقدس ترین — ایک ایسا حق ہے جس کی مدد سے ہم دنیا کو آزاد کرا سکتے ہیں"۔ ۱۹۱۷ء میں ولسن کے ۱۴ نکات، جس کے ذریعہ انھوں نے ہر جگہ کے عوام کے لئے حقوق خود ارادی کی حمایت کی تھی، ایک ایسا نظریہ تھا جو امریکہ کی تاریخ میں رچا بسا تھا۔

اسی طرح فرینکلن ڈی۔ روز ویلٹ کی چار آزادیاں تھیں — یعنی اظہار رائے، اور بول چال کی آزادی، اپنے مخصوص انداز میں خدا کی عبادت کرنے کی آزادی، افلاس سے آزادی، اور خوف سے آزادی۔ اور ان میں سے ہر آزادی ہر جگہ کے عوام کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔

لہذا ہمارے اخلاقی اور تصوراتی وسائل میں سے پہلا وسیلہ خود ہماری انقلابی تاریخ کی تصویت ہے۔ اور دوسرا وسیلہ اس تاریخ کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی عناصر ہیں۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہم نے انقلاب کے متعلق محض باتیں ہی باتیں نہیں کی ہیں۔ بلکہ انقلاب کو قانون کے ذریعہ نافذ کیا ہے۔ دور حاضرہ کے بہت سے اقتصادی اور سماجی قوانین اور پروگرام جن کو ہم امریکیوں نے بلا حیل وحجت کے تسلیم کر لیا ہے۔ وہ نظری حیثیت سے انتہا پسندانہ اور نتائج کے اعتبار سے انقلابی ہیں۔

مثال کے طور پر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیشتر رہنما ہنوز اس فکر میں مبتلا ہیں کہ شرح آمدنی کے اعتبار سے انکم ٹیکس نافذ کیا جائے، جس کو امریکہ والوں نے آج سے پچاس سال قبل قبول کر لیا تھا۔ اور اس کو ایک انتہائی اہم اقدام قرار دیا تھا۔ پھر بھی امریکہ کے بیشتر باشندے، بلا امتیاز پارٹی ایک عرصہ سے ان قوانین کو قبول کرتے چلے آرہے ہیں جن کی بدولت نہ صرف یہ کہ محاصل میں ہی اضافہ ہوا ہے بلکہ دولت کی دوبارہ تقسیم کی بدولت امیر اور غریب کا درمیانی فرق بھی کافی حد تک کم ہوتا جارہا ہے۔

اسی طرح بعض دیگر تصورات مثلاً سماجی تحفظ، سرکاری مکانات، عام ضروریات کی چیزیں

اور رسل و رسائل کا انتظام، مزدوروں اور منتظمین کے درمیان اجتماعی لین دین اور کارپوریشن کے بھاری محصولات، جو آج ہماری اقتصادیات کا ایک جزو بن چکے ہیں، وہ بیشتر دنیا کے ذہن میں "انتہا پسندی" کے لفظ کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں آج جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں ان کا مقصد عوام کا معیار زندگی کو اونچا اٹھانا، قومی آمدنی کی تقسیم، مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے کم سے کم تحفظ کی فراہمی ہے۔ یہ وہ نصب العین ہیں جو ہم نے اپنے لئے متعین کئے ہیں اور جن کے حصول کے لئے ہم ہمیشہ کوشاں ہیں گے،

ایک اور بنیادی بات جو ہمیں آج دنیا میں رونما ہونے والے انقلاب کے ساتھ وابستہ کرتی ہے وہ ہمارے اس گہرے یقین کی پیداوار ہے کہ ہر دیہاتی کنبے کو اس بات کا موقع ملنا چاہیئے کہ وہ خود اپنی زمین رکھتا ہو۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان تینوں براعظموں پر انقلاب کے سلسلہ میں اس سے زیادہ بنیادی اور کوئی بات نہیں ہے کہ وہ لوگ جو خود زمینوں کے مالک نہیں ہیں یا جو دوسروں کی زمین پر کاشتکاری کرتے ہیں، وہ خود زمین کے مالک بننا چاہتے ہیں۔

اپنے نوآبادیاتی دور کے اوائل میں بھی، جب کہ ہم اپنی زمینوں پر کاشت کرتے تھے اور ساتھ ہی فوجی خدمات بھی انجام دیتے تھے، ہم نے نہایت دوررس قوانین بنا کر زمیندارانہ نظام کی ہر شکل کی مخالفت کی تھی ــــ ایک سو سال قبل ہم نے اپنے نظریات کو ہومسٹیڈ ایکٹ کی صورت میں پیش کیا تھا جس کی رو سے ہر اس کنبہ کو جو کاشت کرنے کی خواہش اور صلاحیت رکھتا تھا ۱۶۰ ایکڑ زمین دی گئی تھی۔ اور اس کے بعد کے چند سالوں میں ہم نے دیہی قرضوں، امداد باہمی اور زرعی ترقی کے لئے بہت سی ایجنسیوں کو وجود میں لا کر اپنے زمین کی نجی ملکیت کے تصور کو اور تقویت پہنچائی۔

امریکہ کے یہ تین بڑے وسائل ــــ یعنی نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہمارے انقلاب کی تاریخ، اقتصادی اور سماجی اصلاحات کے سلسلہ میں ہماری یہ یقین دہانیاں اور زمین کی نجی ملکیت کے تصور کی حمایت ــــ ہمارا وہ عظیم سرمایہ ہے جو اس آزمائش سے گزرنے کے سلسلہ میں ہماری مدد کرے گا جو آج کی انقلابی دنیا نے ہمارے اوپر مسلط کر دی ہے۔

اس کے باوجود ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بہت سے باشندے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی روایات سے رابطہ کھو بیٹھے ہیں۔ اس طرح ہمارے لئے یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ ہم آج کی انقلابی دنیا کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے قومی مقاصد پر دوبارہ غور و فکر اور ان کی دوبارہ تشریح کریں۔ یعنی یہ کہ ہم دنیا کے ساتھ اپنے تعلقات کے سلسلہ میں کیا بات چاہتے ہیں؟ ہم کو اپنے مقاصد کے حصول کے سلسلہ میں کیا ضروری اقدامات کرنے چاہئیں؟ ہم کو دوسرے لوگوں کی حمایت اور تعاون حاصل کرنے کے سلسلہ میں کن چیزوں کی تلاش ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جو شہریوں اور رائے دہندگان کی حیثیت سے ہمیں مسلسل کرتے رہنے چاہیئں۔ یہ وہ سوالات ہیں جن پر ہمارے پالیسی ساز حضرات اور سفارت خانوں کے افسران پچھلے چند ماہ میں کافی غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام سوالات ہماری سمندر پار کی جملہ سرگرمیوں کی اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر کیا ہمارا قومی مقصد صرف یہی ہے کہ ہم کمیونسٹوں کی مخالفت کرتے رہیں؟ کمیونزم آزاد اداروں کے لئے ہر مقام پر ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے اور کمیونزم کے خلاف جنگ، استبداد کی جملہ صورتوں کے خلاف ہماری جدوجہد کا ایک جزو ہے۔

پھر بھی تنہا کمیونزم کی مخالفت کو جیفرسن اور لنکن کی قوم کا واحد مقصد نہیں سمجھا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم اپنے انفعال کو کسی قوم کو لاحق ہونے والے کمیونسٹ خطرے کی موجودگی کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں، تو ہم اس قوم کے کمیونزم کو ایک قدرتی وسیلے مثلاً یورانیم یا پٹرولیم کی صورت میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں جنھیں امریکہ میں ڈالروں سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

یا پھر ہمارا مقصد، جیسا کہ اکثر ہمیں بتلایا جاتا ہے "لوگوں کے دل و دماغ کو تسخیر کرنا ہے" تجزیہ کی رو سے یہ مقصد بھی عملی حقیقت اور ہمارے جمہوری عقائد دونوں میں سے کسی ایک کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے۔ کیا وہ انسان کے دل و دماغ کی آزادی نہیں تھی جس کے لئے جیفرسن نے کام کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا اور کیا یہ مقصد ہماری آج تک کی تاریخ میں جاری و ساری نظر آتا ہے؟

پھر کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ ہمارا مقصد سرکاری ملکیت کے مقابلہ میں نجی ملکیت کی فوقیت کو جتانا ہے۔ لیکن یہ مقصد بھی انتہائی محدود ہے۔ سرمایہ داری نے خود ہمارے ملک میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور وہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی بڑی بڑی خدمات انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کی عالمگیر قبولیت بھی امریکہ کا اصل قومی نصب العین نہیں ہے۔ سرمایہ داری کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، خود کوئی مقصد نہیں ہے۔

ہمارا قومی مقصد، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ان سے کہیں زیادہ عام فہم، کہیں زیادہ عالمگیر اور کہیں زیادہ اہم ہے۔ یعنی دنیا کی غیر کمیونسٹ اقوام کے ساتھ مل کر ایک ایسے نظام کو وجود میں لانے کی سعی کرنا، جہاں انسان کو انتخاب کی آزادی نصیب ہو، جہاں عوام وسعت پذیر اقتصادی مواقع اور انتہا درجہ کی سماجی دیانتداری کے ماحول میں اپنی زندگی بسر کر سکیں اور جہاں اقوامِ عالم اپنی تہذیب، تمدن اور اپنی روایات کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے انتخاب کا فیصلہ کر سکتی ہیں۔

اپنے قومی سرمایوں کی حقیقت کو سمجھنا اور اپنے اغراض و مقاصد کی تشریح کرنا ایک بات ہے، لیکن اپنی نئی بیداری کو باقاعدہ پروگراموں اور پالیسیوں کی مدد سے بروئے کار لانا اس سے بالکل

مختلف ہے۔

اپنے قومی مقاصد کو اس انقلابی دُنیا کے لئے بعض تعمیری پروگراموں میں تبدیل کرنے کے
طور طریقوں کی تلاش کے دوران جو جوابات ہمارے سامنے آئے ہیں ان کا مطالعہ ہمارے لئے مفید
ثابت ہو سکتا ہے۔

اول، یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب تک دنیا میں جارحانہ قوتوں کا وجود باقی ہے ہمیں اپنی
فوجی قوت کو تمام کاموں سے زیادہ مقدم سمجھنا اور برقرار رکھنا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارا
دفاعی انداز ایسا ہونا چاہیے جس سے عمل استقلال ظاہر ہوتا ہو، نہ یہ کہ اس سے اشتعال پیدا ہوتا ہو۔

دوسرے، یہ بات بھی اس درجہ صاف اور واضح ہے کہ ہم کو ایٹمی ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی دوڑ
کے عظیم خطرات کو کبھی نہ بھولنا چاہیے۔ اس کے برعکس تخفیف اسلحہ کے موثر اور محفوظ منصوبوں کی جستجو میں ہمیں
صبر و استقلال کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔

تیسرے ہمیں اپنے غرور اور اپنے احساسِ آزادگی کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے اور اس خیال
کو اپنے دل سے نکال دینا چاہیے کہ جو لوگ ہمارے ساتھ نہیں ہیں وہ لازمی طور پر ہمارے مخالف ہیں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ "یورپ کے دائمی جھگڑوں" سے بے تعلقی جارج واشنگٹن کے زمانہ
سے لے کر وڈرو ولسن تک امریکی خارجہ پالیسی کی بنیاد بنی رہی تھی۔ اور یہ کہ دنیا کی وہ نوزائیدہ قومیں،
جنھوں نے حال ہی میں یورپ کی سامراجی طاقتوں کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا ہے، وہ آج اپنے
اہم ترین مسائل میں اسی طرح کھوئی ہوئی ہیں جس طرح ہم خود اپنے ملک کی ترقی کی اس منزل میں مصروف تھے۔
اور یہ کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ اقوام کمیونسٹ چیلنج کی اصل اہمیت کو سمجھنے سے بدستور قاصر رہیں
گی جس کے بارے میں ہمیں خاص تشویش ہے۔

اپنے قومی مقصد کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں چوتھا اور نہایت اہم عنصر سمندر پار کی دنیا کی اقتصادی
اور ٹیکنیکل امداد کا پروگرام ہے۔

ہماری سمندر پار کی سرگرمیوں میں ایک پانچواں اور آخری عنصر ہمارے اطلاعاتی پروگرام ہیں ان
پروگراموں کو ہماری اصلیت کے آئینہ دار ہونا چاہیے، مثلاً یہ کہ ہم ایک خوش نصیب قوم سے ضرور تعلق
رکھتے ہیں لیکن آسودہ حال نہیں ہیں۔ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو ہنوز تعلیم، مکانات، نسل اور
رنگ کے غیر حل شدہ مسائل کے ساتھ جد و جہد میں مصروف ہے، ایک ایسی قوم سے جو ہنوز ایک زیادہ
انصاف پسند اور جمہوری معاشرے کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ ہمیں اس چیز کو برملا بیان کرنا چاہیے
جس کے حصول کی ہم کوشش کر رہے ہیں۔ اور جس کی ہم بیرون ملک کے لوگوں کے ساتھ مل کر تکمیل کی
کوشش کر رہے تھے۔

ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں انسانی آزادی کے حصول کی موجودہ کوششیں اپنی جملہ سختیوں اور پیچیدگیوں کے باوجود بنیادی طور پر ان عالمگیر مقاصد کے حصول کی جد و جہد کا ہی ایک سلسلہ ہے جس کو ہمارے آبا و اجداد نے "فرمانِ آزادی" میں بدیہی قرار دیا تھا۔

اگر امریکہ کے باشندوں کی موجودہ نسل اس چیلنج کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتی ہے تو کسی شخص کے لئے اپنے دل میں اس خوف کو جگہ دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ نئی قومیں کمیونزم کے جوابی انقلاب کے کھوکھلے پن، اس کی تلخی اور جھوٹی قدروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گی۔

۱۴۔ دورِ حاضرہ میں سفارتی معاملات کی نوعیت

غیر ملکی امداد، بقائے امن کے دستے، بقائے امن کے لئے خوراک اور دیگر غیر ملکی ترقیاتی پروگراموں نے بیسویں صدی کے وسط میں فنِ سفارت کی وسعت پذیر پہنائیوں کو ڈرامائی شکل دے دی ہے۔ ۱۹۶۲ء کے اوائل میں "فارن افیرز" میں شائع شدہ ایک مضمون میں مسٹر باؤلز نے بتلایا ہے کہ امریکہ کی نئی حکومت نے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے غیر ملکی سفارت خانوں کی تنظیم کس طرح کی ہے۔

پچھلی جنگ سے قبل امریکہ کی خارجہ پالیسی کے مقاصد نسبتاً واضح تھے۔ وزیر خارجہ کارڈل ہل کا واشنگٹن کا کل عملہ ایک ہزار سے کم تھا اور وہ ایک ایسی عمارت میں بیٹھ کر، جس میں جنگ اور بحریہ کے دفاتر بھی موجود تھے، دنیا بھر میں امریکی سفارت خانوں کی صدارت کیا کرتے تھے۔

دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ۷۰ امریکی سفیروں اور وزیروں کا کام بیشتر اس ملک کے حالات کا تجزیہ اور ان کی اطلاع رسانی اور گفت و شنید یا تقریبات میں صدرِ امریکہ کی ترجمانی پر مشتمل تھا۔

لیکن ۲۰ سال کے پرآشوب وقفے نے فنِ سفارت کی اس روایتی حیثیت کو ڈرامائی انداز میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں ہماری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے، ہماری سفارتی سرگرمیاں پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہیں اور اسی مناسبت سے اس کے آلاتِ کار میں اضافہ ہو گیا ہے۔

سفیر پر یہ تبدیلی اس طرح سے اثر انداز ہوئی ہے کہ اب اس کا کام محتاط رہنے اور مشاہدہ کرنے کی بجائے عملی کاموں میں حصہ لینا ہو گیا ہے۔ بجٹ اور ایڈمنسٹریشن کے سلسلہ میں اس تبدیلی کا یہ نتیجہ ہے کہ

آج دفترِ خارجہ میں ۳۸ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس میں فارن سروس اور ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈیولپمینٹ کا عملہ بھی شامل ہے جس کی تعداد سترہ ہزار ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سے ادارے اور ایجنسیاں بھی جو اس نئے دور میں امریکہ کی طرف سے کام کر رہی ہیں، ان میں ایک پیس کارپس، ایک فوڈ فار پیس پروگرام، ایک یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن ایجنسی، ایک سینٹرل انٹیلی جینس ایجنسی، مختلف قسم کے فوجی پروگرام اور ہمارے لیبر، کامرس، اگریکلچر اور مالیات کے محکموں کے بہت سے غیر ملکی پروگرام شامل ہیں۔

علاوہ ازیں آج تقریباً ایک سو سے زیادہ ممالک میں ہمارے سفارتی دفاتر موجود ہیں ۔ ۱۶۶ قونصل اور قونصل جنرل کے دفاتر ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں سے بہت سے دفاتر میں صدرِ دفتر ایک جماعت کی صدارت کرتا ہے جس کی حیثیت ایک کابینہ کے برابر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے قریب پیرس میں ہمارے سفارت خانے کے پاس ۸۰ آدمی ملازم تھے جن میں چار دوسری ایجنسیوں کا عملہ بھی شامل تھا۔ آج اس کے اندر ۷۰۰ آدمی ملازم ہیں جن میں ۲۳ دوسری ایجنسیوں کا عملہ شامل ہے۔

ہمارے سفارت خانوں کی سرگرمیوں اور ایجنسیوں میں یہ غیر معمولی اضافہ دورِ حاضرہ کی پیچیدگی اور ایک دوسرے پر انحصار کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ صورت حال اس وقت بھی پیش آ سکتی تھی جب کہ روس کا کوئی ایسا چیلنج موجود نہ ہوتا۔ اس کے باوجود ہمارے دو معاشروں کے درمیان بڑھتے ہوئے مقابلے یعنی انسانی ترقی کے حصول کے لئے روس اور آزاد جمہوری دنیا کے دو مختلف راستوں نے اس عمل کی رفتار میں زبردست اضافہ کر دیا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اس مقابلہ کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔

شروع شروع میں ہماری حکومت کی منتظمہ اور مقننہ دونوں شاخوں نے دورِ حاضرہ کے اس چیلنج کو صرف ہماری پالیسی سازی کے لئے ایک چیلنج سمجھا تھا، جو کسی حد تک درست بھی تھا لیکن ایک کامیاب خارجہ پالیسی کا وضع کر لینا اس سلسلہ کا محض پہلا قدم ہے لہذا ہمیں اس پر عمل درآمد کے کامیاب طور طریقے بھی وضع کرنے ہوں گے۔ ہماری پالیسی نیز ملک اور بیرون ملک میں ہماری سرگرمیوں کی تنظیم اور تکمیل کو پیش آنے والے اس چیلنج کا ابھی حال ہی میں احساس ہوا ہے اور اس کے بارے میں ضروری اقدامات کئے گئے ہیں۔

چیلنج اور وسعت پذیری کے اسی پس منظر میں نئی حکومت نے اپنے سمندر پار کی سرگرمیوں کی کارکردگی میں اضافہ کرنے کے لئے ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ اس کوشش نے تین عملی صورتیں اختیار کی ہیں۔

۱ ۔ ان ذاتی خصوصیات کا تنقیدی جائزہ جن کا آج کے سفیروں میں ہونا ضروری ہے۔

۲ ۔ جن ممالک میں ان سفیروں کو متعین کیا جاتا ہے ان ممالک میں ان سفیروں کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کی عمدرامرکیطرف سے وضاحت۔

۳ ۔ جہاں جہاں ہمارے سفارتی اور قونصلی دفاتر قائم ہیں وہاں ہماری دور دور تک پھیلی ہوئی سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک پروگرام۔

فن سفارت کی بدلی ہوئی ضروریات نے ہمارے سفیروں کی خصوصیات کو بھی سرے سے بدل کر رکھ دیا ہے۔ شخصی جاذبیت، ایک خوبصورت بیوی، سیاسی بصیرت اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت اگرچہ آج بھی انتہائی ضروری ہیں لیکن اب یہ سب چیزیں کافی نہیں رہی ہیں۔

دور حاضرہ کے سفیر کو ایک اچھا منتظم بھی ہونا چاہیئے جو بہ یک وقت مختلف قسم کے کاموں اور سرگرمیوں کی دیکھ بھال رکھ سکے۔ اس کو ایک تخلیقی رہنما ہونا چاہیئے جس کے اندر اختراع کی صلاحیتیں موجود ہوں جو اپنے زیریں عملہ کی حوصلہ افزائی کر سکے اور جو باریک بینی سے کام لے سکے اور اپنے اختیارات کو کام میں لا سکے۔ اس کو ایک موقع شناس اور خاطر نشین سفیر ہونا چاہیئے جو اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ سختی اور تحمل مزاجی کو کس طرح یک جا کیا جا سکتا ہے۔

انھیں حالات کے پیش نظر حکومت اس نتیجہ پر پہنچی کہ ہمارا وہ پرانا طریقہ، جس کی رو سے بیشتر سفارتی عہدوں پر ایسے دولت مند لوگوں کو فائز کر دیا جاتا تھا جنھوں نے انتخابی مہم میں کافی رقمیں خرچ کی ہوں، آج کے زمانے میں مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۱ء میں امور خارجہ کا تجربہ رکھنے والے جن سفیروں کا تقرر ہوا ہے ان کا فی صد تناسب تاریخ میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دفتر خارجہ میں کام کرنے والے ایسے ہونہار نوجوانوں کو بڑی بڑی ترقیاں دینے کے سلسلے میں خاص اقدامات کئے گئے تھے، جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ نئی آزاد شدہ قوموں کے مخصوص مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں لچک اور تدبر سے کام لیں گے۔ ایسے تقریباً ۲۰ سفیر جن کو سفارتی معاملات کا کوئی تجربہ نہیں تھا، وہ تقریباً سب کے سب خارجہ پالیسی سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر مختلف یونی ورسٹیوں کے مختلف شعبوں اور اداروں سے لئے گئے تھے اور یہ تمام سفیر بہ استثنائے چند، آج ان ممالک کے سیاسی مسائل سے پوری طرح باخبر ہیں جن میں انھیں تعینات کیا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی تھی کہ ہر سفیر کو اسی ملک میں بھیجا جائے جس میں کام کرنے کے لئے وہ خود کو موزوں اور مناسب سمجھتا ہے۔ وہ پرانا طریقہ جس کی رو سے دفتر خارجہ کے افسران کو ان کے کردار کو "استحکام بخشنے" کے خیال سے خاص طور پر ان مقامات پر بھیجا جاتا تھا جہاں پر وہ نہیں جانا چاہتے تھے، اب ترک کر دیا گیا تھا سفیر اور اس کے اہم ترین معاونین کے تقرر مدت بڑھا کر

چار سال کر دی گئی ۔ سفیر اور اس کی بیوی دونوں کو ملا کر ایک ٹیم کی حیثیت دے دی گئی ۔ اور سفیر کو اپنے معاونین اور نائبین کے انتخاب کے سلسلہ میں پہلے سے زیادہ اختیارات دے دیئے گئے ؟

بہتر تربیت یافتہ عملہ کا انتخاب اس سلسلہ کا پہلا ضروری اقدام تھا اور دوسرا اقدام سفیر کے اختیارات کی وضاحت ۔

چنانچہ ۲۹ مئی ۱۹۶۱ء کو صدر کنیڈی نے تمام امریکی سفیروں کو ایک مراسلہ روانہ کیا تھا جس میں انھوں نے سفیر کے کردار کی اس طرح وضاحت کی تھی کہ وہ صدر امریکہ کا ذاتی نمائندہ ہے۔ جسے اس ملک میں جہاں اس کا تقرر کیا گیا ہے ، امریکی حکومت کی تمام سرگرمیوں اور عملہ پر کلی اختیارات حاصل ہوں گے ۔ صدر نے لکھا " میں امریکی حکومت کی تمام سرگرمیوں میں ہم آہنگی اور ان پر نگرانی رکھنے کے سلسلہ میں آپ کے اوپر انحصار کرتا ہوں .. آپ پورے امریکی سفارت خانے کے انچارج ہیں اور میں آپ سے توقع کرتا ہوں کہ آپ اس کے تمام کاموں اور سرگرمیوں کی نگرانی کریں گے ۔" صدر کے اس مراسلے میں قوت اور اختیارات کے متضاد مسائل کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیا گیا تھا ۔ اب سفیر کو صاف لفظوں میں کلی اختیارات سونپ دیئے گئے تھے اور اسے صدر کا اعلیٰ ترین نمائندہ قرار دیا گیا تھا ۔

امریکی سفارت خانوں کے طریقہ کار کی اصلاح اور اس کی اثر آفرینی میں اضافہ کرنے کی طرف دوسرا قدم چھ علاقائی کانفرنسوں کا ایک سلسلہ تھا جس میں نہ صرف یہ کہ سفیروں کو ہی مدعو کیا گیا تھا بلکہ ان کی بیویوں ، ان کے انتظامی عملے کے افسران اور امداد ، اطلاعات اور فوجی معاملات کے متعلق ان کے اعلیٰ مشیروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا ۔

باوجود اس کے کہ سفیروں کے اختیارات کی ایک خاص انداز میں وضاحت کر دی گئی تھی بہت سے لوگوں کو ابھی تک اس بات میں شبہ تھا کہ ان وضاحتوں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ واقعی طور پر درست ہے ۔ اس کے علاوہ بہت سے انتظامی معاملات تھے جن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی ، اور واشنگٹن و میدان کار کے درمیان سلسلۂ مواصلات نے ایسے بہت سے عملی مسائل پیدا کر دیئے تھے جن کا اس وقت کوئی حل موجود نہ تھا ۔ نہ ہی پینٹگن ، نے ایڈمنسٹریشن ، یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن ایجنسی ، پیس کارپس ، خزانے کا محکمہ ، سینٹرل انٹلیجنس ایجنسی ، بیورو آف دی بجٹ اور چند دوسرے محکموں مثلاً کامرس اور لیبر کے نمائندوں کو اس بات کا موقع ملا تھا کہ وہ سفیروں اور ان کے عملہ کے افسران کے ساتھ اپنے کاموں ، ذمہ داری اور تعاون کے مسئلہ پر کچھ غور و فکر کرتے ۔ ان کانفرنسوں نے ان کو یہ موقع فراہم کر دیا ، بعض صورتوں میں بعض ایسے مسائل کو جنھیں پہلے دبا کر رکھ دیا جاتا تھا ، فوری طور پر فیصل کر دیا گیا ۔

ان علاقائی کانفرنسوں کی اور بہت سی اختراعات میں سے ایک اختراع سفیروں کی بیویوں

کا ان کانفرنسوں میں شرکت کرنا تھا۔ جیسا کہ دفتر خارجہ کا ہر افسر جانتا ہے، کہ سفیر کی بیوی جو مقامی مسائل کا پورا پورا احساس رکھتی ہے، جو قومی مقاصد سے اچھی طرح باخبر ہے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی خواہش مند ہے، وہ سفارت خانے میں ایک بیش بہا اضافہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح جو بیوی ان خوبیوں سے محروم ہے وہ انتہائی زحمت کا باعث بنے گی۔ سفیر کی بیوی ہی ایک ایسی شخصیت ہے جو جوڈنر پارٹیوں اور سرکاری تقریبات میں حکومت کے اعلیٰ ترین افسران کے برابر بیٹھتی ہے۔

ان کی معلومات اور سوجھ بوجھ میں اضافہ کرنے کی غرض سے سفیروں کی بیویوں کو بعض مخصوص اجلاسوں کے علاوہ ہر کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا۔

ان کانفرنسوں میں صرف دفتر خارجہ کی انتظامی اصلاحات کے سلسلہ میں تقریباً ۲۰۰ تجاویز مرتب کی گئی تھیں، جن میں سے نصف پر عمل درآمد بھی ہو چکا ہے۔ ان تجاویز میں سرکاری مقاصد کے لئے موٹر کاروں کی خرید کے نسبتاً معمولی مسائل سے لے کر کلرکوں اور افسران اعلیٰ کی لسانی تربیت کے پیچیدہ تر مسائل شامل تھے، اس کے علاوہ سرکاری کاموں میں تساہل دور کرنے نیز واشنگٹن اور غیر ملکی سفارت خانوں کے درمیان سلسلۂ مواصلات میں تیز رفتاری پیدا کرنے کے اور بین الاقوامی ایجنسیوں کے ساتھ اور زیادہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بھی بہت سی تعمیری تجاویز پیش کی گئی تھیں

یہ کہنا درست ہوگا کہ ابھی ہم نے اُن آلاتِ کار کی ہم آہنگی اور ان کی استعداد بڑھانے کی طرف پہلا قدم ہی اُٹھایا ہے۔ جس کے ذریعہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کو آج کے سفارتی دور میں موثر بنایا جا سکتا ہے۔ امریکی عوام اور بعض افسران کو یہ بات ذہن نشین کرانے کے لئے ابھی اور زیادہ تعلیم کی ضرورت ہوگی، کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں خواہ وہ سیاحت سے متعلق ہوں یا لیبر، شہری حقوق، زرعی ذاصلات، تجارت اور سائنس سے، آج ان میں سے ہر چیز کسی نہ کسی درجہ پر ہماری خارجہ پالیسی پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ خارجہ پالیسی کے ان متعدد پہلوؤں کے باہمی ربط و تعلق کے ایک بار سمجھ میں آجانے کے بعد مسئلہ کی نوعیت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ ان پر زیادہ خوبی اور اثر آفرینی کے ساتھ کس طرح عمل درآمد کیا جائے۔

اس معاملہ میں ہماری خوش قسمتی ہے کہ صدر کا موجودہ کابینہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو ایک عالمگیر نقطۂ نظر رکھتے ہیں، جو امور خارجہ اور ایک جامعہ خارجہ پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے سلسلہ میں اپنے محکمہ کے رول کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی ضروری بات ہے کیونکہ ہم نے سفیر کی رہنمائی میں اپنی تمام غیر ملکی سرگرمیوں کو ہم آہنگ کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے، اُس کی بنسبت بنا ہی واشنگٹن میں خارجہ پالیسی کے بہتر کنٹرول اور ہم آہنگی سے ہونی چاہیئے۔

اس قسم کی ہم آہنگی کی منطقی ذمہ داری علاقائی نائب وزرائے خارجہ پر عائد ہوتی ہے۔ ان

افسران کے اختیارات میں اضافہ کر کے ہم ان کو متعلقہ علاقوں میں اپنی جملہ وسیع و بسیط سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں۔ یہ ان چند ضروری اصلاحات میں سے ہیں جن کو مزاحمت پیش آسکتی ہے۔

لیکن ہمارے سامنے جو کام ہے وہ نئی راہوں، زیادہ پرتخیل طور طریقوں اور زیادہ سرگرم حکومت کا متقاضی ہے بشرطیکہ ہم اپنی خارجہ پالیسی کے اجزاء کو اس کی ضروریات کے مطابق رکھنے کے خواہش مند ہوں۔ اگرچہ اس سلسلہ میں امید افزا آغاز کیا جا چکا ہے، پھر بھی ابھی ہم کو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

حصّہ دوم

اِقتصادی امداد کیسے دی جائے

ہمارے امدادی پروگراموں کا مجموعی مقصد بالکل واضح، ضروری اور انتہائی معقول ہے۔ یعنی یہ کہ آزادی دنیا کی اقوام کی اپنی سیاسی اور اقتصادی قوت کو اس درجہ استحکام بخشنا کہ وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکیں اور امریکہ کے مفاد کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے مفاد کے لئے کام کر سکیں۔

جوں جوں وہ اپنے عوام کی ضروریات کو پورا کرنے میں کامیاب ہوں گی جمہوری طور طریقوں میں ان کا اعتماد بڑھتا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے اپنی تمام کامیابیوں کو اندرونی اور بیرونی جملہ آفات سے محفوظ رکھنے کے عزم کو بھی تقویت نصیب ہو گی۔

دسمبر ۱۹۵۴ء

۱۵- بھوکی دُنیا کے لئے امریکی غلّہ

جنگ کے دوران امریکہ کی حیرت انگیز زرعی پیداوار سے متاثر ہو کر مسٹر باوٗلز نے دُنیا سے بھوک کا خاتمہ کر دینے کے لئے امریکہ کی قیادت میں ایک عالم گیر زرعی انقلاب کی تجویز پیش کی ہے۔ ذیل میں ان کی ایک تقریر پیش کی جاتی ہے جو انھوں نے ۵ ۲ مئی ۱۹۴۷ء کو شکاگو میں سپر مارکیٹ انسٹی ٹیوٹ کے گیارھویں سالانہ جلسہ میں کی تھی۔

مستقبل میں امریکہ کو نہ صرف امریکی عوام بلکہ دنیا بھر کے کروڑہا بھوکے انسانوں کے لئے خوراک کی پیداوار اور تقسیم کے سلسلہ میں عظیم خدمات انجام دینی ہیں۔

۱۹۳۹ء میں دنیا کی تین چوتھائی آبادی خوراک کی پیداوار مختلف اشیائے خوردنی کی تیاری اور اس کی تقسیم کے کام میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود دنیا کی کُل آبادی کے دو تہائی حصے کو جنگ سے قبل کے حالات میں پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی۔

ہم میں سے کوئی شخص بھوکے اور نادار لوگوں کی کسی بستی میں ایک متمول اور دولت مند انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا پسند نہ کرے گا۔ اس کے باوجود آج امریکہ کے باشندوں کو ٹھیک یہی صورت حال درپیش ہے۔ ہماری مثال ایسی ہے جیسے ہم نے دنیا کی گندی بستی میں ایک عالیشان محل تعمیر کر کے اس کا نام "ریاستہائے متحدہ امریکہ" رکھ دیا ہو۔

جب تک اس عالمگیر برادری کے تمام افراد کو ایک بہتر زندگی بسر کرنا نصیب نہیں ہوتا اس وقت تک خود ہمیں اور ہمارے بچوں کو بھی امن و عافیت کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور خوراک اس بہتر زندگی کی بنیاد ہے۔

خوراک کی زیادہ پیداوار کے ذریعہ معیار زندگی کو بلند کرنے کا طریقہ اگرچہ نظری حیثیت سے آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کو عملی جامہ پہنانا انتہائی دشوار ہے۔ ہم ایک عالمگیر پیمانے پر آئندہ نسل کی جو خدمت انجام دے سکتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم نے پچھلے ڈیڑھ سو سال میں امریکہ میں خوراک کی پیداوار کے سلسلہ میں کیا خدمات انجام دی ہیں؟

۱۷۹۵ء امریکہ میں تقریباً ۹۰ فیصدی لوگ اپنے لئے آپ خوراک پیدا کیا کرتے تھے اور وہ اتنی وافر

ہوتی تھی کیراں باقی دس فی صدی کے لئے بھی کافی ہو جاتی تھی جو خود اپنے لئے خوراک نہ پیدا کر سکتے تھے۔

لیکن آج امریکہ میں جدید آلات اور زراعت کے ترقی یافتہ طور طریقوں کی مدد سے یہاں کے تقریباً ۲۰ فیصدی باشندے خوراک کی پیداوار کے کام میں لگے ہوتے ہیں جو نہ صرف اپنے اور ہمارے جیسے ۸۰ فیصدی باشندوں لوگوں کے لئے ہی خوراک پیدا کرتے ہیں، جو بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں رہتے ہیں، بلکہ اس کا ایک معتدبہ حصہ بچ بھی رہتا ہے جو دوسرے ملکوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔

یہ زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہے کہ امریکہ کے لاکھوں باشندے اس کام سے آزاد ہو کر اور تربیت پا کر اعلیٰ پیداواری صنعتوں، اور ہمارے معیار زندگی کو دنیا میں بلند ترین مقام پر پہنچانے کے کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔

اب ہمیں جو کام نہایت محنت اور جانفشانی کے ساتھ انجام دینا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس بات کی کوشش کریں کہ تمام دنیا ہماری جیسی ترقی کرے۔ ہمیں دنیا کی خوراک کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ ہمیں اسے آئندہ ایک نسل میں دوگنا کر دینا چاہیئے اور اس دوران میں ہماری زرعی فاضلات اس کمی کو پورا کرتی رہیں گی۔

اس مقصد میں کامیابی کے لئے ہمیں دنیا بھر کی زراعت میں ایک انقلاب لانا ہوگا۔ ہمیں ٹینیسی ویلی اتھارٹی کے نمونے پر ایشیا، جنوبی امریکہ اور افریقہ کے بڑے بڑے دریاؤں پر دریائی وادیوں کی ترقی کے بڑے بڑے منصوبے بنانے ہوں گے۔

ہمیں جدید زرعی آلات کی پیداواری صلاحیت میں بہت کافی اضافہ کرنا ہوگا۔ ہمیں آبپاشی کے بڑے بڑے پروجیکٹ اور مصنوعی کھاد کے بڑے بڑے نئے کارخانے قائم کرنے ہوں گے۔

اس کے علاوہ ہمیں بہت سے ممالک میں زرعی اصلاحات کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی تاکہ وہ لوگ زمین کے مالک بن سکیں جو اس پر کام کرتے ہیں نہ کہ۔۔۔۔ وہ لوگ جو دور بیٹھے ہی اس زمین کے مالک بنے رہتے ہیں۔

اس مقصد کے لئے نہایت وسیع پیمانے پر تخلیقی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے ہمیں ایک نہایت مستحکم ادارہ اقوام متحدہ کی ضرورت ہوگی۔ اور اس بات کی کہ دنیا کی تمام قومیں —— جن میں خود ہماری قوم بھی شامل ہوگی —— اس بات کے لئے آمادگی ظاہر کریں کہ وہ براہ راست اور انفرادی حیثیت میں کام کرنے کی بجائے اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر کام کریں گی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔

امریکہ والوں کو اقوام متحدہ کی فارم اینڈ ایگریکلچرل آرگنائزیشن، جنرل اسمبلی نیز اکنامک اور سکیورٹی کاؤنسل میں اس سلسلہ میں پہل کرنی چاہیئے۔

اگر دنیا بھر میں زرعی اصلاح کے پروگراموں کو صحیح طریقے پر مرتب کیا گیا اور محنت کے ساتھ عمل میں لایا گیا تو اس سے ہمیں اپنی بہترین صلاحیتوں اور وسائل کے استعمال کے لئے بے انتہا مواقع اور حوصلہ افزائی نصیب ہوگی۔ یہ طریقہ کار انسانی مذاق کے نقطہ نظر سے مناسب ہے اور خود ہماری اقتصادیات اور تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی درست ہے۔

جب تک دنیا میں آشوب کے آثار نمایاں ہیں اور امن کو خطرہ در پیش ہے ہمیں اس بات کا یقین رکھنا چاہیئے کہ ہم کیل کانٹے سے اچھی طرح لیس رہیں۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ راکٹوں، ٹینکوں، اور دور تک اڑان کرنے والے بمبار جہازوں کی مدد سے مستقبل کو فتح نہیں کیا جا سکتا۔

اگر تہذیب کا کوئی مقصد ہے تو ایسے جمہوریت پسند عوام کو اس کی ترقی اور تحفظ کی ذمہ داری لینی چاہیئے، جو ٹھوس نظریات کے مالک ہیں اور ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت اور جرأت بھی رکھتے ہیں۔ کل بنی نوع انسان کے مستقبل کا انحصار ہمارے اس چیلنج کو قبول کر لینے پر ہے جو آج کی بھوکی اور خستہ حال دنیا ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

۱۶۔ نا اُمید بچوّں کے لئے اُمید کی کرن

یونائیٹڈ نیشنز اپیل فار چلڈرن کے صدر کی حیثیت سے جنگ کے مارے ہوئے یورپ کا دورہ کرنے کے بعد مسٹر باؤلز یورپ کی "نئی نسل" کے لئے امداد اور خوراک کی فراہمی کی سفارش کرتے ہیں۔ ذیل کا متن یکم فروری ۱۹۴۸ء کو نیویارک ٹائمز میگزین میں شائع ہونے والے ایک مضمون سے ماخوذ ہے۔

میں حال ہی میں یورپ کے پانچ ہفتے کے دورے سے واپس آیا ہوں۔ مجھے اس دورے پر اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل ٹرگوے لی نے بچوں پر جنگ کے اثرات کا مطالعہ کرنے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلہ میں بعض تجاویز پیش کرنے کی غرض سے بھیجا تھا۔

امریکہ کے بیشتر باشندوں کی طرح مجھے بھی، یورپ کی مابعد جنگ تعمیر و ترقی کے مسائل اور اس بارے میں کافی کچھ معلومات اور واقفیت ہے کہ یورپ کے باشندے کس طرح اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ کہ ان کو باہر سے کیا امداد مل رہی ہے۔؟

لیکن یورپ میں میرے مشاہدے میں بہت سی ایسی چیزیں بھی آئیں جن کے لئے میرا ذہن

پہلے سے تیار نہیں تھا: مثلاً وارسا کی تباہی، لڈائس (L i D i C E) کے لوگوں کی موت پر چیکوسلواکیہ والوں کی ناراضگی، فرانس اور ہنگری کے بچوں میں تپ دق کی وبا کا پھیل جانا، اور انگریزوں کا ضبط اور سکون۔

لیکن مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یورپ کے عوام کی وہ جرأت اور استقلال ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ محنت و مشقت ہے جس میں یورپ کے مرد، عورتیں اور بچے مبتلا ہیں جن میں سے بہت سے اچھی خوراک میسر نہ آنے کے سبب لاغر و کمزور بھی ہو گئے ہیں۔

لیکن اتنا ہی امید افزا، خوشگوار وہ ردعمل ہے جو یونائیٹڈ نیشنز اپیل فار چلڈرن کے سلسلہ میں ان لوگوں کی طرف سے ہوا ہے ـــــــ حتیٰ کہ ان ممالک میں بھی جنھیں بذات خود انتہائی تباہی و بربادی کا شکار ہونا پڑا تھا۔ جہاں تک یورپ کے لوگوں کا تعلق ہے، ان کے لئے اس اپیل کا مفہوم صرف خوراک تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ایک دائمی امن کے قیام کی امید اور ایک بین الاقوامی ادارے میں ایک دوسرے کے ساتھ براہ راست تعاون کرنے کا موقع بھی شامل تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ لوگ اس معاملہ میں اپنی حکومتوں پر سبقت لے گئے ہیں۔

اس مختصر سے سفر کے دوران میرے بعض تاثرات ایسے ہیں جنھیں میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں، میں زیادہ سے زیادہ جو کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ بعض ایسے واقعات آپ کے سامنے بیان کر دوں جو میرے لئے ناقابل فراموش ہیں۔

میں نے پیرس کے قریب ایک صنعتی شہر میں دیکھا کہ بغیر کھڑکی کے ایک کمرے والے مکان میں ایک گیارہ سالہ لڑکی، تین چھوٹے بچوں ـــــ اور اپنے باپ کی دیکھ بھال کا کام سنبھالے ہوئے ہے جس کی ٹانگیں لڑائی میں ضائع ہو چکی تھیں اور جس کو مصنوعی ٹانگوں کی تیاری کے لئے ابھی کئی ہفتے انتظار کرنا تھا۔

لڑکی کی ماں دس ڈالر فی ہفتہ اجرت پر کسی جگہ کام کر کے اپنے کنبے کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کا یہ چھوٹا سا مکان نہایت صاف ستھرا تھا۔ بچے بھی صاف تھے۔ اور ـــــ اور یکجا سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ لڑکی گا رہی تھی۔

وارسا میں ایک تباہ شدہ مکان کے دس فٹ چوڑے اور چودہ فٹ لمبے کمرے میں ایک کنبے کے بچے کھچے افراد زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں ایک سات سالہ لڑکا، اس کی دس سالہ بہن اور ان کی دادی تھیں۔ ان کے ماں باپ، اور ننھا لڑکا اور لڑکی جو اس وقت تقریباً ۱۵ سال کے ہوتے، وارسا کی ۱۹۴۴ء کی یورش میں ہلاک ہو چکے تھے۔

دادی نے ان بچوں کو سڑک پر خستہ حال پھرتے دیکھا تھا اور پکڑ کر اپنے گھر لے آئی تھیں۔ ان کی گزر اوقات کے لئے وہ اپنے ہاتھ سے کوڑا کرکٹ صاف کرکے چند سینٹ کماتی ہے۔ اس کے علاوہ اسے ویلفیر ڈیپارٹمنٹ سے دو ڈالر ماہانہ ملتے ہیں۔ دونوں بچے، باری باری سے اسکول جاتے تھے، کیونکہ ان کے پاس اتنے کپڑے نہیں تھے کہ وہ ایک ساتھ اسکول جا پاتے۔

یہ بھی ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنھیں حکومت کی طرف سے سور کی چربی یا دودھ سے چپڑی ہوئی تھوڑی سی روٹی مل جاتی تھی، جو اقوام متحدہ کے چلڈرنس فنڈ کا عطیہ ہوتی تھی۔

میں نے جن ممالک کا دورہ کیا ہے ان میں اس قسم کے لاکھوں بچے موجود ہیں۔ لیکن مجھے صرف ان کی مصیبت، بھوک اور خستہ حالی ہی یاد نہیں ہے بلکہ وارسا اور بڈاپسٹ کے یتیم خانوں میں لڑکیوں کے سروں میں بندھے ہوئے خوبصورت ربن بھی یاد ہیں، چیکوسلواکیہ اور اٹلی کے کسانوں کے جھونپڑوں کی افسوسناک حالت بھی یاد ہے، پولینڈ کے تباہ شدہ اسکولوں کے ہنستے کھیلتے ننھے ننھے بچے یاد ہیں۔ سوئزرلینڈ کی طرف سے حال ہی میں ملنے والے نئے ہسپتالوں کے نئے ساز و سامان کے لئے فرانس اور ہنگری کے ڈاکٹروں کا اظہار تشکر یاد ہے۔ اور ہر ملک کے استادوں، سماجی کارکنوں، نرسوں اور ڈاکٹروں کا وہ خاموش اور خوشگوار عزم مصمم یاد ہے جب وہ اپنے معمولی وسائل کی مدد سے جنگ کے دور کی ایک نئی نسل کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

آج ایشیا اور یورپ کے بچے ایک ایسی پُرمصائب دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں جو ہماری نسل کی پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ان کو ایک نئی اور اس سے بہتر دنیا کی تعمیر کے مواقع فراہم کریں جسے ان کے والدین کی نسل نے تباہ کیا ہے۔

۱۷۔ "پوائنٹ فور" سے ایشیا میں انقلاب کا آغاز ہوتا ہے۔

۵۲-۱۹۵۱ء میں ہندوستان میں امریکہ کے ٹیکنیکل اور اقتصادی امداد کے پہلے اور عظیم ترین "پوائنٹ فور" پروگرام کا آغاز ہوا۔ یہ پروگرام امریکی سفیر مسٹر باؤلز کے مذاکرات کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔ مسٹر باؤلز ۱۶ نومبر ۱۹۵۲ء کے نیویارک ٹائمز میگزین میں اس پروگرام کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہیں۔

کوئی بھی شخص جو ایشیا میں "پوائنٹ فور" پر عمل درآمد ہوتے دیکھتا ہے وہ جلد ہی ایک

خاص نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ "پوائنٹ فور"، اگرچہ نئی اور اہم چیز ہے، وہ محض ایک پروگرام ہی نہیں ہے، بلکہ ایک انقلابی نظریہ ہے۔

اگر ہم نے اس کو سمجھا اور اس کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی تو "پوائنٹ فور" تاریخ میں دورِ حاضرہ کا اہم ترین نظریہ ثابت ہوگا۔ انقلاب کی ایک ایسی جوابی تحریک ثابت ہوگا جس کے مقابلہ میں کمیونزم کے پیر نہ ٹک سکیں گے۔

آرنلڈ ٹوائنبی نے حال ہی میں کہا تھا کہ ہمارا دور "صرف اپنے خوفناک جرائم یا حیرت انگیز ایجادات کی بدولت یاد نہیں رکھا جائے گا، بلکہ اس لئے یاد رکھا جائے گا کہ تاریخ کی ابتدا سے لے کر آج تک کی مدت میں یہ پہلا دور ہے، جس میں بنی نوع انسان نے اس بات کو ممکن اور نا قابلِ عمل سمجھنے کی جرأت کی ہے کہ تہذیب کی برکتوں کو پوری نوعِ انسانی کے لئے قابلِ حصول بنایا جا سکتا ہے"۔ ایسے بہت سے خوش فکر انسان جنھیں ایشیا میں رہنے اور کام کرنے کا موقع ملا ہے وہ اس بات سے اتفاق کریں گے۔ مدتوں تک غلام رہنے والے کروڑہا انسانوں کے لئے یہ نئی بات کہ بہتر معیارِ زندگی بالآخر کسی نہ کسی طرح حاصل ہو ہی سکتا ہے بڑی انقلابی اہمیت رکھتی ہے۔ انقلاب کا یہی وہ جذبہ اور تحریک ہی ہے جو ایشیا کی شکل تبدیل کر رہی ہے اور جو آنے والے برسوں میں اس کو اور زیادہ تبدیل کر دے گی۔

"پوائنٹ فور" پروگرام ایشیا کی موثر اور ترقی پسند حکومتوں کے تعاون کے ساتھ ان کروڑہا انسانوں کو بہتر زندگی کی امید اور اس کے حصول کے لئے ہر ممکن حوصلہ افزائی اور امداد بہم پہنچا سکتا ہے۔ وہ ان کی صلاحیتوں کو مایوسیوں کے اندھیرے سے نکال کر ترقی اور خوشحالی کے یقینی مواقع سے ہمکنار کر سکتا ہے، جس میں بڑی بڑی کھیتیاں، زیادہ تعداد میں اسکول، تعلیم، بجلی کے کنویں، کھیتی باڑی کے بہتر آلات، زیادہ تندرست بچے اور چیچک اور ملیریا سے نجات شامل ہے۔

دوسرے الفاظ میں اگر "پوائنٹ فور" پر سمجھ داری کے ساتھ عملدرآمد کیا جائے اور اس میں کافی سرمایہ خرچ کیا جائے تو وہ افلاس، بھوک، بیماری اور جہالت کو دور کرنے کے سلسلہ میں ایک قومی، غیر خونیں اور غیر کمیونسٹ انقلاب کی تکمیل میں مدد دے سکتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کمیونسٹ رہنما، جو انسانی مسائل کو حل کرنے کے اس بنیادی پروگرام کی کامیابی کے لامحدود امکانات سے ہم میں سے بہت سے لوگوں سے زیادہ اچھی طرح واقف ہیں، اس پروگرام کی شدید مذمت کر رہے ہیں۔

"پوائنٹ فور" ایک زبردست چیلنج ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے۔ ہمارے لئے اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہ قومی نظریہ ان مقامی قوتوں کے ساتھ جن کے ساتھ اسے کام کرنا ہے، اور انسانی فلاح اور بہبود کی اس تحریک کے ساتھ جو نام نہاد غیر ترقی یافتہ

علاقوں میں رہنے والے کروڑہا انسانوں کو غفلت سے بیدار کررہی ہے، کس طرح مطابقت پیدا کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سے ایسے نکات ہیں جن کو یہاں دُہرانے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ "پوائنٹ فور" کوئی ایسا بنا بنایا پروگرام نہیں ہے جس کو خوبصورتی کے ساتھ کسی چیز میں لپیٹ کر برآمد کیا جاسکے اور جو غیر ترقی یافتہ ممالک کی جملہ اقتصادی اور سماجی خرابیوں کو دور کرنے کی ضمانت دیتا ہو۔ "پوائنٹ فور" کے اغراض و مقاصد کو سادہ طریقے پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس کا مقصد جدید آلات اور اقتصادی امداد کے جمہوری استعمال کے ذریعہ افلاس، بیماری اور جہالت کا خاتمہ کرنا ہے۔

ان اجمالی مقاصد کی علیحدہ علیحدہ ممالک کے سلسلہ میں تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔ اس تفصیلی پروگرام کو متعلقہ ممالک، ان کی اقتصادیات، ان کے رسوم، روایات، تہذیب و تمدن اور ان کی حکومتوں کی ضروریات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "پوائنٹ فور" کوئی خیراتی پروگرام نہیں ہے بلکہ ایک سماجی کام یعنی ـــــ خود اپنی مدد کے جدید ترین اصول پر مبنی انسانی فلاح اور بہبود کے حصول کا ایک طریقہ ہے۔ یہ طریقۂ کار اگرچہ بعض اوقات سست اور مایوس کن بھی ثابت ہوتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کا یہی ایک واحد اور مؤثر راستہ ہے۔

تاوقتیکہ لوگ خود اس کام میں حصہ نہ لیں، تاوقتیکہ وہ یہ نہ دیکھیں کہ ان کی کوششیں، روپیہ پیسہ اور اشیا کی صورت میں تھوڑی بہت غیر ملکی امداد کے ساتھ مل کر کس طرح ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کرسکتی ہیں، ان کی حاصل کردہ ترقی اور خوشحالی اپنی جڑیں مضبوط نہ کرسکیں گی اور بالآخر بے دلی اور کاہلی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

تیسری بات یہ کہ "پوائنٹ فور" کو ہر ملک میں انسانی مسائل پر انتہائی کاری ضرب لگانے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

"پوائنٹ فور" کے چند گنتی کے کارنامے جنھیں اعلیٰ درجہ کی کامیابی نصیب ہوئی ہو وہ ہمارے مقصد کے لئے اتنے زیادہ مفید نہیں ہیں جتنے کہ زیادہ تعداد میں ایسے کام جو لوگوں کی زیادہ بڑی تعداد پر اثر انداز ہوتے ہوں، جو ان کو عمل کا جذبہ عطا کرتے ہوں اور ترقی اور خوشحالی کی عالمگیر تحریک کے لئے ایک تعمیری مدد کا باعث بنتے ہوں۔

ہمیں زیادہ ضرورت، زیادہ تعداد میں جدید ہسپتال، جدید اسکول اور جدید طرز کے کھیت قائم کرنے کی نہیں ـــ زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے پیمانے پر صحت عامہ تعلیم

زراعت اور مقامی صنعتوں کے مسائل کو حل کیا جائے، اور ان تمام کاموں میں خود کو اور زیادہ سے زیادہ دیگر لوگوں کو شریک کیا جائے۔

چوتھے یہ کہ ہمیں کوئی "پوائنٹ فور" پروگرام اس خیال کو دل میں رکھ کر نہیں شروع کرنا چاہیئے کہ ہم کسی ملک کو امداد دے کر اس کی دوستی کو خرید رہے ہیں یا کم از کم اس کو اپنا شکر گزار بنا رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض غیر ترقی یافتہ ممالک کی طرف امریکی امداد کو قبول کرنے میں پس و پیش کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو یہ خوف ہے کہ ہم "پوائنٹ فور" کو ان کی نئی نئی حاصل کی ہوئی آزادی کو صدمہ پہنچانے یا ان کی قومی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

صرف ایک ہی ایسا راستہ ہے جس پر چل کر امریکہ اور کم ترقی یافتہ ممالک ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں اور وہ ہے ایک زیادہ محفوظ اور زیادہ آزاد دنیا کے قیام کی باہمی اور مشترکہ خواہش۔ اگر ہندوستان، پاکستان، جاپان، انڈونیشیا، ایتھوپیا، لائبیریا، مصر، برازیل، وینیزویلا، اور دیگر ایشیائی، افریقی اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں جمہوریت کو کامیابی نصیب ہوئی ہے تو امریکہ کا ہر باشندہ خود اپنے اور اپنے بچوں کے لئے بہتر زندگی کی پہلے سے زیادہ توقع کر سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے مقصد کی اس سادہ سی وضاحت سے مطمئن نہیں ہیں تو ہماری ناکامی یقینی ہے ——— اس طرح ہم نہ صرف یہ کہ ایشیا اور افریقہ کے ان کروڑہا باشندوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا ایک موقع ہی ہاتھ سے کھو بیٹھیں گے جو ہم سے دوستی کے خواہشمند تھے، بلکہ اس غیر خونیں اور جمہوری انقلاب کی امید بھی کھو بیٹھیں گے جو امنِ عالم کے قیام اور انسانی عظمت و وقار میں اضافہ کی واحد بنیاد بن سکتا ہے۔

۱۸ - معاشی افزائش کے عالمی تحریک

مسٹر باؤلز کا خیال ہے کہ عوام کی بڑھتی ہوئی توقعات کے انقلاب کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے کی جو کوشش کمیونسٹوں کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ اس کا صرف فوجی امداد کے ذریعہ سدباب نہیں کیا جا سکتا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کے اٹلانٹک منتھلی میں مسٹر باؤلز نے بتلایا ہے کہ ہم ترقی پذیر قوتوں کی آزادی کے سلسلہ میں ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔

اسٹالن کے انتقال کے بعد سے سوویٹ یونین میں سرد جنگ میں حصہ لینے اور آزاد دنیا میں

پھوٹ ڈالنے کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتی جارہی ہے۔ وہ یورپ، ایشیا اور جنوبی امریکہ کے کروڑہا انسانوں کو یہ یقین دلانے کی دن بہ دن کوشش کررہی ہے کہ کمیونسٹ اقوام ہی صحیح معنوں میں امن کی علمبردار ہیں اور یہ کہ امریکہ جس کی طرف دنیا نے ۱۹۴۵ء میں انتہائی پُرامید نگاہوں سے دیکھا تھا، وہ اقتدار کا بھوکا اور جارحانہ نیت رکھنے والا ہے۔

نیز جو مسئلہ ہمیں آج درپیش ہے وہ جزواً یہ ہے کہ امریکہ کی ناقابل یقین حد تک مسخ شدہ تصویر کو آج عام طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہمیں اس تصویر کو بدلنا ہے تو ہم کو دیگر آزاد قوموں کے ساتھ اپنے تعلقات کے ایک نئے تصوّر کو وجود میں لانا ہوگا۔ آج کی انقلابی دنیا میں قوت کی ماہیت کے ایک وسیع تر مفہوم کو وجود میں لانا ہوگا اور اس مفہوم کے ساتھ تطابق پیدا کرنے کے لئے ایک نئے اور جرأتمندانہ طریقۂ کار کو اپنانا ہوگا۔

یورپ میں ہم کیا کررہے ہیں اور کیا نہیں کرپارہے ہیں؟ یہ بات اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن ہم ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں جو کچھ کررہے ہیں، اس کی اہمیت بھی اس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان غیر ترقی یافتہ علاقوں میں ہمارا صرف فوجی معاملات پر اپنی توجہ مرکوز کئے رہنا اور اقتصادی اور سیاسی عناصر سے بے تعلق رہنا خاص طور پر نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔

اگر کل کو عالمگیر کمیونسٹ تحریک کسی وجہ سے ختم بھی ہوجائے تب بھی یہ غیر ترقی یافتہ علاقے امریکہ کے ہر ہر باشندے کے لئے بدستور اہم بنے رہیں گے۔ اگرچہ ہم دنیا کی کل صنعتی اشیاء کا ۴۰ فیصدی حصہ پیدا کرتے ہیں۔ ہم دنیا کی آبادی کا صرف ۶ فی صدی حصہ ہیں۔ چوں کہ ہماری اقتصادیات کے مطالبات کے مقابلہ میں خود ہمارے قدرتی وسائل ناکافی ثابت ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ساتھ تجارت پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے لگے ہیں۔ اور اب ان تین براعظموں کے ساتھ ہماری تجارت پوری دنیا کے ساتھ تجارت کا پچاس فیصدی حصہ ہوگئی ہے۔

آج یہ غیر ترقی یافتہ قومیں ایک انقلابی دور سے گزر رہی ہیں جو سرد جنگ کے علاوہ بھی ہماری زندگی پر اثر انداز ہوگا۔ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے عوام یہ سمجھ کر کہ سائنس نہایت تیزی کے ساتھ ان کے افلاس اور مصائب کا ازالہ کرسکتا ہے، نہایت دلجمعی کے ساتھ ایک بہتر زندگی کے حصول کی کوشش کررہے ہیں۔

یہ شورش اور ہنگامہ کمیونسٹوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ اگر مارکس، لینن، اسٹالن اور ماؤ نے دنیا میں جنم بھی نہ لیا ہوتا، تب بھی آج ہم اس کے ساتھ دوچار ہوتے۔ کمیونسٹ اگر کچھ کررہے ہیں تو صرف یہ کہ وہ اس انقلابی تحریک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں اور اپنے تدبر اور نظریاتی جوش و خروش کی مدد سے پرانے نظام کو اور زیادہ تیزی کے ساتھ تباہ کرکے اس کے نتیجہ میں پیدا

ہونے والے خلا کو پُر کر دینا چاہتے ہیں۔

آج ہر غیر ترقی یافتہ قوم کی حکومت ایک آزمائش سے گزر رہی ہے۔ آئندہ چند برسوں میں ان حکومتوں کو اپنے عوام کے سامنے اس بات کا ثبوت پیش کرنا ہو گا کہ جمہوریت نہ صرف ہر فرد کے لئے سیاسی آزادی ہی مہیا کر سکتی ہے، بلکہ نہایت تیز رفتار اور قابلِ دید معاشی افزائش بھی لا سکتی ہے۔

اعلیٰ معیارِ زندگی، زیادہ خوراک بیماری سے نجات، اسکول اور سڑکیں، آب پاشی کی سہولتیں اور برقی قوت کے حصول کے لئے دریاؤں پر ڈیموں کی تعمیر، ریلوں اور سلسلۂ مواصلات کی توسیع کے مطالبات روز بہ روز بڑھتے جا رہے ہیں۔ اگر کوئی حکومت ان مطالبات کو پورا کرنے میں مسلسل ناکام رہے گی تو وہ خواہ وہ کتنی بھی ایماندار اور جمہوریت پسند کیوں نہ ہو اس کو بالآخر دوسروں کے لئے راستہ صاف کرنا ہو گا۔

تیز رفتار ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہیں وہ کافی بڑی ہیں اور ان میں بھی سب سے بڑی رُکاوٹ مالی وسائل کا فقدان ہے۔

ملک خواہ امیر ہو یا غریب، اقتصادی ڈھانچہ سرمایہ دارانہ ہو، کمیونسٹ، یا سوشلسٹ ہو بچت کے لئے اکٹھا کیا ہوا سرمایہ وہ اصل قوت محرکہ ہوتی ہے جو اس رفتار کا تعین کرتی ہے، جس رفتار کے ساتھ کہ صنعت ترقی ہے اور عوام کا معیارِ زندگی بلند ہوتا ہے۔

آج ہر ترقی یافتہ قوم کو ایک سوال درپیش ہے اور وہ یہ کہ اتنا سرمایہ کہاں سے لایا جائے کہ جس سے اس رفتار کے ساتھ ترقی کے کاموں کو آگے بڑھایا جا سکے کہ اُن کے عوام مطمئن ہو جائیں؟

اگر کوئی جمہوری حکومت ٹیکسوں کی بھرمار کرتی ہے تو اس کو انتخابات میں ناکامی کا سامنا کرنا ہو گا۔ لیکن اگر وہ کمیونسٹ عوام کے مقابلہ میں ترقی کرنے میں ناکام رہتی ہے تو اس کو کسی انقلابی شورش کے ذریعہ ہٹایا جا سکتا ہے۔

ہم اس چیلنج کا مقابلہ اپنے ایٹمی بموں کی فراہمی میں، جو پہلے ہی کافی زیادہ ہے مزید اضافے کے ذریعہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہند چینی سے یہ سبق حاصل کر لینا چاہئے کہ انقلابی ایشیا کے لئے مغرب کی فوجی طاقت بہر حال ایک محدود چیز ہے، نہ ہی امریکہ اپنی تقریروں اور دھمکیوں کے ذریعہ ایشیا کو کمیونزم سے "محفوظ" رکھ سکتا ہے۔

اگر ایشیا کسی مرحلہ پر ہو بچکر کمیونسٹ نظریہ کو رد کر دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ ایشیا کے عوام خود اپنی ذاتی تجربے کی بنا پر اس بات کے قائل ہو گئے ہوں گے کہ مسلسل اقتصادی ترقی اور انفرادی آزادی، یہ دونوں چیزیں جمہوری حکومتوں کے ماتحت حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور یہ کہ ان چیزوں کے حصول کے خونیں اور استبدادی راستہ پر چل کر سیاسی اور اقتصادی دونوں حیثیتوں سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ صورت حال اور چیزوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی اقتصادی امداد کے متعلق ایک نئے انداز فکر کی ضرورت کو واضح کرتی ہے جو قابل عمل، قابل قبول اور ہماری بساط کے مطابق ہو۔

اگر ہمارا مقصد صرف کمیونزم کو روکنا ہے تو گویا ہم ایک بہت بڑی خامی کے ساتھ اپنی جدوجہد کا آغاز کریں گے۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنی جدوجہد کو صرف ان علاقوں پر مرکوز کر دینا ہوگا جہاں کمیونزم پہلے سے موجود ہے اور خطرہ بنا ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری ہر نقل وحرکت اور ہر کام کو ایک سیاسی چال سمجھا جائے گا۔

مثال کے طور پر اگر کوئی نیا امریکی پروگرام جنوبی ایشیا پر مرکوز کر دیا جائے جسے کمیونزم سے خطرہ موجود ہے، اور افریقہ اور جنوبی امریکہ کو اکثر حالتوں میں نظر انداز کیا جائے، تو ایشیا والے فوراً یہ سمجھنے لگیں گے کہ ہمیں ان کی فلاح اور بہبود کے بجائے صرف کمیونزم کی مخالفت سے دلچسپی ہے۔ ہم پران کی دوستی کو خریدنے اور ان کو "مغربی بلاک" میں گھسیٹ کر لانے کی کوشش کا الزام لگایا جائیگا۔ اور ایشیا کے بہت سے آزاد رہنما، باوجود اس کے کہ وہ امداد کے بے انتہا خواہشمند ہوں گے، وہ ہماری امداد کو بہت کچھ پس وپیش کے ساتھ قبول کریں گے، یا پھر قبول ہی نہیں کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ سرد جنگ ہی ہمیں کسی ایسے کام کے لئے کیوں مجبور کر سکتی ہے جس کو ہم فی الواقع اس لئے کرتے ہیں کہ ہم اس کو کرنا چاہتے ہیں؟ ایسے لوگوں کی مدد کو آنا جو ہمارے جتنے خوشحال نہیں ہیں، ماسکو اور پیکنگ کے اتحاد کے وجود میں آنے سے بہت پہلے ہمارے مذہبی عقائد اور روایات کی بنیاد بنا رہا ہے۔

ہمارے امدادی پروگراموں کا مجموعی مقصد بالکل واضح، ضروری اور انتہائی معقول ہے۔ یعنی یہ کہ آزاد دنیا کی اقوام کی اپنی سیاسی اور اقتصادی قوت کو اس درجہ استحکام بخشنا کہ وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکیں اور امریکہ کے مفاد کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے مفاد کے لئے کام کر سکیں۔

جوں جوں وہ اپنے عوام کی ضروریات کو پورا کرنے میں کامیاب ہوں گی، جمہوری طور طریقوں میں ان کا اعتماد بڑھتا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے اپنی تمام کامیابیوں کو اندرونی اور بیرونی جملہ آفات سے محفوظ رکھنے کے عزم کو بھی تقویت نصیب ہوگی۔

ایسی اقوام کے ساتھ مل کر امریکہ ایک آزاد اور حرکت پذیر اتحاد کو وجود میں لاسکتا ہے۔ جو آگے چل کر کمیونسٹ جارحیت کے خطرے کو سرے سے ختم کر کے رفتہ رفتہ ایک دائمی امن کی بنیاد قائم کرے گا۔

لہذا کسی بھی موثر پروگرام کا مقصد صرف افلاس کو ختم کرنے کے مقابلہ میں وسیع تر ہونا چاہیئے۔ بعض ناسمجھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "جس آدمی کا پیٹ بھرا ہوا ہوگا وہ کبھی کمیونسٹ نہ بنے گا"۔ تاریخ سے اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ انقلابات کی رہنمائی کبھی بھوکے کسانوں نے نہیں کی۔ بلکہ درمیانی درجہ

کے مایوس شدہ اور عموماً اچھے کھاتے پیتے مفکرین نے کی ہے۔

غیر کمیونسٹ اقوام کے لئے ہمارے امدادی پروگراموں کو سیاسی بندشوں سے آزاد ہونا چاہئے۔ لیکن طویل المدت اقتصادی منصوبہ بندی، زمینی اصلاحات اور محصولی اصلاحات کے لئے قابل عمل شرائط کا پورا کرنا اور دولتمند لوگوں کے لئے پُر تکلف سامان خریدنے کے لئے غیر ملکی زر مبادلہ کے استعمال پر پابندی بھی اپنی جگہ ضروری ہے۔

آج بہت سے غیر ترقی یافتہ ممالک میں امریکی امداد اس قسم کی اصلاحات کی رفتار میں تیزی پیدا کرنے کی بجائے اس میں اور تعطل پیدا کر رہی ہے۔ اگر ہم نے اس مسئلہ سے چشم پوشی کی تو ہمارے امدادی سرمائے کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع چلا جائے گا اور ہم پر جاگیردارانہ طرز کی اقتصادیات کی حوصلہ افزائی کا الزام آئے گا جو بہت سے نہیں بلکہ چند لوگوں کے مفاد کے لئے ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ ہمیں اس مقصد کے لئے ایک سیدھا سادھا اور جامع فارمولا مرتب کرنا چاہئے۔ اقتصادی افزائش کے مسائل انتہائی پیچیدہ ہیں۔ لہذا ہم ان کے جو حل تلاش کریں ان میں اس پیچیدگی کی جھلک نظر آنی چاہیئے۔

مثال کے طور پر کم محصولات اور زیادہ تجارت ہونے کی صورت میں امدادی رقم میں بہت کافی کمی کی جا سکتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ قومیں، جہاں تک ان سے ممکن ہو سکتا ہے اپنی ترقی اور خوشحالی کے لئے خرچ کرنے کی خواہشمند اور اس کے لئے فکر مند بھی ہیں لیکن دو ہی راستے ہیں جن سے ان کو ڈالر مہیا ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ ہماری ضرورت کی چیزیں ہمیں فروخت کرکے ڈالر کما سکتی ہیں یا پھر وہ امریکی عطیات یا قرضوں کی شکل میں انھیں حاصل کر سکتی ہیں۔

ہم ان قوموں کے لئے ان کی پیداوار کا کچھ حصہ امریکہ کے ہاتھوں فروخت کر دینے کے کام کو جتنا زیادہ آسان بنا دیں گے وہ ہم سے اتنی ہی کم امداد کے خواہشمند ہوں گے۔ اس کے علاوہ ان کا معیار زندگی جتنا جتنا بلند ہوتا جائے گا وہ اتنی ہی زیادہ امریکی مصنوعات کو خریدنے کے قابل ہوتی جائیں گی۔

ہمیں ان خام اشیاء کی قیمتوں میں زیادہ سے زیادہ استحکام پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو ہم غیر ترقی یافتہ علاقوں سے خریدتے ہیں۔ ملایا میں کل خاندانوں کے تین چوتھائی افراد کی آمدنی براہ راست امریکہ میں ربڑ کی قیمتوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی طرح چائے، قہوہ، کوکو، ٹین اور تیل پیدا کرنے والی بیشتر اقوام کی آمدنی بھی مختلف منڈیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

ہم اتنے سمجھدار ضرور ہیں کہ کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ قیمتوں کے ایک ایسے نظام کو وجود میں لا سکتے ہیں جو منڈیوں کے اس شدید اتار چڑھاؤ کا تدارک کرے جو اس طرح تنگی اور تلخی

کا باعث ثابت ہوتا ہے اور جس سے صرف سٹہ بازوں کو نفع پہنچتا ہے۔ معمولی نوعیت کے اُتار چڑھاؤ کے لیے جیسے تھوڑی بہت کمی بیشی کے ذریعہ قابو میں کیا جا سکتا ہے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ قیمتوں کا ایک نقشہ تیار ہونا چاہیئے۔

اگر پیداوار اس سے زیادہ رہتی ہے جتنی کہ منڈی میں اس کی کھپت ہے تو باقاعدہ اور منصوبہ بندی کے ساتھ پیداوار کے دوسرے میدانوں میں کام کی ابتدا کی جا سکتی ہے۔ کوئی ذمہ دار آدمی یہ بات نہیں۔کہے گا کہ ایسے کسی پروگرام پر جلدی عمل درآمد شروع کیا جا سکتا ہے یا اس کے بارے میں فوری طور پر کوئی بات طے پا سکتی ہے۔ البتہ فوری طور پر کام کی ابتدا کر کے اس کے بارے میں بعد میں تفصیلات طے کی جا سکتی ہیں۔

آزادانہ تجارت اور مستحکم قیمتوں پر خام اشیاء کے نئے منڈیوں کی موجودگی سے غیر ترقی یافتہ قوموں کی اقتصادیات کو تقویت نصیب ہوگی اور وہ زیادہ موثر طریقہ پر اپنی اپنی مدد کرنے کے قابل ہوسکیں گی۔ لیکن براہ راست امداد کے ایک معقول پروگرام کی بھی فوری ضرورت ہے۔ اس قسم کا پروگرام مارشل پلان کی طرح جو اتمندانہ اور تخلیقی ہونا چاہیے جس میں ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیان مغربی یورپ کی اقتصادیات کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دی تھی۔

سرمائے کی اس کمی کو امریکہ یا دوسری مغربی قوموں کی طرف سے لگائے جانے والے نجی سرمائے کی مدد سے بہت معمولی حد تک پورا کیا جا سکتا ہے۔ جنگ کے بعد سے اب تک امریکہ میں نجی سرمائے کا اوسط ۴۶ بلین ڈالر سالانہ رہا ہے۔ جب کہ اس عرصہ میں غیر ملکوں میں ہمارے سرمائے کا اوسط صرف دس بلین ڈالر رہا ہے۔ اس میں سے بیشتر سرمایہ یورپ اور کنیڈا میں لگایا گیا تھا اور اس کا بیشتر حصہ اس منافع پر مشتمل ہوتا تھا جو امریکی کارپوریشنوں کو ان ممالک سے حاصل ہوتا تھا۔ اگر ہم جنوبی امریکہ میں اپنی تیل کی صنعت کی ترقی کا ذکر نہ بھی کریں تو جنگ کے بعد سے غیر ترقی یافتہ قوموں میں لگائے جانے والے امریکہ کے نجی سرمائے کا کل اندازہ تقریباً ایک بلین ڈالر ہوتا ہے اور اسی عرصہ میں ہندوستان میں امریکہ کے کل نجی سرمائے کا اندازہ ۱۰۰ ملین ڈالر ہے۔

غیر ملکوں میں لگائے جانے والے امریکہ کے سرمائے کی اس ہیچ مقداری کی بعض جائز اور معقول وجوہات ہیں۔ بہت سی غیر ترقی یافتہ قوموں کے اندرونی حالات غیر اطمینان بخش ہیں۔ ان ممالک میں اکثر غیر ملکی سرمایہ داروں کے متعلق بلا سبب کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جس کی وجہ ان کا نوآبادیاتی پس منظر ہے۔ بعض صورتوں میں محصولی قوانین اس بات کو انتہائی دشوار بنا دیتے ہیں کہ وہ منافع کا کوئی معقول حصہ بھی اس میں سے لے سکیں۔ اس کے علاوہ ان کے کاروبار کو اکثر بعض غیر ضروری قسم کی ضابطہ پرستیوں کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے۔

لیکن انتہائی اچھے حالات میں بھی یہ توقع کرنا ایک غلطی ہوگی کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں نجی سرمائے کی مدد سے اقتصادی افزائش کی ضروری شرائط کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ جس کی ضرورت ہے بہت زیادہ ہے اور منافع کے امکانات بہت محدود اور غیر یقینی ہیں۔

بعض بنیادی ضرورت کی چیزیں مثلاً برقی قوت، اچھی قسم کی بندرگاہیں، ریلیں اور سلسلہ مواصلات کی سرکاری سرمائے سے تعمیر ہونی چاہیئے۔ اس طرح ان بنیادی چیزوں کے وجود میں آجانے اور نو آبادیاتی خدشات کو دور ہو جانے کے بعد بھی ہم نجی سرمائے کے وسیع تر مواقع پیدا ہو جانے کی توقع کر سکتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ بیشتر غیر ترقی یافتہ ممالک میں معقول درجے پر ترقی کے لئے سرکار سے براہ راست اور اعلیٰ پیمانہ پر عطیات اور قرضوں کا ملنا ضروری ہے۔

ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ بیشتر حصوں افلاس کا جو دور دورہ ہے وہ ایک ایسی فضا تیار کرتا ہے جو کمیونزم کے پھیلنے اور پھولنے کے انتہائی ساز گار ہے۔ جب ہم غیر ترقی یافتہ قوموں کی امداد کے معاملے میں اس خیال سے پس و پیش کرتے ہیں کہ ہم بیک وقت اقتصادی افزائش اور دفاع کے کاموں کے متحمل نہیں ہو سکتے، تو ہم روسیوں کے اسلحہ کی موجودہ دوڑ کو جاری رکھنے کا ایک اور جواز پیدا کر دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کو روس کے غلبہ سے آزاد کیوں نہیں کر سکتے ہم وہ اقدامات کیوں نہیں کرتے جو خود ہماری امریکی روایات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور جو ہمارے جیسے انسانوں کی انتہائی اہم ضروریات کو پورا کرنے میں ان کی مدد کر سکتے ہیں؟ اب وقت آگیا ہے کہ ہماری دونوں سیاسی جماعتوں کے رہنما مستقبل میں ایک نیا لائحہ عمل مرتب کریں۔ اب امریکہ کو اپنے پس و پیش کو ختم کر کے ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کی غیر جانبدار اور غیر ترقی یافتہ قوموں کی اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے اور ان کو امداد دینے کی پیشکش کرنی چاہیئے۔

۱۹ - غیر ملکی امداد کا ایک نیا تصور

کم ترقی یافتہ قوموں کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اقتصادی ترقی کے کام کو کس صورت سے آگے بڑھایا جائے کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ عوام کا معیار زندگی بھی بلند ہونے لگے۔ یہ مسئلہ ہمارے غیر ملکی امداد کے پروگرام کے لئے ایک زیادہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کی ضرورت کو واضح کرتا ہے، جس کا اظہار مسٹر باؤلز نے نومبر ۱۹۵۶ء میں ہاؤس فارن افیئرس کمیٹی کے سامنے ایک تقریر کے

دوران کیا تھا۔

پچھلے چند سالوں میں غیر ترقی یافتہ اور خاص طور پر غیر جانب دار علاقوں میں ہمارے اثر و رسوخ کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کی کئی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ ان وجوہات میں سب سے اہم وجہ عالمگیر اقتصادیات کے اس بڑھتے ہوئے جمود پر قابو پانے میں ہماری ناکامی ہے جو روس کی نئی چالوں کی بدولت پیدا ہو رہا ہے۔

ایشیا اور افریقہ کے غیر کمیونسٹ ممالک کے نئے رہنماؤں میں بیشتر نے مغربی ممالک میں تعلیم پائی ہے اور وہ زیادہ تر جمہوری مقاصد اور مختلف درجوں پر جمہوری طور طریقوں پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن ان کو بھی اس اندرونی دباؤ کے سامنے جھکنا پڑتا ہے جو پست معیار زندگی کی بدولت پیدا ہوتا ہے اور جو جدید ٹیکنالوجی کی صلاحیتوں کے متعلق عوام کی نئی نئی واقفیت کی بدولت اور بھی زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔

اس صورت حال نے ان کے لئے ایک عجیب گومگو کی صورت پیدا کر دی ہے۔

صنعتی ترقی قومی مقاصد اور قوت کی چونکہ ایک نشانی سمجھی جانے لگی ہے اور نئی ٹیکنالوجی کی برکتوں سے لوگ عام طور پر واقف ہو گئے ہیں اس لئے ایشیا اور افریقہ میں نہایت تیز رفتار ترقی کے لئے جو سیاسی دباؤ پڑ رہے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جن سے اپنی صنعتی ترقی کے ابتدائی دور میں ہمیں دوچار ہونا پڑا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ جمہوری نظریات کی حامل قوموں میں - - - رائے عامہ کی توجہ ایک ٹھوس صنعتی بنیاد کے قیام پر نہیں بلکہ معیار زندگی کی فوری اصلاح اور بہتری پر مرکوز رہی ہے۔ ان ممالک کے عوام اپنے سیاسی رہنماؤں کے متضاد وعدوں اور اقوام متحدہ اور "پوائنٹ فور" کے جائزوں اور کمیونسٹوں کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوتے رہے ہیں کہ کمیونسٹ ممالک کی حکومتوں کی کامیابی کا اندازہ ان کی اس صلاحیت سے لگا لینا چاہئے کہ انھوں نے فوری طور پر عوام کو زیادہ خوراک زیادہ کپڑے زیادہ تعلیم اور بہتر سماجی خدمات فراہم کی ہیں۔ اور وہاں بیماری بھی بہت کم ہے۔

لہذا ایک قوم جو جمہوری طور طریقوں پر چل کر اپنے وسائل کو ترقی دینا چاہتی ہے اسے اپنے محاصل کو بعض قابل قبول حدود کے اندر رکھنا ہوگا۔ اس کو معیار زندگی کو بہتر بنانے کے عام مطالبے کی تشفی کے خیال سے اپنی پیداواری صلاحیتوں کے ایک معتدبہ حصہ کو کھپت کی اشیاء کی طرف منتقل کرنا ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کو کسی نہ کسی حد تک کمیونسٹ قوموں کی انتہا سے زیادہ تشہیر یافتہ صنعتی ترقی کی بھی ہمسری کرنی ہوگی۔

چین کا استبدادی اور ہندوستان کا جمہوری معاشرہ ان دو مختلف نظاموں کے عملی نتائج کی بالکل واضح مثالیں ہیں۔ اس وقت چین اپنی سالانہ بالمقطع قومی پیداوار کا ۲۲ فیصدی توسیعی کاموں پر صرف کر رہا ہے اور اس میں سے بھی بیشتر بھاری صنعتوں، رسل و رسائل اور برقی قوت کی ترقی پر صرف کر رہا ہے۔ لیکن ہندوستان والے، باوجود اس کے کہ اس کے رہنما اعلیٰ درجہ کی قابلیت اور سیاسی جرأت کے مالک ہیں، اس قسم کے کاموں کے لئے اپنی بجٹ کا ۸ یا ۹ فیصدی سے زیادہ نہیں لگا پاتے ہیں۔

اس مختصر سے تجزیہ سے ایشیا اور افریقہ کی ان قوموں کے لئے امریکہ کے دانشمندانہ اقتصادی امداد کے پروگرام پر روشنی پڑتی ہے جو خود کو استبداد سے محفوظ رکھنا چاہتی ہیں، یعنی اپنی اندرونی شورشوں اور ہنگاموں کو جو تیز رفتار اقتصادی ترقی کی ایک لازمی اور ضمنی پیداوار ہوتے ہیں، ایسی حدود کے اندر رکھنا چاہتی ہیں جو ایک آزاد قوم کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہیں اور جو جمہوری حکومتوں کو اس قابل بنا دینا چاہتی ہیں کہ وہ پولیس کی حکومتوں کے طور طریقوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر کمیونسٹوں کی اقتصادی ترقی کی رفتار کا مقابلہ نہ بھی کر سکیں تب بھی اس کے قریب ضرور پہنچ جائیں۔

جمہوری نظریات کی حامل بیشتر غیر ترقی یافتہ قوموں کو نہ صرف یہ کہ ٹیکنیکل امداد کی ہی ضرورت ہے۔ بلکہ صنعتوں، رسل و رسائل اور برقی قوت کی ترقی کے لئے بہت کافی سرمائے کی بھی ضرورت ہے جس کے ساتھ ساتھ کھپت کی اشیاء اور خدمات میں بھی ایک واضح اضافہ ہوتا رہے گا اور یہ سب اندرون ملک قابل برداشت قسم کے محصولات کی حدود میں رہتے ہوئے ہوگا۔

ترقی یافتہ قوموں کی طرف سے کم ترقی یافتہ قوموں کی طرف سرمایہ کے انتقال کا روائتی ذریعہ صنعتوں میں نجی سرمائے کا لگایا جانا ہے۔ اس کے باوجود آج اس ذریعہ سے اتنا سرمایہ فراہم نہیں کیا جا سکتا جو بالآخر ان قوموں کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

آج جو قومیں سیاسی کشمکش میں مبتلا ہیں ان میں امریکہ کے براہ راست نجی سرمائے کی مقدار اس وقت تک محدود رہے گی جب تک کہ منافع کے اعلیٰ معیار، جو نجی سرمایہ داروں کے لئے سرمایہ لگانے کا واحد جواز ہو سکتے ہیں، سیاسی حیثیت سے ان قوموں کے لئے ناقابل قبول رہیں گے۔ پٹرولیم اور کان کنی کی صنعتوں کو چھوڑ کر اگر دیکھا جائے تو ۱۹۴۵ء سے لے کر آج تک ایشیا اور افریقہ میں لگائے جانے والے امریکی نجی سرمائے کی کل مقدار ۲۰۰ ملین ڈالر سے بھی کم ہے۔

غیر ممالک میں سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی کا کام ہمیں اس سے کہیں زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ کرنا چاہئے جتنی کہ آج تک ہماری طرف سے برتی گئی ہے۔ جوں جوں جدید ذرائع رسل و رسائل معقول درجہ کی برقی قوت اور بھاری صنعتوں کی مدد سے ایک صنعتی اساس قائم ہوتی جائے گی، ایشیا اور افریقہ

کو سیاسی استحکام بھی نصیب ہوتا جائے گا اور اس کے بعد نجی سرمایہ لگانے والوں کو ایک اہم رول ادا کرنا ہوگا۔

لیکن اس دوران میں ایشیا اور افریقہ کے نئے اور غیر کمیونسٹ ممالک میں سرمائے کی بھاری مقدار کا اصل مخرج امریکی حکومت ہی رہے گی۔ صرف حکومت کی براہ راست دخل اندازی ہی امریکی سرمائے اور ٹیکنالوجی سے یہ کام لے سکتی ہے کہ وہ مقامی وسائل اور کم از کم ترقیاتی مقاصد کے درمیانی فرق کو پورا کر سکیں جو موجودہ ایشیا اور افریقہ میں ایک مستحکم جمہوری حکومت کے لئے ضروری ہیں۔

آئندہ چند سالوں میں حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر اقتصادیات کے ایک نئے اور عالمگیر نظریہ کا وجود میں آنا لازمی ہے۔ اس نئے نظریہ اور ہمارے موجودہ تصورات میں اتنا بُعد ممکن ہے جتنا کہ روزویلٹ اور کیلون کالج کے قومی اقتصادیات کے پروگراموں تھا۔

مستقبل میں ہماری سلامتی کے لئے اس کی کیا اہمیت ہے، اس کی وضاحت کے سلسلہ میں چوں کہ ابھی تک سنجیدگی کے ساتھ کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، اس لئے امریکہ کے بیشتر باشندے غیر فوجی اقتصادی امداد کے پروگراموں کو ایک قلیل مدت امدادی اسکیم سمجھتے ہیں جس کی قدر و قیمت اور کامیابی کے امکانات کے بارے میں ان کو شک و شبہ ہے۔

نتیجہ کے طور پر اس پروگرام کے لئے جو کچھ رقوم مہیا کی گئی ہیں وہ اس کے ایک فی صدی سے بھی کم ہیں جو آج ہم فوجی دفاع پر خرچ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کانگریس نے جو رقوم غیر فوجی امدادی پروگراموں کے لئے مہیا کی ہیں ان کو اکثر غلط کاموں پر، غلط مقامات پر اور غلط وجوہات کی بنا پر صرف کیا گیا ہے۔

ایشیائی ممالک میں ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ امریکی امداد کے ذریعہ ترقیاتی کاموں میں جو اضافہ ہوا وہ ہمیشہ سیاسی استحکام کے اضافہ کے ہم پلہ نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے امدادی پروگرام زندگی کی پرانی قدروں کو مع اس کی جملہ ناانصافیوں کے، ہوا دیتے رہے ہیں، اگرچہ ان کی بدولت پیداوار کے معیار ضرور بلند ہوئے ہیں۔

ہمارے امدادی پروگراموں کو دولت میں اضافہ کے علاوہ اس بات پر زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیئے کہ مزدوروں اور کسانوں میں اپنی قومی حکومتوں اور اپنے عوام کے لئے صحت مند اور تعاون کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

اس مقصد کے لئے تین ایسے ضروری مقاصد کے حصول کے لئے سعی پیہم کی ضرورت ہے جس کے بغیر ایشیا، افریقہ، اور لاطینی امریکہ میں سیاسی استحکام کا پیدا ہونا قطعاً خارج از امکان ہے۔

۱۔ اقتصادی ترقی کی رفتار میں ایک واضح اضافہ۔

۲ - اس اضافہ کے حصول میں عالمگیر ذاتی جد و جہد کا احساس۔
۳ - عوام کا یہ عقیدہ کہ پیداوار میں اضافہ کی بدولت ہونے والا منافع جائز طریقے پر تقسیم ہو رہا ہے اور ناانصافیوں میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے۔

چونکہ ہم نے ایشیا اور افریقہ میں اپنی کوششوں کو زیادہ تر مقصد نمبر ا— یعنی محض پیداواری اضافہ — کی طرف مرکوز کر دیا تھا اور چونکہ بہت سے ممالک میں ہماری امداد کی بدولت ہونے والی آمدنی کے اضافے کا بیشتر حصہ حکمراں طبقے کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں دنیا کے بہت حصوں میں انتہائی غیر ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔

مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے بعض ممالک کے طلبا جنھوں نے امریکہ میں تعلیم پائی ہے اکثر ایک افسوسناک بات بیان کرتے ہیں۔ یہ لوگ امریکہ میں اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر دل میں یہ جوش و خروش لئے واپس جاتے ہیں کہ وہ اپنے ممالک میں جمہوری عقائد کی ترقی کے لئے کام کریں گے۔ لیکن جب یہ لوگ اپنے وطن پہنچتے تو وہ دیکھتے ہیں کہ امریکی امداد سے بعض نیم جاگیردارانہ طبقوں کو نہ صرف تقویت ہی پہنچ رہی ہے بلکہ وہ ان کو برسرِ اقتدار بھی رکھے ہوئے ہے۔

ان کو اپنے وطن میں ایسی حکومتوں کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے جو اپنے ملک کے دولت مندوں پر اس کا عشر عشیر محصول بھی نہیں لگاتیں جتنا کہ ہم اپنے ملک کے دولت مندوں پر لگاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی زرِ مبادلہ کا بہت بڑا حصہ ضروریات پر نہیں، بلکہ پُر تکلف سامان درآمد کرنے پر صرف ہوتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں وہ اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری اقتصادی امداد اصلاح و ترقی کے کام کو کچھ آگے بڑھانے کی بجائے اس میں ایک قسم کا التوا پیدا کر کے دائیں بازو اے جمہوریت دشمن عناصر کی قوت اور حیثیت میں اضافہ کر رہی ہے جو ناامیدی کے عالم میں ابھی تک دورِ گزشتہ سے نہیں نکل پائی ہیں —

اقتصادی امداد کے پروگرام جن کا مقصد ایسے معمولی ذرائع کی مدد سے "کمیونزم کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے"۔ ان کو بالآخر ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ناپسندیدہ، اور جاگیردارانہ طرزِ زندگی کو سہارا دے کر، جو غالباً اب خود اپنے ذرائع کی مدد سے زندہ نہیں رہ سکتا تھا، امریکہ کے اقتصادی پروگرام کثیر تعداد میں لوگوں کو ہمارا مخالف بنا سکتے ہیں اور وہ بالآخر کمیونزم کو ایسے ناگفتہ بہ حالات کی اصلاح کا واحد ذریعہ سمجھ کر اس کو قبول کر سکتے ہیں۔

لہٰذا میں ذیل میں مختصراً چند تجاویز پیش کرتا ہوں، جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے بین الاقوامی اقتصادی امداد کے سلسلہ میں کوئی معقول منصوبہ تیار کیا

جا سکتا ہے۔

۱۔ ہمیں اقتصادی امداد کے اصل مقصد کی صاف طریقے پر وضاحت کر دینی چاہیئے۔ ہمیں یہ علم ہونا چاہیئے کہ یہ امداد کیا کیا خدمات انجام دے سکتی ہے، اور اتنا ہی ضروری اس بات کا علم ہونا ہے کہ وہ کیا خدمات ہیں جن کو وہ انجام نہیں دے سکتی۔

انسان ہونے کی حیثیت سے ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہمیں پسند کریں گے اور ہمارے نظریات کے ساتھ اتفاق کریں گے ـــــ لیکن دوست بنانے یا اپنے ساتھ ملانے اور اپنے نظریات کی تائید کرانے کی خواہش کو کبھی ہمارے امدادی پروگرام کی اصل غرض و غایت نہ بننا چاہیئے۔

اس کے علاوہ اگرچہ روسی چیلنج کے تمام پہلو اچھی طرح واضح ہیں، وہ دلائل جو ہمارے اقتصادی امداد کے پروگرام کو صرف "کمیونسٹ خطرے کی موجودگی کے زمانے" کے ساتھ وابستہ رکھتے ہیں، وہ ان مسائل کی اہمیت کو خطرناک حد تک کم دیتے ہیں۔ جن سے آج ہمیں سابقہ پڑ رہا ہے ـــ یہی نتیجہ ان تمام تجاویز کا بھی برآمد ہوتا ہے جو ہماری امداد کا سلسلہ ہر زیر غور ملک میں کمیونسٹ خطرے کی کمی بیشی کے ساتھ قائم کرنا چاہتی ہے۔

ہمارا مقصد دوستی اور اور ہر دلعزیزی سے کسی قلیل مدت میں عالمگیر مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس بات کی کوشش کرنا ہے کہ دوسری قوموں کو اس درجہ اندرونی استحکام ضرور نصیب ہو جائے کہ وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکیں اور تمام بیرونی حملہ آوروں کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کے لئے کمربستہ رہیں۔

۲۔ غیر ملکی اقتصادی امداد ایک طویل المدت کام ہے۔ اس کے کوئی فوری نتائج مرتب نہیں ہوتے، اور اگر ہم نے وقت سے پہلے کسی بات کی توقع کی تو سوائے مایوسی اور بدمزگی کے اور کوئی بات نصیب نہیں ہوگی۔

آج ہم تیز رفتار بین الاقوامی ترقی کے ایک انتہائی اُمید افزا دور میں داخل ہو رہے ہیں جس کی بُنیاد ٹیکنالوجی اور مواصلات کی نئی ترقیات پر ہے۔ اس کے باوجود ایسے معاشرے جس میں اقتصادی ترقی اور انسانی حقوق کے متعلق پختہ عقائد بہ یک وقت ایک ایسے متوازن انداز میں ترقی پا رہے ہوں جو سیاسی استحکام کے لئے ضروری ہوں، آسانی کے ساتھ وجود میں نہیں لائے جا سکتے۔

بہرحال مہلت کا یہ مسئلہ ہمارے سامنے قانون سازی سے متعلق ایک عملی مسئلہ پیدا کر دیتا ہے۔ کانگریس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ صرف ایک پانچ سالہ پروگرام بنا دے۔

اور اس کی قطعاً پابند ہو کر بیٹھ جائے ۔ اس کے باوجود مارشل پلان، اقوام متحدہ، ایکسپورٹ امپورٹ بینک فارن سپورٹ، پرائس پروگرام، کموڈٹی کریڈٹ، ایڈمنسٹریشن اور سوشل سیکورٹی پروگرام اور ایسی بہت سی چیزوں کو ہماری طرف سے جو طویل مدت امداد دی جارہی ہے ان سے ہمیں عملی نظیروں کا ایک سلسلہ ہاتھ آجاتا ہے ۔

کانگریس کسی سال اخراجات کی منظوری دینے سے انکار کر سکتی ہے ۔ لیکن کسی طویل مدت امدادی پروگرام کے بڑے بڑے مسائل ایک مرتبہ طے پا جانے کے بعد اس قسم کے انکار کا کچھ زیادہ امکان باقی نہیں رہتا ہے بشرطیکہ بین الاقوامی معاملات میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہ ہو گئی ہو ۔

ہماری امداد کی مقدار اتنی ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ نئے دور کی صورت حال کی ضروریات کو پورا کر سکے ۔ ہمارے لئے اپنے وعدے اور یقین دہانیوں میں اس درجہ کمی اور کٹوتی کرنا کہ وہ فوری اور اہم ترین ضروریات کو بھی پورا نہ کر سکیں، ایک انتہائی شدید غلطی ہوگی ۔

اب ہم زیادہ عرصہ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ نئی آزاد شدہ اور جمہوریت پسند قومیں جو کچھ بچا سکتی ہیں اور اندرونی ترقی پر خرچ کر سکتی ہیں، اور جو کچھ کمیونسٹ قومیں بچا اور خرچ کر سکتی ہیں، اس کے درمیان ایک زبردست اور خطرناک فرق موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا ۔

ہماری امداد کا کچھ حصہ یقینی طور پر ٹیکنیکل امداد، اشیاء کے تحائف، اور اشیاء کے قرضوں کی صورت میں ہوگا جن کی نوعیت مختلف قوموں کے سلسلہ میں مختلف ہوگی ۔ ایک ایسے علاقے کے لئے جہاں کے لوگ بھوک سے چلا رہے ہوں، اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا مانگتے ہوں، وہاں ہماری زرعی فاضلات اقتصادی امداد کے ایک بڑے پروگرام کا بیشتر حصہ بن سکتی ہیں اور انھیں بننا چاہیئے ۔ ایک ورلڈ کموڈٹی بینک غالباً اس امداد کے بہترین مصرف کے سلسلہ میں ایک کامیاب ادارہ ثابت ہو سکتا ہے ۔

۴ ۔ جن قوموں کو یہ قرضے دیئے جائیں انھیں اس بات کے لئے آمادہ کیا جانا چاہیئے کہ وہ ان قرضوں کا کچھ حصہ انتظامی تربیت پر بھی صرف کریں ۔ معاہدہ کرنے والی فرم فیکٹری کا منصوبہ بنانے اور اس کی تعمیر، اس کے کارکنان کی تربیت اور خود اس فیکٹری کے چلنے کی اس وقت تک کے لئے ذمہ دار ہوگی جب تک کہ ان کے دیش کے منتظمین اس کاروبار کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتے ۔

سمندر پار کے ان ترقیاتی پروگراموں میں امریکی تاجروں کا مرکزی رول فوری توجہ کا مستحق ہے ۔ ہماری اقتصادی امداد کی ایک اہم ٹیکنیک یہ ہو سکتی ہے کہ ہم ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں

امریکہ اور مغربی یورپ کے ٹکنیکل اور انتظامی ماہرین بھیجیں۔ اس طرح امریکی تاجرین پر بڑی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔

اب ان شرائط پر جو اس مقصد کے لئے عموماً پیش کی جائیں گی، امریکی تاجرین، اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ تاہم امریکی صنعتوں میں آج بہت سے ایسے رہنما موجود ہیں جو آج کے منافع سے قطع نظر کرکے کل کی بقائے لئے کام کرنے کا ایک تعمیری جذبہ رکھتے ہیں۔

۵۔ ہمیں ان بنیادی اقتصادی اصلاحات کے ساتھ اپنے کو مسلسل وابستہ رکھنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے جو ایک ایسے آزاد معاشرے کے قیام کے سلسلے کے لئے ضروری ہیں جہاں جمہوری سیاست کا عمل کامیاب ہو سکتا ہے۔ اگر ہمیں اس کام میں کامیابی حاصل ہو جائے تو غیر ترقی یافتہ ممالک میں ہمارا اثر اور رسوخ تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے گا۔

اس سلسلہ میں کسی ایک مخصوص اور مقررہ اصول کو اپنا لینا ناممکن ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حسن تدبیر سے کام لیتے ہوئے ہم تقریباً ہر قسم کے حالات میں اس کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ امداد پانیوالی قومیں زمین کی مساوی تقسیم، اقتصادی ناانصافیوں کے ازالے، محصولات کے ایک زیادہ جمہوری نظام اور اس جیسی دوسری اصلاحات کی طرف مسلسل ترقی کرتی رہیں — میں اس بات کو ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس لازمی انسانی ترقی کے بغیر صرف پیداواری کامیابیاں یقینی طور پر اس سے کہیں زیادہ سیاسی مسائل پیدا کر دیں گی جتنی کہ وہ حل کر سکتی ہیں۔

۶۔ آخر میں اب اقوام متحدہ کے ذریعہ اقتصادی امداد کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس بات پر بہت کافی زور دیا جا رہا ہے کہ ہمیں اپنی اقتصادی امداد کا بیشتر حصہ اقوام متحدہ کے ذریعہ تقسیم کرنا چاہیئے۔ اقوام متحدہ قرضے کی ایک بین الاقوامی ایجنسی قائم کرکے، جو عالمی بینک کا ایک ادارہ ہوگی، ان ترقیاتی رقوم کی مناسب تقسیم کا ذریعہ نکال سکتی ہے۔ ان رقوم کی تقسیم کے سلسلہ میں کولمبو پلان آرگنائزیشن بھی کافی سہولیات پیدا کر سکتی ہے۔

ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے لئے اقتصادی ترقی کا کوئی مربوط اور جامع منصوبہ بنانے کے لئے فکر اور عمل کے نئے میدانوں میں قدم رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے ہماری حکومت کے شعبۂ انتظامیہ میں ایک موثر قیادت کی ضرورت پیش آئے گی۔ اور رائے عامہ کی تربیت کے ایک جامع منصوبہ پر عمل درآمد کرنا ہوگا جس کو صرف صدر امریکہ ہی کانگریس میں دونوں سیاسی جماعتوں کی حمایت کے ساتھ شروع کر سکتے ہیں۔

○

۲۰- غیر مُلکی امداد کی تقسیم کے معیار

مشرقی کنیکٹیکٹ سے کانگریس کے نئے ممبر کی حیثیت سے مسٹر باؤلز نے ایوان نمائندگان میں اپنی ابتدائی تقریروں میں سے اس ایک تقریر (۲۰ اپریل ۱۹۵۹ء) میں ہمارے فوجی امداد کے پروگراموں کا از سر نو جائزہ لینے پر زور دیا ہے اور اقتصادی امداد کے پروگراموں پر عمل درآمد کے سلسلہ میں بعض نئے اور تسلیم شدہ معیاروں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

مسٹر اسپیکر، امریکی عوام کے دماغ میں اور کانگریس اجنڈے پر غیر ملکی امداد جیسے اہم چند ہی مسائل ہیں۔ اور غالباً یہی وہ مسئلہ ہے جس پر سب سے زیادہ عدم اتفاق، غلط فہمی اور مایوسی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہمیں غیر ملکی امداد کے لئے بھاری رقموں کے حصول کے سلسلہ میں آج جو شدید دشواریاں پیش آرہی ہیں، ان کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری حکومت اس امر کی صحیح وضاحت کرنے میں ناکام رہی ہے کہ اس امداد کی فوری طور پر کیوں ضرورت ہے؟

میں اپنی قوم کے تدبر اور فہم و فراست کو قابل فخر سمجھتا ہوں کہ رائے عامہ معلوم کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ امریکہ کے ۷۰ فیصدی عوام اس بات کے باوجود کہ حکومت اس کے اصل، طویل مدت مقاصد کی وضاحت کرنے میں ناکام رہی ہے، غیر ملکی امداد کے پروگرام کی پر جوش حمایت کرتے ہیں۔

آج حکومت کی طرف سے غیر ملکی امداد کے جو مقاصد اکثر و بیشتر بیان کئے جاتے ہیں، وہ کئی وجوہات سے ناکافی ہیں۔

وہ بین الاقوامی معاملات میں امریکہ کے اصل نصب العین کی وضاحت نہیں کرتے۔
وہ انسانی وقار کے لئے کی جانے والی اس جدوجہد کے ساتھ مطابقت نہیں پیدا کرپاتے جس میں ہم غیر کمیونسٹ دنیا کے تمام تر انسانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔
اس کے علاوہ ان سے امریکی عوام کی اس ذہانت اور سلیقہ مندی کا اظہار بھی نہیں ہوتا جس کے وہ مالک ہیں۔

میوچول سیکورٹی ایکٹ کے انتتاحیہ سے آج یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پالیسی" امداد کے پروگرام کو محض "اس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک کہ (کمیونسٹ) خطرہ ... موجود ہے۔"

اس طرح گویا ہم نے سرد جنگ کے بازار میں شور وغل کرتی ہوئی کمیونسٹ اقلیت کو کانگریس کے الفاظ کی مدد سے غیر ضروری اہمیت دیدی ہے۔

غیر ملکی امداد کے پروگرام کی حمایت میں ایک بظاہر معقول دلیل جو عموماً سرکاری حلقوں کی طرف سے بات چیت میں پیش کی جاتی ہے وہ یہ کہ اس کی مدد سے ہم اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اپنی پالیسیوں کے متعلق اکثریت کی حمایت خرید سکیں گے۔

لیکن، مسٹر اسپیکر، کیا دوسری دلیل بھی اتنی ہی مہمل نہیں ہے جتنی کی پہلی؟ فرض کیجئے کہ کوئی دولت مند آدمی کسی مخصوص امریکی علاقے میں آکر آباد ہوتا ہے اور اس علاقے کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام شروع کرتا ہے اور اس سب معاوضے میں اس بات کا طلب گار ہے کہ وہاں کے باشندے اس کے سیاسی نظریات کی حمایت کریں تو کیا ایسی صورت میں بیشتر اونچے درجے کے سمجھدار لوگ اس پر اس بات کے لئے زور نہیں دیں گے کہ وہ فلاح و بہبود کے سب کاموں کو ختم کر کے وہاں سے روانہ ہو جائے۔

کیا ہم ایشیا اور افریقہ کی نئی اور مختصر اور یورپ اور لاطینی امریکہ کی پرانی قوموں کی طرف سے کسی مختلف ردعمل کی توقع کر سکتے ہیں؟

غیر ملکی امداد کے بارے میں ایک تیسری غلط دلیل یہ ہے کہ کمیونزم صرف بھوکے لوگوں کے لئے کشش کا باعث بنتا ہے بعض اوقات ہم لوگوں کو کہتے سنتے ہیں "چاول کھلا کر آدمی کا پیٹ بھر دو اور سمجھ لو کہ غیر ترقی یافتہ دنیا میں کمیونزم کا خاتمہ ہو گیا۔"

یہ نظریہ کمیونزم کی کشش اور فی الحقیقت انسانی فطرت کے متعلق ہماری سمجھ بوجھ کی انتہا درجہ کی خامی کو ظاہر کرتا ہے۔ ناانصافی اور بے مائگی کے احساس کی بدولت جو مایوسی اور نامرادی پیدا ہوتی ہے وہ صرف بھوک کے مقابلہ میں کمیونزم کے لئے کہیں زیادہ کشش کا باعث بنتی ہے۔

امریکی امداد کے اغراض و مقاصد ہمیشہ ہی ایسے منفی انداز میں بیان نہیں کئے گئے، مثال کے طور پر ۱۹۴۸ء کے فارن اسسٹینس ایکٹ میں، جس نے مارشل پلان کی داغ بیل ڈالی تھی، کانگریس نے بعض ایسے اقدامات کی سفارش کی تھی جن کا مقصد "انفرادی آزادی، آزاد اداروں اور صحیح قسم کی آزادی کے اصولوں کو استحکام بخشتا تھا جن کی بنیاد ایک مستحکم پیداواری جدوجہد پر مبنی ہو۔ اس کے علاوہ چند دوسرے مقاصد، غیر ملکی تجارت کی توسیع، اندرونی مالی استحکام کا پیدا کرنا اور اس کا برقرار رکھنا اور اقتصادی تعاون کو فروغ دینا" تھا۔

لہذا اس پس منظر میں ۱۹۵۴ء میں بیان شدہ اغراض و مقاصد جنھیں اس بل میں بدستور باقی رکھا گیا ہے ہماری شان کے شایان نہیں معلوم ہوتے۔ اس کے محرکات منفی، غیر منصفانہ اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں۔

تاریخ کے اس اہم دور میں ہمیں امریکی عوام کی حیثیت اور مرتبہ کو کسی طرح کم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ وقت آگیا ہے جب ہمیں اپنے تجارتی طور طریقوں کو چھوڑ کر ان کاموں کو انجام دینا چاہیئے جن کو جائز وجوہات کی بنا پر انجام دینے کی ضرورت ہے۔

پھر آخر امریکہ کیا چاہتا ہے؟ ہم ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قوموں اور ان کے وسائل پر قابض ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم کسی قوم کو اپنا تابع فرمان بنا کر نہیں رکھنا چاہتے، نہ ہی ہم دوسروں پر اپنے طور طریقے مسلط کرنے کے خواہش مند ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم خود ایک انقلاب کی پیداوار ہے اور ہم اپنی ابتدا سے لے کر آج تک دنیا کے ہر حصے کے عوام کی حصول اور بقائے آزادی کی جدوجہد اور ان کے اپنے طرز پر ان کے مستقبل کی تعمیر کی کوششوں میں ان کے ساتھ رہے ہیں۔

ہمارے عالمگیر مقاصد آج بھی وہی ہیں جو جیفرسن کے زمانے میں تھے یعنی ایک ایسا امن عالم جس میں دنیا کے تمام انسانوں کو اپنے تہذیب و تمدن، اپنے مذہب اور اپنی قومی صلاحیتوں کے دائرے میں رہتے ہوئے آزادانہ ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔

اب وقت آگیا ہے جب کہ ہمیں امریکی عوام اور دنیا کے سامنے اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمارے میوچول سکیورٹی پروگرام کے اغراض و مقاصد ہمارے تاریخی سیاسی مقاصد، ہمارے جمہوری عقائد کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

مسٹر اسپیکر، میری پہلی تجویز یہ ہے کہ ہمیں ان مقاصد کی صاف طریقہ پر وضاحت کرنی چاہیئے۔ اب میں اپنی دوسری تجویز آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ امریکی فوجی امداد کے ایک حصہ کو جن غلط اور غیر موثر طریقوں سے تقسیم کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں مجھے انتہائی تشویش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب لوگوں کو بھی ہوگی۔

بہت سے موقعوں پر ہم نے بلا کسی ارادے کے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں جن سے کمیونسٹوں کو فائدہ پہنچا ہے اور ان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ جن علاقوں کو یقینی طور پر کمیونسٹ حملہ کا خطرہ درپیش ہے وہاں فوجی مصلحتوں کو اکثر حالات میں ترجیح ملنی چاہیئے۔ مغربی یورپ، یونان، ترکی، یوگوسلاویہ، کوریا، فارموسا اور ویٹ نام ایسے ہی علاقے ہیں، ان علاقوں کے لئے ہماری امریکی فوجی امداد نہایت ضروری ہے۔

لیکن جنوبی امریکہ اور افریقہ کے دو پورے براعظموں اور لبنان سے لے کر مشیلا تک ایشیا کی ایک پٹی میں امن عالم کے لئے جو چیز سب سے بڑا خطرہ بنی ہوئی ہے وہ روسی ٹینک یا جیٹ ہوائی جہاز نہیں ہیں۔ بلکہ اصل خطرہ اقتصادی بدحالی، ناانصافی اور محرومیٔ قسمت کا ہے۔

ان علاقوں کے لئے امریکہ سے اندھا دھند طریقے پر جو فوجی سازوسامان بھیجا گیا ہے وہ ہمارے طویل مدت حفاظتی مفادات کے سلسلہ میں شاید ہی کسی طرح مفید ثابت ہو سکے۔ اور خود ان ممالک کے عوام کے لئے تو کس طرح مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

اس قسم کی فوجی امداد جو مصلحت وقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے دی جائے، اس سے خود ہمارے مقاصد کی نفی ہوتی ہے۔ اس کی بدولت ملک کی اقتصادی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی بدولت ملک کی اندرونی جدوجہد تعمیری کاموں کی طرف سے منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کی بدولت انقلابات برپا ہوتے ہیں۔ بعض صورتوں میں اس کی بدولت ہماری ساری جاہ و منزلت اور اثر و رسوخ ایک ایسی آمریت کے ساتھ وابستہ ہو کے رہ جاتا ہے جس کا بہر طور اب یا آگے چل کر خاتمہ ہونا لازمی ہے۔

امریکہ کی طرف سے ان براعظموں کو جو فوجی امداد دی جا رہی ہے وہ اس صورت میں خاص طور پر نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے جب کہ وہ بعض علاقائی سیاسی مصلحتوں کا خیال کئے بغیر دی جا رہی ہو۔ مثال کے طور پر ہم جس ملک کو امداد دے رہے ہیں اس کے اور اس کے غیر کمیونسٹ پڑوسیوں کے درمیان معمولی سے توازنِ طاقت کو درہم برہم کر کے ہماری یہ اندھا دھند فوجی امداد اس پورے علاقے کو فوجی اور سیاسی استحکام کو خطرہ میں ڈال دے گی۔

ان وجوہات کی بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنی فوجی امداد کے پروگرام کی اثر آفرینی اور کارکردگی کو ہر ملک کے علیحدہ حالات کی روشنی میں پرکھنا چاہیئے۔

میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں اپنے پرانے انتظامات کو بے ڈھنگے پن سے ترک کر دینا چاہیئے۔ اس کے برعکس میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اپنے تمام انتظامات کی نئے مقاصد کی روشنی میں تشکیل کرنی چاہیئے۔ اور وہ تمام معاہدات جو ان معیاروں پر پورے نہ اترتے ہوں، انھیں سرے سے رد کر دینا چاہیئے۔

× × ×

مسٹر اسپیکر، میں اقتصادی امداد کی تقسیم کے سلسلہ میں ایک زیادہ حقیقت پسندانہ طریق کار کی ضرورت پر زور دینا چاہتا ہوں۔

کیا وجہ ہے کہ کسی ایک ملک میں ایک ڈیم نہایت کامیابی کے ساتھ تعمیر کیا جا سکتا ہے اور چلایا جا سکتا ہے جب کہ دوسرے ملک میں اس قسم کے ڈیم کو شدید ناکامی کا سامنا کرنا

پڑتا ہے ؟ کیا وجہ ہے کہ جدید آلات کی مدد سے ایک ملک کی زرعی اور صنعتی پیداوار میں قابلِ قدر اضافہ ہوتا ہے جب کہ دوسرے ملک میں بھیجا ہوا اس قسم کا سامان بندرگاہوں پر پڑا زنگ کھاتا رہتا ہے۔

اکثر صورتوں میں اس سے ان ممالک اور حکومتوں کے باہمی فرق کا پتہ چلتا ہے — اس فرق کا حس کو خاطر میں لانے میں ہم اکثر افسوسناک طریقے پر ناکام رہتے ہیں۔

ذیل میں پانچ ایسے معیار پیش کرتا ہوں جن پر ہماری طویل مدت اقتصادی امداد کے استعمال کے سلسلہ میں ہر ملک کی صلاحیت کو پرکھا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں یہ پانچوں معیار قابلِ عمل بھی ہیں اور انتہائی ضروری بھی۔

۱۔ امریکی اقتصادی قرضوں اور دیگر امدادی رقوم دینے کے سلسلے میں اہم ترین معیار ذاتی قربانی ہونی چاہیئے۔

ہماری طویل مدت امداد کا حق دار بننے کے لئے ہر ملک کو اس بات کا مظاہرہ کرنا ہوگا کہ یہ ملک خود اپنے وسائل کی مدد سے اپنی مدد سے اپنی قومی ترقی کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ اس قسم کا مظاہرہ کرنے کے لئے اس ملک کی حکومت کو اپنے یہاں قومی محصولات کا ایک موثر نظام قائم کرنا ہوگا جس کی بنیاد ادائیگی کی انفرادی صلاحیتوں پر ہوگی، اور پر تکلف اور غیر ضروری چیزوں کی برآمد پر پابندی لگانی ہوگی ورنہ اس کے زرمبادلہ کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہو جایا کرے گا، اور اس بات کی انتہائی اور مسلسل کوشش کرنی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ کاشتکار اپنی زمینوں کے مالک بن جائیں۔

۲۔ بھاری مقدار میں امریکی سرمائے کی امداد کی مستحق بننے کے لئے ایک غیر ترقی یافتہ قوم کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کچھ قابلِ عمل اور جامع اقتصادی اغراض و مقاصد وضع کرے اور ان کے حصول کے لئے اپنے جملہ وسائل کو علیحدہ علیحدہ مدات میں متعین کر دے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ضروری کاموں کو اولیت حاصل ہو جائے گی اور یہ کہ اس ملک کے ترقیاتی پروگرام نجی اور قومی آمدنی کے ساتھ وابستہ ہوں گے اور غیر ملکی امداد کی ضرورت کا زیادہ صحیح طریقے پر اندازہ لگایا جا سکے گا۔

اگر اس ملک میں پہلے سے کوئی قابلِ لحاظ نجی کاروباری حلقہ موجود ہے تو ملکی ترقیات کا کوئی منصوبہ وضع کرتے وقت زراعت، برقی قوت اور رسل و رسائل کی ترقی کے لئے سرکاری اقدامات کے ساتھ ساتھ اس کی طرف بھی توجہ کی جانی چاہیئے۔

۳۔ امریکی امداد کے حصول کا مستحق بننے کے لئے کسی ملک میں ایک ایسی معقول اور موثر سول سروس کا ہونا بھی لازمی ہے جو بدعنوانی سے قطعاً مبرا ہو۔ اعلیٰ درجے کے ماہرین، منتظمین اور ٹیکس

وصول کرنے والوں کی عدم موجودگی میں امدادی رقوم کا بیشتر حصہ اقتصادی منافع کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ طویل مدت امداد کا مستحق ثابت ہونے کے لئے ملک میں ایک مستحکم حکومت کا ہونا ضروری ہے جسے عوام کا پورا پورا اعتماد اور حمایت حاصل ہو۔

ہماری جمہوری روایات کی بدولت امریکہ کے بیشتر باشندے مطلق العنان حکومتوں کے مخالف ہیں، قطع نظر اس کے کہ ان حکومتوں کے سیاسی عقاید یا مسلک کیا ہیں؟ لیکن' مسٹر اسپیکر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں اپنی امداد کو مغربی طرز کی پارلیمانی جمہوریتوں تک ہی محدود کر دینا چاہیئے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اس حقیقت پر غور و خوض کرنا چاہیئے کہ ایک طویل مدت کے گزر جانے کے بعد ایشیا اور افریقہ کی نئی قومیں ہمارے اپنے اداروں کو ناموزوں سمجھنے لگیں گی جن حکومتوں کا میابی کی سب سے کم توقع جا سکتی ہے۔ وہ وہ حکومتیں ہیں جن کی قوت کا دار و مدار زمینداروں اور ساہوکاروں کی ناپائیدار حمایت اور طرفداری پر قائم ہے۔

درمیانے درجے کے اعتدال پسند طبقے اور بائیں بازو کے غیر کمیونسٹ عناصر کی حمایت سے بے نیاز ہو کر ایسی حکومتیں کمیونسٹوں کے لئے اس بات کے دروازے کھول دیتی ہیں کہ وہ خود کو مصلحین وقت کی حیثیت سے پیش کریں اور مشترکہ محاذ بنانے کی اہمیت پر زور دیں۔ جب ہم ان حکومتوں کی حمایت کرتے ہیں اور بالآخر انھیں شکست نصیب ہوتی ہے تو ان کے ساتھ ہی ہمارا اثر و رسوخ اور وقار بھی خطرے میں پڑنے لگتا ہے۔

اتاترک' جنھوں نے تقریباً ایک پشت تک ترکی پر حکومت کی وہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک غیر کمیونسٹ ڈکٹیٹر تھے' ہم نے ہر معاملے میں ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا لیکن چونکہ ان کی حکومت کو عوام کا اعتماد اور حمایت حاصل تھی' اس لئے انھیں تمام ضروری اصلاحات کے نافذ کرنے' عوام کو حکومت کے کاموں میں حصہ لینے کی ترغیب دلانے اور جمہوری طور طریقوں کی بنیاد رکھنے میں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ ایسی حکومت یقیناً ہماری امداد کی مستحق ہے۔

۵۔ آخری بات یہ کہ کسی ملک کو اقتصادی امداد دینے کے سلسلہ میں ہمیں اس کی سیاسی اہمیت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اس کا اندازہ اس ملک کی آبادی' اس کے رقبہ' اس کے وسائل' اس کے اثر و رسوخ اور اس کے جائے وقوع سے لگایا جا سکتا ہے۔

جو ممالک ترقی کے ان ادنیٰ ترین معیاروں پر بھی پورے نہیں اترتے ہیں نرمی کے ساتھ ان

سے یہ کہہ دینا چاہیئے کہ جب تک وہ اپنی ترقی کے لئے اندرونی طور پر خود اپنی کوئی بنیاد قائم نہیں کر لیتے ہیں۔ اس وقت تک انھیں ہم سے کسی امداد کی توقع نہیں رکھنا چاہیئے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں ان کی طرف سے قطعاً منہ موڑ لینا چاہیئے، اس کے برعکس ایسے بہت سے کام ہیں جنھیں ہم ان کی امداد کے سلسلہ میں انجام دے سکتے ہیں اور انجام دیتے رہنا چاہیئے۔

ہمیں اقتصادی نشوونما کے ایک ایسے جامع منصوبے کی تیاری ان کی مدد کرنی چاہیئے جس کی مدد سے وہ خود اپنے وسائل کو اپنے زیادہ سے زیادہ نفع کے لئے استعمال کر سکیں۔

ہمیں ان کو محصولات کے ماہرین، انجنیئر اور دوسرے ٹیکنیکل ماہرین فراہم کرنے چاہئیں جس سے ایک عملی انتظامی ڈھانچہ تیار ہو سکے۔

ہمیں ان کو یہ مشورہ دینا چاہیئے کہ وہ دولت مند طبقے کے کام میں آنے والے پر تکلف سامان کی درآمد پر پابندیاں لگائیں تاکہ ان کا قلیل سا بیرونی زرمبادلہ عوام کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے استعمال ہو سکے۔

ہمیں ان پر زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی ضرورت پر زور دینا چاہئے اور ان کی مدد کے لئے انھیں فنی ماہرین مہیا کرنے چاہئیں۔ جاپان اور فارموسا میں امریکی حکومت نے زمین کی نجی ملکیت کے ایسے پروگرام کو ترقی دینے کے سلسلہ میں پیش رفت کی تھی جس کی بدولت دونوں ممالک کے کاشتکاروں نے زرعی پیداوار اور دیہی جمہوریت کی توسیع کے سلسلہ میں اعلیٰ کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

خاص طور پر اور فوری طور پر ہم ان قوموں کی اس طرح مدد کر سکتے ہیں کہ ان کے بعض ایسے انفرادی کاموں میں ان کی مدد کریں جو بذات خود اس امداد کے اہل ہیں جو ملک کی مجموعی اقتصادیات پر انحصار نہیں رکھتے اور جو واضح طور پر عوام کے مفاد کے لئے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ ملک کے دارالحکومت میں کوئی جدید ہسپتال ہو سکتا ہے جس میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی تربیت کے لئے ضروری سہولیات اور دیہاتی علاقوں سے آنے والے مریضوں کے علاج و معالجے کا ایک شعبہ بھی ہو۔ یا کوئی جدید اور وسعت یافتہ یونیورسٹی یا زرعی تحقیق کا کوئی کالج ہو سکتا ہے۔

میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ اقتصادی امداد کی کوئی شکل ——— جسے سرکاری طور پر "دفاعی مدد" یا "خصوصی امداد" کہا جاتا ہے وہ بعض اہم سیاسی مقاصد، بعض مخصوص اقتصادی اسباب کی بنا پر ضروری ہے تاکہ ایک فوجی اڈے کے استعمال کے کرایہ کے طور پر فوجی امداد کو

رد کیا جا سکے۔

باہمی تحفظ کے اندر اشتراک کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ اس کی کامیابی کے لئے فریقین کی جد وجہد ضروری ہے۔ غیر ممالک میں مقیم امریکی نمائندوں کو اس بات کی اور زیادہ کوشش کرنی چاہیئے کہ فوجی معاملات میں ہماری باہمی تحفظ کی کوششیں صحیح قسم کی اشتراکی بنیاد پر قائم ہوں۔

× × ×

ہمارے غیر ملکی امداد کے بیشتر پروگراموں پر میری اس نقطہ چینی میں فوجی اور اقتصادی دونوں قسم کی امدادیں شامل ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں عراق کی مثال پیش کر سکتا ہوں۔ عراق میں پیش آنے والے واقعات کے ایک مختصر سے جائزے سے اس بات کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے امدادی پروگراموں کو فوجی اندازِ فکر کی بجائے واقعاتی اندازِ فکر اپنانا چاہیئے۔

۱۹۵۳-۵۴ء میں بہت سے موقعوں پر مصر نے امریکہ سے فوجی امداد کی درخواست کی تھی۔ اس درخواست کو دانشمندی سے کام لیتے ہوئے رد کر دیا گیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی بدولت اسرائیل کے ساتھ طاقت کا توازن درہم برہم ہو جاتا اور اس طرح ان دونوں ممالک کے درمیان تصادم کا خطرہ بڑھ جاتا۔

لیکن ۱۹۵۴ء میں امریکی حکومت نے عراق کو فوجی امداد بھیجنا منظور کر لیا، جس کی بدولت نہ صرف یہ کہ اسرائیل کی تباہی کا خطرہ ہی پیدا ہو گیا بلکہ یہ اقدام عرب بلاک کی قیادت کے سلسلہ میں براہ راست مصر کے مفادات کے خلاف بھی ثابت ہوا۔

مصر والوں نے اس بنا پر اس کی مخالفت کی کہ اس امداد کے ذریعہ امریکہ نے عرب ممالک میں پھوٹ ڈالنے کی براہ راست کوشش کی ہے اور یہ کہ اس امدادی پروگرام میں مصر کے مفادات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان احتجاجات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

فروری ۱۹۵۵ء میں بغداد پیکٹ قائم کر کے عراق، ایران، پاکستان اور ترکی کی فوجی قوت میں اور اضافہ کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس کا مقصد خلیج فارس کی طرف روس کے فوجی حملے کو مسدود کرنا ہے لیکن قاہرہ میں دوسرے عرب رہنماؤں نے یہ سمجھ لیا کہ بغداد پیکٹ کا اصل مقصد عراق کو زیادہ سے زیادہ فوجی امداد دینا ہے جب اس فوجی امداد کے خلاف ناصر کے احتجاجات کو ایک بار پھر رد کر دیا گیا تو نومبر ۱۹۵۵ء میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ مصر نے روس کے ساتھ ایک فوجی معاہدہ کر لیا ہے۔

اس علت و معلول کے باہمی تعلق میں صرف یہی عناصر کارفرما نہیں تھے۔ البتہ یہ واقعات کے ایک ایسے سلسلہ کا ایک جزو تھے جو بعد میں مصر پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کے حملہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اس دوران میں امریکہ سے بھاری مقدار میں اقتصادی اور ٹکنیکل امداد بھی عراق کو بھیجی جاتی

رہی۔ جو لوگ عراق کو اس امداد کے دینے کے لئے ذمہ دار تھے انھوں نے کانگریس کے سامنے یہ بیان کیا کہ یہ امداد تیل کے محصولات کے ساتھ مل کر عراق کی اقتصادی امداد کے کام میں مددگار ثابت ہوگی لیکن اس بات کو جاننے کی بہت کم کوشش کی گئی کہ اس مشترکہ کوشش کے نتیجہ میں عراق کے عوام کو بھی براہ راست کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے یا نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آبپاشی کے وہ تمام پروگرام جن سے زمینداروں کی آمدنی میں بہت کافی اضافہ ہوا' ان کی بدولت کاشتکاروں کو کوئی خاص فائدہ نصیب نہ ہو سکا۔

عراق کی بالمقطع قومی پیداوار میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ لیکن چونکہ سامانِ تکلف پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی، چونکہ محصولات کے جدید پروگرام نافذ نہیں کئے گئے تھے اور چونکہ زرعی اصلاحات کو التوا میں ڈال دیا گیا تھا اس لئے آمدنی کے اس اضافے نے غریب اور امیر کے اس فرق میں، جو پہلے ہی تشویشناک تھا' اور اضافہ کر دیا۔ ۱۹۵۸ء کی گرمیوں میں، جیسی کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں نے پیشین گوئی کی تھی، یہ صورت حال ختم ہو گئی اور کرنل قاسم نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی جس سے کمیونسٹوں کو فائدہ حاصل ہوا۔

اس مثال سے یہ بات اچھی طرح واضح ہے جب ہم مبہم قسم کے فوجی تحفظ کے حصول کی کوشش میں سیاسی، اقتصادی، اور مقامی حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو ہمارے مفادات کا کیا انجام ہوتا ہے۔

عراق اور اس قسم کی دوسری مثالیں ہمارے سامنے ایک اور نیا مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ اور وہ یہ کہ اقتصادی امداد کے سلسلہ میں، میں نے جو شرائط پیش کی ہیں۔۔۔ ان غیر ترقی یافتہ قوموں کے رہنماؤں پر کیا اثر ہوگا جن کی دوستی ہمارے لئے ضروری ہے؟ کیا وہ قومیں جو ان شرائط کو پورا نہیں کرتیں وہ میرے تجویز کردہ طریق کار کو اپنے معاملات میں سیاسی مداخلت قرار دیں گی؟

اگر ہم ان قوموں کو اپنی امداد کے معاوضہ میں اس بات کے لئے مجبور کریں گے کہ وہ سرد جنگ میں ہماری ہاں میں ہاں ملائیں تو ان کی طرف سے اس قسم کی مزاحمت یقینی ہے۔ لیکن کیا امریکی عوام کے لئے جو خود اتنے بھاری ٹیکس ادا کرتے ہیں، اس بات کا خواہش مند ہونا کوئی نازیبا بات ہے کہ ان کی امداد کو سلیقے اور دیانتداری کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

ایشیا اور افریقہ میں خود میرا تجربہ مجھے اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ اس مقصد کے لئے میں نے جو اصول تجویز کئے ہیں ان کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیا جائے گا' بشرطیکہ امریکہ کے باتدبیر لوگ سمجھ داری کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کریں اور کانگریس نہایت مضبوطی کے ساتھ ان کی حمایت کرے۔ مجھے اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ بیشتر حکومتوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کرائی جا سکتی ہے کہ یہ

شرائط خود ان کے دوررس مفادات کے لئے ضروری ہیں۔ بلکہ ان میں سے بہت سی حکومتیں ان شرائط کو خوش آمدید کہیں گی اور ان کی مدد سے رجعت پسند عناصر کو اندرونِ ملک تعمیری کاموں کی راہ میں رکاوٹ بننے سے باز رکھیں گی۔

اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ میوچوئل سیکورٹی بل کو اس بات کی صاف صاف وضاحت کرنی چاہیئے کہ ہماری ٹیکنیکل امداد اور ترقیاتی قرضوں کو کن اصولوں کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اگر کانگریس میرے تجویز کردہ اصولوں کو تسلیم کر لیتی ہے تو دنیا کے سامنے ہم اس بات کا مظاہرہ کرسکیں گے کہ ہمارا میوچوئل سیکورٹی پروگرام سرد جنگ کی کسی چال سے بڑھ کر کوئی چیز ہے، اور یہ کہ ہم نے نہایت عزم اور استقلال کے ساتھ ایک ایسے طویل مدت پروگرام کو اپنایا ہے جس کا مقصد دنیا کے ہر خطے کے انسانوں کو امن اور خوش حالی کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی اس دنیا میں اپنی پسند کی حکومتوں کے ماتحت زندگی گزارنے کا موقع عطا کرنا ہے۔

۲۱ - غیر ممالک میں خوراک کے ذخیرے قائم کرنے کی ایک تجویز

سینٹ فارن ریلیشنز کمیٹی کے سامنے ایک بار یہ مسئلہ درپیش تھا کہ امریکہ کے زرعی فاضلات کو بھوکی دنیا کا پیٹ بھرنے کی غرض سے کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ۸ جولائی ۱۹۵۹ء کو مسٹر باؤلز نے کمیٹی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ترقی پذیر ممالک میں خوراک کے بہت سے "فوڈ بینک" یعنی خوراک کے ذخیرے قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

مستقبل کے تاریخ داں جب ہمارے دور کی تاریخ لکھنے لگیں گے تو بہت سی حیران کن چیزیں ان کے علم میں آئیں گی۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب و غریب بات جو ان کے دیکھنے میں آئے گی وہ یہ صورت حال ہوگی کہ ایک ایسے زمانے میں جب کہ دنیا بھوک، سیاسی بحران کی روک تھام اور امن عالم کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہے، امریکہ اپنی نام نہاد زرعی "فاضلات" کے انبار پر بیٹھا ہوا ہے جس کی قیمت کا اندازہ تقریباً ایک کروڑ ڈالر لگایا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط کی اس منزل میں آج ہم اپنی رحمتوں کو "زحمتوں" کے نام سے پکارنے پر مجبور رہو رہے ہیں۔ جب کہ تمام دنیا خوراک کی کمی کی شکار ہے اور تقریباً ہر ملک اس بات کے لئے مجبور

ہے کہ یا تو وہ غیر ممالک سے غلّہ درآمد کرے اور یا پھر بھوکوں مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

سوویٹ یونین کا سب سے بڑا اور واحد مسئلہ خوراک اور کپڑے ہی کا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر آج کوئی مسئلہ چین کی کمیونسٹ حکومت کے زوال کا سبب بن سکتا تو وہ خوراک کا مسئلہ ہے، جسے چینی حکومت ۱، ۱۱ ایکڑ زمین پر ایک کنبے کی پرورش کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے برعکس ہم اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں کہ اپنے اس غلّہ کو کیا کریں۔

ایک اعتبار سے آج ہم ایک عالمگیر پیمانے پر اسی مسئلہ سے دو چار ہیں جس سے ۱۹۳۲ء میں ہمیں خود امریکہ میں دو چار ہونا پڑا تھا جب کہ امریکہ کے ۱۶ ملین بے روزگار مزدور جن میں سے بہت سوں کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی، کام کی تلاش میں روزانہ ایسی دوکانوں کے سامنے سے گزرتے تھے جن میں خوراک کے ذخیرے پڑے سڑتے تھے لیکن یہ مزدور "اقتصادیات کے آہنی قوانین" کی بدولت اس کو کھانے سے معذور تھے۔

بالآخر ہم نے ایک ایسی حکومت کا انتخاب کیا جو اس صورت حال کی مہملیت اور لوالعجبیت کو سمجھتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم یہ جانے بغیر کہ اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے، کبھی کسی ایک طریق کار کا تجربہ کرتے تھے اور کبھی دوسرے کا ـــ اور اپنے تصور میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے ـــ رفتہ رفتہ ہم نے جان لیا کہ "اقتصادیات کے آہنی قوانین" یہ کس طرح تنظر ثانی اور افراط اور ضرورت میں کس طرح یکسانیت پیدا کی جا سکتی ہے۔

آج ہم اس مسئلہ سے ایک عالمگیر پیمانے پر دو چار ہیں۔ کیوں کہ آج دنیا کی دو تہائی آبادی کو پیٹ بھر کر خوراک نصیب نہیں ہو رہی ہے اور امریکہ والوں کے قبضے میں غلّے کے بڑے بڑے ذخیرے موجود ہیں جن کے لئے ان کے پاس کوئی "منڈی" نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اب سے چند سال کے بعد ہم بھی آج کے زمانے کو اسی حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھا کریں گے جس طرح کہ آج ہم ۱۹۳۳ء کی صورت حال کو دیکھتے ہیں جب کہ وافر خوراک کی موجودگی میں امریکہ والے بھوکے رہے تھے۔

بہرحال اب وقت آ گیا ہے جب کہ ہمیں اپنی نام نہاد زحمتوں کو برکتوں میں تبدیل کرنے کا کام شروع کر دینا چاہئے۔ آپ کی کمیٹی کے سامنے جو بل زیرِ بحث ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ یہ اس کام کے سلسلہ میں ہمارے لئے بے انتہا مفید ثابت ہوگا۔

خاص طور پر میں اس بل کے ٹائیٹل نمبرہ کے [۱] تخلیقی اور تعمیری پہلوؤں سے متاثر ہوا ہوں۔

۱۔ دی ہمفری انٹرنیشنل فوڈ فار پیس بل آف ۱۹۵۹ء۔

خوراک کے ذخیروں کا یہ تصور انتہائی اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

مختلف ممالک میں خوراک کے ایسے ذخیروں کے قیام کے مسئلہ پر برسوں تک خود ہماری حکومت، اقوام متحدہ اور دوسرے مقامات پر بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ لیکن ابھی تک کسی معقول معیار پر اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

آج ہم اس بات سے واقف ہیں کہ ہمیں نہ صرف ایک اخلاقی جمود ہی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے بلکہ اقتصادی جمود کا بھی۔ جہاں تک ہمارے ذخائر کا تعلق ہے۔ اگر انھیں استعمال نہ کیا گیا تو وہ خراب ہو جائیں گے۔ خراب ہونے سے روکنے کا مسئلہ ایک مسلسل اور وسعت پذیر مسئلہ ہے۔ اس سال پھر ایک اچھی فصل کے امکان کی بدولت ہم کو جلد ہی ذخیرہ اندوزی کے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ڈرامائی مسائل ڈرامائی حلوں کے متقاضی ہوتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ اس سلسلہ میں عملی قدم اٹھایا جائے۔

میری رائے میں ہمیں اپنی کل زرعی فاضلات کا نصف حصہ غیر ممالک میں متعینہ مقامات پر ذخیرے میں رکھ دینا چاہیئے جو دنیا کے کروڑہا انسانوں کے لئے بھوک اور بیماری کے خلاف ایک ضمانت ہوگی۔ اور ہمارے اس عزم کا ایک سچا مظاہرہ ہوگا کہ ہم اپنے پاس فاضل خوراک ہونے کی صورت میں کسی کو بھوکا نہیں مرنے دیں گے۔

اس قسم کے تیس یا چالیس ذخیرے صرف ہندوستان ہی میں قائم کئے جا سکتے ہیں، پاکستان کے لئے ایسے دس ذخیروں کی ضرورت ہوگی اور باقی ذخیرے مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ، انڈونیشیا، اور لاطینی امریکہ کے کچھ حصوں میں قائم کئے جا سکتے ہیں۔

ہمارا یہ تعمیری اقدام ہمارے لئے کم خرچ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے آج تک جو کچھ اعداد و شمار دیکھنے کا موقع ملا ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ غلّہ کی ایک مخصوص مقدار کو باہر بھیجنے میں جو خرچ آئے گا وہ اسے اس ملک میں تین سال تک محفوظ رکھنے کے مقابلہ میں کہیں کم ہوگا۔ اس طرح جو بچت ہوگی اس میں دوسرے سال کے بعد بہت کافی اضافہ ہو جائے گا۔

لہذا ہمیں اپنے کل غلّے کا نصف حصّہ ممالک غیر میں محفوظ کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیئے کہ یہ ذخیرے صحیح طریقہ پر تعمیر شدہ عمارتوں میں کئے گئے ہیں تاکہ غلّہ خراب ہونے سے محفوظ رہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم اسے امریکہ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں ان حکومتوں کے ساتھ یہ بات طے کر لینی چاہیئے کہ وہ باہمی طور پر طے شدہ شرائط کے ماتحت مقامی کھپت کے لئے ان ذخیروں میں سے غلّہ حاصل کرتی رہیں گی۔

ان میں سے ایک واضح اور ضروری شرط فصل کا واقعی طور پر خراب ہو جانا ہوگی۔ دوسری شرط غلے کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا جس کا سبب غلے کی قلت ہو سکتی ہے تیسری شرط ناکافی غذائیت کے کسی وجہ سے متعلق ہو سکتی ہے۔

دنیا بھر میں امریکہ کی طرف سے قائم کئے جانے والے غلے کے ان ذخیروں کا سلسلہ امریکہ کے عظیم زرعی فاضلات اور دنیا کے ان بھوکے عوام کے درمیان جن کو وہ غلہ پہنچائے گا ایک براہ راست رابطہ کی شکل اختیار کر لے گا۔ اگر اس سلسلہ میں ذخیروں سے نکال کر ان لوگوں تک غلہ پہنچانے کے لئے امریکہ کے مزید جہازوں کی ضرورت پیش آئی تو ہم اس کو بھی خوشی سے قبول کر لیں گے۔

اس بل کے ٹائیٹل ۵ کے نظریہ کو اپنا کر اور جیسا کہ میں نے تجویز کیا ہے اسے اس شکل میں وسعت دے کر ہم دنیا کے کروڑہا انسانوں کو اس بات کی ٹھوس ضمانت دیں گے کہ وہ اور ان کے بچے فاقہ کشی، قحط اور بیماری سے جو تاریخ کی ابتدا کے زمانے سے لے کر آج تک انسان کے لئے مصیبت کا باعث بنی ہوئی ہیں، ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیئے جائیں گے۔

اس کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جو امریکی خارجہ پالیسی کو اس سے زیادہ مفید طریقے پر ایک جدید اور مثبت شکل عطا کر سکتی ہو۔

۲۲ — دیہی ترقی : جمہوری ارتقا کی کنجی

مسٹر باؤلز کا کہنا ہے کہ دیہی علاقوں میں رہنے والی نبی نوع انسان کی مفلس اور نظر انداز شدہ اکثریت کو بیسویں صدی کی برکتوں سے بہرہ یاب کرانا ہماری اقتصادی امداد کا بنیادی مقصد ہونا چاہئے۔ ذیل کا مضمون ۲۴ رمئی ۱۹۶۲ء کو واشنگٹن میں وہائٹ ہاؤس آف کنزرویشن میں مسٹر باؤلز کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے۔

اس سال امریکی تاریخ کی دو اہم دستاویزات کی صد سالہ برسیاں آرہی ہیں ہیں ایسی دستاویزات جن کے ذریعہ یہ یقین دہانی کی گئی تھی کہ امریکہ کی سرزمین فلاح عامہ کے لئے استعمال ہوگی۔ ان دستاویزات میں ۲۰ رمئی ۱۸۶۲ء ہوم سیڈ ایکٹ اور ۲ رجولائی ۱۸۶۲ء کا مورل لینڈ گرانٹ کالج ایکٹ ہے۔

ان قوانین نے ہماری قوم کی مادی ترقی میں جو رول ادا کیا ہے اگرچہ اس کی اہمیت محض ڈرامائی رہے، لیکن ان کی سب سے بڑی اہمیت اس طریقے میں ہے جس سے کہ انھوں نے ہمارے

قومی کردار کی تشکیل کی اور فرد کے وقار میں ہمارے عقیدے کو مزید گہرائی عطا کی۔

انسان کا اپنی زمین کی ملکیت کا حق اور حکومت کا یہ فرض کہ وہ شہریوں کو تعلیم دلا کر انھیں مفید اور کارآمد انسان بنائے، عرصہ سے امریکی روایات کا ایک جزو بنے چلے آتے ہیں۔

کنبہ کا مالک زمین ہونا، کاؤنٹی ایجنٹ، دیہاتی اسکول ہاؤس، خود امدادی کمیونٹی آرگنائزیشن، زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی کے لئے وسائل کا استعمال اور عوام کے لیے کام کرنے والی یونی ورسٹی ان قدیم اور مشترک جمہوری اقدار کی پیداوار ہیں جن کا سلسلہ کئی حیثیتوں سے قدیم نوآبادیاتی دور سے جا ملتا ہے۔

نہ ہی امریکی کاشتکاروں نے کبھی اس چیز کے لئے لڑنے میں پس وپیش کا اظہار کیا ہے جس کو وہ صحیح سمجھتے ہیں۔ حکومت کی ناانصافیوں اور ساہوکاروں اور ریلوے کمپنیوں کے استحصال کے خلاف جد وجہد ہمیشہ سے ہماری دیہی روایات کی ایک خصوصیت بنی رہی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ اصول جو ایک صدی بیشتر ہمارے قومی قوانین کی روح رواں بنے تھے اور اس کے ساتھ ہی امریکی کاشتکاروں کا ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے رضامند ہونا، کیا آج ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ترقی پذیر قوموں کے لئے کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہے۔ بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں کامیاب امریکی پالیسی کے لئے ایک کنجی کا کام دے سکتا ہے۔ آیئے اس پس منظر میں ہم اس چیلنج کا جائزہ لیں جس سے آج ہمیں دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

امریکہ کے بیشتر باشندے ہنگامہ مچاتے ہوئے طالب علم اور احتجاج کرتے ہوئے مزدوروں کو دیکھ کر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی بدحالی اور بے چینی کا اندازہ لگاتے ہیں لیکن ان ترقی پذیر براعظموں کے مستقبل کی تشکیل کا فیصلہ ان گندے دیہاتوں میں ہونے کا زیادہ امکان ہے جہاں ان کی تقریباً ۸۰ فی صدی آبادی رہتی ہے۔

ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی دہقانی اکثریت دو حیثیتوں سے اہم ہے: اول اپنی سیاسی قدر وقیمت کے اعتبار سے اور دوسرے پیدا کرنے اور صرف کرنیوالی کی حیثیت سے انکا جو رول ہے اس کی وجہ سے۔

جب تک کسی ترقی پذیر ملک کی تین چوتھائی آبادی کو ذاتی وقار اور سیاسی کاموں میں حصہ لینے سے محروم رکھا جائے گا وہ تخریب کاری اور آشوب کے لئے کارآمد ثابت ہوتے رہیں گے جب تک ان لوگوں میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہو جاتی کہ وہ اپنی اہم ترین ضروریات کے علاوہ کوئی چیز خرید سکیں اس وقت تک شہری علاقوں کی صنعتی پیداوار کو کوئی ترقی نصیب نہیں ہو سکتی۔

آج کے بہت سے ترقی پذیر ممالک کے دیہی علاقوں پر صدیوں تک انقلابی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے زمینداروں اور ساہوکاروں کا غلبہ رہا ہے اور آج بھی لگان یا مال گزاری کی صورت میں کاشتکار کے پاس سے پیداوار کا تقریباً ۳/۲ حصہ چلا جاتا ہے اور قرضے کی رقموں پر سود کی شرح ۳۰ فی صدی سالانہ سے بڑھ جاتی ہے۔

تاہم اب ہر جگہ اس صورت حال کا مضبوطی سے مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ اب لوگوں کا یہ عقیدہ ہو چلا ہے کہ افلاس اور جہالت بد قسمت لوگوں کے بارے میں خدا کے منصوبے کا کوئی جزو نہیں ہیں بلکہ ایسی لعنتیں ہیں جن کا مقابلہ کر کے ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

لیکن بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو یکجا ہو کر ترقی کی راہ میں حائل ہونے لگتی ہیں۔ اور اس چیلنج پر قابو پانے سلسلہ میں ان نئی حکومتوں کی راہ میں مزاحم ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صنعتی ترقی پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے اور عوام اور اداروں کی طرف بہت کم توجہ کی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ جدید معاشروں کی نشو و نما کے لئے صنعتی ترقی انتہائی ضروری ہے، اور ہمارے اقتصادی پروگرام کا ایک بڑا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ اس قسم کی ترقی کو سہارا دیا جائے۔ لیکن خود ہماری تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف صنعتی ترقی ہی کافی نہیں ہے۔ معاشرے کے سیاسی اعتبار سے مستحکم ہونے کے لئے ایک ایسی ٹھوس دیہی بنیاد کی ضرورت ہے جو دیہقانی اکثریت کو قومی ارتقار کے اصل دھارے کے ساتھ ہم آہنگ کر دے۔

لہذا ہمارے امدادی پروگرام کا ایک کلیدی مقصد شہری اور دیہی ترقی کے درمیان ایک مؤثر اور قابل عمل توازن قائم کرنا ہے۔ ورنہ ہم صنعتی ترقی، برقی پلانٹ، بندرگاہیں اور سڑکیں بنانے پر کتنے ہی بلین ڈالر صرف کر دیں، ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

اگرچہ یہ بات کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے کہ کسی قوم کو مختلف مدارج افزائش میں پیش آنے والے مخصوص مسائل کے سلسلہ میں کوئی عمومی مفروضے قائم کئے جائیں، پھر اس سلسلہ میں ہمارا اور جاپان اور چند دیگر اقوام کا جو تجربہ رہا ہے اس سے دیہی علاقوں کی متوازن ترقی کے بارے میں چند مفید ہدایتیں ملتی ہیں۔ ان ہدایتوں کو مندرجہ ذیل سات عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کسی معاشرے کو طرز جدید میں لانے کے کام میں بہت کچھ اتھل پتھل کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں صنعتی ترقی پر غیر متوازن انداز میں زور دینے کے نتیجہ میں شہری اور دیہی علاقوں میں سیاسی اضطراب اور بے چینی میں کوئی کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہو جائے گا۔

اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ قومی آمدنی کا اضافہ بجائے خود سیاسی استحکام میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ لاطینی امریکہ میں اس کی ڈرامائی مثالیں موجود ہیں۔

فی کس بالمقطع قومی پیداوار کا اوسط نہ بینز یلا میں ...اکی بلندی سے لے کر بولیویا میں ۵۵ ڈالر کی پستی تک دیکھنے میں آتا ہے جب کہ ان دو انتہائی صورتوں کے درمیان سیاسی استحکام کی کوئی صورت نہیں ہے بتیستا کے دور میں کیوبا لاطینی امریکہ میں فی کس آمدنی کے اوسط کے اعتبار سے دوسرے درجہ پر تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ باضابطہ سیاسی نشو ونما کے لئے نہ صرف اقتصادی ترقی ہی ضروری ہے بلکہ سماجی ترقی اور سیاسی اصلاح بھی ضروری ہے۔

۲۔ لہذا زمینی اصلاحات کا ایک جامع پروگرام سیاسی اور اقتصادی دونوں حیثیتوں سے ضروری ہو جاتا ہے جو کاشتکار خود اپنی زمینوں کے مالک نہیں ہیں۔ ان کے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ وہ قاعدے کے ساتھ اپنا کام کریں، اس میں زیادہ سے زیادہ وقت لگائیں اور وہ تمام محنت کریں جو ان کی پیداوار کو بڑھانے کے لئے ضروری ہے۔ ایک کاشتکار جو دوسرے کی زمین کو کاشت کر رہا ہے وہ اپنے کام میں بے پروا اور لاابالی ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ مستقبل کی فکر سے آزاد ہو کر اپنا کام کرتا رہے گا اور اس زمین کی تمام زرخیزی کو تباہ کر دے گا۔ اس کی بدگمانی اور آزادگی عموماً اس کے چہرے سے نمایاں ہوتی ہے۔

لہذا آج جہاں کہیں بڑی بڑی جاگیریں موجود ہیں انھیں ختم کر کے ان کی زمینیں ان لوگوں میں تقسیم کر دینی چاہئیں جو انھیں کاشت کرتے ہیں اور ان کے سابقہ مالکان کو ان کی زمینوں کا معقول معاوضہ مل جانا چاہیئے۔

۳۔ باوجود اس کے کہ وسیع پیمانے پر زمین کی نجی ملکیت ایک مستحکم دیہی معاشرے کے قیام کے لئے ضروری ہے، یہ اس سلسلہ کی محض ایک کڑی ہے۔ کمیونٹی ڈویلپمنٹ کے ایک جامع پروگرام کو بھی اس معاملہ میں مساوی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ جس میں زراعتی ترقی کا ایک پروگرام بھی شامل ہو جس کے مقاصد میں اچھے بیج، جدید آلات، مصنوعی کھاد اور جراثیم کش ادویہ کی بہم رسانی اور بہتر آبپاشی کا اہتمام شامل ہو۔

اگر زمینی اصلاحات کے ساتھ ساتھ اس قسم کا کوئی کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروگرام عمل میں لایا گیا تو یقیناً پیداوار میں بہت کم اضافہ ہو سکے گا۔ اور اس قسم کے پروگرام کی موجودگی میں، جیسا کہ جاپان میں ہے، فی ایکڑ پیداوار میں لازمی طور پر اضافہ ہوگا۔

کمیونٹی ڈویلپمنٹ کی کوششوں میں یہ کام شامل ہونا چاہیئے کہ وہ مقامی لوگوں کو اسکول اور سڑکیں بنانے کی ترغیب دلائیں جس میں مزدور بغیر کسی معاوضے کے کام کریں۔ اسے چاہیئے کہ وہ صحت کے اعلیٰ معیار قائم کرنے کی کوشش کرے اور دیہاتوں کی اندرونی خودمختاری کی

حوصلہ افزائی کرے۔
اس سلسلہ میں وہ ذرائع جن کی مدد سے ترقی کی منزلیں طے کی جائیں گی وہ اس ترقی سے زیادہ اہم ہیں جو اس طرح ہمیں نصیب ہوگی۔ مثال کے طور پر اسکول کی ایک کچی عمارت یا کوئی سڑک جسے خود دیہات والوں نے مل جل کر بنایا ہے وہ جملہ متعلقین کے دل میں اس بستی کے سدھار کے کاموں میں حصہ لینے کے لئے ایک نئی اُمنگ اور ولولہ پیدا کرتی ہے۔
لہٰذا اس قسم کے کام دیہات کے باضابطہ ارتقا میں حکومت کی تعمیر کردہ اسکول کی اس پختہ عمارت اور سڑک سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوں گے جن کی تعمیر میں خود دیہات کے باشندوں نے کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔

۴۔ معمولی شرح سود پر دیہی قرضوں کی فراہمی کمیونٹی ڈیویلپمنٹ کا ایک اور اہم عنصر ہے۔ اس قسم کے قرضوں کی بدولت کاشتکاروں کو ساہوکاروں اور مہاجنوں کے پنجے سے نجات مل جائے گی اور ان کو کھاد اور کاشتکاری کے سلسلہ میں معمولی ساز و سامان کرنے کے لئے آسان شرائط پر روپیہ بھی مل جائے گا۔

۵۔ پانچویں بات یہ کہ زرعی پیداوار کی فروخت کے لئے جمہوری بنیادوں پر مارکٹنگ کوآپریٹیوز قائم کی جانی چاہئیں۔ ان کوآپریٹیوز کی بدولت درمیانی بیوپاری کا نفع بچ رہے گا اور اور کاشتکار کو مال کی فروخت سے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول ہو سکے گی۔ جاپان میں اس قسم کی ۹ ہزار کوآپریٹیوز قائم کی گئی ہیں۔

۶۔ ترقی پذیر ممالک کو اس بات کی ترغیب بھی دلائی جانی چاہیئے کہ وہ اپنے فوجی بجٹ کا کچھ حصہ امریکہ کے فوجی انجینیری دستوں کی طرح، انجنیروں کے کچھ دستے قائم کرنے پر بھی صرف کرے۔ انجنیروں کے یہ دستے پل، سڑکیں، اسکول اور ہسپتال قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ دیہات کے ان لوگوں کے ساتھ بھی رابطہ قائم کر سکیں گے جن کی آزادی کی حفاظت کے وہ خواہشمند ہیں۔

۷۔ ساتویں اور آخری بات یہ کہ صحت مند دیہی معاشروں کی تعمیر کے کام میں ترقی پذیر ممالک کی مدد کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمارے کامیاب زرعی تجربے کی تمام باتیں ان کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔
مثال کے طور پر کاشتکار کی وہ گراں قیمت اور پیچیدہ مشینری جو بیشتر امریکی کھیتوں پر استعمال ہوتی ہے، اس کا بنیادی مقصد مزدوری کے مصارف میں کمی کرنا ہے نہ کہ پیداوار میں اضافہ کرنا۔

نسبتاً کم آبادی والے ممالک مثلاً افغانستان اور افریقہ کے بعض ممالک میں اس قسم کی مشینری مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان، پاکستان، سیلون اور بہت سے ترقی پذیر ممالک میں جہاں دیہی مزدوروں کی ایک وافر تعداد موجود ہے، زرعی کاروبار نہایت کم قیمت پر معمولی آلات اور بیلوں اور بھینسوں کی مدد سے چلایا جا سکتا ہے۔

چاول، گیہوں اور سبزیوں کی دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار جاپان اور مصر کے تین اور چار ایکڑ والے کھیتوں سے زیادہ ہوتی ہے جہاں پر ہر کھیت میں ایک نجی باغ کی طرح انفرادی کاشتکاری ہوتی ہے۔

×× ×× ××

اس کے باوجود کہ ہم نے ایک امید افزا آغاز کیا ہے، ابھی ہمیں اس سلسلہ میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دیہی علاقوں کے سدھار کا مطالبہ ایک ٹھوس مطالبہ ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

یہ صورت حال امریکہ کے ہر صاحب فکر باشندے کے سامنے ایک اہم سوال کھڑا کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ کہ کیا ہم اپنے وقت کے بے مثال انقلابی تغیرات میں تخلیقی حیثیت سے کوئی حصہ لے سکتے ہیں، ایسے تغیرات میں جن کی بیشتر مراعات یافتہ لوگ پوری قوت کے ساتھ مخالفت کریں گے لیکن جن کی بدولت بنی نوع کی اکثریت کو کسی قدر زیادہ خوراک، کسی قدر زیادہ مواقع، ان کے بیمار بچے کے لئے ایک ڈاکٹر اور ذاتی وقار کا ایک احساس نصیب ہو سکے گا؟

تمام دنیا میں کاشتکار کی بیداری کی کیفیت کئی سال ہوئے ایڈون مارکھم نے ملٹ کی مشہور تصویر "بیلچے والا" پر خیال آرائی کرتے ہوئے ایک نظم کی صورت میں بیان کی تھی:

صدیوں کے بوجھ سے اس کی کمر خم ہے اور وہ
اپنے بیلچے پر جھکا ہوا زمین کو تک رہا ہے
اس کے چہرے سے ادوار کا کھوکھلا پن نمایاں ہے
اور اس کی پیٹھ پر دنیا کا بوجھ لدا ہوا ہے
کون ہے جس نے اسے حزن و انبساط سے یوں بیگانہ کر کے
ایک ایسی چیز بنا دیا ہے کہ اس کے دل میں نہ کوئی غم باقی رہا ہے اور نہ کوئی اُمید؟
اے تمام ممالک کے آقاؤں، مالکوں، اور حکمرانوں،
مستقبل اس شخص کا کس طرح سامنا کرے گا؟
ایسے وقت میں جب کہ ہر ملک میں انقلاب کی آندھیاں چل رہی ہیں۔

اس کے تند و تند سوالوں کا کس طرح جواب دیا جا سکتا ہے؟
ان بادشاہوں اور بادشاہتوں کا کیا انجام ہوگا
جو اس شخص کو اس کی موجودہ حیثیت میں لاتے ہیں
جب صدیوں کی خاموشی کے بعد یہ گونگا
اور دہشت ناک انسان دنیا کا جائزہ لینے کے لئے اپنا سر اُٹھائے گا۔

اس وقت امریکہ کے کھاتے پیتے اور مالدار لوگ اس شخص سے کیا کہیں گے؟ کیا ہمارے اندر اس کو سمجھنے اور اس کے چیلنج کا موثر طریقے پر مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہے؟
موجودہ صدی کی آئندہ دہائی بیشتر اس سوال کے بارے میں ہمارے جواب سے تشکیل پائے گی۔

× × ×

حصّہ سوم

ترقی پذیر برّ اعظم

ایشیا اور افریقہ کی طرح لاطینی امریکہ میں بھی ہمارے سامنے انتخاب کی دد صورتیں ہیں۔ یعنی شہریت یا زرعی غلامی، اُمید یا مایوسی، تدریجی سیاسی ارتقاء یا خونیں ہنگامہ آرائی۔ ان میں سے ہم کو ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ اگر ہم اس چارۂ کار کو سمجھنے سے قاصر رہے یا ان نئے اور اہم عناصر کی حوصلہ افزائی نہ کرسکے، جو قیادت کا پُرزور دعویٰ کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ تباہ کُن ثابت ہوگا۔

۲۳ - ہندوستان کے لئے امریکی امداد کے اصل مقاصد

ہندوستان میں بائیں بازو کے ترجمان ہفت روزہ بلٹز کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے جولائی ۱۹۵۲ء میں امریکی سفیر مسٹر چیسٹر باؤلز نے چند ایسے اہم سوالات کے جوابات دیئے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں امریکہ کی کتنی مخالفت تھی اور ایشیائی عوام کے دلوں میں "امریکی مداخلت" کے متعلق کتنے شکوک اور شبہات پائے جاتے تھے۔

نمائندہ بلٹز:۔ امریکہ نے ہندوستان کو جو اقتصادی امداد دینی شروع کی ہے اس کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا یہ اقتصادی امداد ہندوستان کو اس لئے دی جا رہی ہے کہ اس کی بدولت اس ملک میں امریکی خارجی پالیسی کے اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو یا یہ محض ایک انسانی ہمدردی کے طور پر ہے؟

مسٹر باؤلز:۔ اس سے قبل کہ میں آپ کے اس سوال کا جواب دوں میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ اگر ہندوستان کا ایک ایک کمیونسٹ کل کو اپنی سیاسی چالوں سے باز آجائے، تب بھی ہندوستان کے مسائل جوں کے توں باقی رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسائل کمیونسٹوں کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ البتہ اس وقت وہ ان مسائل سے فائدہ اُٹھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔

اب آپ اپنے سوال کا جواب سُنیئے:۔ ابھی کمیونسٹوں کے متعلق یہاں یا دُنیا کے کسی اور حصے میں یہ کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ امریکہ کے باشندوں نے مختلف صورتوں مثلاً امریکہ کے مذہبی اداروں اور فلاح و بہبود کی انجمنوں کی طرف سے غیر سرکاری ہندوستان کو امداد بھیجنی شروع کر دی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے امریکنوں نے انفرادی طور پر بھی لاکھوں اور کروڑوں ڈالر ہسپتالوں اور اسکولوں کی تعمیر اور ہندوستانی عوام کے لئے خوراک اور دوائیں خریدنے میں مدد دینے کی غرض سے بھیجے تھے۔

اس سال تقریباً دس لاکھ ڈالر مالیت کی دوائیں اور غلہ عطیات کے طور پر ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ غیر سرکاری اداروں کی طرف سے ۱۱۷ ایمبولینس کاریں ہندوستان کے

ہسپتالوں کے لئے بطورِ عطیات بھیجی گئی ہیں اور پھر ان کی کوئی خاص تشہیر اور نمود و نمائش بھی نہیں کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا کہ اس کے پس پردہ انسانی امداد اور ہمدردی کے علاوہ کوئی اور خواہش یا جذبہ کارفرما نہیں۔

جہاں تک حکومت امریکہ کی طرف سے ہندوستان کی امداد کا تعلق ہے، ہمیں اس بات کی بڑی سنجیدہ توقعات ہیں کہ ہندوستان اس امداد سے صحیح طور پر کام لے کر آنے والے چند سالوں میں ایک ایسی حقیقت کا مظاہرہ کر سکتا ہے جس کا اس سے قبل کبھی واضح طور پر مظاہرہ نہیں کیا گیا ہے۔ یعنی یہ حقیقت کہ ایک ترقی پذیر ملک کی جمہوری حکومت اپنے عوام کو نہ صرف شخصی آزادی، آزادیٔ رائے، آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ مذہب جیسے بنیادی حقوق کی ہی ضمانت دے سکتی ہے، بلکہ انھیں زندگی کے اعلیٰ ترین معیار بھی عطا کر سکتی ہے، ملک کی زرعی پیداوار کو بھی بڑھا سکتی ہے اور فولاد سازی، برقی قوت، کیمیاوی اشیاء اور دوسری اہم صنعتوں کی توسیع کے لئے مستحکم بنیادیں بھی قائم کر سکتی ہے۔

اگر ایشیا کی یہ نومولود جمہوریت آزمائش کی اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی تو انجام کار ایشیا میں جمہوریت ناکام ہو جائے گی۔ ایشیائی جمہوریت کی سب سے بڑی تجربہ گاہ یہی ہندوستان ہے۔ اسی سبب سے آج ہم امریکہ والے ہندوستانی عوام کو اپنی ان عظیم مساعی میں کامیاب بنانے کے لئے وہ سب کچھ مدد دینے کو تیار ہیں جو ہمارے لئے ممکن ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کو اقتصادی امداد دینے کے سلسلہ میں ہمارا اصل مقصد یہی ہے۔

نمائندہ بلٹز:۔ کیا واقعی آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ ٹیکنیکل کوآپریشن ایڈمنسٹریشن اور چار نکاتی امدادی پروگرام کے تحت ہندوستان کو جو معمولی امدادی رقوم دی گئی ہیں ان سے ہندوستان کی معاشی ترقی میں معقول مدد ملے گی؟ کیا یہ کہنا غلط ہو گا کہ یہ معمولی درجہ کی معاشی امداد امریکی پروپیگنڈے کا بہترین ذریعہ ہے؟

مسٹر باؤلز:۔ ہم نے گزشتہ ماہ جنوری میں، جنوری سے ۳۰ جون تک خرچ کرنے کے لئے جو امدادی رقم منظور کی تھی وہ معمولی رقم نہ تھی۔ بلکہ ۵ کروڑ چالیس لاکھ ڈالر کی گرانقدر رقم تھی۔ اس رقم سے آج ایک لاکھ ٹن کیمیاوی کھاد مہیا کیا جا رہا ہے۔ دو ہزار دو سو ٹیوب ویل بنانے میں مدد ملی جا رہی ہے، جن سے آٹھ لاکھ ایکڑ زمین سیراب کی جا سکے گی۔ یہ تاریخ میں ٹیوب ویل تعمیر کرنے کا عظیم ترین منصوبہ ہے — اور اسی رقم سے ڈی۔ ڈی۔ ٹی مہیا کر کے ہندوستان سے ملیریا کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہمارا امریکی امداد کا پروگرام ہلکا ساز و سامان بنانے والے کارخانوں کو چالیس پچاس

ٹن فولاد مہیا کرے گا۔ اس سے ہندوستان کی صنعت ماہی گیری کو جدید طرز پر لانے کا عظیم الشان کام شروع ہوگا۔ اسی پروگرام کے تحت مشینی ہل اور آپ کے عظیم الشان دریائی وادی کے منصوبے کے لئے زمین شکن آلات کے مہیا کرنے اور متعدد دوسرے منصوبوں کے سلسلہ میں مدد دی جائے گی۔

کچھ کیمیاوی کھاد یہاں پہنچ گیا ہے، ڈی۔ ڈی۔ ٹی یہاں موجود ہے اور دیہات میں کام کرنے والے کارکنوں کی آمد و رفت کے لئے جیپ کاریں اسی موسم خزاں میں یہاں پہنچنے والی ہیں۔ ان تمام ترقیاتی منصوبوں پر ہماری امدادی رقوم ہندوستان کے ان اخراجات کے برابر ہیں جو آپ روپیہ کی صورت میں کرتے ہیں۔ بیرونی ملکوں میں جو کچھ خریدا جاتا ہے، ہم اس کی قیمت ڈالر میں ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے حسب ضرورت خام اشیاء، مزدور اور دوسری متعلقہ ضروریات آپ مقامی طور پر مہیا کرتے ہیں۔

نہیں، میں اسے حقیر امداد نہیں کہہ سکتا اور یہ بات کہ ہندوستان نے اپنے عوام کے مسائل کو ایک پُرزور اور مؤثر طریقے پر جمہوری طریقوں سے حل کرنے کا آغاز کیا ہے، کوئی پروپیگنڈہ نہیں ہے۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے کمیونسٹ صفحہ ہستی سے نہیں مٹا سکتے ہیں۔

نمائندہ بلٹز: اس کی وجہ کیا ہے کہ امدادی پروگرام میں سارا زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ہندوستان زراعت کے میدان میں ترقی کرے؟ اس کے برعکس ہندوستان کی صنعتی ترقی پر کیوں زور نہیں دیا جاتا؟

مسٹر باؤلز:۔ یہ ایک معقول سوال ہے میرے بہت سے دوست امریکہ میں بھی مجھ سے یہی سوال کرتے رہے ہیں۔ صورت حال اس طرح ہے:

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تو ہندوستان کی کچھ اعلیٰ درجہ کی زرخیز زمینیں، جن میں اناج اور کپاس کی پیداوار ہوتی تھی، ہندوستانی علاقے سے نکل گئیں۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اب ہندوستان کو تیس لاکھ ٹن سے پچاس لاکھ ٹن تک اناج اور کپاس کی ۵ لاکھ سے زائد گانٹھیں ہر سال خریدنی پڑتی ہیں تاکہ ملک کے کارخانے چالو رہیں اور عوام کو پیٹ بھر کھانا نصیب ہو سکے۔

ہندوستان کا منصوبہ بندی کمیشن، جس نے پانچ سالہ پلان تیار کیا ہے، وہ محسوس کرتا ہے اور معاشیات کے دوسرے ماہرین کی رائے بھی یہی ہے کہ ہندوستان کا اولین مسئلہ گندم اور دوسرے غذائی اناج اور کپاس کے معاملہ میں خود کفیل ہونا ہے۔

گزشتہ سال صرف امریکہ سے تیس لاکھ ٹن اناج ہندوستان میں برآمد کیا گیا تھا۔ اس غلہ

کی قیمت ادا کرنے کے لئے ہندوستان کو ساٹھ کروڑ ڈالر کی مساوی رقم بیرونی زرمبادلہ
کی صورت میں صرف کرنی ہے۔ ہندوستان نے اس خطیر رقم میں سے تقریباً ایک تہائی
رقم امریکہ سے بطور قرض حاصل کی جسکی ادائیگی ۱۹۵۷ء سے شروع ہوکر بالاقساط
تیس سال میں کی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے غیر ملکی زرمبادلہ کا ایک بڑا حصہ ریلوے لائنوں کی تعمیر، فولاد
کے کارخانوں اور کیمیکل اشیاء بنانے والی صنعتوں کے قیام پر صرف ہونے کی بجائے خوراک
فراہم کرنے پر صرف ہو رہا ہے جو ہندوستان کے عوام کو زندہ رکھنے اور کسی قدر ادنیٰ معیار
زندگی پر زندہ رکھنے کے لئے درکار ہے۔ اگر آنے والے چند برس میں ہندوستان کی غذائی
پیداوار اور کپاس ملک کی ضرورت کے لحاظ سے کافی ہوجائے تو پھر یہی غیر ملکی زرمبادلہ
فولاد سازی کے کارخانوں، چھوٹی موٹر کاروں کی صنعتوں اور نقل و حمل کا بہترین نظام
قائم کرنے، نیز ملک کی دوسری ترقیاتی ضرورتوں پر خرچ کرنے میں کام آسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے اقتصادی منصوبہ بندی کے ماہرین سمجھتے ہیں کہ ہمارا پہلا قدم زرعی
اصلاح و ترقی اور دوسرا قدم صنعتی ترقی ہونا چاہیئے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ خیال
درست ہے۔

نمائندہ ملیٹز: کیا یہ درست نہیں ہے کہ امریکی کانگریس ہندوستان کی امداد کے لئے بھاری رقم
کی منظوری دینے سے پہلے ہی اس بات کی واضح شہادت حاصل کر لینا چاہتی ہے کہ ہندوستان
اب نہیں تو آئندہ چل کر امریکی خارجہ پالیسی کی توقعات کو پورا کرے گا؟

مسٹر باؤلز:- اگر ہم ہندوستان جیسے جمہوری ملک کو خریدنے کی کوشش کرتے تو بھی اسے خرید نہیں سکتے
تھے۔ اور ہم ایسی کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو ایک
آزاد قوم کی حیثیت سے اس کے مقاصد کی تکمیل میں مدد دیں۔ ہم ہندوستان سے یہ نہیں
کہتے کہ ہماری امداد کے عوض ہندوستان ہمارا ساتھ دے یا ہم سے اتفاق رائے کرے۔
بعض اوقات ہندوستان ہم سے اتفاق کرے گا اور بعض اوقات نہیں کرے گا۔
ہمارے اور ہندوستان کے درمیان بعض اختلافات بھی پیدا ہوسکتے ہیں اور ان میں سے بعض
اختلافات ہم دونوں کے لئے مفید بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ ہماری بنیادی غرض و غایت یہ ہے
ہندوستانی عوام کو ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہوئے ترقی اور خوشحالی نصیب ہو جس میں
انفرادی حقوق اور انسانی آزادی کا پورا پورا تحفظ کیا گیا ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان اس
مقصد کے حصول میں ضرور کامیاب ہوگا۔

نمائندہ بلٹز :- آپ نے حالیہ چند برسوں میں ایشیا پر اربوں ڈالر صرف کئے ہیں، تاہم سارے ایشیا میں کوئی ایک ملک بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس گراں قدر امریکی امداد کا احسان مند ہو؟ آپ اس تضاد یا غلطی کی کس طرح وضاحت کریں گے؟

مسٹر باؤلز :- میں پھر آپ سے کہتا ہوں کہ ہم ہندوستان یا ایشیا کے کسی اور ملک کو اپنا احسان مند نہیں بنانا چاہتے۔ لیکن اگر اس سوال سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ ایشیائی عوام امریکہ کی طرف غیر دوستانہ انداز رکھتے ہیں تو میں آپ کو مشورہ دوں کا آپ اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کریں۔ میں نے ہندوستانی عوام کے دلوں میں امریکہ کے لئے بڑی گرم جوشی اور دوسروں سے کہیں زیادہ دوستانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ دوستانہ جذبات مجھے ہندوستان میں ہر مقام پر نظر آئے ہیں جن میں وہ تیس یونی ورسٹیاں بھی شامل ہیں جہاں مجھے بولنے اور اظہار خیال کرنے کا موقع ملا ہے۔

میں ہندوستان کے بعض ایسے دور افتادہ علاقوں کے دیہاتی عوام کے گھروں پر گیا ہوں، ان کے ساتھ بات چیت کی ہے اور چائے بھی پی ہے، جہاں غیر ملکی باشندے بہت کم پہنچ پاتے ہیں۔ عوام نے ہر مقام پر میرا انتہائی گرم جوشی اور گہرے دوستانہ جذبات کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔ ان لوگوں میں سے کچھ بیشک تعلیم یافتہ تھے لیکن اکثر غیر تعلیم یافتہ تھے جو ہندوستان اور خود اپنے لئے بعینہٖ انھیں چیزوں کے خواہش مند تھے جن کے ہم امریکہ میں خواہشمند ہیں —— یعنی ایک ایسی صاحب عقل اور امن پسند دنیا کا وجود جس میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک باوقار زندگی گزار سکیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب والوں کی طرف سے ایشیائی نو آبادیوں کے ساتھ نسلوں تک نازیبا سلوک ہوتا رہا ہے۔ ان حالات میں اگر میں خود بھی ایشیا کا باشندہ ہوتا تو اس نو آبادیاتی نظام کا سخت مخالف ہوتا، جس کے محکوم رہتے ہوئے ایشیائی عوام نے صدیوں تک زندگی گزاری ہے۔ لیکن مغرب کے سابقہ طرز عمل کا ہمارے موجودہ باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں ہے۔ آپ کبھی میرے ساتھ دورے پر چلئے تو آپ کو خود اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

نمائندہ بلٹز :- کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ امریکہ کو ہمیشہ باؤ ڈائی جیسے رجعت پسند اور ناپسندیدہ دوست کیوں میسر آتے ہیں، جن کے لئے ان کے عوام کے دلوں میں مطلق کوئی جگہ نہیں ہے؟ کیا آپ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ ایشیا میں امریکہ کے نامقبول ہونے کا سبب یہی ہے؟

مسٹر باؤلز :- دوسرے ممالک کے رہنماؤں کا انتخاب کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ رہنما مختلف طریقوں سے چنے گئے ہیں، جن میں سے بعض طریقے اچھے ہیں اور بعض خراب۔ بعض شخصیتوں

کا انتخاب جمہوری طرز پر ہوا ہے، مگر بعض کا انتخاب بالکل غیر جمہوری جمہوری طریقوں سے عمل میں آیا ہے۔ تاہم میں اتنا کہوں گا کہ آج ہم اس انقلابی دنیا میں رہتے ہیں، اس میں رجعت پسند عناصر، خواہ وہ دائیں بازو کے فسطائیت پرست ہوں یا بائیں بازو کے کیمونسٹ زیادہ عرصہ تک اپنا موجودہ اقتدار برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ دائیں بازو کی رجعت پسندی فنا ہونے والی شے ہے اور وہ لازمی طور پر فنا ہو کر رہے گی۔ ساتھ ہی بائیں بازو کے رجعت پسندوں کو یا تو آخر کار اپنے موجودہ سیاسی طرزِ عمل میں اعتدال پیدا کرنا ہوگا یا پھر وہ بھی اپنے اندرونی تضادات کی بدولت پارہ پارہ ہو کر ختم ہو جائیں گے۔

دورِ حاضرہ کی افسوسناک سرد جنگ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بعض اوقات ہمیں ایسی دشوار صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے جس میں ہمیں بعض ایسے سمجھوتے کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جنھیں ہم پسند نہیں کرتے۔ لیکن انجام کار ان اصولوں کی بقا کا انحصار ایک ایسی قوی اور اعتدال پسند تحریک پر ہے، جو دائیں اور بائیں بازو کے رجعت پسندوں کو کلیتہً مسترد کر دے گی۔ اور اس کے پیشِ نظر کچھ اعلیٰ تعمیری مقاصد مثلاً زرعی اصلاحات کا نفاذ، مزدوروں کے لئے کم سے کم مناسب اجرتوں کا تعین، عوام کے لئے اعلیٰ معیارِ زندگی کا حصول اور ہر فرد کو زیادہ وسیع معنوں میں سماجی تحفظ مہیا کرنا، صحتِ عامہ کے لئے بہتر سہولتیں اور تمام اشخاص کو رنگ ونسل، مذہب اور ذات کے امتیاز کے بغیر ترقی کرنے کے زیادہ وسیع مواقع فراہم کرنے ہوں گے۔

یہی وہ سیاسی تحریک ہے جس پر امریکہ کے بیشتر باشندے گہرا اعتقاد رکھتے ہیں اور جس کی ہم ہندوستان میں اور سارے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں حمایت کریں گے اور بالآخر ــــــ یہی تحریک کامیاب ہوگی۔

× ×　　× ×　　× ×

۲۴ - ایشیا اور امریکی خواب

۱۹۵۳ء کے اوائل میں مسٹر چیسٹر باؤلز امریکی سفیر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ہندوستان سے امریکہ واپس پہنچے تو آپ نے امریکہ کی اہم ریاستوں میں تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں آپ نے ایشیا سے متعلق ایک ایسی نئی امریکی حکمت عملی وضع کرنے پر زور دیا، جو ایشیا کی ایک نئی سیاسی بیداری کی ضروریات سے ہم آہنگ ہو۔ کمیونٹی چرچ، نیویارک میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر باؤلز نے ایشیا کے بارے میں امریکہ کی اور زیادہ تعمیری حکمت عملی کے لئے آٹھ بنیادی نکات پیش کئے ہیں۔

ہم گزشتہ دس سال کی محنت و کاوش کے بعد یورپ کے لئے امریکی پالیسی وضع کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی معقولیت پسند اور قابل عمل پالیسی ہے، جسے آج ہماری ایک عظیم اکثریت کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ یہ پالیسی شمالی اوقیانوس پر آباد اقوام کے باہمی اور قریبی تعلقات اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہم اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کریں گے کہ کوئی اجنبی طاقت یورپ کے اوپر چڑھی چلی آئے اور اس پر اپنا اقتدار قائم کرے۔

لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے آٹھ سال بعد ابھی تک ایشیا کے بارے میں امریکہ کی کوئی واضح حکمت عملی وجود میں نہیں آئی ہے۔ اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں، کہ اس کے لئے کون قصوروار رہے ؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے امریکہ کی دونوں سیاسی پارٹیاں ذمہ دار ہیں۔ بہر حال، اس وقت ایک اہم سوال یہ ہے کہ ہمیں اس بارے میں آئندہ کیا کرنا ہے؟

میں یہاں ایسے آٹھ بنیادی نکات پیش کروں گا کہ جن پر میں سمجھتا ہوں کہ ایشیا کے لئے امریکہ کی تعمیری حکمت عملی کو مبنی ہونا چاہیئے۔

اول ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ مختلف بین الاقوامی سیاسی مسائل کے بارے میں ایشیا والوں کا ایک اپنا نقطۂ نظر بھی ہے۔

اس ایشیائی نقطۂ نظر کو مجھے لبنان، لنکا، ہندوستان، برما، ویٹ نام، فلپائن اور جاپان میں ایسے لوگوں کے ساتھ میل ملاقات کے دوران سمجھنے کا موقع ملا جو بالکل مختلف زبانیں بولتے ہیں اور ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر رہتے ہیں۔

یہ کسی اعتبار سے کوئی ناقابل فہم بات نہیں ہے بلکہ ایک سیدھی سادی اور صاف بات ہے، جسے ایشیا کے پس منظر میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

دوسرے ایشیا کا مستقبل بالآخر ایشیائی عوام ہی متعین کریں گے۔ ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ ایشیائی عوام کو اپنے مستقبل کا صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دینے کے لئے تعمیری عناصر کی حوصلہ افزائی اور تخریبی عناصر کی حوصلہ شکنی کریں، مگر جہاں تک مستقبل کا سوال ہے ایشیا کے مستقبل کا فیصلہ خواہ وہ بہتری کے لئے ہو یا بدتری کے لئے امریکی مدبرین واشنگٹن میں بیٹھ کر نہیں کریں گے، بلکہ ایشیائی عوام کے رہنما ٹوکیو، جاکارتا، رنگون، نئی دہلی اور دوسرے ایشیائی دارالحکومتوں میں ہی کریں گے۔

تیسری بات یہ کہ ایشیا کا انقلاب محض ایک نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔

ایشیا کا یہ انقلاب تین ایسے قومی مقاصد پر مبنی ہے، جو ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھنے کی وجہ سے ایک ہی مقصد یا نصب العین نظر آتے ہیں۔ وہ مقاصد یہ ہیں: غیر ملکی غلبہ اور تسلط سے آزاد ہونے کا عزم، جاگیردارانہ نظام کے قدیم تصورات، مثلاً زمینداری، سودخواری اور استحصال سے نجات حاصل کرنے کا عزم اور یہ خواہش کہ دنیا کی رنگ دار قوموں کی حیثیت کو دنیا کی سفید اقوام کے مساوی تسلیم کیا جائے۔ انسانی وقار کے حصول کے لئے ایشیائی عوام کی یہ پُرجوش اور بے پناہ خواہش گہری بھی ہے اور قوی بھی۔

چوتھے یہ کہ کمیونزم کے بارے میں ایشیائی عوام کا نقطۂ نظر ہمارے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔

ایک اوسط درجے کا ایشیائی رہنما کمیونزم کو اتنا ہی غلط طریقے پر دیکھتا ہے جتنا کہ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں امریکی عوام نے نازی ازم کو سمجھا تھا۔ یعنی وہ ایک ناخوشگوار، دور دراز اور ایک مبہم سی پُرخطر قوت ہے، جس سے ان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

پانچویں یہ کہ نئی آزاد شدہ ایشیائی قوموں کو اس وقت انتہائی دشوار معاشی مسائل کے ساتھ دوچار ہونا پڑ رہا ہے جن کے متعلق انھیں یقین ہے کہ یہ مسائل خود ان کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔

اس نازک وقت پر ایشیا کو امریکہ کی اوسط درجہ کی معاشی امداد دینے کا مطلب ایشیا میں کامیاب جمہوریتوں کے قیام میں مدد دینا اور اس امداد کے نہ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم یونہی بیٹھے دیکھتے رہیں گے اور ایشیا کے ان ممالک میں انتشار اور ابتری پھیلتی رہے گی اور آخر کار کمیونزم حاوی آجائے گا۔

خصوصیت کے ساتھ ہمیں ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ بھی تحفظات کے ویسے ہی جرأت مندانہ وعدے کرنے چاہئیں جیسے کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں ترکی اور یونان اور پھر بعد کو مغربی یورپ کے ساتھ کئے تھے ——— یعنی یہ کہ ہم ان ممالک کی معاشیات کو آئندہ چند برسوں میں وسائل کی کمی

کی بدولت ناکام نہیں ہونے دیں گے۔

ہندوستان نے نہایت حوصلہ اور جرأت مندی کے ساتھ اپنا عظیم پانچ سالہ منصوبہ شروع کیا ہے، جس کے بارے میں بعض مبصرین کی رائے ہے کہ ایسا منصوبہ آج تک دنیا کے کسی جمہوری ملک نے نہیں بنایا ہے۔ ہندوستان ابھی تک صرف اپنی کوششوں کے ذریعہ اور ابھی حال تک بغیر کسی بیرونی امداد کے اس منصوبے کو عمل میں لانے میں اس حد تک کامیاب ہوچکا ہے جتنی کہ کسی قوم سے توقع کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا دنیا کی کوئی قوم اگر امریکی امداد کی مستحق ہو سکتی ہے تو وہ ہندوستان ہے۔

لیکن آج ہندوستان کو اپنے پانچ سالہ منصوبے کی تکمیل میں وسائل کی شدید کمی سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ امریکہ کو ہندوستان کا یہ خسارہ بغیر کوئی سیاسی شرط عائد کئے پورا کرنے پر رضامند ہونا چاہیئے۔

چھٹے ہمیں ایشیا کے بارے میں خالص نظریاتی انداز فکر نہیں اختیار کرنا چاہیئے۔

مجھے اب تک ایسا کوئی امریکی مفکر نظر نہیں آیا جس نے گزشتہ دس سال میں مستقبل کے واقعات کی پیشین گوئی کرنے میں بارہا ٹھوکر نہ کھائی ہو۔ کوئی شخص از راہِ انکسار آج سے دس سال میں ایشیا یا دنیا کے کسی اور حصے میں ہونے والے واقعات کی پیشین گوئی نہیں کرے گا۔

البتہ بعض محرکات پہلے سے ہی بعض نتائج کی طرف واضح اشارہ کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ آئندہ چل کر جب کمیونسٹ چین اور زیادہ خود کفیل ہو جائے گا تو وہ روس کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن جائے گا۔ آج روس چین کے ساتھ بڑی گہری وابستگی رکھتا ہے لیکن متحدہ امریکہ کی ایسی خارجہ حکمت عملی، جس کی بنیاد اس مفروضے پر ہو کہ روس اور چین کے موجودہ روابط دائمی اور مستقل ہیں یقینی طور پر غلط اور ناکام ثابت ہوں گی۔

ساتویں، ادارہ اقوام متحدہ کو ایک ایسے ادارے کی حیثیت سے برقرار رکھا جانا چاہیئے جس میں اقوام عالم کے لئے باہمی اتفاق رائے اور اختلاف رائے دونوں کے لئے کافی گنجائش موجود ہو۔

لہٰذا ہمیں اقوام متحدہ کو محض سفید فام اقوام اور مغربی ملکوں کا ایک کلب بنانے کے ہر رجحان کی پوری قوت سے مخالفت کرنی چاہیئے۔ آنجہانی جیفرسن کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اقوام متحدہ کے ایوان ایسے واضح امریکی بیانات اور اعلانات سے گونج اٹھیں، جن میں نو آبادیاتی نظام، معاشی استحصال اور رنگ و نسل اور مذہب کی بنیاد پر کئے جانے والے کسی بھی امتیاز کی اعلانیہ مخالفت کی گئی ہو۔

آٹھویں بات یہ کہ ہم بیرونی ملکوں میں جمہوریت کو اس وقت تک فروغ نہیں دے سکتے جب تک کہ خود اپنے ملک میں اس پر اور زیادہ دل و جان کے ساتھ عمل پیرا نہ ہوں۔

یہ صریحاً ہماری غلطی ہو گی کہ اقوام عالم کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر ہم اپنے دفاعی انتظامات کو کمزور کر دیں۔ ایک کمزور امریکہ ایک ایسی تیسری عالمگیر جنگ کو یقینی بنا دے گا جو انتہائی ناساز گار حالات میں لڑی جائے گی۔ لیکن ہمیں صرف فوجی خطرے ہی کا سامنا نہیں ہے بلکہ ایک ایسے تشویشناک اور قوی نظریے سے بھی خطرہ درپیش ہے جو بعض سرگرم دلیر اور پرعزم انسانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ایسے نظریات محض بموں کی مدد سے ختم نہیں کئے جا سکتے بین الاقوامی کمیونزم کے لاحاصل تصورات کا مقابلہ ہمیں اس کے مخالف تصورات یعنی انفرادی حقوق اور انسان کی انفرادی حیثیت کے ایک قوی نظریے کی مدد سے کرنا ہو گا۔

امریکہ کے اعلان آزادی کے ایک سو ستر سال بعد بھی امریکی خواب آج روئے زمین پر ایک سب سے زیادہ طاقت ور اور ٹھوس نظریئے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظریے کو صرف ہم اپنے ہاتھوں سے تباہ کر سکتے ہیں اور صرف ہم ہی اس کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔

۲۵۔ ایشیا کے لئے مارشل پلان کی تجویز

بیرونی امداد کو صحیح طریقے پر مستحق ملکوں تک پہنچانے کے لئے ایک مؤثر ذریعہ کی تلاش و جستجو کی بدولت ہی ایشیا کے لئے "مارشل پلان" کی تجویز وجود میں آئی ہے۔ جسے کولمبیا یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ سائنس میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں پیش کیا گیا۔

یہ کہنا کہ ایشیائی ممالک تھوڑی سی غیر ملکی امداد کے عوض اپنا ضمیر فروخت کر دیں گے انتہائی مضحکہ آمیز بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایشیائی عوام نے نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بڑی جرأت مندانہ جد و جہد کی ہے اور اس آزادی کو اندرونِ ملک مقامی کمیونسٹوں کی دست برد سے بچانے میں بھی وہ کامیاب ہوئے ہیں۔

اب یہ لوگ اپنے لئے روٹی اور آزادی دونوں کے خواہاں ہیں۔ جمہوری نظام کو ایشیا میں یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ انھیں یہ دونوں چیزیں فراہم کر سکتا ہے، ورنہ ایشیا میں جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس اہم کام کے لئے بنیادی طور پر قیادت اور وسائل ایشیائی عوام کو خود ہی پیدا کرنے

چاہئیں۔ مثال کے طور پر آزاد ایشیائی ملکوں کی حکومتوں کو زرعی اصلاحات نافذ کرنی چاہئیں، ٹیکسوں کا ایک انصاف پسندانہ نظام قائم کرنا چاہیئے اور تمام ممکن وسائل سے صحیح طور پر فائدہ اُٹھانے کے لئے قومی منصوبے وضع کرنے چاہئیں۔ چنانچہ جن ایشیائی ملکوں کے رہنما اور حکومتیں ایسے تعمیری اقدامات کر رہی ہیں، وہاں عوام ان کے ساتھ پرجوش تعاون کر رہے ہیں۔

جمہوریت پسند ایشیا میں کلیت پسندی کے جابرانہ طریقوں سے کام لے کر عوام پر دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ایشیا کو اپنی اس تعمیری جدوجہد میں امداد کے لئے مغربی ملکوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں امریکہ کا چار نکاتی امدادی پروگرام ایک نہایت مناسب اقدام ہے۔ لیکن ہمارے امدادی پروگرام کے تحت ایشیا کو مالی امداد بھی ملنی چاہیئے اور فنی تعاون بھی۔ اور یہ مسئلہ مختلف ملکوں کو علیحدہ علیحدہ امداد دینے کی بجائے ایشیا میں بھی اسی طرح علاقائی بنیادوں پر حل کیا جانا چاہیئے جس طرح یورپ میں کیا گیا ہے۔ اگر پورے ایشیائی علاقے کے مجموعی ذرائع اور وسائل کو ایک مشترکہ منصوبے کے تحت مربوط اور ہم آہنگ کر کے بروئے کار لایا جائے تو یہ مسئلہ بہترین صورت سے حل ہو سکتا ہے۔

ایشیا کے مختلف ممالک مختلف صورتوں سے ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جاپان، جہاں چاول کی فی ایکڑ پیداوار امریکہ سے زیادہ اور ہندوستان کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ ہے چاول کی وسیع کاشت میں فنی امداد مہیا کر سکتا ہے۔

انڈونیشیا جو دھان کی آبپاشی کے پانی میں مچھلی کی وافر پیداوار کے کامیاب طریقوں کا ماہر ہے، ایشیا کے چاول پیدا کرنے والے ملکوں کو بہت کچھ مدد دے سکتا ہے۔ ہندوستان ملیریا کے انسداد میں اپنے کامیاب تجربات سے ایشیا کے بعض ملیریا زدہ ملکوں مثلاً انڈونیشیا کو اپنی ملیریا کش جماعتیں بھیج کر مدد دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دیہی ترقیات کے کارکنوں کی تربیت کے معاملے میں بھی ہندوستان اپنے گرانقدر تجربات سے بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

اسی طرح ایشیائی ملکوں کے درمیان باہمی تجارت ان تمام ملکوں کے لئے مفید ثابت ہوگی اور اس سے ان کی اقتصادیات کو استحکام نصیب ہوگا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک جاپانی مصنوعات کے لئے ایک بڑی نفع بخش اور وسیع منڈی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور اسی طرح جاپان ان ممالک سے اپنی صنعتی ضروریات کی وہ خام اشیاء خرید سکتا ہے، جو پہلے اسے چین سے حاصل ہوتی تھیں۔ جاپان کی چھوٹے پیمانے کی صنعتیں جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں منتشر چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے قیام کے لئے ایک نمونے کا کام دے سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ خود ہمارے امدادی پروگرام بھی ایک ہم آہنگ اور مربوط علاقائی امدادی

پروگرام کے توسط سے بروئے کار آنے کی بدولت اور زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ایشیا کی امداد کے لئے مختلف منصوبے اور پروگرام موجود ہیں۔ مثلاً حکومت امریکہ کے چار نکاتی پروجیکٹ، برطانوی دولت مشترکہ کا کولمبو پلان اور اقوام متحدہ کا فنی امدادی پروگرام۔ ان کے علاوہ بھی اقوام متحدہ کے ماتحت دوسرے تقریباً نصف درجن اداروں کے زیر اہتمام امدادی کام ہو رہا ہے، مثلاً عالمی ادارۂ صحت، ادارۂ خوراک و زراعت اور بچوں کا بین الاقوامی امدادی فنڈ اور ناروے اور سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کے امدادی منصوبے، نیز غیر سرکاری اداروں اور مذہبی تنظیموں کے امدادی منصوبے۔ یہ تمام منصوبے بڑی عظیم اور گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ لیکن اگر ان میں اور زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو اس سے امداد پانے والے تمام ملکوں کو عظیم فوائد حاصل ہوں گے۔

ایشیا و مشرق بعید کے لئے اقوام متحدہ اقتصادی کمیشن غالباً اس قسم کی علاقائی امداد کے سلسلہ میں ایک اہم مرکز کی حیثیت سے ضروری خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اگر اس قسم کی مجموعی امداد کا کوئی عملی منصوبہ وضع کر لیا جائے تو اسے ہمارا پورا پورا تعاون اور حمایت حاصل ہونی چاہیئے۔

اس صورت میں کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ متحدہ امریکہ آزاد ایشیائی قوموں کو یہ ترغیب دلائے کہ وہ اپنے لئے اس قسم کے علاقائی امدادی پروگرام کے سلسلہ میں خود ہی پیش قدمی کریں، جس طرح کہ وزیر خارجہ جارج مارشل نے ۱۹۴۷ء میں یورپی ملکوں کو یہ ترغیب دلائی تھی۔ ایشیا کے باقی ماندہ ملکوں کو چین کا راستہ اختیار کرنے سے روکنے کا یہی ایک واحد طریقہ ہے۔

اگر ہم مناسب وقت پر ایک مآل اندیشانہ اور مناسب اقدام نہ کر سکے تو پورے جنوب مشرقی ایشیا میں ایسے ایسے حادثات رونما ہونے لگیں گے کہ اس کے مقابلہ پر چین میں ہماری ناکامی ایک بے حقیقت سی شے معلوم ہو گی۔

اب تک ہم نے ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا اور برما جو سب مل کر دنیا کی ساری انسانی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں، اس سے نصف امداد بھی نہیں دی ہے، جتنی کہ ہم نے کمیونسٹوں کے خلاف چیانگ کائی شیک کو دی تھی۔ ہم نے ان چاروں ملکوں کو اس سے بھی کم امداد دی ہے، جتنی کہ ہم نے صرف یونان کو دی ہے۔

مغربی دنیا نے صدیوں تک ایشیا سے فوائد حاصل کئے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ یورپی اقوام نے اپنی ایشیائی اور افریقی ملکوں کی نوآبادیوں سے ہی وہ تمام دولت حاصل کی ہے، جس کی بدولت مغربی ملکوں کے لئے صنعتی ترقی کے اس عروج پر پہنچنا آسان ہو گیا

دوسری طرف امریکہ نے اپنی سرحدوں کی بدولت ایشیائی نوآبادیوں پر انحصار نہیں کیا، بلکہ

اسے پہلی جنگ عظیم سے قبل برطانیہ سے ایک معتد بہ رقم قرض لینی پڑی تھی ۔ جس کا کچھ حصہ ایشیا اور افریقہ کی نوآبادیوں میں سرمایا لگا کر کمایا گیا تھا

واقعہ یہ ہے کہ "بیسل" یونی ورسٹی، جہاں سے میں نے گریجولیشن کیا تھا، اس کو دیا جانے والا پہلا عطیہ برطانوی ہند میں انگریز گورنر ایلیہو ییل کی طرف سے سوتی کپڑے سے لدے ہوئے پانچ جہازوں کی صورت میں پیش کیا گیا تھا ۔ مجھے شک ہے کہ ہندوستان کے بے بس مزدور مرد اور عورتیں جنھوں نے یہ نفیس کپڑا تیار کیا تھا انھوں نے خوشی کے ساتھ اپنا وقت اور محنت اس لئے صرف کی ہوگی کہ ان کی اس محنت سے خوش حال امریکی والدین کے بچے اپنی تعلیم مکمل کر سکیں گے ۔

تاریخ کا کیسا حیران کن اور تعجب انگیز واقعہ ہو، اگر اس وقت مغربی دنیا اپنی اس دولت کا کچھ حصہ جو اس نے ایشیا سے حاصل کی تھی مع سود کے لوٹا کر، ایشیا کو آسانی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے اور اپنی آزادی کی حفاظت کرنے میں مدد دے ۔ تاریخ اس وقت ہم یعنی امریکہ والوں سے اس بات کی متمنی ہے کہ ہمیں اس نئی قسم کی دنیا میں سمجھ داری اور سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہئے ۔

۲۶ ۔ برما اور ویٹ نام : ایک سبق آموز موازنہ

مسٹر باؤلز نے اپنے اس بصیرت افروز مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ صرف وہی قومیں جو کلی طور پر آزاد ہیں، اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتی ہیں، یہ مضمون نیویارک ٹائمز میگزین کے ۱۳ رجون ۱۹۶۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔

دسمبر ۱۹۳۶ء کے اوائل میں میں نے برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر سے ایشیا میں برطانیہ کی نوآبادیاتی حکمت عملی سے متعلق کچھ سوالات کئے تھے، جن کے جواب میں رکن مذکور نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ "آپ (امریکہ) فلپائن کو آزاد کر چکے ہیں ۔ آئندہ ایک سال میں ہندوستان، پاکستان، لنکا، برما، ہند چینی، ملایا اور انڈونیشیا بھی آزاد ہو جائیں گے ۔

مگر ان ملکوں کی یہ نئی آزادی زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہ سکیں گی ۔ یہ نئی حکومتیں کمزور اور نااہل ہوں گی ۔ ان کی فوجی طاقت برائے نام ہوگی ۔ ان کی سول سروس مغربی ماہرین کی رہنمائی کے بغیر پارہ پارہ ہو جائے گی ۔ اس کے بعد آئندہ دو یا تین سال میں کمیونسٹ چین پر قابض ہو جائیں گے، اور یہ گویا ایشیا میں آزادی کے خاتمہ اور مغربی دنیا کے ایشیا اور افریقہ سے الگ تھلگ ہو جانے کا آغاز

ہو گا۔"

برطانوی رکن پارلیمنٹ کی اس وحشتناک پیشین گوئی کا پہلا حصہ صحیح ثابت ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹوں نے پورے چین پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ایک اور اعتبار سے برطانوی رکن پارلیمنٹ کی رائے غلط ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے ہندوستان، پاکستان اور لنکا کو آزاد کر دیا اور ولندیزی حکومت نے انڈونیشیا سے دست بردار ہونا شروع کر دیا۔ لیکن یہ ڈگمگاتی ہوئی نو آزاد ایشیائی قومیں جن کے بارے میں رکن موصوف نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ بہت جلد کمیونزم کے زیر اقتدار آجائیں گی۔ کمیونسٹوں کے تسلط سے آزاد رہیں۔

چین کو چھوڑ کر کمیونزم کو ٹھوس کامیابی ایشیا کے ان ہی مقامات پر نصیب ہوئی، جو مغربی اقتدار کے محکوم تھے، جہاں کمیونسٹوں کو عوام کا یہ ہر دلعزیز نعرہ لگا کر انھیں اپنے ساتھ لینے میں آسانی ہوئی کہ "مغربی سامراجیوں کو سمندر میں دھکیل دو۔"

کیا یہ محض ایک اتفاق ہے؟ جب ہم جنگ کے بعد جنوب مشرقی ایشیا میں رونما ہونے والے واقعات پر کسی قدر گہری نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہے۔ برما اور ویٹ نام کی حالیہ تاریخ سے خصوصی طور پر کچھ واضح سبق ملتے ہیں۔

بادی النظر میں جنوب مشرقی ایشیا کے یہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے انتہائی مشابہ معلوم ہوتے ہیں اور ان کی بہت سی خصوصیات آپس میں مشترک معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دونوں قومیں قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں، دونوں میں بکثرت بارش ہوتی ہے۔ دونوں میں زرخیز زمین موجود ہے اور دونوں میں چاول کی اتنی کثیر پیداوار ہوتی ہے کہ اس کی فاضل مقدار بیرونی ملکوں کو برآمد کی جاتی ہے۔ دونوں ممالک میں سے کسی ایک میں بھی زیادہ گھنی آبادی موجود نہیں ہے۔ برما جس کا رقبہ فرانس، بلجیم اور ہالینڈ کے مجموعی رقبے سے بڑا ہے، اس کی آبادی صرف ایک کروڑ نوے لاکھ ہے۔ ویٹ نام جو رقبے میں اٹلی کے برابر ہے اس کی آبادی دو کروڑ چالیس لاکھ ہے۔

ان دونوں کی باہمی یکسانیت ان کی طبعی یکسانیت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک یہ دونوں ممالک نو آبادیاتی طاقتوں کے غلام رہے۔ فرانس نے انیسویں صدی کے وسط میں ہی ویٹ نام میں مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جمائے تھے اور برطانیہ نے ۱۸۸۶ء میں برما کی آزادی کی آخری علامات کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان نے دونوں ملکوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

دوران جنگ میں دونوں ہی ملکوں میں برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے جاپانیوں کے خلاف گوریلا جنگ کی منظم تحریک شروع ہوئی۔ گوریلوں میں کمیونسٹ رہنما پیش پیش تھے۔ آخر کار جب جاپانیوں کو نکال باہر کر دیا گیا تو ان دونوں ملکوں میں یکساں اور وسیع طور سے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ۱۹۴۶ء

میں جب وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن گاندھی اور پنڈت نہرو کے ساتھ ہندوستان کو آزاد کرنے کی بات چیت کر رہے تھے تو اسی قسم کی بات چیت برما کے موجودہ وزیراعظم یو نو اور حکومت برطانیہ کے درمیان بھی جاری تھی ۔ ادھر ویتنامی رہنما فرانسیسیوں کے ساتھ آزادی کے مسئلہ پر گفتگو میں مشغول تھے ۔

لیکن واقعات کے اس موڑ پر پہنچ کر ان دونوں ملکوں کے مابین یہ گہری مطابقت اچانک ختم ہوگئی ۔ برطانوی حکومت نے برما ، ہندوستان ، پاکستان اور لنکا کی مکمل آزادی کو تسلیم کر لیا ۔ مگر فرانسیسی حکومت ویٹ نام ، لاؤس اور کمبوڈیا کو مکمل آزادی دینے پر تیار نہیں ہوئی جس کا نتیجہ آٹھ سالہ طویل اور تباہ کن خانہ جنگی کی صورت میں پیش آیا ۔

اس خانہ جنگی میں آج ایک لاکھ چالیس ہزار فرانسیسی فوجیں اور مزید ڈیڑھ لاکھ ویٹ نامی فوجیں ، جو فرانس کی تربیت یافتہ فرانسیسی ہتھیاروں سے لیس اور فرانسیسی فوجی افسروں کے زیر کمان ہیں ، بری طرح الجھی ہوئی ہیں ۔ فرانسیسی یونین کے ۳۸ ہزار فوجی ہلاک ہو چکے ہیں ، ان میں گیارہ ہزار فرانسیسی سپاہی شامل ہیں جن میں ایک بڑی تعداد نوجوان تجربہ کار افسران اور غیر متحارب فوجیوں کی بھی ہے ۔

امریکہ اس لڑائی میں فرانس کو تا حال دو کھرب روپے ڈالر کی مدد دے چکا ہے اور امریکی امداد کی یہ مقدار اس مجموعی امداد سے بھی دو یا تین گنا زیادہ ہے ، جو امریکہ ۴ نکاتی ترقیاتی پروگرام کے تحت گزشتہ پانچ سال میں مختلف ملکوں کو دے چکا ہے ۔ خود فرانس ہند چینی کی اس جنگ پر اب تک اس سے بھی زیادہ رقم خرچ کر چکا ہے ، جتنی مجموعی طور پر اسے مارشل پلان کے تحت امریکہ سے حاصل ہوئی تھی ۔ تاہم یہ سطور لکھتے وقت یہ اہم سوال ہمارے سامنے موجود ہے کہ کیا فرانسیسی فوجیں شمالی ویٹ نام کے ایڈرور ڈیلٹا کی ایک فٹ زمین پر بھی اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتی ہیں ؟

اس فوجی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ فرانسیسی اور امریکی حکومتوں نے نوآبادیادیاتی نظام کے خلاف ایشیائی عوام کے انقلاب کی اصل قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا ۔ فرانسیسی حکومت دوسری جنگ عظیم کے دوران شکست کھا کر اپنا مستقبل غیر یقینی سمجھتی ہے اور اسے یہ اندیشہ محسوس ہو رہا ہے ، کہ ایشیائی نوآبادیاں چھوڑ دینے سے مراکش ، ٹیونس اور دوسری افریقی نوآبادیوں میں اس کی طاقت کمزور ہو جائے گی ۔ ادھر امریکی حکومت جانتی ہے کہ یورپ کے فوجی دفاع میں فرانس کی حمایت حاصل کرنی ضروری ہے ، اس لئے وہ بھی ویٹ نام ، کمبوڈیا اور لاؤس کی مکمل آزادی کی واضح طور پر حمایت کرنے میں پس و پیش کرتی ہے ، حالانکہ ان ممالک کی مکمل آزادی ہی کمیونسٹوں کے خلاف موثر کارروائی کی بنیاد بن سکتی ہے ۔

نتیجہ کے طور پر ویٹ نام عظیم کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر ہو چی منہ خود کو ویٹ نام کی قوم پرست تحریک کے ایک محب وطن رہنما کی حیثیت سے پیش کرنے میں کامیاب ہے اور ویٹ نام کے کمیونسٹ دشمن رہنماؤں کو، جن میں سے بہت سے نہایت لائق اور قوم کے بے لوث خادم ہیں، لوگ فرانس کے زرخرید ایجنٹ اور طرفدار سمجھتے ہیں۔

فرانس نے ویٹ نام کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دینے کے سلسلہ میں کافی کچھ مراعات دی ہیں، خصوصاً پچھلے چند ماہ میں، لیکن چونکہ اس قسم کی مراعات ہمیشہ اسی وقت دی گئی ہیں، جب کہ کمیونسٹوں نے فرانس پر فوجی فتوحات حاصل کی ہیں، لہذا یہ مراعات اپنے اصل مقصد، یعنی عوام کی نئی حمایت حاصل کرنے کے حصول میں ناکام رہی ہیں۔

فرانس کے ویٹ نامی عوام کی تائید و حمایت حاصل نہ کر سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فرانسیسی حکومت دیہی علاقوں میں بنیادی قسم کی اصلاحات نافذ کرنے پر بھی رضامند نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں مجھے ویٹ نام کے کمیونسٹ دشمن وزیر اعظم وان تام نے بتایا تھا کہ جب کمیونسٹ فوجیں کسی گاؤں پر قبضہ کرتی ہیں تو ان کی طرف سے فوراً یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ کسانوں کے پچھلے تمام قرضے معاف کر دیئے گئے اور آج کے بعد سے کاشتکار ہی زمینوں کے مالک ہوں گے۔

اس کے برعکس فرانسیسی فوجوں نے جب ان علاقوں پر دوبارہ قبضہ کیا تو انھوں نے فوراً تمام جاگیرداروں اور سود خوار ساہوکاروں کو ان کی سابقہ حیثیت میں بحال کر دیا" ایسی صورت میں ہم اس جنگ کو کس طرح جیت سکتے ہیں؟" انھوں نے کسی قدر آزردہ ہو کر مجھ سے سوال کیا۔

اس واقعہ کے سات ماہ بعد وان تام سے جب دوسری بار میری ملاقات سیگاؤں میں ان کے دفتر میں ہوئی تو انھوں نے مجھے "بہت کامیابی" کی خبر سنائی۔ انھوں نے کہا "اب جب کبھی فرانسیسی فوجیں کسی گاؤں پر دوبارہ قابض ہوتی ہیں تو وہ زمینوں پر کسانوں کا قبضہ برقرار رکھتی ہیں۔" اب کسان کمیونسٹوں سے صرف یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ان پر قبضہ کر کے انھیں زمین دیدیں گے، مگر ساتھ ہی یہ دعا مانگتے ہیں کہ فرانسیسی انھیں کمیونسٹوں سے آزاد کرالیں تاکہ وہ اپنی زمینوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکیں۔"

ویٹ نام میں ایشیائی عوام کے اُبھرتے ہوئے حریت پسندانہ جذبات کے سلسلہ میں غلط اندازے اور فہم و ادراک کی اس غلطی اور بے توجہی کی یہ دردناک داستان دوسری جنگ عظیم کے بعد برما میں پیش آنے والے حالات سے قطعاً مختلف ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب ہند چینی میں فرانسیسی اقتدار کے خلاف مسلح بغاوت اور جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو برما بھی ایک خانہ جنگی کے قریب تھا، جو برطانوی اقتدار کے خلاف عوام کی مسلح بغاوت بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن برخلاف ہند چینی کے برما ۱۹۴۷ء

میں آزاد ہو گیا۔

۱۹۴۸ء میں برمی کمیونسٹوں کو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ برطانوی اقتدار کے ختم ہو جانے سے ان کے ہاتھوں سے "سامراج مردہ باد" کا وہ نعرہ چھن گیا ہے، جو فرانسیسی حکومت نے ویٹ نام کو آزاد نہ کرکے ویٹ نامی کمیونسٹوں کو مہیا کیا ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے برما کی نئی قائم شدہ حکومت کی اعلانیہ اور مسلح مخالفت شروع کر دی ہے۔ برمی کمیونسٹوں کی اس بغاوت کے بعد ۱۹۴۹ء میں کیرین قبائل کی بغاوت ہوئی۔ کیرین قبائل مشرقی برما کے بڑے جنگجو قبائل ہیں جنھوں نے اپنی ایک جداگانہ خود مختار ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ۱۹۵۱ء تک کیرین قبائل کی بغاوت اور خانہ جنگی سارے برما میں پھیل گئی اور اس جمہوریت کا مستقبل خطرے میں دکھائی دینے لگا۔

۱۹۵۱ء کے آخر میں امریکی حکومت نے قریب قریب یہ تسلیم کر لیا تھا کہ برما کی نئی حکومت ختم ہو جائے گی۔ اسی وقت چین کی کمیونسٹ حکومت نے جو اس بات کو بہتر طور پر سمجھتی تھی کہ ایشیا میں قوت و اقتدار کا اصلی سرچشمہ کہاں ہے، برما کے کمیونسٹوں سے بے تعلقی اختیار کر لی۔

لیکن اسی دوران میں ویٹ نام میں کمیونسٹوں کے زیر قیادت فرانسیسی فوجوں کے خلاف جو جنگ جاری تھی، اس کو چین کی طرف سے ملنے والی امداد میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن برما کی نئی حکومت کی غیر یقینی صورتِ حال کے باوجود، جہاں تک ہم کو معلوم ہے، برما کے کمیونسٹوں کو چین کی طرف سے کسی قسم کی فوجی یا دوسری امداد نہیں بھیجی گئی تھی۔ کیوں کہ پیکنگ کی حکومت جانتی تھی کہ اس قسم کی مداخلت کے متعلق برما والے یہ کہیں گے کہ برما کے کمیونسٹ باغیوں کو چین کی طرف سے مالی امداد مل رہی ہے اور پھر اس کے بعد برمی عوام کے دلوں میں غیر ملکی غلبہ کے پرانے اندیشے اور خدشات پیدا ہونے لگیں گے۔

رفتہ رفتہ وزیر اعظم یو نو اور ان کے ساتھی برما میں نسبتاً مستحکم بنیادوں پر جمہوری حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ملک کے لئے جو معاشی اور سیاسی اصلاحات ضروری تھیں اور جن کی آڑ لے کر برما کے کمیونسٹ حالات سے فائدہ اٹھا رہے تھے، انھیں جو یو نو اور ان کے ساتھیوں نے رائج کر دیا اور اس طرح انھوں نے کمیونسٹ تحریک کی اصل بنیاد کو ہی ختم کر دیا۔ چنانچہ اسی سال برما کے جس آخری کمیونسٹ رہنما نے ہتھیار ڈالے ہیں اس نے شکایتاً یہ اعتراف کیا تھا کہ "یو نو نے دیہی اصلاح دستی کا وہ پروگرام نافذ کر دیا ہے، جس کا ہم عوام سے وعدہ کر رہے تھے، اس لئے اب ہمیں کسی صورت میں عوام کی تائید و حمایت حاصل نہیں ہو سکتی۔"

اگرچہ برما واضح طور پر جمہوری اصولوں کا حامی ہے، لیکن ہندوستان کی طرح وہ بھی

عالمی مسائل میں بڑی سختی کے غیر جانبدار حکمت عملی پر کار بند ہے۔ برما کی اس واضح غیر جانبدار حکمت عملی کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ برما ہی ایشیا کا سب سے پہلا غیر کمیونسٹ ملک ہے، جس نے ۱۹۵۰ء میں کمیونسٹ چین کو تسلیم کر لیا تھا۔ پھر ۱۹۵۳ء میں حکومت برما نے اس یقین کے ساتھ کر شمالی برما میں قوم پرست چینی فوجوں کو امریکہ کے علم اور رضامندی سے خاموش سا نے مسلح کیا تھا، نہایت خوش اسلوبی مگر تلخی کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ برما متحدہ امریکہ سے اب مزید کوئی معاشی امداد قبول نہیں کرے گا۔

یہ ہے جنوب مشرقی ایشیا کے ان دونوں ملکوں کی داستان جو باوجود اس کے کہ رقبہ، آبادی اور اپنے وسائل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی مماثلت رکھتے ہیں، ان کے سیاسی طرز عمل میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے ان تجربات سے ہمیں وہ کیا سبق ملتا ہے، جس کی مدد سے ہم آج کی پیچیدہ اور منقسم دنیا میں ایک ایسی حکمت عملی وضع کر سکیں، جو سلامتی اور بقا کے حصول کے لئے قابل عمل ثابت ہو سکے۔

کیا ہند چینی کی اس خونچکاں داستان سے کسی شک اور شبہہ کے بغیر یہ حقیقت واضح نہیں ہو جاتی کہ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں نوآبادیاتی نظام ایک ایسی زوال پذیر قوت ہے جسے امریکہ مزید عرصہ تک سہارا دے کر زندہ نہیں رکھ سکتا۔؟

فرانسیسی رہنما نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ بات کہہ چکے ہیں کہ "ہم ہند چینی میں کوئی کمزوری اس لئے دکھانا نہیں چاہتے کہ اس سے مراکش، ٹیونس، اور سارے فرانسیسی افریقہ میں آزادی کی تحریکوں کو تقویت نصیب ہو گی۔"

لیکن کیا ویٹ نام کی جنگ میں کام آنے والے فرانس کے ۲۸ ہزار نوجوانوں اور کھربوں ڈالر کی فرانس اور امریکی امداد سے افریقہ میں فرانسیسی اور امریکی قوت کو واقعی کوئی استحکام نصیب ہوا ہے؟ اس کے برعکس کیا مراکش، ٹیونس اور الجزائر کے نوجوان انقلاب پسند اس فوجی تباہی کے مطالعہ سے یہ منطقی نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ انھیں بھی اپنی آزادی خون خرابے اور کمیونسٹوں کی تائید و حمایت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے؟

ایک اور واضح سبق اس انقلابی دنیا میں طاقت کی صحیح نوعیت کے متعلق ملتا ہے۔

کیا دنیا کی آزاد قوموں کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کتنی قومیں ہماری طرفدار ہیں اور کتنی کھلم کھلا ہماری مخالفت کرتی ہیں؟ کیا قابل اعتماد ہونے کی بنیادی کسوٹی یہی ہے کہ ایسی قوم امریکہ کی فرمانبردار ہو اور وہ اس کی ہدایات پر بے چون و چرا عمل کرے؟ کیا ہم کسی قوم کے سیاسی اور سفارتی سطح پر قابل اعتماد ہونے سے اس بات کا یقین کر سکتے ہیں کہ وہ قوم فوجی

اعتبار سے بھی ہمارے لئے قابل اعتماد ثابت ہوگی؟

اگر وہ منحوس دن پیش آنے لگے، جب دنیا کی چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں بڑھتے ہوئے عالمی کمیونزم کے خلاف اپنی جدوجہد میں آخری طور پر ناکام ہو جائیں گی، تو کیا ہم ان ملکوں کی حمایت پر بھروسہ کر سکتے ہیں، جو ادارۂ اقوام متحدہ میں ہماری ہاں میں ہاں ملاتے ہیں؟

پھر بین الاقوامی مسائل میں غیر جانبدار برمی عوام کے متعلق کیا سمجھا جائے، جنھوں نے اتنی عظیم قربانیاں دے کر آزادی حاصل کی، اور پھر بھی سب سے پہلے کمیونسٹ چین کو تسلیم کر لیا؟ ان ۳۶ کروڑ ہندوستانی عوام کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے، جو اپنے ملک میں ایک قومی جمہوریت کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف ہیں پھر بھی انھیں امریکہ کی قیادت پر اطمینان نہیں ہے؟ سویڈن اور سوئٹزرلینڈ جیسے غیر جانبدار ملکوں کو کیا کہا جائے گا؟ قبل اس کے کہ ہم ان سب کی دوستی کا خیال دل سے نکال دیں، ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے، کہ ایک بار فن لینڈ کے چالیس لاکھ غیر جانبدار باشندوں نے پوری سرخ فوج سے ٹکر لے لی تھی۔

امریکی حکمت عملی کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے کہ آج کی انقلاب پسند دنیا میں بھی قوت گولیوں اور بموں اور حتیٰ کہ اقوام متحدہ میں دوٹوں کی نسبت کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ فرانس والوں نے ہند چینی میں انتہائی دشوار صورت حال سے دو چار ہونے کے بعد یہ سبق سیکھا ہے، روسیوں کو مشرقی جرمنی، پولینڈ اور ریاست ہائے بلقان میں اس حقیقت کا احساس ہوا ہے اور چینیوں کو اس کا احساس کوریا میں ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ طاقت کا اندازہ کئی باتوں سے لگایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک قیمتی کسوٹی عوام اور ان کے وہ نظریات ہیں جو ان میں حرکت و عمل پیدا کرتے ہیں۔

۲۷ — رنگ دار اقوام کی ذمہ داری

چوں کہ نئی خود مختار قوموں اور مغرب کے درمیان باہمی مفاہمت کی ضرورت انتہائی نازک اہمیت اختیار کر گئی ہے، اس لئے مسٹر باؤلز نے ایشیا اور افریقہ کی قوموں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے ذہنوں سے مغربی دنیا کے خلاف تعصبات اور ان کی بے جا مخالفت دور کر دیں۔ مسٹر باؤلز کا یہ مقالہ نیویارک ٹائمز میگزین مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔

"گورے آدمی کی ذمہ داری" کا پُرانا تصور نہ صرف اب ایشیا والوں کو ہی ایک فریب نظر آنے لگا ہے، بلکہ اکثر صاحبِ فکر مغرب والے بھی اسے اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ لیکن مغرب نے کافی وقت گزارنے کے بعد ایشیا کے ساتھ باہمی تعاون کی جو نئی بنیاد تلاش کرنی شروع کی ہے، اس کے حصول میں مغرب کو ابھی ایک اور رکاوٹ سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہ ہے ایشیا والوں کا وہ اندازِ فکر جسے "سانولے آدمی کی ذمہ داری" کہا سکتا ہے۔

ایشیا کی نوآزاد قوموں نے جو عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کے لئے میرے دل میں تعریف اور تحسین کے انتہائی گہرے جذبات ہیں۔ ایشیا کے بارے میں مغرب کے قدیم روایتی نقطہ نظر پر میں نے جو شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ تاہم جن ایشیائی قوموں کی طرف سے مغرب پر اکثر و بیشتر انگشت نمائی کی جاتی ہے، میں ان سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ خود بھی کانچ کے گھر میں رہتے ہیں۔ ایشیا کے اس کانچ کے گھر پر ایک دوستانہ نظر ڈالنے سے غالباً یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مغرب اور ایشیا کے نئے باہمی تعاون کے لئے آج ہمارا نقطہ نظر کیا ہونا چاہیئے۔

ابتداءً ہمیں ایک سب سے بنیادی سوال یعنی نوآبادیاتی نظام سے بحث کرنی ہے۔ ایشیا کو مغربی طرز کے نوآبادیاتی نظام کا حال ہی میں جو تلخ تجربہ رہا ہے، اس کی بدولت ان ملکوں میں اس غیر مغربی سامراج کی ناخوشگوار یادوں کو حافظہ سے دور کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے، جو خود ایشیائی قومیں ایشیا والوں پر مسلط کر چکی ہیں۔ اس کی ایک جدید اور واضح مثال سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۴۵ء کے درمیان جاپان کی جارحیت ہے۔

اگر ایشیا والے خود اپنی ہی تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں تو اس سے خود ایشیا کے حقیقت پسندوں کو اس بات کی شہادت مل جائے گی کہ سامراج محض مغربی ملکوں کی لائی ہوئی ایک لعنت ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا مرحلہ ہے جو کسی بھی حرکت پذیر سماج کو ارتقائی منزلیں طے کرنے کے دوران میں آسکتا ہے چاہے یہ مرحلہ سامراج کا شکار ہونے والے ملکوں کے لئے کتنا ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو۔

مثال کے طور پر ہندوستان کو اپنی قدیم روایات پر ناز ہے اور ماضی میں جنوب مشرقی ایشیا میں جو ہندوستانی نوآبادیاں قائم تھیں، ان پر علانیہ فخر کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ اشوک کے عہد سے لے کر اس وقت تک جب کہ مغربی سیاح تلاش و جستجو کرتے کرتے مشرق کے سمندروں میں پہنچ گئے۔ ہندوستان تہذیب و تمدن، تجارت اور فتوحات کا مرکز بنا رہا۔

میرے بچوں کو نئی دلی کے پبلک اسکول میں جو تاریخ پڑھائی جاتی تھی اس کے ایک باب کا عنوان ہے "عظیم تر ہندوستان"۔ اس کے نقشوں میں لنکا، برما، ملایا، جاوا، سماترا، بورنیو، بالی

اور کمبوڈیا ہندو نو آبادیاں دکھائی گئی تھیں۔ کتاب کا مصنف رقمطراز ہے کہ:

"ان ملکوں کو محکوم بنانے کا مقصد عوام کا استحصال کرنا یا محض نئی نئی منڈیاں تلاش کرنا نہیں تھا"

اس کے برعکس ہندوستانی اسکولوں کے بچوں کو یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ ہندو فاتحین اس علاقے کے زیادہ پس ماندہ ملکوں میں تہذیب و تمدّن کی روشنی پھیلانے اور وہ نیک خواہشات لے کر گئے تھے جن کا انحصار تہذیب و تمدّن پر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ صحیح ہو، مگر کیا یہی بات یورپی نو آبادیاتی نظام کے پرانے ہمنوا اردڈیارڈ کیپلنگ نے یورپی نو آبادیات کے متعلق نہیں کہی تھی؟

نہرو نے "ڈسکوری آف انڈیا" میں معاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ہندوستان کے اس تاریخی کردار کو نو آبادیاتی واقعات کے پس منظر سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لنکا، جنوبی برما، اور انڈونیشیا کے کچھ حصوں کو جنوبی ہند کی چولا سلطنت نے فتح کیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت بھی ملایا کو فتح کرنے کا اصلی مقصد چین کی کانوں پر قبضہ کرنا تھا۔

آج بھی ہندوستان کے پڑوسی ملکوں خصوصاً لنکا اور نیپال کو "ہندوستانی سامراج" کی طرف سے شبہات اور اندیشے لاحق ہیں۔ ہندوستانیوں کی نظر میں یہ اندیشے بھی اس قدر بے بنیاد ہیں جس قدر ہم امریکیوں کو متحدہ امریکہ کے پڑوسیوں کے وہ اندیشے بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں، جو مبینہ امریکی اغراض کے بارے میں ان کی طرف سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ان الزامات کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے اور انھیں عام طور سے صحیح تسلیم کیا جاتا ہے، جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستان کی طاقت اور اثر و رسوخ جیسے جیسے بڑھتا جائے گا، اسی اعتبار سے اس کے خلاف شکوک و شبہات اور نکتہ چینی بھی بڑھتی جائے گی۔

نیپال کے ساتھ ہندوستان کی پانچ سو میل لمبی شمالی سرحد کے باوجود ہند اور نیپال کے موجودہ تعلقات کی جو نوعیت ہے اس میں ویسے ہی نشیب و فراز پائے جاتے ہیں، جیسے امریکہ کو خود اپنے بعض اتحادی اور حلیف ملکوں کے ساتھ تعلقات میں پیش آتے ہیں۔

جب کمیونسٹ چین نے ۱۹۵۰ء میں تبت تک پہنچنے کے لئے سڑکوں کی تعمیر شروع کی تو ہندوستان کو اپنی شمالی سرحدوں کے متعلق تشویش محسوس ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں ایک ہندوستانی فوجی مشن اس مقصد سے نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو کو بھیجا گیا تھا کہ نیپالی فوجوں کو از سر نو اور جدید طرز پر منظم کرنے کی ابتدا کی جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی فوجی دستوں کو نیپال کے گورکھا حفاظتی دستوں کے شانہ بشانہ نیپال اور تبت کی سرحدوں کی ہمالیائی گزرگاہوں پر پہرہ دینے کے لئے بھی مامور کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان نے نیپال کی معاشی ترقی کے لئے ایک معقول رقم بطور قرض منظور کی۔

پھر نیپال میں ہندوستانی سفارشات کی روشنی میں معاشی اور سیاسی اصلاحات کے نفاذ کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اس موقع پر حکومت ہند کے کچھ ماہرین بھی نیپال میں ٹیکسوں کے نظام کی از سر نو تنظیم کرنے، سڑکوں کی تعمیر میں مدد دینے اور نیپال کے سرکاری محکموں کی کارکردگی میں اصلاح کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔

ہندوستان کی اس عظیم و جرأت مندانہ سعی نے، جس کے ساتھ امریکی چار نکاتی پروگرام کی کچھ امداد بھی شامل تھی، نیپال کو اپنی جمہوری مختاری کو برقرار رکھنے میں کافی سہارا دیا، مگر اس فیاضانہ امداد کے باوجود ہندوستان کے بارے میں نیپال کے عوام کا ردعمل اس سے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔ جتنا کہ ایشیا کی اکثر نو آزاد اقوام کا ردعمل امریکی امداد کے بارے میں ہے۔

بین الاقوامی تنازعات میں ایسی مثالیں اور بھی مل سکتی ہیں۔ بہت سے ہندوستانی جو جلدی میں آکر امریکہ پر یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ وہ سوویٹ روس اور سرخ چین کے ساتھ مفاہمت کی راہ پیدا نہیں کرتا، انھیں ہند اور پاکستان کے درمیان مفاہمت کی سست رفتاری پر کوئی تشویش نہیں ہے۔

تاہم یہ دونوں قومیں صدیوں تک ایک اور ایک ہی حکومت کے تحت رہ چکی ہیں، اور ان میں عموماً ایک ہی زبان بولی جاتی ہے۔ اگر ان دونوں پڑوسی ملکوں کی حکمت عملی میں کسی حد تک ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو اس سے ایشیا میں امن کے امکانات اور زیادہ روشن ہو جائیں گے۔ آزادی کے سات سال گزر جانے پر بھی ان دونوں کے آپس کے تعلقات ناخوشگوار ہیں اور وہ باہمی سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہیں۔

اس طرح ایشیا ایک طرف تو دنیا کو رواداری، فراخ دلی اور انسانیت کی تعلیمات سے روشناس کراتا ہے، لیکن خود نسل، مذہب اور قومیت کی خوفناک تقسیم کا شکار ہے، جس سے ہم الجھن میں پڑ جاتے ہیں، اور ایشیا والوں کو یہ بتانے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ جن اصولوں کی تبلیغ کرتے ہیں، انھیں خود بھی ان پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

لیکن بہت کم ہندوستانی ایسے ہیں جنھیں امریکہ میں نیگرو عوام کے ساتھ نسلی امتیاز اور ہندوستان میں نسلی چھوت چھات اور امتیاز کے درمیان کوئی یکسانیت نظر آتی ہے جس کا تصور مغرب والوں کے لئے انتہائی ہولناک ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور انھیں حل کرنے میں دوسرے کی کوششوں کو برا بھلا کہنے کی بجائے آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔

گاندھی جی، جنھوں نے اس قسم کے جذبات کی مخالفت میں اپنی جان تک قربان کر دی، ایشیا کی رواداری اور مغرب کے حق دناحق کے اخلاقی تصور کے درمیان ایک مفاہمت کی راہ پیدا کرنا چاہتے تھے — وہ امن پسند تو ضرور تھے مگر

ان کا نقطۂ نظر یہ نہیں تھا کہ ناحق کی اطاعت قبول کر لی جائے، یا عملاً اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ تمام جانداروں کا احترام کیا جائے، مگر ساتھ ہی جو بُرائی نظر آئے اس کی سرگرم مزاحمت اور مدافعت بھی کی جائے۔

وہ ایشیا کے قدیم روحانی اور مذہبی تصورِ امن اور خیر خواہی کو عمل میں لانا چاہتے تھے لیکن ان کی اس تحریک کے خلاف تشدد کی ایک تحریک بھی وجود میں آئی۔ بنگال کے سرگرم اور جوشیلے رہنما سبھاش چندر بوس کے بہت سے مدّاح آج بھی ایشیا میں موجود ہیں۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف لڑنے کے لئے ایک انڈین نیشنل آرمی بنائی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے فوراً بعد ہندوستان کو کشمیر میں جو مسلّح اور جنگی مدافعت کرنی پڑی، اس نے گاندھی جی کے بہت سے غیر تشدد پسند حامیوں کو سراسیمہ کر دیا۔ اور خود گاندھی جی نے بھی بادلِ ناخواستہ مشروط طریقے پر اس کی منظوری دیدی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ ایشیا میں مہاتما بدھ، اشوک اور گاندھی جی جیسے امن پرست پیدا ہوتے ہیں، پھر بھی دنیا کا یہ خطّہ دوسرے ملکوں کی طرح تشدّد اور جنگ کا راستہ ترک کر دینے میں ناکام رہا ہے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ جب پاکستان اپنی سرحد کے حفاظتی انتظامات مستحکم کرتا ہے تو ہندوستان بھی اس کے جواب میں اپنی سرحدوں کے دفاع میں استحکام پیدا کرنے لگتا ہے۔ ہتھیاروں کی جنگ جس میں ایک اندیشہ کو دوسرے سے تقویت حاصل ہوتی ہے، صرف مغربی ملکوں کی ہی اجارہ داری نہیں ہے۔

اُبھرتے ہوئے نئے ایشیا میں ہر جگہ مادی ترقی کی پُر زور خواہش نظر آتی ہے۔ کمیونسٹ چین میں انسانی طاقت کے لامتناہی وسائل کو جبر اور بے رحمی کے ساتھ کام میں لایا جاتا ہے۔ جمہوری ہندوستان کے قومی رہنما جنھوں نے ملک کے ۳٦ کروڑ عوام کے لئے عدم تشدّد کے ہتھیار سے آزادی حاصل کی تھی، اب اپنی قوت پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے پر صرف کر رہے ہیں۔ جو اس نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر وضع کیا گیا ہے کہ عوام کی غریبی اور پس ماندگی کو آمریت کا سہارا لئے بغیر دور کیا جا سکتا ہے۔

کوئی اسے پسند کرے یا ناپسند لیکن یہ واقعہ ہے کہ دنیاوی نفع و نقصان کے تصور سے بے نیازی کے دعوے کے باوجود ایشیائی عوام مادی ترقی کے لئے بے چین ہیں۔ مادّی ترقی کے لئے یہ بے چینی اس سے کہیں زیادہ جو مغربی دنیا کے ان طور طریقوں سے روحانی نجات حاصل کرنے کے لئے تھی جو آج عوام اور ان کی پارلیمانوں میں فکر و تشویش کا ایک مشترکہ موضوع بنے ہوئے ہیں۔

ایک اور مسئلہ جس کے بارے میں مغرب کے بہت سے لوگ فکر مند ہیں، ایشیا والوں کی وہ دو رُخی ہے جو ان کے رہنما اکثر عالمی مسائل کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت اختیار کرتے ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے ہی ایشیا کے عظیم رہنما یہ تعلیم دیتے چلے آتے ہیں کہ بہترین مقاصد کے لئے بھی غلط ذرائع سے کام لینا جائز نہیں ہے۔ گاندھی جی کی تعلیمات کا لب لباب بھی یہی ہے۔

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ایشیائی ممالک کے رہنما اکثر ان ہی ناجائز ذرائع کا انتخاب کرتے ہیں جن کی وہ خود مذمت کرتے ہیں، وہ مغربی ممالک کی ایک ایک غلطی کا سختی کے ساتھ محاسبہ کرتے ہیں۔ لیکن کمیونسٹ ممالک میں جو مظالم ڈھائے جارہے ہیں۔ ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی۔

ایشیا والوں کو اہلِ مغرب سے یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنا تحکمانہ انداز ترک کر کے دوسروں کی رائے کا احترام کریں اور انھیں غیر مشروط طریقے پر امداد دیں۔ انھیں مغربی ملکوں سے یہ کہنے کا حق بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے بین الاقوامی معاملات میں اعلیٰ اخلاقی معیار پیش کریں اور گفت و شنید میں زیادہ لچک اور آمادگی دکھائیں، جبر اور طاقت کا کم سے کم مظاہرہ کریں اور ان سیاسی اور معاشی قوتوں کا اور گہرا ادراک کریں، جو تاریخ کا راستہ متعین کر رہی ہیں۔

مگر ساتھ ہی امریکہ اور دوسرے اہلِ مغرب کو بھی ایشیا کے غیر کمیونسٹ ممالک سے یہ توقع رکھنے کا حق حاصل ہے کہ وہ ان مشکلات کا کچھ زیادہ احساس کریں جن کا ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس حقیقت کو سمجھیں کہ قیام و بقائے امن ایک ایسی دو جہتی شاہراہ ہے جو اس وقت تک حقیقت نہیں بن سکتی، جب تک کہ اشتراکیت کے حامی اپنا عالمی اقتدار کا منصوبہ ترک نہ کر دیں۔

سفید قوموں کے اقتدار کے عہد میں اگرچہ کچھ ریاکاری بھی برتی گئی، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ اہلِ مغرب نے ایشیا کو بہترین تہذیب و تمدن سے روشناس کرانے کی کوشش کی جس میں انھیں تھوڑی بہت کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ لیکن آج جب کہ سانولی اقوام اپنی روز افزوں ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے قابل ہو رہی ہیں، مغرب کے لئے، جو ان تمام چیزوں سے سبق حاصل کر چکا ہے یہ مناسب ہوگا کہ وہ ایشیا والوں کو تاکید کرے کہ وہ اس کی غلطیوں کا اعادہ نہ کریں۔

ایشیا کو بین الاقوامی انتشار اور ابتری کے اس دور میں محض ایک اور نزاع اور تلخ کلامی کا باعث بننے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بلند رول ادا کرنا ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ ایشیا اس دنیا کی بہترین خدمت انجام دے گا جسے آج بقا کی امید اور روحانی غذا کی شدید ضرورت ہے۔

گاندھی جی نے اپنے عقیدتمندوں سے کہا تھا کہ "ایشیا کے پاس دنیا کے لئے ایک پیغام ہے .... مگر ایشیا محض ایشیا کے رہنے والوں کے لئے ہی نہیں، بلکہ تمام دنیا کے لئے ہے۔ اسے مہاتما بدھ کے پیغام کو پھر سے سمجھنا اور اسے ساری دنیا کو پہنچانا ہے۔" مجھے یقین ہے کہ گاندھی جی کے ان جملوں کا مفہوم بھی وہی ہے، جس کی وضاحت میں نے کی ہے۔

۲۸ - آزاد ایشیا کا مستقبل کیا ہوگا؟

اس یقین کے ساتھ کہ ایشیا سے متعلق امریکی خارجہ حکمت عملی از سرِ نو غور وفکر کی محتاج ہے، مسٹر باؤلز نے ان انقلابی قوتوں کا ایک تحقیقی اور حکیمانہ جائزہ لیا ہے۔ جو اس وقت ایشیا میں سرگرم عمل ہیں۔ انھوں نے ایشیا کے لئے ایک امکانی "منرو ڈاکٹرین" سفارش کی ہے۔ فارن افیئرز ، اکتوبر ۱۹۵۴ء

تاریخی مشابہتیں اکثر بودی معلوم ہوتی ہیں لیکن جدید ایشیا کے موجودہ غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر اور گزشتہ صدی کے امریکی طرزِ عمل کے درمیان کافی گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ نئی آزاد شدہ ایشیائی قوموں کی طرح متحدہ امریکہ بھی ایک ایسے دور میں وجود میں آیا تھا، جب دنیا کے مختلف حصوں میں انقلابی سورشیں برپا تھیں، فرانسیسی انقلاب اور نپولین کی جنگیں شباب پر تھیں۔ ۱۹۱۴ء میں جب نپولین کو واٹرلو کے معرکہ میں آخری اور حتمی شکست ہوئی تو امریکہ کی خارجہ حکمت عملی ترتیب دینے والے مدبرین کو ایک غیر متوقع صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس وقت امریکہ کی بری فوج کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھی اور بحری فوج بھی بہت مختصر تھی۔ تاہم اس وقت دنیا میں امریکہ کا اخلاقی اثر ورسوخ بہت کافی تھا۔ جس طرح آج اعصابی جنگ میں اُلجھے ہوئے کمیونسٹ اور جمہوری بلاک دونوں ہندوستان کی دوستی کے خواہشمند ہیں، اسی طرح ۲۳-۱۹۲۰ء کے درمیان ایک طرف روس کے زیر اثر "اتحاد مقدس" کے ممالک اور دوسری طرف حکومت برطانیہ حکومت امریکہ کی تائید اور حمایت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ۱۸۳۲ء میں زار روس کی حکومت امریکہ کے جمہوریت پسندوں کے خلاف ایسا ہی عناد رکھتی تھی، جیسا آج اس کا جانشین سوویٹ روس اکثر آزاد ایشیائی ممالک کے خلاف رکھتا ہے۔ امریکہ نے اس کی تجویز کو نہایت خوبصورتی لیکن مضبوطی کے ساتھ رد کر دیا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح آزاد ایشیائی قومیں تاحال کمیونسٹ بلاک میں شامل ہونے سے انکار کر رہی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں جنوبی امریکہ میں روس کے مقدس اتحاد کی دست درازیوں کا جم کر مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں برطانیہ کی امریکہ کو ترغیب دلانے کی کوششیں بالکل براہ راست تھیں۔ ان حالات میں متحدہ امریکہ کے صدر منرو اور ان کے سکریٹری امور خارجہ جان آدمس نے

امریکہ کی طرف سے ایک "یکطرفہ" اعلان جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۲ر دسمبر ۱۸۲۳ء کو صدر منرو نے اپنے مشہور اصول کو امریکی کانگریس کے سامنے اپنے ساتویں سالانہ خطبہ کے ایک جزو کی حیثیت سے پیش کر دیا۔

اس طرح امریکہ نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہی عالمی سیاسیات کے اس بنیادی اصول کو عملی جامہ پہنا دیا جسے بعد میں اکثر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ وہ اصول یہ کہ غیر جانبداری اور ناوابستگی صرف ایک خواہش کی تکمیل نہیں ہے اور یہ کہ بر وقت تھوڑی سی تعمیری اور امن پسندانہ وابستگی بعد میں کئی گنا زیادہ ہلاکت انگیز اور خونیں تصادم سے بچا سکتی ہے۔

عالمی مسائل میں آج ہندوستان کو جو حیثیت حاصل ہے اس میں اور ۱۸۲۳ء میں متحدہ امریکہ کی حیثیت میں بعض بڑے نمایاں اختلافات موجود ہیں لیکن ساتھ ہی ان دونوں میں بعض حیرت انگیز مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۸۲۳ء میں جنوبی امریکہ میں آج کے مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا کی مانند ایک ایسا سیاسی خلاء موجود تھا، جو غیر ملکی اقتدار پرستوں کی ہوس کے لئے مقناطیس کا کام کر رہا تھا۔

آج ہندوستان اور آزاد ایشیا کے سامنے بھی سب سے اہم سوال وہی ہے، جو ۱۸۲۳ء میں متحدہ امریکہ کے سامنے تھا، یعنی یہ کہ حصول اقتدار کی کشمکش کو اپنی سرحدوں پر ایک عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کرنے سے کیوں کر روکا جائے، یہ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی جنگ میں خود ہندوستان کی فوجی شمولیت یقینی ہو جائے گی۔ ۱۸۲۳ء کے متحدہ امریکہ کی مانند ہندوستان بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ جغرافیائی طور پر عالمی جنگ کے بڑے بڑے مرکزوں سے الگ تھلگ واقع ہے۔ وہ اپنے ان عظیم معاشی مسائل سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے، جو آج اسے درپیش ہیں، اور اسے سب سے زیادہ دلچسپی صرف اس بات سے ہے کہ ترقی اور خوشحالی کے مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔

نو آبادیاتی نظام کے متعلق ہندوستان کے شبہات اور اندیشے بڑے گہرے ہیں، اور وہ ان قوموں کی جدوجہد آزادی میں مدد دینے کے لئے بےچین ہے، جو غیر ملکی حکومت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ اسے یقین ہے کہ امن عالم اور ترقی پذیر خوشحالی کے لئے اس کی امیدیں اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں، جب دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ ہونگے اور ہندوستانی عوام موجودہ بین الاقوامی تنازعات سے جذباتی طور پر الگ تھلگ رہیں گے۔

ہندوستان اور امریکہ کی یہ مشابہت کب تک برقرار رہے گی؟ کیا آج کا ہندوستان ۱۸۲۳ء کے متحدہ امریکہ کی طرح اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ آزادانہ حیثیت صرف بعض مثبت اور دور رس اقدامات اور واضح ذمہ داریاں قبول کر کے باقی رکھی جا سکتی ہے۔

جب تک مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں قوت کا خلا باقی ہے، کمیونزم اسے پُر کرنے کی کوشش کرتا رہے گا اور ماسکو اور پیکن کے حکمرانوں کے ایما پر کمیونسٹ بلاک کی طرف سے جو بھی مسلح جارحانہ فوجی کارروائی ہوگی، متحدہ امریکہ اسے پوری قوت کے ساتھ ناکام بنانے کی کوشش جاری رکھے گا، خواہ اس کے لئے تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔

کیا ہندوستان کو اس بات کا احساس ہے کہ کسی ایسے تصادم کی صورت میں، جو اس کے انتہائی ضروری بحری مواصلات کے سلسلہ کو درہم برہم کر دیگا اور جو اس کی سرحدوں سے اس قدر نزدیک ہوگا، اس کے لئے اپنی غیر جانبداری کو قائم رکھنا ممکن نہیں ہوگا جو آج اس کی خارجہ پالیسی کی اساس بنی ہوئی ہے۔

ایشیا میں کسی ایسی دفاعی تنظیم کا قیام جسے کولمبو طاقتوں یعنی ہندوستان، پاکستان، برما، لنکا، اور انڈونیشیا کی تائید حاصل نہ ہو، ایک محدود اور محض وقتی فوجی اقدام ہے، جس میں یقیناً بعض سیاسی دشواریاں مضمر ہیں۔

آنے والے چند برسوں میں پانچ کولمبو طاقتوں کے لئے ایک ایسا متبادل راستہ موجود ہے جس کی بدولت ایشیا میں استحکام کے لئے سب سے زیادہ واقعاتی اُمید پیدا ہوتی ہے، جسے کسی بھی صورت میں خارج از بحث قرار نہیں دیا جا سکتا۔

انھوں نے مغربی ملکوں کے مجوزہ فوجی معاہدوں میں شامل ہونے سے انکار کرتے ہوئے مستقبل میں چین کے دباؤ کو محسوس کر لیا ہے اور اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا ہے کہ جنوبی ایشیا میں آئندہ کسی بھی جارحانہ اقدام کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔

میری رائے میں یہ سمجھنا ایک سنگین غلطی ہوگی کہ نئی دہلی میں ہندوستان اور چین میں جو معاہدہ ہوا ہے، وہ کمیونسٹوں کی کوئی بڑی کامیابی ہے۔ جولائی ۱۹۵۴ء میں جاری شدہ نہرو، چو این لائی مشترکہ اعلان میں کہا گیا ہے کہ تبت کے سلسلہ میں ہندوستان اور چین کا معاہدہ پورے ایشیا کے لئے ایک مثال ثابت ہونا چاہیئے۔ اس معاہدے کی تمہید میں دوستانہ تعلقات کے یہ پانچ اصول بیان کئے گئے ہیں: ایک دوسرے کی علاقائی یکجہتی اور خود مختاری کا احترام، ایک دوسرے پر جارحانہ حملہ نہ کرنا۔ ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں مداخلت نہ کرنا، مساوات اور مل کر فائدہ اُٹھانا، اور پُرامن ہم وجودیت۔

ہندوستان والے اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ چین نے ۱۹۵۱ء میں تبت پر جبراً قبضہ کر کے ان پانچوں اصولوں سے انحراف کیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان نے چین کے ساتھ اپنے تعلقات کے سلسلہ میں کبھی ان اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ نہرو، چو این لائی مشترکہ بیان میں ان اصولوں کے اعادے کا اگر کچھ مفہوم ہو سکتا ہے تو یہی کہ چین اس بات کا عہد

کرے کہ وہ ان اصولوں کی پابندی کرے گا، جن سے حال میں خود چینیوں نے ہی کھلم کھلا انحراف کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہندوستانی حکومت اور عوام بھی بالکل اسی طرح، یہ امید رکھتے ہیں (جس طرح ہم مغرب والے جنگ کے بعد یہ بے معنی امید رکھتے تھے) کہ کمیونسٹ اپنی ہوس اقتدار پوری کرنے کے بعد، امن پسندی اور ہم آہنگی کا راستہ اختیار کرلیں گے۔ تو ہم پرست ایشیائی ملکوں کو اس وقت مغرب کے دلائل، خواہ وہ کیسے ہی معقول اور منطقی دلائل کیوں نہ ہوں، یہ سمجھانے میں بے اثر ثابت ہوں گے کہ وہ ایک ناممکن شے کی امید کررہے ہیں۔ جب انھیں خود کمیونسٹوں کی بدعہدیوں کے تلخ حقائق کا تجربہ ہوگا، اسی وقت ان پر اس فریب کاری کا پردہ چاک ہوگا۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر نہرو، چو این۔ لائی معاہدہ ہندوستان اور چین کے تعلقات بہتر بنانے کی بجائے الٹا اثر دکھا سکتا ہے۔ بہرحال چین کے اصل ارادوں کے لئے یہ ایک آزمائش کا کام دے گا۔
اگر چینی کمیونسٹ سوویٹ روس کی ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے بعد کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور عارضی طور پر اپنا دباؤ کم کرکے کمیونسٹ انقلاب کو مستحکم کرنے پر متوجہ ہوجاتے ہیں تو اس سے ہندوستان اور دوسری آزاد ایشیائی قوموں کو وہ مہلت مل جائے گی جس کی آج انھیں اپنے معاشی اور سیاسی حالات کو بہتر بنانے کے لئے شدید ضرورت ہے۔

لیکن اگر چین اپنے نئے وعدوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتا، جس کا امکان زیادہ معلوم ہوتا ہے، اور مزید توسیعی اقدامات شروع کردیتا ہے تو بہت سے ایشیائی عوام کو تاریخ میں پہلی بار چینی کمیونزم کی اصلی نوعیت کا علم ہوگا اور وہ اسے اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

نئی دہلی اور رنگون میں چو۔ این۔ لائی کے وعدوں کے بعد یہ صورت حال پیش آئی تو آزاد ایشیائی ممالک کے اعتماد کو ایسا ہی نفسیاتی صدمہ پہنچے گا، جیسا کہ ۱۹۴۸ء میں چیکوسلواکیہ میں کمیونسٹ بغاوت کی کامیابی اور جان ماسریک کی موت سے مغربی ملکوں کو پہنچا تھا۔

ہندوستان ان تمام حالات کی ایک کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایشیا میں چینی کمیونسٹوں کی یلغار کو روکنے کے لئے ہندوستان کس حد تک آگے بڑھے گا؟ موجودہ حالات میں کوئی شخص حتیٰ کہ خود ہندوستانی حکومت اور عوام بھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اگر ہندوستان اور اس کے پڑوسی ملکوں کی طرف سے ایشیا کی نہرو ڈاکٹرین کے اعلان کو عملی جامہ پہنانا ہے تو اس شک اور شبہہ کو دور کرنا ہوگا۔

اپریل ۱۹۵۴ء میں منعقدہ سیلون کانفرنس میں ایک بات واضح ہوچکی ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ متحدہ امریکہ کے صدر منرو ہمسایہ جنوبی امریکہ کے احساسات کا غیر ضروری لحاظ کئے بغیر ایک یکطرفہ

اقدام کر سکتے تھے، مسٹر جواہر لال نہرو "نہرو ڈاکٹرین" قسم کی کبھی چیز کا اس وقت یک طرفہ اعلان نہیں کر سکتے، جب تک کہ وہ جنوبی ایشیا میں اپنے قابلِ فخر ہمسایہ ملکوں کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

ایشیا کے حالات میں ایشیائی طرز کی منرو ڈاکٹرین کو موثر اور کامیاب بنانے کے لئے ایک متفقہ بنیاد تلاش کرنی ہوگی جس میں کچھ اور مسائل پوشیدہ ہیں۔

آزاد ایشیا میں منرو ڈاکٹرین قسم کی کسی چیز کا اطلاق کرنے میں جو رکاوٹیں درپیش ہیں وہ بالکل واضح، لاتعداد اور ناقابلِ تسخیر ہیں، لیکن یہ کب اور کس طرح وجود میں آئیں گی اس کے بارے میں فی الحال کوئی پیشین گوئی کرنا غلطی ہوگی۔ اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ چیز بنی بنائی خدا کے یہاں سے نہیں آئے گی بلکہ اور تمام دور رس پالیسیوں کی طرح یہ بھی موزوں طرز عمل، ہمدردی، پسندیدگی، شخصیت اور اقتدار کے متعدد اجزا کے ترقی پا جانے کی صورت میں خود بخود پیدا ہونے لگتی ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے امریکی باشندوں کو ان سوالوں کے آسان جواب تلاش کرنے کی خواہش ترک کر دینی چاہیئے۔ ایشیا میں ایسی کوئی چیز دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس سلسلہ میں یک طویل المیعاد نظریہ کی طرف ہم جتنی جلدی اپنی توجہ مبذول کریں گے، اسی قدر ہمارے لئے ایشیا کے امن اور استحکام میں مدد دینا زیادہ ممکن ہوگا۔

اس دوران میں ہمیں مستقبل میں سوویٹ روس اور چین کے درمیان پیدا ہونے والی رقابت کا بھی پیشگی اندازہ کر لینا ہوگا اور ان داخلی سیاسی اثرات کی شدت کے ساتھ مزاحمت کرنی ہوگی، جن کی بدولت ہمارے لئے چین اور روس کی باہمی رقابت سے فائدہ اٹھانا ناممکن نظر آنے لگے

ہماری اصل غرض وغایت بحیرۂ روم اور جنوبی چین کے سمندر کے درمیان آزاد، پُراعتماد اور حرکت پذیر نئی قوموں کو ان کی ترقی میں مدد دینا ہے۔ یہ سوال کہ کمیونسٹوں نے جو کچھ منصوبہ بنایا ہے وہ اس نوعیت کے حالات ظہور میں آنے دیگا یا نہیں، اس بات کے باوجود بحث طلب ہے کہ آج آزاد ایشیا کے بہت سے رہنماؤں کے خیالات کیا ہیں۔

لیکن متحدہ امریکہ خود یہ حالات ایشیا یا دنیا کے کسی اور خطے میں پیدا نہیں کر سکتا، بلکہ انھیں خود ہی کسی بیرونی مداخلت کے بغیر وجود میں آنا چاہیئے ــــ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان حالات کو فروغ دینے میں اپنی دوستانہ حوصلہ افزائی اور تائید کے ذریعہ مدد کریں۔

× × ×

۲۹۔ ایشا والوں کے مشکل سوالات

ایشیا والوں کے ساتھ متعدد موقعوں پر گفتگو دوران جو مسائل زیر بحث آئے ہیں، مسٹر باؤلز نے انھیں ایک برمی پروفیسر اور ایک امریکی سفیر کے درمیان مکالمے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ گفتگو کا موضوع ایشیا کے بارے میں امریکی انداز فکر ہے۔
پاکٹ میگزین۔ نومبر ۱۹۵۴ء

اگر ہم ایشیا والوں کے ساتھ مفاہمت کی کوئی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے لازمی ہے کہ ان کی مشکلات کو زیادہ سنیں اور اپنی شکایات کم بیان کریں۔ بعض اوقات ہم ان سے ایسی باتیں بھی سنیں گے جنھیں ہم ناپسند کرتے ہیں، مگر یہ باتیں ہمیں لازمی طور پر سننی پڑیں گی۔

حال ہی میں برما کے ایک بڑے مستقل مزاج اور تیز فہم سائنس پروفیسر سے (یہ برمی پروفیسر کمیونسٹوں کا انتہائی مخالف تھا، جتنا کہ وہ غیر مناسب حد تک امریکہ کا مخالف نظر آتا تھا۔) ملاقات ہوئی تھی، جس کی بنیاد پر حسب ذیل مکالمہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس مکالمے سے ایشیا والوں کے بعض ایسے تلخ احساسات کا پتہ چلتا ہے، جو مغربی دنیا اور ایشیا کے جمہوری ملکوں کے موجودہ نازک اور غیر اطمینان بخش تعلقات میں کارفرما ہیں۔

برمی پروفیسر:۔ آپ امریکیوں سے گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ایشیا میں جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، وہ انتہائی افسوسناک ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر ہم آپ سے بہت سی امیدیں لگائے بیٹھے تھے، لیکن آج ہماری وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں، اور ہمیں اس سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔

امریکی سفیر:۔ آپ نے غالباً ہم سے ضرورت سے زیادہ توقعات قائم کی تھیں۔ ہم بھی آخر آپ ہی کی طرح انسان ہیں، اور ہماری بھی بہت سی مجبوریاں اور معذوریاں ہیں۔ ہماری فطرت میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ ہم خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کریں۔ ہم نے ۱۹۴۱ء تک دوسری جنگ عظیم میں شریک ہونے سے گریز کیا، یہاں تک کہ پرل ہاربر کے واقعہ نے ہماری اس بے تعلقی اور علیحدگی کو ختم کر دیا۔ جیسے ہی جنگ ختم ہوئی ہم نے اپنی فوج توڑ دی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ سوویٹ روس نے اپنی فوج بدستور قائم رکھی اور اسے جدید

طور پر منظم کرنے لئے کھربوں ڈالر کی رقم خرچ کی ۔
ہم کبھی اس حیثیت کے خواہشمند نہیں ہوئے تھے جو آج ہمیں حاصل ہے ۔ نہ ہی ہم کسی قسم کی برتری چاہتے ہیں ۔ ہم نہ تو علیحدگی پسند ہیں اور نہ سامراج کے حامی ہیں، ہم صرف امن اور سلامتی کے خواستدگار ہیں اور کمیونزم کی روک تھام کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں ۔

برمی پروفیسر :- کمیونزم مجھے اتنا ہی ناپسند ہے، جتنا کہ آپ کو ۔ بلکہ کمیونسٹ چھاپہ ماروں نے اگست ۱۹۵۱ء میں میرے بھتیجے کو بھی ہلاک کر دیا تھا ۔ ہماری حکومت برسوں تک کمیونسٹوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رہی ہے اور اس نے حال ہی میں انھیں شکست فاش دی ہے، لیکن آپ لوگ کمیونزم کے اندیشہ سے اس درجہ مغلوب ہو گئے ہیں کہ آپ نے ایشیا کے حقائق سے چشم پوشی اختیار کر لی ہے ۔

امریکی سفیر :- ہم کمیونزم کے اندیشہ سے بہت زیادہ مغلوب کس طرح ہو سکتے ہیں ؟ آپ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ کمیونسٹ ساری دنیا کو روندڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ لینن نے آج سے تین سال قبل ہی کمیونسٹ پارٹی کے اغراض و مقاصد بیان کر دیئے تھے اور اس وقت سے آج تک تمام بڑے بڑے کمیونسٹ رہنما اس کی تائید کرتے چلے آرہے ہیں ۔

برمی پروفیسر :- آپ صحیح کہتے ہیں لیکن آپ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ آپ کمیونزم کے اوپر ایک ایٹم گرا کر اسے آگے بڑھنے سے روک سکتے ہیں ۔ کمیونزم کوئی فوج یا کوئی مقام نہیں ہے، بلکہ ایک نظریہ ہے ۔
ہم نے ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ آپ ان تمام معاملات کو زیادہ اچھے طریقے پر سمجھتے ہیں ۔ آپ کا آئین ان جمہوریتوں کے لئے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے، جو ہم ایشیا میں قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ہمیں تشویش اس بات پر ہے کہ آپ لوگ آزادی سے متعلق اپنی طویل تاریخی روایات اور انسانی اصولوں پر اپنے اعتقادات سے روگردانی کر رہے ہیں اپنے ملک میں کمیونزم کا خاتمہ کرنے کے لئے آپ خود کمیونزم کے طور طریقے اختیار کر رہے ہیں ۔

امریکی سفیر :- آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنی جمہوری روایات سے احتراز کر رہے ہیں، دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا میں ہم نے جو کچھ کیا ہے، آپ اس پر ایک نظر ڈالئے ۔ جنگ کے دوران امریکہ کے لاکھوں نوجوانوں نے ایشیا کو جاپانی سامراج سے بچانے کی کوشش میں اپنی جانیں قربان کر دیں ۔

صدر روزویلٹ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ نئی اقوام متحدہ میں چین کو پانچ بڑی طاقتوں میں سے ایک مان کر سلامتی کونسل کا رکن بنایا جائے ۔ جنگ ختم ہونے کے فوراً

بعد جیسا کہ ہم نے وعدہ کیا تھا، ہم نے فلپائن کو آزاد کر دیا۔ ہم نے ہندوستان اور انڈونیشیا کی آزادی کی پوری حمایت کی اور جاپان کی اس درجہ حوصلہ افزائی اور اعانت کی کہ آج تک کوئی فاتح ملک اپنے سابقہ دشمن کے ساتھ نہ کر پایا ہوگا۔

برمی پروفیسر :۔ میں جانتا ہوں۔ مگر ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ آپ اس مغربی دنیا کا ایک حصہ ہیں جس نے نسلوں تک ہر سال ایشیا سے لاکھوں اور کروڑوں ڈالر حاصل کر کے اپنے شہروں کی تعمیر، یونیورسٹیوں کے قیام اور اعلیٰ معیارِ زندگی کے حصول پر صرف کئے اور ہمیں افلاس اور جہالت میں مبتلا کر کے فاقہ کشی کرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

اس دولت سے کہیں زیادہ، جو اہلِ مغرب ایشیا سے نکال کرلے گئے، وہ ذلّت ہے جو اس عرصہ میں ہم کو برداشت کرنی پڑی، صرف اس بنا پر کہ ہماری جلد کا رنگ گہرا تھا اس لئے ہم دوسرے درجہ کے انسان قرار دیئے گئے۔

امریکی سفیر:۔ مگر میں آپ سے پھر یہ سوال کروں گا کہ آپ اس میں امریکہ کو کیوں شامل کرتے ہیں؟ ایشیا میں ہم کبھی اس قسم کی سامراجی حیثیت میں نہیں رہے ہیں۔ بلکہ ہم دنیا کی وہ پہلی قوم ہیں جس نے یورپ کے سامراجی اقتدار سے خود کو آزاد کرانے کے لئے جنگ کی تھی۔

برمی سفیر :۔ لیکن آپ گزشتہ چند سالوں میں کیا کرتے رہے ہیں؟ آپ نے ہندچینی یعنی فرانس کو کروڑوں ڈالر کی فوجی امداد دے کر فرانسیسی سامراج کو سہارا دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر آپ نے ۱۹۴۶ء میں ذرا سختی سے کام لیا ہوتا تو ہندچینی سے فرانس کو اسی طرح ہٹ جانا پڑتا جس طرح برطانیہ، ہندوستان، پاکستان، برما، اور لنکا چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گیا، اور پھر ویٹ نام، کمبوڈیا اور لاؤس کو خونریزی بغیر آزادی نصیب ہو جاتی۔

امریکی سفیر :۔ ہاں، لیکن ویٹ نام کا لیڈر ہوچی منھ کمیونسٹ تھا اور اگر امریکہ فرانس کی امداد نہ کرتا تو یہ کمیونسٹ لیڈر ویٹ نام، کمبوڈیا، اور لاؤس تینوں ملکوں کو چینی کمیونسٹوں کے حوالے کر دیتا۔

برمی پروفیسر :۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہوچی منھ ایک کمیونسٹ لیڈر ہے۔ لیکن اگر وہ ویٹ نامی عوام کی نئی حاصل کردہ آزادی کمیونسٹ چینیوں، روسیوں یا کسی دوسری غیر ملکی طاقت کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے عوام جنھوں نے ہمیشہ چینیوں پر جو بد اعتمادی کا اظہار کیا ہے، اسے نکال باہر کرتے۔

فرانسیسی حکمرانوں نے اسے طاقت کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے فرانسیسیوں کی اس حماقت میں انھیں کثیر تعداد میں مشین گنوں، ٹینکوں، ہوائی جہازوں اور دوسرے

فوجی سازوسامان سے مدد دی۔ اس لئے آپ ایمانداری کے ساتھ کس طرح یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے ایشیا میں سامراج کی تائید نہیں کی؟

امریکی سفیر:۔ ہم یوروپی سامراج کو اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں جتنا کہ آپ ناپسند کرتے ہیں اور ہم اس بات سے بھی متفق ہیں کہ فرانسیسیوں نے ہند چینی میں غلطیاں کی ہیں۔ لیکن ایشیا میں وہ سامراج، جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں، اب ایک داستان ماضی بن چکا ہے۔

آپ جس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں، وہ نیا کمیونسٹ سامراج ہے، جسے ماسکو اور پیکن کے حکمرانوں کی تائید حاصل ہے، یہ نیا سامراج یقیناً یورپی سامراج سے زیادہ خطرناک ہے۔ آپ ایشیا والے یورپ کے دور از کار نوآبادیاتی نظام پر ہی بحث کرتے رہیں گے کہ وقت سے فائدہ اُٹھا کر نیا کمیونسٹ نوآبادیاتی نظام آپ کو ہڑپ کر جائے گا۔

برمی پروفیسر:۔ اگر آپ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں تو ہم لوگ کمیونزم سے اپنی آزادی کا تحفظ اس سے کہیں زیادہ بہتر طریقے پر کر سکتے ہیں، جتنا کہ آپ سوچتے ہیں۔ ذرا واقعات پر نظر ڈالئے۔ چین کی جنگ کے علاوہ، دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے سے اب تک ایشیا میں ۶ خانہ جنگیاں ہو چکی ہیں، اور وہ سب کی سب کمیونسٹوں کی جاری اور منظم کردہ تھیں۔

ان میں سے چار خانہ جنگیاں ان ملکوں میں ہوئیں جنھوں نے حال ہی میں آزادی حاصل کی تھی، یعنی فلپائن، انڈونیشیا، برما اور ہندوستان — اور ان چاروں ملکوں میں کمیونسٹوں کو کسی بیرونی امداد کے بغیر کچل دیا گیا۔ دوسرے دو ملکوں — ملایا اور ہند چینی میں کمیونسٹوں کو کافی بڑے پیمانے پر گڑبڑ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی — ہند چینی میں انھوں نے فرانس اور متحدہ امریکہ کے مشترکہ فوجی امداد کے باوجود نمایاں فتح حاصل کر لی ہے۔

آخر کیوں؟ محض اس لئے کہ ملایا اور ہند چینی میں کمیونسٹ عوام کو یہ بات ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ غیر ملکی سامراجیوں کو سمندر میں دھکیلنے کے لئے عوامی جنگ کی قیادت کر رہے ہیں۔ لیکن جہاں جہاں انھیں ایشیائی قوم پرستی کا مقابلہ کرنا پڑا، وہاں انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ اس کے علاوہ امریکہ والوں نے صرف ایشیا میں ہی نوآبادیاتی نظام کی تائید نہیں کی، بلکہ افریقہ میں بھی آپ لوگوں کا ریکارڈ اتنا ہی خراب ہے — اقوام عالم کے حق آزادی کے بارے میں آپ جتنی اچھی اچھی باتیں کہتے ہیں، ان سب کے باوجود آپ نے اقوام متحدہ میں ٹیونس، اور مراکش کی آزادی کی تحریکوں کے خلاف ووٹ دیا ہے۔

امریکی سفیر: ہیں فرانسیسی افریقیہ کے سوال پر وقتی طور پر اس لئے سمجھوتہ کرنا پڑا ہے کہ یورپ کے دفاع میں فرانسیسی فوج کی شمولیت لازمی ہے۔ اس لئے ہم فرانس کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے کے لئے مجبور تھے، جو الجیریا، ٹیونس اور مراکش کی آزادی کی شدّت کے ساتھ مخالفت کر رہا ہے۔ اس طرح ہم وقتی طور پر اپنے ضمیر کے خلاف ووٹ دینے پر مجبور ہو گئے۔

برمی پروفیسر:۔ مگر اس قسم کے سمجھوتوں سے آپ کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ اس کا ایک واضح نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نہ صرف ایشیا بھر کے عوام کا اعتماد آپ پر سے اُٹھ گیا ہے بلکہ افریقیہ میں بھی یہی صورت پیش آئی۔

آپ لوگوں کے ساتھ ایک مشکل یہ ہے کہ آپ ہر چیز کو فوجی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اب یہ ایک واقعہ ہے کہ دنیا کے بیشتر حصے میں فوجی طاقت ہی کوئی فیصلہ کُن چیز نہیں ہے برطانیہ نے ہندوستان کو کس لئے چھوڑ دیا؟ کیا صرف اس لئے کہ برطانوی حکمرانوں کے پاس فوجی طاقت نہ تھی نہیں، بلکہ برطانیہ اس وقت بھی دنیا کی تیسری بڑی فوجی طاقت تھی لیکن وہ ہندوستانی عوام کی مرضی کے خلاف جن کی رہنمائی گاندھی جی کر رہے تھے، آئندہ صرف چند ہی سال تک اپنا اقتدار قائم رکھ سکتے تھے۔ آج ہندچینی میں فرانسیسیوں کو بھی بالآخر اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا ہے لیکن خرابیٔ بسیار کے بعد۔

آپ لوگ کب اس بات کو سمجھیں گے کہ ایشیا کے مسائل بنیادی طور پر سیاسی اور معاشی مسائل ہیں اور یہ کہ ان کی فوجی ضروریات قطعاً ضمنی حیثیت رکھتی ہیں؟

امریکی سفیر:۔ لیکن ہم اس حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنے چار نکاتی امدادی پروگرام کے تحت ایشیائی قوموں کو خود کفیل ہونے اور عوام کی غریبی، بیماری اور جہالت کو دور کرنے میں مدد دینے کی کوشش کی ہے۔

برمی سفیر:۔ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ چار نکاتی امدادی پروگرام دنیا کی تاریخ میں ایک انتہائی جرأتمندانہ اقدام ہے اور امریکی عوام اسے وضع کرنے کے لئے ہر طرح تعریف و تحسین کے مستحق ہیں لیکن اگر آپ لوگ خود اپنے دل میں ایمانداری سے سوچ سکتے ہیں تو آپ کو اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ ابھی تک اس کی بدولت جو نتائج مرتب ہوئے ہیں، وہ افسوسناک حد تک غیر تسلّی بخش ہیں۔

امریکی سفیر:۔ یہ سچ ہے کہ ہمارا چار نکاتی امدادی پروگرام بہت محدود ہے، اگر خود ہمارے درمیان آپس میں اس مسئلہ پر سیاسی اختلافات موجود ہیں، اور بہت سے امریکیوں کو اس بات پر تشویش

محسوس ہوتی ہے کہ دوسرے ملکوں کے عوام اس بات سے باخبر نہیں ہیں کہ ہم ان کی مدد کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔

برمی پروفیسر:۔ اچھی طرح شکر گزار نہیں ہیں؟ کیا آپ کی امداد کا اصل مقصد یہی ہے۔ آپ اس خیال سے امداد دیتے ہیں کہ اس سے آپ ہماری دوستی خرید لیں گے؟ کیا امریکہ میں یہی ہوتا ہے؟ کیا آپ امریکہ میں روپیہ کے عوض دوستی خرید سکتے ہیں؟ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں امریکی امداد کا مقصد ایک اور صرف ایک ہونا چاہیئے، اور وہ یہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک کے عوام کو اس لئے مدد دی جائے کہ اپنی مدد آپ کر سکیں۔ جب وہ معاشی ترقی کو محسوس کرنے لگیں یعنی یہ دیکھیں کہ ان کی زرعی پیداوار زیادہ ہو رہی ہے، بیماریوں کا خاتمہ ہو رہا ہے، اور ان کے بچے روز بروز زیادہ تندرست اور توانا ہو رہے ہیں، اور اسکولوں اور سڑکوں کی تعمیر ہو رہی ہے، تو پھر وہ اس کے لئے ضرورت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں امریکی امداد دینے کا یہی ایک معقول سبب ہو سکتا ہے، نہ یہ کہ اس سے دوستی خریدی جائے یا اقوام میں ووٹ خریدے جائیں۔

کیا اقوام عالم کا استحکام آپ کے لئے کافی نہیں ہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم امریکی تصورات اور غلبہ کی تابعدار ہوں؟ اگر کمیونسٹ اقلیتوں کا شور و ہنگامہ موجود نہ ہوتا تو غالباً آپ ہمیں اور ہماری غریبی کو بالکل ہی نظرانداز کر دیتے۔

امریکی سفیر:۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ چین میں کمیونزم کے ایک قرار واقعی مسئلہ بن جانے سے بہت پہلے ہم نے چین کو بہت کافی مالی امداد دی تھی۔ اور اب چین ہمارا دشمن بن کر ہمارے سامنے آ رہا ہے اور ہمارے خلاف نفرت اور جراثیمی جنگ کا پروپیگنڈہ کر کے پورے ایشیا کو ہمارا مخالف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

برمی پروفیسر:۔ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ چینی کمیونسٹ بڑے تلخ اور جارحیت پسند ہیں، بلکہ مستقبل میں وہ روسی کمیونسٹوں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن آپ کی حکمت عملی سے صورتِ حال بہتر ہونے کی بجائے اور بھی بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں، کمیونسٹ چین آج کی ایک حقیقت ہے۔ آپ چین کے ساتھ براہِ راست کیوں بات چیت نہیں کرتے، اور کیوں روسیوں کو ان کا واحد ترجمان بننے کا موقع دیتے ہیں۔

امریکی سفیر: لیکن ہم کمیونسٹ چین کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں، جب کہ چینی کمیونسٹ کوریا کی جنگ میں تیس ہزار امریکی سپاہی ہلاک کر چکے ہیں؟ وقت آگیا ہے کہ آپ واقعات کو دیکھیں۔ کمیونسٹ

چین ایک جارحیت پسند قوم ہے۔

برمی پروفیسر:۔ مگر آپ روسیوں کو بھی "جارحیت پسند" قرار دیتے ہیں اور کم از کم روسی بھی اتنے ہی کمیونسٹ ہیں، جتنے چینی ۔ لیکن ۔۔ لیکن آپ نے سرخ روس کو بیس سال قبل تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں آپ نے ان کے دوش بہ دوش جنگ میں حصہ لیا تھا۔

ہم ایشیا والوں میں سے اکثر کا یہ خیال ہے کہ آپ کی طرف سے کمیونسٹ چین کو تسلیم نہ کرنے کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ رنگ دار قوم ہیں اور آپ سفید فام ہیں۔ کیا آپ خود اپنے ہی ملک میں رنگدار اشخاص کو دوسرے درجہ کا شہری قرار نہیں دیتے؟ اگر آپ رنگدار عوام کو سفید فام عوام کے مساوی سمجھتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے دوسری عالمگیر جنگ میں جاپانیوں پر ایٹم بم استعمال کیا مگر جرمنوں پر نہیں؟

امریکی سفیر:۔ یہ سراسر لغویت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی ایٹم بم تیار بھی نہ ہوا تھا کہ جرمنی کے ساتھ جنگ ختم ہو گئی تھی۔

برمی پروفیسر:۔ آپ کے لئے ایشیا والوں کو اس بات کا یقین دلانا بہت مشکل ہے۔

اس برہم ایشیائی کی باتوں سے ان دوسرے کروڑوں ایشیا والوں کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے جو تہران سے لے کر ٹوکیو تک آباد ہیں۔

اسے کمیونزم ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ جمہوریت کو کامیاب ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ امریکہ پر اعتماد کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا ملک ترقی کرے اور استحکام، خوش حالی اور امن کی منزل تک پہنچ جائے۔

لیکن وہ ایک ایسے امریکہ کے نام سے گھبراتا ہے جو ذہنی انتشار میں مبتلا ہے اور دنیا کی ان قوموں کے ساتھ رابطہ کھو بیٹھتا ہے جو اس کی دوست بن سکتی ہیں۔ وہ پریشانی اور تشویش محسوس کرتا ہے اور انتہائی خوف زدہ بھی ہے۔

اس کے گہرے اور اکثر جانبدارانہ نظریات جو یقین کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں، تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اور ایک دن آئے گا جب وہ ہمارے تمام جنگی اسلحہ کے مقابلہ میں زیادہ مؤثر اور وزن دار ثابت ہوں گے۔ ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے خیالات کو سنیں اور جہاں کہیں ہم یہ سمجھیں کہ وہ غلطی پر ہے تو اس سے اختلاف کریں۔ لیکن سنیں ضرور۔

× × ×

۳۰۔ غیرجانب دار قومیں اور ہندوستان کی کامیابی کی داستان

کیا ہم اپنے یورپین حلیفوں کو نظرانداز کرکے ترقی پذیر ممالک کی فلاح، اور بہبودی پر ضرورت سے زیادہ توجہ صرف کرتے رہے ہیں؟ مسٹر باؤلز نے ذیل کے مضمون میں اس خیال کی نفی میں اپنے دلائل پیش کئے ہیں اور اس بات پر زور دیا ہے کہ امریکہ کو ان تمام جانب دار اور غیر جانب دار قوموں کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنا چاہیئے۔ جو اس تعاون اور امداد کو سلیقے کے ساتھ کام میں لارہی ہیں۔

رسالہ "دس منتھ" جولائی ۱۹۶۲ء

امریکہ کے بیشتر باشندے نام نہاد افریقی ایشیائی بلاک کے نام سے حال ہی میں واقف ہوئے ہیں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ کیوں کہ افریقہ اور ایشیا کی ایسی بیشتر قومیں، جنھیں بین الاقوامی سیاسیات میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ پچھلے چند ہی سالوں کے اندر آزاد ہوئی ہیں۔

اقوام متحدہ کی رکن ۱۰۴ قوموں کی ٹھیک نصف تعداد افریقی اور ایشیائی ممالک پر مشتمل ہے۔ ان نئی اقوام کو اس عالمی ادارے میں بین الاقوامی سطح پر اپنی زبان کھولنے کا موقع دیا گیا ہے: اور انھوں نے بھی اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھانے میں کسی قسم کا تردد نہیں کیا ہے۔

اقوام متحدہ میں افریقی اور ایشیائی قوموں کی طرف سے ظاہر کئے جانے والے خیالات، اور نظریات اُس کے مقابلے میں امریکی نظریات کے ساتھ کہیں زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے اور ہمارے درمیان بعض ایسے اختلافات موجود ہیں جنھیں امریکہ کے بہت سے باشندے تشویش کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

پچھلے چند ماہ میں ان اختلافات نے ایک خاص اہمیت اختیار کرلی ہے۔ کیوں کہ اس عرصہ میں ایشیا اور افریقہ کے ممتاز رہنما امریکہ پر شدید نکتہ چینی اور روس کے ساتھ بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ امور خارجہ کی روز افزوں پیچیدگی اور خارجہ سے متعلق مسائل کے سادہ اور فوری حلوں کا فقدان اور ایٹمی ناپ تول کی کسی امکانی غلطی کے بڑھتے ہوئے خطرے نے بہت سے امریکیوں کو ایک قسم کی مایوسی اور ذہنی خلفشار میں مبتلا کردیا ہے۔

مایوسی کا یہ جذبہ اکثر غیر جانبدار قوموں پر شدید نکتہ چینی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ہمارے بعض انتہا پسند نکتہ چینیوں نے الزام لگایا ہے کہ امریکہ افریقی ایشیائی ممالک کی طرف بہت زیادہ توجہ صرف کر رہا ہے، یہ کہ ہم غیر ضروری طور پر ان کی "ناز برداری" کر رہے ہیں، اور یہ کہ ہماری حکمت عملی "قابلِ عمل" نہیں ہے۔

اس قسم کے خیالات اکثر ان لوگوں کی طرف سے ظاہر کئے گئے ہیں جو اپنے آپ کو "پختہ کار حقیقت پسندوں" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ لوگ بین الاقوامی معاملات میں اعتدال برتنے والوں کو "خیال پرستوں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جن کے ذہنوں پر دھند چھائی ہوئی ہے۔

یہ خود ساختہ "حقیقت پسند امور خارجہ کے سلسلہ میں ایک قدیم اور مشہور مکتب خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ میں ایسی بہت سی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں اپنی اس غیر تحمل مزاجی اور عدم واقفیت کے معاملے میں یہ لوگ صحت کے مقابلہ میں عدم صحت سے زیادہ قریب ہیں۔

مثال کے طور پر پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد ہی ان "حقیقت پسندوں" نے وڈرو ولسن اور مجلس اقوام کے سلسلہ میں ان کے "ناقابلِ عمل" تصورات پر شدید نکتہ چینی کی تھی، جس کے نتیجہ میں ہم پر علیحدگی پسندی کا الزام عاید ہوا، اور دنیا کو "جنگ برائے خاتمۂ جنگ" کے ایک ہولناک اور متواتر عمل سے دوچار ہونا پڑا۔

افریقی اور ایشیائی مسائل کے ساتھ ان لوگوں کی عدم واقفیت بھی ایسے ہی شدید نقصانات کا باعث ثابت ہوئی ہے۔ برطانیہ میں امور خارجہ سے تعلق رکھنے والے "پختہ کار حقیقت پسندوں" کو یقین کامل تھا کہ ان کے ہندوستان، پاکستان، سیلون اور برما سے چلے جانے اور ان ملکوں کے انتظامی معاملات ان کے "غیر ذمہ دار باشندوں" کے ہاتھوں میں آجانے کے بعد جلد ہی ان تمام ممالک کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ حال ہی میں ان لوگوں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ مصری باشندے "تجربہ کار یورپینوں" کی رہنمائی کے بغیر نہر سویز کا روبار نہیں چلا سکیں گے۔

لیکن نتائج نے ان تمام دعووں کی نفی کر دی ہے۔ رفتہ رفتہ ان تمام قوموں نے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ وہ اپنے ملک کی حکومت کا کاروبار سنبھالنے کی بہترین صلاحیتیں رکھتی ہیں اور اپنے ملک کو پیش آنے والے مسائل کا پوری جرأتمندی اور قوت ارادی کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانس کے "پختہ کار حقیقت پسندوں" نے فرانسیسی حکومت کو ہند چینی میں ایک انتہائی احمقانہ حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے ناسازگار حالات میں ایشیا کے اندر ایک چھوٹی سی نوآبادی کو برقرار رکھنے کی کوشش ایشیا کے

نوآبادیات دشمنوں، قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کو ہوچی منہ کی قیادت میں ایک متحدہ محاذ کی صورت میں مجتمع کر دیا، جنھوں نے فرانس کے خلاف "قومی آزادی" کی کامیاب لڑائی لڑی۔

لیکن ان "حقیقت پسندوں" نے ہند چینی کی تباہی سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے برسوں تک فرانس کی حکومت کو الجیریا کے باشندوں کے ساتھ کوئی معقول تصفیہ کرنے سے باز رکھا۔ ابھی حال ہی میں الجیریا میں یہ "پختہ کار" مفکرین فرانس کے نوآبادیات خواہوں کو پھر سے ایک ایسے راستے پر ڈالنے کی دھمکی دے رہے تھے جو انھیں ایک بار پھر تباہی کی طرف لے جا سکتا ہے۔

افریقی اور ایشیائی ممالک کی امداد اور ان کے ساتھ تعاون کی پالیسی کے مخالفوں کی تازہ ترین پود، جو حقائق سے بے بہرہ ہے اور اکثر فاش غلطیوں کی مرتکب ہوتی ہے، اس کے بیشتر افراد دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس قدیم اور تکبر آمیز نظریہ کے حامی ہیں کہ سفید فام اقوام نسلی اعتبار سے دوسروں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ چند پشتیں گزریں کہ ان کے نظریاتی پیشرو اس بات کی حمایت کرتے تھے کہ جب کبھی "مقامی باشندے" قابو سے باہر ہونے لگیں تو انھیں بندوق کے استعمال میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے۔

اگر اس دور کے لوگ اس سے کچھ زیادہ بردباری اور پیش بینی سے کام لیتے اور اپنی پختہ کار "رجعت پسندی" کے معاملہ میں ذرا پیچھے ہوتے، تو ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی نئی حکومتوں کو آج جن عظیم دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ ان کے لئے اتنی زیادہ پریشان کن ثابت نہ ہوتیں۔ موجودہ دور میں جب کہ نسلی برتری کا تصور تیزی کے ساتھ مفقود ہوتا جا رہا ہے، سفید فام قوموں کی نسلی برتری کا احساس ان کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

پچھلے سولہ سال کی مدّت میں یورپ کی قدیم نوآبادیاتی سلطنتوں کے اندر سے چوالیس نئی قوموں نے جنم لیا ہے جو زمین کی کل آبادی کے تخمیناً ایک تہائی حصے پر مشتمل ہیں۔ اور چونکہ یہ نئی اقوام اپنی سیاسی و معاشی آزادی کے معاملہ میں انتہائی حسّاس واقع ہوئی ہیں، اس لئے انھیں ان تمام پالیسیوں پر، خواہ وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہوں، عمل درآمد کرتے ہوئے تردّد ہوتا ہے، جن کے متعلق وہ یہ سمجھتی ہیں کہ یہ پالیسیاں بعض بیرونی قومیں ان پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کا یہ رجحان روس اور امریکہ دونوں کے ساتھ ان کے معاملات پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔

اس طرح ہمارا مقصد بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی ہمیں اس بات کا یقین کر لینا چاہیئے کہ ان نئی اقوام میں سے ہر ایک اپنے مخصوص انداز میں اور اپنے مخصوص ثقافتی ڈھانچہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

کمیونزم کا سدّباب کرنے کی صلاحیت کا انحصار اس بات پر نہیں کہ یہ نئی قومیں لازمی طور پر

امریکی طرزِ معاشرت اختیار کریں یا یہ کہ ان کے باشندے امریکن ہتھیاروں سے مسلّح ہوں۔ اس کے برعکس اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ایسی ہر نئی قوم اپنے قدرتی اور انسانی وسائل کو فروغ دینے کی کوشش کرے اور اپنے سرکاری اداروں کو اپنے مخصوص قومی مقاصد کی تکمیل کے لئے وقف کردے۔

دورِ حاضرہ کے امریکہ کی تعمیر میں کئی پشتوں تک شدید جانفشانی اور ایثار و قربانی کے ساتھ کام کرنا پڑا ہے اور اس میں بے اندازہ مالی مصارف بھی ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ روس کے باشندے بھی تیس یا چالیس سال کی مدّت میں ایک جدید صنعتی ریاست کے قیام میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن اس مقصد کے لئے انھوں نے جو طور طریقے اختیار کئے وہ ہمارے آزادی کے تصورات سے قطعاً مختلف ہیں۔

اب ایشیا اور افریقہ کے کم ترقی یافتہ ممالک دنیا کی تمام تر توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ یہیں اس خطّے کے کروڑہا انسان اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کمربستہ نظر آتے ہیں۔ صدیوں کے افلاس اور نو آبادیاتی نظام کی بدولت ان کے اندر سعی اور سرگرمی کا ایک زبردست جذبہ اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے ایک عزمِ مستحکم پیدا ہو چکا ہے۔

پھر بھی ایشیا اور افریقہ کی قومیں اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ترقی کے نصب العین کو اسی صورت میں حاصل کر سکتی ہیں جب کہ زیادہ ترقی یافتہ قومیں — مثلاً برطانیہ، امریکہ، فرانس، جرمنی، جاپان — ان کے لئے وہ اقتصادی امداد فراہم کریں جو ان ترقیاتی کاموں کو آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے۔

اگر ہم یہ امداد بہم پہنچانے میں ناکام رہتے ہیں تو ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ یہ نئی قومیں ہمارے اس رویّے سے متاثر ہو کر خاموشی کے ساتھ ماضی کی سستی اور کاہلی اور ناامید کے کسی گڑھے میں نہیں جا پڑیں گی۔ انھیں مستقبل کے امکانات کا علم ہو گیا ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت سے ان سے فائدہ اٹھانے پر تلی ہوئی ہیں۔

یہ صورتِ حال انتہا درجہ کے تحمّل، جرأت، اعلیٰ درجہ کی قوتِ فیصلہ، سوجھ بوجھ اور سرمائے کی متمنّی ہیں۔ پھر بھی ایشیا اور افریقہ میں آج جو عظیم سیاسی اور سماجی شورشیں اور ہنگامے برپا نظر آتے ہیں۔ اگر ان کو ہم ملکی تعمیر و ترقی کے پُرامن مقاصد میں تبدیل کر سکیں تو اس سے ہمیں اور نئی قوموں کو زبردست منافع ہوگا۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہم کھڑے تماشہ دیکھتے رہیں اور چھوٹے بڑے بہت سے چین، جو مادی طور پر ننگے اور بھوکے ہوں گے، لیکن سب کے سب ہماری تباہی کے خواہاں ہوں گے اُبھر اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

کیا یہ نصب العین ہماری پہنچ سے باہر ہے؟ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اس کے ثبوت کے لئے

ہم صرف ایک غیر ترقی یافتہ ملک کی ایک نسل سے بھی کم کی ترقی کا جائزہ لیں گے۔

ہندوستان کی آبادی ۴۵ کروڑ ہے جو افریقہ اور لاطینی امریکہ کی مجموعی آبادی کے قریب قریب برابر ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء کو ہندوستان کی آزادی کے ۱۵ سال پورے ہو جائیں گے۔ گاندھی جی کی ذہانت اور برطانیہ کے تدبّر کی کرشمہ سازی تو دیکھئے کہ ہندوستان اپنا یوم آزادی مناتا ہے تو اس کے دل میں اپنے سابق نوآبادیاتی حکمرانوں کے لئے زبردست جذبۂ محبت ہوتا ہے۔

پچھلے دس سالوں میں ہندوستان کی قومی آمدنی میں ۴۲ فیصدی اور غلّے کی پیداوار میں ۵۶ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ہر سال ملیریا کے تقریباً دس کروڑ مریض ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ بیماری ہندوستان سے تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا اوسط عمر ۲۷ سال تھی جو اب بڑھ کر ۴۲ سال ہو گئی ہے۔

ایک ایسے ملک میں جس میں ۱۵ سال بیشتر پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب صرف ۱۰ فیصدی آج اس کے ۱۲ سال سے کم عمر کے ۶۰ فیصدی بچے اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ہندوستان کی صنعتی پیداوار میں اضافہ کی سالانہ شرح ۱۴ فیصدی ہے جو دنیا کی سب سے زیادہ شرحوں میں سے ہے۔

اپنی آزادی کے ابتدائی سالوں میں ہندوستان نے ایک ایسا آئین مرتب کیا تھا جس میں امریکہ اور برطانیہ دونوں کی حکومتوں کی خصوصیتوں کو یکجا سمویا گیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ہندوستان میں تین قومی انتخابات ہو چکے ہیں —— جن میں سے ہر انتخاب دنیا میں جمہوری حقوق کا سب سے بڑا استعمال کہا جا سکتا ہے۔ ان انتخابات میں رائے دہندگان کا تناسب امریکہ سے زیادہ رہا ہے۔

ہندوستان میں آزادی تقریر، آزادی مذہب، آزادی تحریر اور غالباً ہمارے معاشرے کے مقابلہ میں نجی صنعتوں پر حکومت کو کم سے کم دخل حاصل ہے۔

ہندوستان کی کامیابی کا سبب بیشتر اس کی اپنی جد و جہد ہے۔ ہندوستانیوں نے سخت محنت سے کام کیا ہے۔ ایک مؤثر قسم کی قیادت کو وجود میں لائے ہیں، تعلیم حاصل کی ہے اور برطانیہ کی دی ہوئی تربیت کی مدد سے اعلیٰ درجہ کی سول سروس کو منظم کیا ہے۔ لیکن ہندوستانی جمہوریت کو غالباً اتنی کامیابی نصیب نہ ہوتی اگر ہندوستان امریکہ کی امداد سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ پچھلے ۱۵ سالوں میں ہم نے ۳٫۸ بلین ڈالر کی اقتصادی امداد دی ہے۔

اس امداد کا تخمیناً ۵۵ فیصدی حصہ "فاضل" اشیا مثلاً گیہوں، روئی، اور مکئی وغیرہ کی صورت میں تھا اور ۴۲ فیصد ڈالروں کی صورت میں تھا جس کی مدد سے ضروری ساز و سامان مثلاً فولاد، ریل کی پٹریاں اور مشینری خریدا جاتا تھا۔ اس سامان کا بیشتر حصہ خود امریکہ کا

بنایا ہوا تھا۔ باقی رقم ٹیکنیکل امداد اور تربیت پر صرف ہوتی تھی۔

ہماری اس خطیر امداد اور ہندوستان کے جمہوری اصولوں پر اعتقاد رکھنے کے باوجود ہندوستان ہمیشہ ہی ہماری رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ روس اور چین کی جغرافیائی قربت اور خود اپنی گزشتہ تاریخ کے پیش نظر ہندوستان بین الاقوامی معاملات کو بالکل مختلف زاویے سے دیکھتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے دو سمندروں کے پار واقع ہم اپنی محفوظ حیثیت کی بدولت ایک سو سال تک غیر جانبداری اور علیحدگی پسندی کی پالیسی اختیار کئے رہے اور امن و امان قائم رکھنے کی تمام تر ذمہ داری برطانوی سیاست اور برطانوی بحریہ کو برداشت کرنی پڑی۔

ان سب باتوں کے باوجود اس ایشیائی قوم کی یہ عظیم الشان کامیابی ہمارے اپنے تحفظ کے نقطۂ نگاہ سے بھی نہایت اہم ہے۔ اعتماد کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آزاد ہندوستان ایشیا میں کمیونسٹ چین کی طاقت میں توازن قائم رکھے گا۔ ہندوستان نے اس بات کا مظاہرہ کر دکھایا ہے کہ جمہوریت محض کوئی ایسی چیز نہیں جو مغرب کا ایک خوش آیند نظریہ ہو، بلکہ اس پر نہایت خوبی سے عمل درآمد بھی کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ جب ہم افریقہ اور ایشیا کے ان رہنماؤں کی نکتہ چینی پر خفا اور برہم ہوتے ہیں، جو بین الاقوامی معاملات میں ہمارے ساتھ پورا پورا اتفاق نہیں رکھتے، تو ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ ہندوستان، پاکستان، فلپائن اور بہت سی دوسری قوموں کی کامیابی کی بدولت غیر کمیونسٹ دنیا کو کتنی زبردست تقویت نصیب ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اگر ان قوموں کو اپنی جدوجہد میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تو اس کی بدولت کتنی تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا ہوتا۔

مجموعی حیثیت سے ہمارا قومی مفاد اس بات میں ہے کہ ایسی ریاستوں کی ایک عالمگیر برادری کو وجود میں لایا جائے جو انسانی امور کے متعلق انتہائی مشترکہ نظریات کے ساتھ اتفاق رکھتی ہو۔ ایسی عالمگیر برادری کے لئے کمیونسٹ کے پاس کوئی موثر جواب نہیں ہے۔

× × ×

۱۳ ۔ وسطِ مشرق میں نئے رجحانات

کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا کے اس اہم خطے کے متلون مزاج عوام جب اپنے قومی وسائل کو ترقی دینے پر اپنی توجہات مرکوز کردیں گے تو وہاں کشیدگی کم ہو جائے گی؟ اس بارے میں مسٹر باؤلز نے امریکی یہودیوں کی کانگریس منعقدہ ۱۲ اپریل ۱۹۶۲ء سے خطاب کرتے ہوئے بہتر فضا پیدا ہونے کی کچھ جچی تلی توقعات ظاہر کی ہیں ۔

پچھلے دس سال میں مشرقِ وسطیٰ کے متعلق امریکی رائے عامہ بلند توقعات اور خوفناک پیش گوئیوں کے درمیان حرکت کرتی رہی ہے ۔ اب البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقتی طور پر کسی درمیانی نقطہ پر آ کر رک گئی ہے ۔

مشرقِ وسطیٰ کے حالات کے بارے میں ہمارا موجودہ اندازہ کسی حد تک اس اہم علاقے کی تیز رفتار معاشی ترقی اور بڑھتی ہوئی سیاسی ہم آہنگی سے متعلق اپنی بلند توقعات میں کمی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ دوسرے معنوں میں اس سے اس پیچیدہ اور دشوار صورت حالات کے سلسلے میں ہماری حکومت، سوویٹ روس اور خود مشرقِ وسطیٰ کی حکومتوں کی مطابقت پذیری کا پتہ ملتا ہے ۔ اس اہم علاقے کے عوام سیکڑوں برس تک جنگ و جدل اور استحصال کا شکار رہے ہیں ۔ پہلی عالمگیر جنگ نے ان اقوام کی آزادی، خوشحالی اور بڑھتے ہوئے اتحاد کی بلند توقعات پیدا کی تھیں ۔ ترکی میں سلطنت عثمانیہ کے زوال کی بدولت جو سیاسی خلا پیدا ہوا تھا اسے انگریزوں اور فرانسیسیوں نے پُر کر دیا تھا اور پرانے تنازعات کی جگہ نئے تنازعات نے لے لی تھی ۔ دوسری عالمگیر جنگ کے نتیجہ میں دنیائے عرب سے یورپ کے نوآبادیاتی نظام کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا ۔ اور ایک نئی آزاد قوم کی حیثیت سے اسرائیل وجود میں آیا ۔

شدید تلخی اور ناخوشگواری کے اس دور میں بہت سے امریکی اس امید پر بیٹھے رہے کہ دوسرے علاقوں کی طرح مشرقِ وسطیٰ میں بھی معقولیت کا دور دورہ ہو گا ۔ معدنی تیل کے بڑھتے ہوئے محاصل اس علاقے کی مجموعی ترقی اور بہبودی کے لئے کامیابی سے استعمال میں لائے جا سکیں گے اور عرب اور اسرائیل دونوں قومیں باہمی امن و آشتی کے ساتھ رہنا سیکھیں گی ۔ نیز دریائے اُردن کے پانی اور پناہ گزینوں جیسے اہم اختلافی مسائل کے حل کے سلسلہ میں باہمی تعاون بڑھتا جائے گا ۔

آج سے چند سال پہلے جب یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ ہماری ان توقعات کے جلد پورا ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے تو ہمیں اور زیادہ مایوسی ہوئی۔

آج جب ہم مشرق وسطیٰ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صورت حال میں تین اہم حیثیتوں سے کچھ بہتری پیدا ہوئی ہے۔

۱۔ اس علاقے میں کمیونزم کی کشش رفتہ رفتہ معدوم ہو رہی ہے اور سوویٹ روس زار روس کی ایک بدلی ہوئی شکل اور تیل کی تجارت میں ایک بڑے حریف کی حیثیت سے نمودار ہو رہا ہے۔

۲۔ متحدہ امریکہ میں مشرق وسطیٰ کی قوموں کے ساتھ تعلقات میں اب پہلی جیسی کشیدگی موجود نہیں ہے۔ اب امریکہ مدتوں پرانے تنازعات کے فوری حل کی اُمیدیں باندھنے کی طرف کچھ زیادہ مائل نظر نہیں آتا۔

۳۔ خود مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی دلچسپی اور توجہ اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ جھگڑوں کی طرف سے کم سے کم ہو کر اپنی اندرونی ترقی اور خوشحالی کی طرف منتقل ہوتی جا رہی ہے۔

یہ تین تبدیلیاں اس پُر سکون سیاسی اور معاشی اعتدال میں اضافہ کرتی ہیں جو باہمی کشیدگی کو رفتہ رفتہ کم کرنے اور تمام متعلقہ ملکوں کو خوش حالی اور ترقی کے زیادہ وسیع مواقع سے فائدہ اُٹھانے میں مدد دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ حالات میں اس قسم کا اعتدال موجودہ عالمی بحران میں کوئی اہم ترین واقعہ ثابت نہ ہو، لیکن یہ ایک تاریخی واقعہ ضرور ہوگا۔

کئی سال پہلے امریکہ کے بہت سے باشندے اس بات پر تشویش کا اظہار کرتے تھے کہ عرب قوم پرستی کمیونزم پر فریفتہ ہو جائے گی۔ مگر حالیہ چند برسوں میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے کی کس درجہ مخالف ہیں اور ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ ایک نئی اُبھرتی ہوئی قوم کی جدوجہد غیر ملکی اثر و نفوذ کے لئے کتنی زبردست رکاوٹ بن سکتی ہے۔

مثال کے طور پر مصر کو لے لیجئے، جہاں صدر ناصر اسوان ڈیم کی تعمیر کے لئے وسیع پیمانے پر روسی امداد حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے ملک کو خود اپنے تخلیق کردہ اصولوں پر ترقی دے رہے ہیں۔ متحدہ جمہوریہ عرب پر مسٹر خروشچیف اقتدار تو کیا حاصل کرتے وہ صدر ناصر کو اس بات پر بھی آمادہ نہ کر سکے کہ وہ مقامی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ کسی قسم کی نرمی برتتے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ہماری حکومت نے مشرق وسطیٰ میں اپنے اثر و رسوخ کی حدود بھی تسلیم کر لی ہیں اور تجربات کی مدد سے اس پُر آشوب خطے کے ساتھ معاملات رکھنے کے سلسلے میں زندگی کے بعض بنیادی حقائق کا ادراک بھی کر لیا ہے۔ خاص طور پر ہمیں یہ انکشاف ہوا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ اس سے کم ہے جتنا ہم اب تک سمجھتے تھے کہ ہمیں کرنا ہوگا اور یہ کہ فوجی تحفظ کے پروگرام

بر ضرورت سے زیادہ زور دینا ہی ہمارے قومی مفادات کے تحفظ کا بہترین ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس علاقے کے مختلف ممالک سرحدی تنازعات اور جنگی خواہشات کو ایک عالمگیر تباہی کی صورت اختیار کرنے سے روکنے میں مناسب ضبط و تحمل سے کام لیں اور اس علاقے میں تدریجی سیاسی اور معاشی ترقی کے لئے معقول حد تک استحکام پیدا ہو جائے۔ خاص طور پر ہم یہ چاہتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کی قومیں آزاد اقوام کی برادری میں خود مختار اور خود دار ارکان کی حیثیت سے ترقی کریں اور اپنے معاشی حالات کو اپنے قومی اصولوں کے مطابق فروغ دینے میں کامیاب ہوں۔

مشرق وسطیٰ میں ہمیں جو تجربات حاصل ہوتے ہیں ان سے ہم نے غیر جانبداری اور مختلف قسم کے جانبدارانہ نظریات کے ساتھ مل کر زندہ رہنا سیکھا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح دنیا کے دوسرے علاقوں میں ہمیں اپنے تجربات سے یہ سب کچھ سیکھنا پڑا ہے۔

اس علاقے کی ضروریات حیرت انگیز حد تک وسیع ہیں۔ نسلوں تک بیرونی حملوں، جنگ و جدل، طاعون اور دوسری وبائی بیماریوں، قتل عام اور انقلابات کا جو طویل سلسلہ جاری رہا ہے، اس سے اس علاقے کے انسانی اور قدرتی وسائل کو بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اکثر ریگستانوں میں آب پاشی کے عظیم انسانی کارناموں کی بربادی کے آثار نظر آتے ہیں۔ بہترین زمینوں کو قابلِ کاشت بنا کر پھر خراب ہونے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ گندے پانی کے اخراج کی نالیاں پاٹ دی گئیں۔ آبپاشی کے ذرائع کو تباہ کر دیا گیا۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں ہر چیز کا انحصار قدرتی وسائل پر ہے، ماضی کی معاشی بنیادوں کا پھر سے تعمیر کرنا بڑا اہم کام ہوگا۔

حالیہ چند برسوں میں مشرق وسطیٰ کے بیشتر رہنماؤں نے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ان کے پیچیدہ مسائل محض باتوں کی مدد سے حل نہیں کئے جا سکتے۔ اب ان ممالک میں اندرونی ترقی کے روزمرہ کے مسائل جن میں زرعی زمین کی غیر مناسب تقسیم، تعلیم اور جدید طبی سہولتوں کی کمی اور سماجی اصلاحات شامل ہیں اور جنہیں ایک طویل عرصہ تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، روز بہ روز دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

دریں اثنا متحدہ امریکہ کو بھی مشرق وسطیٰ میں اپنی طویل کامیابیوں اور ناکامیوں کی بدولت یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ ایک پورے برصغیر کے سیاسی اور معاشی مسائل کو سلجھانے کا اہل نہیں ہے اور یہ کہ محض ڈالر کی مدد سے ہی ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر نہیں کی جا سکتی خصوصاً اب ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح وسطِ مشرق میں ایک کامیاب امریکی پالیسی کے لئے وہاں کے عوام کے مسائل کا سمجھنا ضروری ہے۔ یعنی روزمرہ کے مسائل میں ان کی زیادہ سے زیادہ شرکت کی خواہش، ملکیت کا روزافزوں احساس اور بڑھتے ہوئے انفرادی حقوق اور شخصی وقار کی خواہش

کا سمجھنا ضروری ہے۔

تجربے نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ جب ایسے انسانی محرکات کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو تیز رفتار معاشی ترقی لوگوں کو ممکن الحصول سے زیادہ کی اُمید نہ لا کر اکثر ان کے لئے ذہنی انتشار اور مایوسی کا باعث بنتی ہے۔ اور دوسری جانب اس کی بدولت قدیم سماجی روابط درہم برہم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ترقیاتی عمل کو روکا نہیں جا سکتا۔

اس وقت ہمیں ایک دوہرے چیلنج کا سامنا ہے یعنی معاشی ترقی کے بنیادی مقاصد کی تکمیل کے لئے ذرائع کی تلاش و جستجو اور ایسے طریقوں سے کام لینا جس کی بدولت فرد کو زیادہ سے زیادہ اطمینان اور آسودگی نصیب ہو سکے۔

مجموعی طور پر اس وقت مشرق وسطیٰ میں اس کے لئے حالات سازگار ہیں اور یہ یقین کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ یہ سازگار حالات قائم رہیں گے اور ان میں مزید اضافہ ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو یہ مشرق وسطیٰ میں ہونے والی تباہی، شہروں کی بربادی۔ تغیر پذیر اغراض و مقاصد اور ان گہرے اور قدیم تنازعات کے اس طویل سلسلے میں ایک خوش آئند وقفہ ہوگا، جو برسہا برس تک مشرق وسطیٰ کی خصوصیت بنا رہا ہے۔

لیکن ہمیں اس خطۂ ارض میں پوشیدہ اور غیر محسوس خطرہ کی اہمیت کو کم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اس خطے میں رونما ہونے والا محض ایک اتفاقی دھماکہ خیز واقعہ اس تدریجی ترقی کو اُلٹ کر رکھ سکتا ہے جو اس وقت جاری ہے، اور اس طرح یہ پورا خطہ ایک خونیں انتشار اور ابتری کا شکار ہو سکتا ہے۔ دریں اثنا اس خطے کے اہم علاقائی مسائل بڑی حد تک غیر حل شدہ ہیں، اور ان مسائل کے کسی آن حل کی توقع کرنا بھی حماقت ہوگی

مثال کے طور پر اگر ہم دریائے اردن کے پانی اور عرب پناہ گزینوں کے مسائل کو جن کے باعث سارا مشرق وسطیٰ ایک مستقل بحرانی صورت حال سے دوچار ہے، کسی حد تک حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے تمام متعلقہ فریقوں کو پُر خلوص جد و جہد کرنی ہوگی۔

ممکن ہے کہ اس کے نتیجہ میں مشرق وسطیٰ میں ایک ایسا واحد غالب نظریہ تشکیل پا جائے جس کے فوائد متعلقہ ممالک کے مشترک ہوں اور اس طرح روایتی اختلافات فراموش ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس وقت یورپ میں "مشترکہ منڈی" کے تصور سے اسی قسم کے باہمی اختلافات میں مفاہمت پیدا ہو رہی ہے جب تک یہ نئی صورت حال وجود میں آئے، ہمیں سیاسی اور اقتصادی مسائل کے ساتھ حقیقت پسندانہ طریقے پر عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔

اس سلسلے میں اسرائیل کو ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔ ایک نسل سے بھی کم کی مدت میں اسرائیل

دنیا کی انتہائی تیز رفتار یعنی ۸ فیصدی سالانہ کی شرح سے ترقی کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کی مجموعی فی کس قومی آمدنی ایک ہزار ڈالر سالانہ ہے، جو مشرق وسطیٰ میں اس کے ہمسایہ ملکوں کی فی کس سالانہ آمدنی سے کئی گنا اور نیدرلینڈ، اٹلی، اسپین، آسٹریا، یونان یا پرتگال سے زیادہ ہے۔

سنہ ۱۹۶۱ء میں اسرائیل کی صنعتی ترقی کی شرح ۱۴ فیصدی یعنی دنیا میں صنعتی ترقی کی بلند ترین شرحوں میں سے تھی۔ اس کی برآمد ۲۵ فیصدی تک پہنچ گئی تھی اور غیر ملکی زرِ مبادلہ میں ایک سال پہلے کی نسبت ۶۵ فیصدی اضافہ ہوا تھا۔

ساتھ ہی عربوں کی طرف سے اسرائیل کے تجارتی بائیکاٹ نے اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کی مدد سے باہر اپنے دوست بنانے اور منڈیاں تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ آج اسرائیل ایک عظیم غیر ملکی فنی امدادی پروگرام کے تحت ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیس سے زائد ملکوں کو فنی امداد دے رہا ہے۔ گزشتہ سال ۵۲ ملکوں کے ایک ہزار طالب علم اسرائیل میں زیرِ تعلیم تھے اور دو سو سے زائد اسرائیلی فنی ماہرین غیر ترقی یافتہ ممالک میں فنی صلاح کاروں کی خدمات انجام دے رہے تھے۔

اسرائیل کے ہمسایہ ممالک نے ابھی تک اسرائیل کی ان کوششوں کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسرائیل کی کامیابی ہی اس کے خلاف مخالفانہ جذبات پیدا کر رہی ہے۔ لیکن جب مشرق وسطیٰ کی یہ قومیں خود اپنے ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گی اور ایک نئے باہمی اعتماد سے رواداری اور مفاہمت پیدا ہونے لگے گی تو یہ کیفیت بھی بدل سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ حالات اس پس منظر میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں امریکہ کی کسی حقیقت پسندانہ پالیسی کے اجزائے ترکیبی کیا ہو سکتے ہیں؟

سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس علاقے کی تمام قوموں کو ان کی آزادی برقرار رکھنے میں مدد دینے کے لئے تیار رہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس علاقے کے کسی بھی ملک کے خلاف کسی بیرونی جارحیت کے مؤثر انسداد کے لئے امریکی امداد فوری طور پر اور آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکے۔

دوسرے ہمیں انجمن اقوام متحدہ کے ذریعہ بعض واضح قسم کی کشیدگیوں کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور عرب۔ اسرائیل کے نزاع کو ایک ایسے کھلم کھلا تصادم کی شکل اختیار کرنے سے روکنا چاہیئے، جو بڑی تیزی کے ساتھ پھیل سکتا ہے۔

تیسرے ہمیں مشرق وسطیٰ کی تمام قوموں کو سمجھانا چاہیئے کہ وہ اپنے ہمسایہ ملکوں کے خلاف غم و غصہ اور مخالفانہ بحثوں پر کم اور اپنی اندرونی ترقی کے مسائل کے حل پر زیادہ کوشش اور توجہ مبذول کریں۔ ہم ان ملکوں کو امداد دینے کے سلسلہ میں خصوصیت اور اولیت کا سلوک کر سکتے ہیں جو ایمانداری کے ساتھ اپنے تمام شہریوں کی زندگی کو بہتر بنانا چاہتے ہیں نہ کہ محدود دے چند دولتمند اشخاص کو۔

چوتھے وسط مشرق کے ہمسایہ ملکوں کے درمیان باہمی تعاون کی کوئی نہ کوئی بنیاد تلاش کرنے کی مستقل کوشش کی جانی چاہیئے۔ خواہ یہ باہمی تعاون کتنا ہی محدود اور عارضی کیوں نہ ہو۔

مشرق وسطیٰ یا کسی بھی جگہ استحکام پیدا کرنے کا کوئی طلسمی فارمولا موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود کہ ہمارے صنعتی اور فوجی وسائل لامحدود ہیں دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح مشرق وسطیٰ میں بھی واقعات کی تشکیل کے سلسلہ میں ہماری استطاعت نہایت محدود ہے۔

تاہم، ایک صبر آزما حکمت عملی، جارحیت کے خطرے کے مقابلہ کے لئے عزم صمیم، دوسروں کے لئے ترغیبات کا سبب بننے والی چیزوں کا ادراک اور معاشی ترقی کی امداد میں اپنے وسائل کا دانشمندانہ استعمال ایسے اقدامات ہیں جن سے انتشار اور ابتری اور بڑھتے ہوئے معاشی استحکام کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کی جا سکتی ہے۔

کم از کم ایک بات یقینی ہے۔ ایسے انصاف پسند معاشروں کی تخلیق کے ذریعہ ہی، جن کے شہریوں کو حقیقی آزادی، انفرادی وقار اور مادی فلاح وبہبود حاصل ہو، دائمی امن کا قیام ممکن ہے۔ اس اعتبار سے مشرق وسطیٰ میں واقعات کی آئندہ نہج غیر یقینی ہے۔ لیکن یہ امید سے خالی نہیں ہے۔

× × ×

افریقہ

۳۲۔ سفر افریقہ کی کچھ یادیں

مسٹر باؤلز کی ان مختصر تحریروں میں ان کے اس چھ ہفتے کے افریقی دورے کے تاثرات کا ذکر ہے، جو انھوں نے ۱۹۵۵ء کے موسم سرما میں مسٹر باؤلز کے ہمراہ صحرائے اعظم کے آس پاس کے علاقے میں کیا تھا۔ یہ تحریریں مسٹر باؤلز کے ان خطوط سے لی گئی ہیں جو انھوں نے اپنے گھر والوں کو لکھے تھے۔

ہمارے افریقہ میں آنے سے پہلے لوگوں نے بتایا تھا کہ افریقہ ایک نہیں ہے بلکہ کم از کم نصف درجن افریقہ موجود ہیں۔ افریقی براعظم میں صرف ۶ ہفتے رہ کر ہمیں ایسی بہت کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں، جن سے اس پیشگی اطلاع کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

ایک کنارے پر مسلم شمالی افریقہ واقع ہے، جس میں اندازاً ۲۶۵ ملین اطالوی اور فرانسیسی آباد ہیں۔ دوسرے سرے پر جنوبی افریقہ ہے، جس میں تقریباً اتنی ہی تعداد میں تند مزاج قسم کے سفید فام لوگ آباد ہیں۔ پرتگالی مشرقی افریقہ، مغربی افریقہ اور برطانوی مشرقی افریقہ کے حالات بھی اسی طرح اور اسی سبب سے تشویشناک ہیں یعنی یہاں جو سفید فام اشخاص آئے، انھوں نے اس خطے کو دیکھا اور خوش ہوئے اور پھر یہاں اپنے پنجے جما لئے۔

لیکن برٹش ویسٹ افریقہ کے حالات اس سے قطعاً مختلف ہیں۔ یہاں یوروپی باشندے بہت تھوڑے ہیں اور انگریز، جو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، عوام کی آزادی کے مطالبہ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسی طرح صحرا کے جنوب میں واقع فرانسیسی افریقہ اور بلجین کانگو کے حالات بھی مختلف ہیں۔ جہاں کے نوآبادیاتی افسران کے واضح منصوبے ہنوز اس بات کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اس علاقہ کا مستقبل کیا ہوگا؟ ان کے علاوہ ایک آزاد افریقہ بھی ہے، جس میں لائبیریا، ایتھوپیا، (حبش)، مصر، لیبیا اور سوڈان شامل ہیں۔ یہ تمام ممالک کسی نوآبادیاتی قوت کی رہنمائی کے بغیر اپنے مخصوص مسائل سے دوچار ہیں۔

افریقہ کے متعلق اس قسم کے کچھ اختلافات کا افریقہ کے دورے سے متعلق ہماری ان تحریروں اور بعد کی تحریروں میں نمایاں نظر آنا ممکن ہے جو بغیر کسی منصوبے کے اس پس منظر کی عدم موجودگی میں کیا گیا تھا جو بعد میں فکر اور فاصلے کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے۔

× × ×

افریقہ کے متعلق میرا تأثر یہ ہے کہ یہ ایک خالی براعظم ہے۔ ایشیا کے بعد یہ سب سے زیادہ جاذب توجہ خطہ ہے اور ان دونوں کا باہمی فرق مجھے مسلسل متاثر کرتا رہتا ہے۔ کیا افریقہ میں انسانی آبادی کی قلت معاشی ترقی کے مسئلہ پر گہرے نتائج کے ساتھ اثرانداز ہوگی۔

مثال کے طور پر بیلجین کانگو قدرتی وسائل کے اعتبار سے اتنا ہی مالا مال ہے جتنا کہ ہندوستان اور تقریباً اتنا ہی وسیع بھی ہے۔ لیکن اس کی آبادی صرف ایک کروڑ بیس لاکھ ہے جبکہ ہندوستان کی آبادی ۳۶ کروڑ ہے۔ کانگو کے گورنر نے مجھ سے کہا کہ اگر ہماری آبادی موجودہ آبادی کے مقابلہ میں پانچ گنا زیادہ ہوتی تو ترقی کی رفتار دوگنی ہوتی۔

ایشیا کی حکومتیں اپنے ملکوں میں مشینوں کو رواج دینے میں پس و پیش کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ عوام کی کثیر تعداد کام کی متلاشی ہے۔ اُجرتوں اور قوتِ خرید میں اضافہ کی رفتار میں بہت معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ افریقہ میں اس وقت بھی انسانی محنت بچانے والی مشینوں کے استعمال پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افریقہ میں فنی ترقی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اجرتوں اور بلند معیار زندگی کے وسیع مواقع موجود ہیں۔ اس کے سیاسی اثرات پیچیدہ بھی ہو سکتے ہیں اور غیر متوقع بھی۔

آج کانگو کے کارخانے ہندوستانی کارخانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہاں کپڑے کے کسی مل میں کام کرنے والے مزدور کی یومیہ اُجرت ۲ ڈالر ہے، جس کے علاوہ اسے رہنے کے لئے مکان ملتا ہے، اس کی اور اس کے تمام خاندان کی تمام طبی ضروریات مفت پوری کی جاتی ہیں اور اسے غذائی الاؤنس بھی دیا جاتا ہے۔

× × ×

میں نے ایک برطانوی افسر سے جو ۱۹۳۸ء میں گولڈ کوسٹ آیا تھا، دریافت کیا کہ اس وقت اس کی ذمہ داریاں کیا تھیں۔ اس نے جواب دیا کہ "سب سے پہلے امن و امان برقرار رکھنا، اس کے بعد مواصلات اور پھر متعدی بیماریوں کی روک تھام کرنا" (متعدی بیماریاں وہ ہوتی ہیں، جن کے یورپ کے باشندوں کو لگ جانے کا سب سے زیادہ احتمال ہوتا ہے۔)

میں نے پھر اس سے دریافت کیا کہ آج کل اس کے فرائض کیا ہیں؟ اس نے اس دور کی تبدیلی کی اہمیت کا احساس کئے بغیر جواب دیا " سب سے پہلے دیہی سڑکوں کی تعمیر اور پانی کا انتظام، پھر اسکولوں کا قیام' ملیریا کا انسداد' دیہاتی شفاخانے' اور زرعی پیداوار کو بہتر بنانا۔"

یہ کہنا کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ نوآبادیاتی حکومتوں نے افریقی عوام کے ساتھ جنگ کے بعد سے دل چسپی لینی شروع کی ہے، جنگ سے پہلے یہ حکومتیں افریقیوں کے ساتھ کچھ کیا کرتی تھیں۔ اب ان کے لئے کچھ کرتی ہیں۔ یہ ایک ٹھوس ترقی ہے۔ لیکن تاوقتیکہ وہ ان کے ساتھ مل کر کچھ نہ کریں، ان کے درمیان کوئی حقیقی اشتراک قائم ہو سکتا ہے۔

× × ×

اکرہ میں افریقہ کے ایک باشندے نے مجھ سے نہایت ترشروئی کے ساتھ یہ بات کہی کہ " سفید فام لوگ مسیح کے نام پر افریقہ کو غلام بنانے آئے تھے۔"

عیسائی پادریوں کی جملہ غلطیوں کے باوجود میں اس قبائلی ملک میں جہاں جہاں گیا مجھے ان کی توانائی، ہمت اور احساس مقصدیت پر بڑی حیرت ہوئی۔ اس کے علاوہ ہم میں سے کسی کو سیاہ فام انسان کے سماجی انصاف کے مطالبہ پر برہم ہونے سے پہلے یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ اس شخص کے اندر وہ عقیدہ اور خواہشات ہماری عیسائی تعلیمات کے اثر سے ہی پیدا ہوتی ہیں، جن کی بدولت آج اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

× × ×

ممکن ہے کہ برطانوی حکومت گولڈ کوسٹ میں ایسا ہی غلط قسم کا نظام تعلیم جاری کرنے کی کوشش کر رہی ہو، جن کی بدولت اس وقت ہندوستان میں بہت سے دانشور پیدا ہو رہے ہیں۔

میں نے یہی بات ایک اونچے درجے کے انگریز دانشور سے کہی تو اس نے یہ جواب دیا:
" ہندوستان میں تعلیمی نظام اس لئے کمزور ہے کہ وہاں معیار تعلیم گرا دیا گیا ہے۔ گولڈ کوسٹ میں ہم اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آکسفورڈ کا معیار برقرار رہے۔"

میں نے کہا کہ " کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج اور ہارورڈ اور ییل یونیورسٹی کا معیار تعلیم ایسے لائق نوجوان افریقیوں کے لئے بہترین تعلیم ثابت نہ ہو، جن کے نئے معاشرہ کے لئے ہنرمند کاریگر اور فنی ترقی بہت جلد ضروری ہے؟"

" نہیں " اس نے جواب دیا، " آکسفورڈ کی تعلیم افریقہ والوں کی عزیز ترین خواہش ہے۔" اس بارے

میں کسی اگر، مگر کی گنجائش نہیں تھی۔ اور پھر ہم کسی اور موضوع پر بات چیت کرنے لگے۔
باوجود اس کے کہ افریقی رہنماؤں کے لئے اعتدال پسند تعلیم کی ضرورت کی اہمیت کو کم کرنا بے وقوفی ہوگی، برطانیہ کا انتہا پسندانہ نظریہ کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔ اس وقت جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ ماہرین کی تربیت ہے۔
افریقہ کے انجنیروں، ڈاکٹروں، زرعی ماہرین اور لائق سیاسی لیڈروں کی ضرورت ہے۔ جو شخص کبھی ایشیا، یا افریقہ گیا ہے، وہ اس بات سے اختلاف نہیں کرے گا کہ ان دونوں براعظموں کو اس وقت وکیلوں کی کم اور کھیتوں میں کام کرنے والے باعمل افراد اور ماہرین کی ضرورت ہے۔
نوآبادیاتی طاقتوں نے تعلیم کے بارے میں جو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، وہ اپنی جگہ بہت دلچسپ ہیں۔ مثال کے طور پر برطانوی حکومت اعلیٰ تعلیم کے فوائد پر یقین رکھتی ہے، اور آکسفورڈ کے معیار تعلیم کو ترجیح دیتی ہے، اسے یقین ہے کہ جتنے زیادہ گریجویٹ ہوں گے، اتنا ہی اچھا ہوگا۔ گولڈ کوسٹ کے آئندہ ہونے والے تین ہزار شہری بیرونی ملکوں میں انگریزی زبان کے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہیں اور اکرہ کے قریب آکسفورڈ کے طرز پر ایک یونی ورسٹی قائم کی جا رہی ہے، جس میں ایک ہزار نوجوان تعلیم پا سکیں گے۔
دوسری طرف بلجیم کے حکام تعلیم یافتہ افریقیوں کے تصور سے لرزہ براندام ہیں۔ بلجیم کے اندر کانگو کے صرف گیارہ آدمی زیر تعلیم ہیں اور اس کے علاوہ کانگو کا کوئی اور باشندہ کسی اور جگہ تعلیم نہیں پا رہا ہے۔ اور لیوپولڈ وِل کے اطراف میں واقع نئی یونی ورسٹی مستقبل میں ہر سال زیادہ سے زیادہ چھ یا سات سو گریجویٹ پیدا کر سکے گی
فرانس والوں نے ان دونوں انتہائی صورتوں کے بین بین اپنا راستہ متعین کیا ہے۔ فرانسیسی افریقہ کے استوائی ممالک (جن کا رقبہ متحدہ امریکہ سے نصف ہے، لیکن آبادی صرف چالیس لاکھ ہے۔) کے تین سو طالب علم فرانس میں زیر تعلیم ہیں۔ ان میں سے اکثر کو خصوصی پیشوں کی تربیت دی جاتی ہے اور آرائش کے عام مضامین سے دور رکھا جاتا ہے۔
تعلیم کے سلسلہ کی مجموعی سہولیات عام نوآبادیاتی ملکوں میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔ ایک معمولی تخمینے کے مطابق ان علاقوں میں چھ سال کی عمر کے تقریباً ۵ فیصدی بچے اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو یہ تعداد ہندوستان کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔
فرانسیسی افریقہ اور کانگو میں اپنے قیام کی پوری مدت کے دوران میرا تعارف چار افریقیوں سے نام بنام کرایا گیا۔ چاروں اشخاص نہایت سمجھدار اور غیر جانب دار تھے۔ لیوپولڈ وِل میں ان میں سے تین اشخاص سے میں نے سوال کیا کہ "آپ کے عوام موجودہ نظام کے کس پہلو پر سب سے

نہ یادہ نکتہ چینی کرتے ہیں ؟" ایک لمحہ کے توقف کے بعد مجھے جواب ملا "سیاسی امتیازات پر اتنی نکتہ چینی نہیں کرتے، جتنی کہ سماجی امتیازات پر کرتے ہیں۔ شہر کا ایک حصہ کالی آبادی کے لئے مخصوص ہے اور دوسرا گورے اشخاص کے لئے اور دن چھپنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے علیحٰدہ ہو جاتے ہیں۔"

× × ×

وسط افریقہ میں ہماری انفارمیشن سروس جو کچھ کر رہی ہے وہ افریقی عوام کی اس اکثریت کے لئے نہیں کر رہی ہے جسے مستقبل کی تعمیر کرنی ہے۔ بلکہ اس کا اصل نشانہ یورپی باشندوں کی معمولی سی اقلیت ہے۔ لیوپولڈ وِل میں ہماری لائبریری سے کتابیں لے جانے والے ۱۶۸۰ افراد کے نام درج ہیں، جن میں سے صرف ۱۱۲ افریقی ہیں۔

اس لائبریری میں کل ۴۳۰۰ کتابیں موجود ہیں، جن میں سے صرف ۲۸۰ فرانسیسی زبان میں ہیں۔ میں نے یہ سوال کیا کہ "لیوپولڈ وِل میں کتنے آدمی انگریزی بول اور پڑھ سکتے ہیں"۔ تو جواب ملا کہ "غالباً" اٹھارہ سو، جن میں سوائے معدودے چند کے باقی سب بلجیم کے باشندے ہیں۔

ہمیں تھوڑی سی رقم کو اور زیادہ دانشمندی کے ساتھ خرچ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم افریقہ والوں کے سامنے کھُل کر اپنے خیالات نہیں ظاہر کر سکتے تو ہمیں اپنی کوششیں کسی اور طرف مرکوز کر دینی چاہیئں۔ باوجود اس کے کہ لیوپولڈ وِل میں دو بڑے روزنامے شائع ہوتے ہیں، تین لاکھ افریقیوں میں ان کی صرف ۱۶۰۰ کاپیاں فروخت ہوتی ہیں۔

یورپ کے مضطرب باشندوں کو ان اعداد و شمار سے بڑا اطمینان نصیب ہوتا ہے، کیوں کہ اس سے انھیں یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ خطرناک خیالات کو دبا کر کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔

× × ×

شمالی رھوڈیشیا میں واقع ایک کان پر جب ہم گئے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں ۹ ہزار افریقی اور ۱۵ سو یورپی باشندے کام کرتے ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی جُدا گانہ یونینیں قائم ہیں۔ ایک یورپی باشندے کو اوسطاً ۴۹۲ ڈالر تنخواہ ملتی ہے جس سے علاوہ انھیں ۶۰ فیصدی بونس، مفت طبّی امداد، ایک اچھی قسم کا صاف ستھرا مکان اور ایک انتہائی جدید طرز کے کلب میں برائے نام فیس ادا کر کے رکنیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی اُجرتیں امریکہ میں تانبہ کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اُجرتوں سے بہت زیادہ ہیں۔ حالانکہ وہاں کے اخراجاتِ زندگی متحدہ امریکہ کی نسبت نصف ہیں۔

کانوں میں زیرِ زمین کام کرنے والے افریقی مزدور کو اوسطاً اٹھارہ ڈالر ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔

اس کے علاوہ انھیں ایک چھوٹا لیکن اچھا سا مکان، روزانہ خوراک اور مفت طبی امداد ملتی ہے۔ تمام متعلقہ تفصیلات کو سامنے رکھ کر حساب لگانے سے اجرتوں کی اس شرح کا تناسب بیس اور ایک ہوتا ہے۔ یہ اعداد و شمار وفاقی حکومت کے شائع کردہ "مجموعہ اعداد و شمار" بابت دسمبر ۱۹۵۲ء میں سے لئے گئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کانوں میں یورپی ملازمین کو افریقیوں کے مقابلہ میں وہ کام انجام دینے پڑتے ہیں جن میں زیادہ فنی مہارت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، جن کی شرح امتیاز ایک امریکی کان میں تین کے مقابلہ میں ۲ یا دو کے مقابلے میں ایک ہوتی ہے۔

جنوبی رھوڈیشیا میں اجرتیں شمالی رھوڈیشیا کے مقابلہ میں اوسطاً تیس فیصدی کم ہیں۔ قانون کے مطابق کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی کم سے کم اُجرت ۵ا ڈالر ماہوار ہونی چاہیئے۔ چنانچہ تقریباً ۷۰ فیصدی مزدور اسی کم سے کم ماہوار اجرت پر کام کرتے ہیں۔ مجھے اس پوری فیڈریشن میں صرف دو درجن افریقی ایسے ہیں جنھیں کم سے کم تنخواہ پانے والے یورپی ملازمین سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ میں نے سوال کیا کہ افریقی مزدور کیا مطالبہ کرتے ہیں۔ جواب ملا کہ "اٹھارہ پونڈ اسٹرلنگ ماہوار" (۴۸ ڈالر) ظاہر ہے کہ یہ مانگ سیاسی اغراض و مقاصد کے لئے انقلاب پسندوں کی تحریک سے کی گئی ہوگی۔

× × ×

میں نے ایک اعلیٰ افسر سے کہا "میں ایک اُلجھن میں مبتلا ہوں، میرا خیال ہے کہ گولڈ کوسٹ کے افریقی اور جنوبی رھوڈیشیا کے افریقی دونوں ایک ہی یعنی بانتو نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود میں دیکھتا ہوں کہ گولڈ کوسٹ کے ۴ ہزار طالب علم خود اپنے ملک اور بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جب کہ یہاں ساری فیڈریشن میں صرف پچاس گریجویٹ ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے لائق افریقی گولڈ کوسٹ میں سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، جب کہ جنوبی رھوڈیشیا میں کوئی بھی افریقی سرکاری عہدے پر نہیں ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟

میرے اس سوال سے وہ افسر کسی قدر پریشان ہوا اور اس نے تسلیم کیا کہ یہ صورت حال واقعی عجیب و غریب ہے۔ لیکن اس نے کہا کہ اس بارے میں اس نے کبھی کچھ زیادہ غور و فکر نہیں کیا تھا۔

اس کی وجہ سمجھنا آسان ہے۔ برطانوی مشرقی افریقہ میں نوآبادیاتی حکومت افریقی باشندوں کی فلاح اور بہبود کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے، لیکن اس وسطی فیڈریشن میں، جس کے بارے

میں نوآبادیاتی دفتر خاموش ہے، دو ہزار ایسے یورپی باشندے آباد ہیں جنھیں مخصوص مراعات حاصل ہیں اور یہ ساٹھ لاکھ افریقی عوام کی امیدوں اور آرزوؤں پر ایک چھپر کی مانند چھائے ہوئے ہیں۔ یہ ناکام امیدیں نہ جانے کس وقت کوئی خطرناک صورت اختیار کر لیں۔

× × ×

اب مجھے کانگو کے بارے میں چند باتیں اور عرض کرنی ہیں۔ بلجیم کے نوآبادیاتی حکمراں اپنے نقطۂ نظر سے ایک اچھی طرح سوچے سمجھے اور منظم منصوبے کے تحت اس وسیع علاقے کو ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے پروگرام کی کمزوری یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ افریقی اشخاص کو اعلیٰ تعلیم ـــــ یہاں تک فنی تعلیم بھی ـــــ حاصل کرنے کا موقع مہیا کرنے پر بھی رضامند نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اندیشہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے مستقبل کی تعمیر کی زیادہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے حق کے طلب گار ہوں گے۔

جہاں تک خطرہ کا تعلق ہے وہ اس امکان میں اتنا زیادہ نہیں ہے کہ بلجیم کے حکمراں بالآخر قوم پرستی کی طاقت کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکیں گے، بلکہ اس بات میں ہے کہ جب انھیں سمجھوتہ کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا تو افریقی عوام ملک کی آزادی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بالکل ہی ناتجربہ کار ہوں گے جن کا وہ یقینی طور پر مطالبہ کریں گے اور جنھیں بالآخر وہ حاصل کر لیں گے۔

اگرچہ برطانوی نوآبادیاں کانگو کی نسبت سیاسی اعتبار سے بہت ہی کم پرسکون معلوم ہوتی ہیں، لیکن جنوبی رھوڈیشیا کو چھوڑ کر دیگر تمام نوآبادیوں میں برطانوی حکمرانوں کی طرف سے اس بات کی سرگرم کوششیں جاری ہیں کہ افریقی باشندے حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے سلسلہ میں وہ تمام تجربات حاصل کریں، جنھیں وہ حاصل کر سکتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر جب بالآخر قوم پرست عناصر ذمہ داریاں سنبھالیں گے تو مجھے یقین ہے کہ انھیں نسبتاً کم تکلیف دہ مجبوری مراحل سے گزرنا ہوگا۔

× × ×

جنوبی رھوڈیشیا میں ہمیں یورپ کے جن باشندوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، ہم ان کی مہمان نوازی اور دوستانہ جذبات کی تعریف میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں کرتے۔ اسی سبب سے جب میں ان کی پالیسیوں اور طرزِ عمل پر اس قدر کھل کر اظہارِ کلفت کرتا ہوں تو مجھے خود ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ مگر ایک آخری مثال زندگی کے حقائق سے ان کی دوری کا پتہ دیگی، اور یوگنڈا کی

اختلافی صورت حال کا، جہاں نسلی سوال نسبتاً برائے نام ہے۔

سالسبری میں ہمیں تین ایسی ضیافتوں میں مدعو کیا گیا، جو ہمارے اعزاز میں منعقد کی گئی تھیں۔ آخری ضیافت گورنر جنرل کی طرف سے تھی، جس میں ہمارے علاوہ سولہ دیگر افراد شریک تھے۔ ان سولہ میں سے صرف ۲ خطاب یافتہ نہ تھے ـــــ دو نوجوان فوجی ایڈی کانگ تھے جو ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ باقی مہمانوں میں دو "لارڈ" یا پانچ "سر" اور ان کی بیگمات تھیں۔ ان تینوں ضیافتوں سے دیسی باشندوں کو اسی طرح دور رکھا گیا، جیسے لکڑبھگا انسانوں سے دور رہتا ہے۔

اوگینڈا کی صورتِ حال اطمینان بخش طریقے پر اس سے مختلف ہے۔ پہلی رات لیک وکٹوریہ کے قریب واقع گورنرز ہاؤس میں جہاں ایک ڈنر کا انتظام کیا گیا تھا، مہمانوں میں کمپالا کا ہندوستانی میئر، متعدد افریقی افسران اور دو امریکی ماہرین سماجیات اور ان کی بیویاں شریک تھیں۔ دوسری رات کو ہمیں کمپالا میں رات کے کھانے پر مدعو کیا گیا، جس میں ہندوستانی اور افریقی مہمانوں کی تعداد یورپین لوگوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ایک اور شب کو گورنمنٹ ہاؤس میں ایک ڈنر دیا گیا، جس میں نصف مہمان افریقی تھے۔

آخری ڈنر جو ہمارے اعزاز میں دیا گیا وہ اوگینڈا میں آباد ہندوستانیوں کی طرف سے تھا، جس میں افریقی اور یورپی مہمان شریک ہوئے تھے۔

حالات میں یہ اختلاف اس لئے موجود ہے کہ اوگینڈا میں مقابلتاً تھوڑے سے یورپی باشندے آباد ہیں، جو معاشی اعتبار سے زیادہ مستحکم نہیں ہیں۔ اس پوری نو آبادی میں جہاں ۶۵ ملین (پچپن لاکھ) انسان رہتے ہیں۔ یورپی، باشندوں کی تعداد صرف چھ ہزار ہے، ان کے پاس صرف نصف فی صد زمینیں ہیں، اور قانون کی رو سے اس سے زیادہ زمینیں خرید ہی نہیں سکتے ہیں۔

× × ×

آج افریقہ میں ۹۵ فیصدی انتظام عیسائی چرچ کے ہاتھوں میں ہے جسے وہ عموماً حکومت سے مالی امداد لے کر چلاتے ہیں اس کے مقابلہ میں افریقی مسلمانوں کے لئے تعلیم کا ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اکثر انتہائی ناخواندہ اور پسماندہ نظر آتے ہیں۔

اگر افریقہ میں مسیحیت ناکام ہوئی تو اس کا سبب وقت یا موقع کی کمی نہیں ہوگی۔ نہ اس کے لئے مسیحی تعلیمات کو ہی باطل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی بہت بڑی ذمہ داری اس شدید مقابلہ پر ہوگی، جو مختلف العقائد مسیحی چرچوں کے مابین جاری ہے اور ایسے مشنریوں کے طرز عمل

پر ہوگی جو مسیحی عقائد کے متوقع قبول کرنے والوں کو اکثر مضحکہ خیز اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں ۔

× × ×

اوگینڈا میں افریقہ کے بہت سے باشندے صنعتی ترقی سے، حتیٰ کہ قریب واقع دریائے نیل پر پن بجلی کے منصوبوں سے خوف کھاتے ہیں ۔ آخر ایسا کیوں ہے ؟ اس لئے کہ "جب یورپ والے قدرتی ذرائع دریافت کر لیتے ہیں، یا کوئی کارخانہ قائم کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو وہ اسے چلانے کے لئے یورپی ماہرین لاتے ہیں۔" یہ افریقہ والوں کا خیال ہے ۔ اس کے بعد پھر انھیں پریشانی محسوس ہوتی ہے اور وہ اور گورے فورمینوں اور کاریگروں کو بلا لیتے ہیں تاکہ وہ اس کارخانہ پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکیں ۔ پھر ہم پر ایسی ہی سخت پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں جیسی کہ تانبے کی سرزمین کینیا اور جنوبی افریقہ میں عائد ہیں

× × ×

کینیا کے یورپی باشندوں میں بھی ہم ہمت و جرأت، کشش، شائستگی اور ہمہ تن مصروفیت کے اس غیر معمولی امتزاج سے متاثر ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں دنیائے حالات اور قدیم طرز اقتدار کے ناکافی ہونے کے متعلق ناقابلِ اعتبار حد تک لاعلمی پائی جاتی ہے جسے ہم نے افریقہ کی وسطی فیڈریشن میں نہایت تشویشناک پایا ہے ۔

کینیا میں ۵۵ لاکھ افریقی، ایک لاکھ بیس ہزار ایشیائی (جن میں زیادہ تر ہندوستانی باشندے ہیں) اور چالیس ہزار یورپی باشندے آباد ہیں (سفید فام اشخاص کا افریقی نام) یورپی باشندے اکثر اچھی اور زرخیز زمینوں کے مالک ہیں، جن کے بہت تھوڑے حصے میں کاشت ہوتی ہے ۔ باقی زمین افریقیوں کے لئے ممنوع ہے، جو ناقص زمین کے محدود اور گھنی آبادی والے علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔

ایک افریقی رہنما نے مجھ سے کہا کہ "ہم ایک اچھے یورپی کسان کو وہ زمین حاصل کرنے سے منع نہیں کرتے جس پر وہ کھیتی کرتا ہے ۔ اگر اس کے پاس ۵ ہزار ایکڑ زمین بھی ہو تب بھی اس وقت تک ہم اس پر اعتراض نہیں کریں گے جب تک کہ وہ سچ مچ یہ کاشت کرتا رہے گا ۔ لیکن ہم یورپی باشندوں کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کر سکتے کہ زمین کا مالک ہونا اس کا خدا داد حق ہے، چاہے وہ اسے استعمال کرے یا نہ کرے اور دوسروں کو اس زمین پر غلبہ پیدا کرنے سے روک دے، جس کی آج ہمیں شدید ضرورت ہے ۔"

اتوار کے روز ہم نائیری گئے، جو نیروبی سے ۲۵ میل دور شمال مشرق میں کینیا کے کوہستانی ڈھلانوں پر واقع ہے۔ پہلے ۲۵ میل تک ہم نے اپنا سفر زرخیز یورپی مقبوضہ زمین میں سے ہو کر طے کیا، جس کی بیشتر زمین غیر مزروعہ تھی۔ اس زمین کی بڑی فصل کافی یا ایلوے کا ریشہ تھی (جو رسی بنانے کے کام آتا ہے) افریقی باشندوں کے لئے ایلوے کا اُگانا ممنوع ہے اور کافی اگانے کے لئے بھی ان کو محدود اجازت حاصل ہے۔

لیکن جب ہم ریگستانی پہاڑیوں میں داخل ہوئے تو ہمیں افریقیوں کے کھیت نظر آئے، یہاں کی اناج کی فصل افریقہ میں سب سے زیادہ خراب نظر آتی تھی۔

ہم نے جہاں کہیں کسی افریقی سے ملاقات کی، وہ ہم کو نہایت معقولیت پسند اور صحیح معنوں میں قدامت پرست نظر آیا۔ ہمیں آج تک کسی ایسے افریقی یا ایشیائی باشندے سے سابقہ نہیں پڑا جس نے افریقہ کی آئندہ ترقی میں یورپی باشندوں کی اہمیت پر زور نہ دیا ہو۔

اگر یورپ والے ان اشخاص کے ساتھ اشتراک و تعاون کی کوئی راہ نہیں نکال سکتے تو اس بات کی کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ انقلاب پسندوں اور شورش پسندوں کے ساتھ جو یقینی طور پر بعد میں نمودار ہوں گے، ان کی کوئی مفاہمت ہو سکے گی؟

× × ×

۳۳۔ افریقہ میں امریکہ کا کردار

مسٹر باؤلز کا کہنا ہے کہ گزشتہ ۱۹۵۵ء میں افریقہ سے متعلق امریکہ کی کوئی طے شدہ پالیسی نہ تھی۔ اس مقالے میں آپ نے ایسے چند بنیادی اصول بیان کئے ہیں، جن پر آگے چل کر افریقہ سے متعلق امریکہ کی حقیقت پسندانہ پالیسی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور جنھیں اب عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے۔

کولیئرس میگزین۔ مورخہ ۱۰ رجون، ۱۹۵۵ء

اپنی دوسری ذمہ داریوں کی موجودگی میں آج اکثر امریکی یہ سوال کرتے ہیں کہ "مجھے افریقہ کے بارے میں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے افریقہ سے کیا غرض ہو سکتی ہے؟" افریقہ امریکہ کے لئے متعدد وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ ایشیا کے بعد یہ دنیا کا سب سے بڑا براعظم ہے، جو کل سطح زمین کے پانچویں حصے پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس کے قدرتی ذرائع اور وسائل کا ابھی تک کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا

جا سکا ہے، تاہم اتنا معلوم ہے کہ یہ وسائل لامتناہی ہیں۔

ہم بہت سی چیزوں مثلاً یورانیم، ربڑ، کوبالٹ، مینگنیز، صنعتی ہیرے، کرومیم، سیسے، جست خام لوہے اور دوسری چیزوں کی تلاش میں افریقہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور افریقہ کی معدنی دولت کی سطح ابھی صرف کھرچ کر دیکھی گئی ہے۔ علم طبقات الارض کے ماہرین کی ستر جماعتیں فرانسیسی افریقہ کے استوائی خطے میں کام کر رہی ہیں۔ اور ایسے ہی وسیع جائزے کانگو اور برطانوی افریقہ میں عمل میں لائے جا رہے ہیں۔

لیکن افریقہ کا سب سے عظیم وقوعہ اس کے بیس کروڑ یا اس سے زائد عوام کی بیداری ہے افریقہ کا دیو ہیکل اپنی طویل شب کے خواب سے انگڑائی لیتا ہوا اُٹھ رہا ہے اور اپنی سستی کو اُتارنے کی کوشش کر رہا ہے اور لڑکپن سے نکل کر عالم شباب میں داخل ہوتے ہوئے نوجوانی کے پُرشوق اور بے صبر جذبات کے ساتھ اپنے تمام اعضا کو پھیلا رہا ہے۔ آنے والے چند سالوں میں افریقہ اپنے مسائل، تنازعات اور ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ منظر عام پر آجائے گا۔ اس وقت امریکہ کے باشندے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوں گے، خواہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں۔

یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے کہ افریقہ کی یہ نئی بیداری گہرے سیاسی عواقب و نتائج کی حامل ہے۔ وہ دن بڑی تیزی کے ساتھ اختتام پر آرہا ہے جبکہ افریقی عوام خوشی خوشی دوسرے درجہ کے شہری بننا گوارا کر لیا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بادل ناخواستہ کچھ تاخیر گوارا کر لیں، مگر اب وہ بنیادی اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔

آج ہر جگہ افریقی عوام مغرب والوں سے انتہائی مشکل سوالات دریافت کر رہے ہیں ان میں سے بہت سے سوالات نسلی احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں، مثلاً یہ سوال کہ "اگر یورپ کے لوگ افریقہ سے اتنی کثیر دولت نکال کر لے جا سکتے ہیں، افریقہ کے باشندے اتنے غریب کیوں ہیں؟" "جب عیسائی مذہب میں تمام انسانوں کو بھائی تصور کیا گیا ہے تو یورپ اور امریکہ کے اکثر باشندے معاشی، سیاسی اور سماجی معاملات میں ہمارے ساتھ امتیازی سلوک کیوں کرتے ہیں؟

امریکہ والوں سے خاص طور پر وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ "نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کی اتنی طویل تاریخ کے حامل ہونے کے باوجود آپ کی حکومت افریقی عوام کی آزادی کے سوال پر کس لئے خاموش رہتی ہے؟" "اقوام متحدہ میں آپ ہمیشہ اس مسئلہ کو کس لئے نظر انداز کر جاتے ہیں؟"

سوال یہ ہے کہ آخر افریقہ سے متعلق ہم کس پالیسی پر عمل کر رہے ہیں؟ فی الحال یہ کہنا مناسب ہو گا کہ اس مسئلہ پر اب تک ہماری کوئی پالیسی نہیں رہی ہے۔ ہماری اس لئے کوئی پالیسی نہیں رہی ہے کہ ہم اب تک اپنے آپ کو یہی سمجھاتے آئے ہیں کہ افریقہ صرف برطانیہ، فرانس، پرتگال اور بلجیم کی توجہ کا مرکز ہے اور اس

کے لئے محض ایک یورپی حکمت عملی ہی کافی ہوگی۔ اسی قسم کی ایک تباہ کن دلیل نے ایشیا میں ہمیں ہند چینی کو ایشیائی مسئلہ سمجھنے کے بجائے محض فرانسیسی مسئلہ سمجھنے پر مجبور کیا تھا۔ افریقہ میں اس طرز فکر کی بدولت ہمیں اور بھی بھاری نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

کوئی ذمہ دار شخص یہ بات نہیں کہے گا کہ افریقہ کے بارے میں ایک معقولیت پسندانہ حکمت عملی وضع کرنا کوئی آسان بات ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر یورپ کی رائے عامہ بڑی زود حس ہے اور بڑی جلدی مشتعل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک بڑا پیچیدہ موضوع ہے جو بڑی آسانی کے ساتھ نسلی فتنہ گری کا سبب بن سکتا ہے۔ میں یہاں چند ایسے نکات پیش کروں گا جن کی مدد سے ہمارے طریق کار کی نہج متعین کی جا سکتی ہے۔

۱۔ ہمیں یہ سمجھتے ہوئے اپنے کام کی ابتدا کرنی چاہیے کہ افریقہ پر ہمیں کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے، اور نہ ہی ہم اقتدار قائم کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں وہاں جو کچھ کرنا ہے اس کی بھی حدود متعین ہیں۔

۲۔ اپنے یورپی دوستوں کو ان کی نوآبادیانی حکمت عملی پر زور دار نصیحت کئے بغیر اور افریقی عوام سے اپنی جمہوریت نوازی کی داد و تحسین حاصل کئے بغیر ہمیں نجی اور علانیہ طور پر اپنا اثر و رسوخ ہر اس منظم اور ذمہ دار تجویز کے حق میں استعمال کرنا چاہیے، جو آزادی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

۳۔ آزادی کی رفتار کا فیصلہ آخر کار خود افریقی عوام کو ہی کرنا ہوگا۔ لیکن اگر امریکہ افریقیوں کو اس بات کا یقین دلا دیتا ہے کہ ہم پوری ایمانداری کے ساتھ ان کے لئے اسی قدر جلد آزادی کی تائید کرتے ہیں، جتنی جلدی وہ اسے حاصل کر سکتے ہیں، تو پھر ہم اس حیثیت میں ہوں گے کہ جو افریقی آج اس سے زیادہ اختیارات حاصل کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، جتنے وہ صحیح طور پر استعمال کر سکتے ہیں، انھیں اپنے مطالبہ پر اعتدال پیدا کرنے پر راضی کر لیں۔ قبل از وقت حکومت خود اختیاری کے نتائج صرف ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور اس قسم کی حکومتیں جھگڑالو قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی رہیں گی۔

۴۔ اگر گولڈ کوسٹ اور نائیجیریا، ہندوستان کی مانند ایک تدریجی اور جمہوری طریقہ پر آزادی حاصل کر سکیں تو آج جن لوگوں کی یہ ایماندارانہ رائے ہے کہ افریقہ والے مستقبل قریب میں اپنی حکومت نہیں چلا سکتے، انھیں اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

امریکہ آزاد مغربی افریقہ کی ان نئی اُبھرتی ہوئی حکومتوں کو کامیابی کا یقین دلانے میں جو کچھ مدد کر سکتا ہے، اس سے اس تعمیری مقصد کی تکمیل ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حکومتوں کو نہ صرف یہ کہ ہماری حکومت ہی کو معاشی امداد دینی چاہیے، بلکہ ہمارے غیر سرکاری اداروں، انجمنوں اور چرچ کو بھی ان کی پُر زور رنگ انگیز امداد کرنی چاہیے۔

۵۔ اسی بنیاد پر ہمیں افریقہ کی ان قوموں کو جو پہلے ہی آزاد ہو چکی ہیں، مثلاً مصر، لیبیا، ایتھوپیا، لائبیریا اور سوڈان وغیرہ، نہایت کشادہ دلی اور دانشمندی کے ساتھ مدد دینی چاہیئے۔

۶۔ افریقہ میں معاشی ترقی کے کسی منصوبے کو مدد دینے پر رضامند ہونے سے قبل ہمیں اس بات کا اچھی طرح جائزہ لے لینا چاہیئے کہ اس سے مختلف نسلوں کے لوگوں کو ترقی کرنے کا پورا موقع ملتا ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو افریقہ میں غیر ملکی باشندوں کی مسلسل برتری کے رجحانات کے ساتھ بالواسطہ طریقے پر وابستہ کریں گے تو ہمارا تمام اثر و رسوخ جاتا رہے گا۔

۷۔ ہمارے محکمۂ خارجہ کو افریقہ کی طرف اس سے کہیں زیادہ توجہ صرف کرنی چاہیئے جتنی کہ وہ آج کر رہا ہے۔ آج افریقی ملکوں میں ہمارے بہت تھوڑے سفارتی مشن کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان سفارتی نمائندوں کے عملہ کی قابلیت اور مستعدی سے میں کافی متاثر ہوا، مگر میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر کے پاس حد سے زیادہ کام ہے اور اتنے وسیع علاقے ان کے سپرد ہیں کہ ان کی طرف مناسب توجہ ان کی جسمانی صلاحیتوں کی حد سے باہر ہے۔

۸۔ ہمیں اپنے مقاصد کی اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ تعبیر و تشریح کرنی چاہیئے۔ محکمۂ خارجہ اور یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن ایجنسی کے ارباب اختیار کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کا کام یورپی حکمران طبقہ کے محض چند اعلیٰ افسروں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ افریقہ والوں کے ساتھ قریبی مفاہمت، اور عملی تعلقات قائم کرنا ہے۔ افریقہ میں ہمارے اطلاعاتی پروگرام کو یورپ والوں سے زیادہ افریقیوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے پر سعی و توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔

۹۔ خود متحدہ امریکہ میں اس وقت ایسے ایک کروڑ چالیس لاکھ افراد موجود ہیں جو نسلی اعتبار سے افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے بیشتر ہماری اپنی جمہوریت کو فروغ دینے میں پُرزور حصہ لے رہے ہیں۔ افریقہ کے ساتھ رابطے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے رابطوں میں ان سے بہتر امریکی سفیر اور نمائندے نہیں مل سکتے، جو ایک طرف امریکہ کے بیٹے ہیں تو دوسری طرف افریقہ کے پڑپوتے ہیں۔ افریقہ میں نیگرو نسل کے امریکیوں کا مقررین، اساتذہ، سرکاری ملازمین اور مشنریوں کی حیثیت میں موجود ہونا ہی ہر متعلقہ فرد کے لئے انتہائی فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ امریکی یونیورسٹیوں میں افریقہ کے موضوعات کو نمایاں جگہ ملنی چاہیئے، افریقی مسائل کے جو مراکز کام کر رہے ہیں انھیں فلاحی انجمنوں اور دوسرے ذرائع سے مالی امداد دے کر مزید استحکام اور وسعت بخشنی چاہیئے۔

۱۱۔ اپنے سفارتی ذرائع کی مدد سے ہمیں اپنے یورپی دوستوں کو مشورہ دینا چاہیئے کہ افریقہ کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس طلب کی جائے اور ایک افریقی منشور

مرتب کیا جائے۔ اس منشور میں حکومت خود اختیاری کے معیار معین کئے جائیں اور یورپی طاقتوں کے ان ارادوں کی پُر زور وضاحت کی جائے کہ وہ افریقی اقوام کو بتدریج حکومتِ خود اختیاری کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

اگر یورپ کے سرمائے اور اس کے سائنسی معلومات اور مہارت اور افریقہ کے تمام قدرتی اور انسانی وسائل کے مابین اشتراک و تعاون عمل میں آجائے تو افریقہ اور یورپ دونوں کا مستقبل پہلے سے کہیں زیادہ خوشحال اور تابناک ہو سکتا ہے۔

ایک برطانوی افسر نے مجھ سے کہا کہ "ہمیں افریقیوں کے مطالبات کا پہلے سے ادراک لینا چاہیئے، ورنہ ہم ختم ہو جائیں گے۔ اگر ہم نے سُستی سے کام لیا تو وہ ہم پر ایسا شدید دباؤ ڈالیں گے کہ ہمارے لئے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم ان کے مطالبات کا پہلے سے اندازہ کر لیں اور دباؤ کے حد سے زیادہ بڑھنے سے قبل انھیں ایک منضبط طریقے پر منظور کر لیں۔"

اس سلسلہ میں امریکہ کو ایک تاریخی کردار ادا کرنا ہے۔ ہم خوش تدبیری، دانشمندی اور ایمانداری پر مبنی پالیسیوں کا سہارا لے کر یورپ اور افریقہ کے بہترین عناصر پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک ایسے باہمی اشتراک و تعاون کو فروغ دے سکتے ہیں، جو دنیا کے تمام انسانوں کی آزادی اور مادّی فلاح و بہبود کی حد کو وسیع بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔

۳۴ - اقوام متحدہ کو افریقہ کا چیلنج

۱۹۶۰ء کے وسط میں جب نو آزاد شدہ کانگو میں ہولناک واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہوا تو افریقہ میں ایک نیا اور پُر خطر میدانِ جنگ قائم ہو جانے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے مسٹر باؤلز نے یہ انوکھی تجویز پیش کی تھی کہ اقوام متحدہ کو تمام غیر افریقی طاقتوں کے لئے ایک "منشورِ عمل" تیار کرنا چاہیئے۔

نیو یارک ٹائمز میگزین، ۲۱ اگست ۱۹۶۰ء

کانگو میں رونما ہوتے والے حالیہ واقعات تاریک بادلوں کے درمیان بجلی کے کوندنے کے مترادف ہیں۔ ان سے افریقہ کے مسائل کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس برِّ اعظم کے ساتھ نئی طرز کے تعلقات قائم کرنے میں امریکہ کی طرف سے ایک جرأتمندانہ اقدام کی شدید ضرورت

واضح ہوتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس عقدہ کا حل یہ ہے کہ معاشی اور سیاسی خلا کے سلسلہ میں اقوام متحدہ راہنمائی کا فریضہ انجام دے اور اقوام متحدہ کے اس کردار کو قبول کرنے کے لئے بیشتر افریقی عوام آمادگی کا ثبوت دیں۔

چنانچہ افریقہ کے لئے امریکہ کی ایک نئی اور مثبت حکمت عملی کا نقطۂ آغاز اقوام متحدہ کے کردار کا ایک وسیع تر تصور ہونا چاہئیے —— جس میں نہ صرف داخلی اور خارجی سلامتی ہی شامل ہوگی بلکہ معاشی ترقی اور تدریجی انتقال اختیارات بھی شامل ہوگا۔

اس نئے طرز فکر کو جنرل اسمبلی کے موسم خزاں کے اجلاس میں امریکہ کی طرف سے ایک ایسی قرارداد کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں افریقہ میں موجود غیر افریقی طاقتوں کے لئے ایک منشور عمل تجویز کیا گیا ہو۔

ایسا منشور محض اس مفہوم کا منفی اظہار و اعلان ہی نہ ہونا چاہئیے کہ بڑی طاقتوں کو افریقہ میں کیا کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس میں یہ تجویز کیا جانا چاہئیے کہ اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک ایک ایسے وسیع تعمیری معاشی اور سیاسی اقدام پر متفق ہوں جو افریقہ کی نئی قوموں کی آزادی، ان کی تدریجی سیاسی اور معاشی نشوونما اور انھیں بڑی حد تک اعصابی جنگ کی کشمکش سے نجات دلانے کی ضمانت دیتا ہو۔

اس قسم کی یقین دہانی ترقی یافتہ ممالک کو اقوام متحدہ کے "غیر جانبدارانہ" توسط سے افریقی ملکوں کی وسیع اور مختلف النوع ضروریات کی تکمیل میں مدد دینے میں سہولت پیدا کرے گی اور انھیں مخالف بلاکوں کے اس خطرناک مقابلے کے ذریعہ مدد حاصل کرنے سے باز رکھے گی، جس نے دنیا کو مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا میں جنگ کے دہانہ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔

اب ہمیں تفصیل کے ساتھ اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ یقین دہانیاں کیا ہو سکتی ہیں:

۱۔ دنیا کی تمام قومیں اس بات کا عہد کریں کہ وہ افریقہ میں اشتعال انگیز پروپیگنڈہ کرنے سے باز رہتے ہوئے ایسی تمام کوششوں کو ترک کر دیں گی جن کا مقصد بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر تخریب کاری ہو۔ اقوام متحدہ کو کسی ملک کی طرف سے اس اصول کی خلاف ورزی کے متعلق الزامات کی تحقیقات کرنے اور جنرل اسمبلی کو رپورٹ دینے کا اختیار حاصل ہو۔

۲۔ اسی طرح ایک بات یہ طے کی جائے کہ افریقہ میں اسلحہ بندی کی دوڑ کو مدد نہیں دی جائے گی۔ موجودہ حالات میں نئی افریقی اقوام کی فوجی ضروریات بہت معمولی ہیں۔ انھیں اسی معیار پر رکھنے میں ہمارا اور افریقیوں دونوں کا فائدہ ہے۔

۳۔ بڑی طاقتیں آپس میں اس بات کو طے کریں کہ وہ افریقہ کو دی جانے والی معاشی ٹکنیکی اور تعلیمی امداد کا بیشتر حصہ اقوام متحدہ کی وساطت سے دیں گی۔ اس مقصد کے لئے کچھ بنیادی اور لازمی انتظامات اقوام متحدہ کے ماتحت مخصوص اداروں کی صورت میں پہلے سے موجود ہیں، مثلاً ٹیکنیکل اسسٹنس اڈمنسٹریشن یا دی اسپیشل فنڈ، ورلڈ بینک اور نئی انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایسوسی ایشن وغیرہ۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بین الاقوامی مشینری کو فرداً فرداً امداد کے ان فرسودہ طور طریقوں کی جگہ، جن کی بدولت اعصابی جنگ کی مقابلہ بازی ناگزیر ہو جاتی ہے ہر ممکن حد تک استعمال کیا جائے۔

۴۔ اقوام متحدہ کی ایک نئی قائم کردہ سول سروس کے توسط سے، افریقہ کی اہم ترین ضروریات مثلاً تجربہ کار انتظامی عملے، ٹیکنیکل ماہرین، انجینیروں، اُستادوں اور مختلف پیشوں کے ماہرین کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اعصابی جنگ کے دائرے سے باہر رہتے ہوئے ایک فکر انگیز اور جامع کوشش کی جائے۔

افریقی اقوام کی تیز رفتار سیاسی اور معاشی ترقی کے لئے ضروری ہوگا کہ کچھ غیر افریقی سول سرونٹس آئندہ ایک زائد نسلوں تک افریقہ کے پالیسی سازوں کے تحت کام کریں۔ لیکن ایک اہم سوال یہ ہے کہ ایسے غیر افریقیوں کو کہاں سے لیا جائے گا؟ ان کی اولین وفاداریاں کس کے ساتھ ہوں گی؟ کیا وہ اعصابی جنگ کو افریقہ تک لانے میں مدد دیں گے؟ یا پھر وہ بین الاقوامی تعاون اور مفاہمت کے عظیم نصب العین کی خدمت کریں گے؟

۵۔ افریقہ اور دوسرے مقامات پر استعمال کے لئے اقوام متحدہ کی ایک ایسی مستقل پولیس فورس قائم کی جائے، جیسی کہ اس وقت کانگو میں منظم کی جارہی ہے۔ یہ پولیس فورس کانگو کی نئی قوم کو اندرونی سلامتی اور قومی اتحاد کی بڑی امید دلاتی ہے۔ دوسرے افریقی علاقوں میں بھی یقیناً اس قسم کی کشیدگی اور جھگڑے پیدا ہوں گے، جو محض یورپی اقتدار کے ختم ہو جانے کا ہی نتیجہ نہیں ہوں گے، بلکہ خود نئی افریقی اقوام کے درمیان باہمی جھگڑوں کی صورت میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

افریقہ کی موجودہ وفاداریوں اور قومی سرحدوں کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے سے کئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جیسا کہ مختلف فیڈریشنوں کے قیام اور ان کے ٹوٹنے کی تاریخ گواہ ہے۔ اس صورت حال کی بدولت بہت سے باہمی مناقشات پیدا ہو چکے ہیں۔ ان معاملات کے نتائج کا فیصلہ کرنا، یا یہ طے کرنا کہ موجودہ صورت حال جوں کی توں ہی رہے

یا اس میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں، خواہ یہ تبدیلیاں کیسی ہی دانشمندانہ کیوں نہ معلوم ہوں، اقوام متحدہ کا کام نہیں۔ یہ تمام باتیں خود افریقیوں کو ہی طے کرنا ہوں گی۔

لیکن اس صورت حالات کو تشدد کی شکل اختیار کرنے سے روکنا اور خصوصاً بڑی طاقتوں کو افریقی ملکوں کے ان باہمی اختلافات میں کسی ایک یا دوسرے فریق کی طرف سے دخل اندازی کرنے سے باز رکھنا اقوام متحدہ کا ایک برمحل اور لازمی نصب العین ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک مناسب پولیس فورس کی موجودگی سے، جس کے بیشتر سپاہی اور افسران افریقی ممالک سے ہی بھرتی کئے جائیں گے، بیرونی طاقتوں کو براہ راست یک طرفہ فوجی مداخلت سے باز رکھنے میں مدد ملے گی۔

مجوزہ افریقی منشور میں ایک خاص افریقی عدالت کے قیام کی سفارش بھی کی جانی چاہیئے۔ جو عالمی عدالت کے ساتھ وابستہ ہوگی اور اسے افریقی ملکوں کے باہمی تنازعات اور افریقی ملکوں اور بیرونی اقوام کے درمیانی تنازعات کا فیصلہ کرنے کے خصوصی اختیارات ہوں گے۔

اس قسم کی عدالت جس کے اگرچہ سب نہیں لیکن زیادہ نمائندے افریقی اقوام ہی سے لئے جائیں گے، ان ملکوں میں بیرونی مداخلت کے خلاف ایک اور رکاوٹ ثابت ہوگی، بشرطیکہ افریقی طاقتیں اس کے دائرہ عمل کو بہت زیادہ شرائط عائد کئے بغیر تسلیم کرنے پر آمادہ کی جاسکیں۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقوام متحدہ افریقہ جیسے پرآشوب براعظم کے تمام ہی مسائل کا بار اپنے کندھوں پر لے سکتی ہے۔ لیکن مجھے اتنا ضرور یقین ہے کہ وہ تمام نقائص کے باوجود ایک ایسا موثر وسیلہ ثابت ہوگی جس کے ذریعہ ان مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے اور انھیں اعصابی جنگ سے علیحدہ رکھا جاسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہماری اپنی حکومت اس بات کے لئے تیار ہے کہ وہ افریقہ کے بارے میں اپنا موجودہ انداز فکر ترک کرکے اس خطہ میں ایک مثبت بین الاقوامی تعاون کی فضا پیدا کرنے کے لئے ایک نئی حوصلہ مندانہ سعی عمل میں لائے؟

اگر ہم بزدلی کے ساتھ اس موقع سے منہ موڑ لیتے ہیں تو نتیجہ میں صرف ایک ہی بات یقینی ہوگی اور وہ یہ کہ براعظم افریقہ بڑی تیزی کے ساتھ اعصابی جنگ کا ایک نیا میدان جنگ بن جائے گا، جس کے نتائج خوفناک حد تک غیر یقینی ہوں گے۔

× × ×

۳۵ ۔ افریقہ میں اُمید کی لہر

فروری ۱۹۶۲ء میں مسٹر باؤلز نے افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے معاملات پر صدر امریکہ کے مشیر خاص کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے ایکانومک کمیشن برائے امریکہ کے ایک اجتماع منعقدہ ادیس ابابا (ایتھوپیا) میں افریقہ کے بارے میں امریکی ایڈمنسٹریشن کے نئے انداز فکر کی وضاحت کی تھی۔ اس اجتماع میں شرکت کرنے والوں میں غالب اکثریت افریقیوں کی تھی۔

آج ہم یہاں اس وسیع اور حرکت پذیر افریقی براعظم کے فوری چیلنج پر غور وفکر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، جہاں ۲۲ کروڑ عوام اپنے وطن اور اپنے مستقبل کی بے پایاں اُمیدیں لئے بیدار ہو رہے ہیں۔

دنیا میں کسی بھی جگہ امید کا دھارا اس درجہ زور اور قوت کے ساتھ نہیں بہتا جتنا کہ افریقہ میں۔ جدید ٹکنیکل معلومات کو ایسے جدید اور ترقی یافتہ معاشروں کی تخلیق کے لئے استعمال کا عزم صمیم، جن میں افلاس، بیماری اور ظلم وستم کی بجائے خوشحالی، ترقی اور انصاف کا دور دورہ ہوگا، جتنا افریقہ میں نظر آتا ہے اتنا کسی اور جگہ نظر نہیں آتا۔

پندرہ سال پہلے ہم میں سے کتنے لوگ یہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ ایک روز ادیس ابابا میں ۲۸ آزاد افریقی اقوام کے نمائندے اپنے عوام کے معاشی اور سماجی مستقبل پر غور وخوض کرنے کے لئے جمع ہوں گے؟

اب سوال یہ ہے کہ افریقہ، خصوصاً افریقہ کے مستقبل کے ساتھ امریکہ کا کیا تعلق ہے؟ افریقہ میں ہمارے اغراض ومقاصد کیا ہیں۔

ہمیں اس سلسلہ میں عاجزی کا احساس ہے۔ ہم افریقہ کے بارے میں اپنی طویل لاعلمی اور آپ کے عوام کے ساتھ ماضی میں رابطہ قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے بڑی شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ برسوں تک ہم آپ کو اچھی طرح سمجھنے میں ناکام رہے جو اس بات کی علامت ہے کہ ہماری توجہ خود اپنی ترقی پر زیادہ سے زیادہ مرکوز رہی ہے۔

لیکن یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ جس سرگرمی کی بدولت ہم نے خود اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش

کی تھی کہ اس کے باعث ہم دوسری قوموں کی اس جد وجہد سے بڑی حد تک بے بہرہ رہے جو ان ہی حقوق کے لئے تھی جن کے لئے ہم نے خود اپنے سامراجی آقاؤں کے خلاف جنگ کی تھی۔

ہمیں افریقہ کے معاملہ میں اس لئے بھی سبکی محسوس ہوتی ہے کہ خود ہمارے ملک میں بھی بہت سے نسلی ہنگامے ہوتے رہے ہیں۔ ہمارے ملک کے عوام میں سے ۱۰ فیصدی سے زائد کا حسب نسب افریقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک سو سال پہلے ہماری عظیم خانہ جنگی کے دوران تقریباً ۱۰ لاکھ سفید فام امریکیوں نے متحدہ امریکہ میں انسانی غلامی کا انسداد کرنے کی غرض سے اپنی جانیں دے دیں تھیں۔

اس کے بعد سے یہ دونوں نسلیں متفق طور باہمی تعاون اور احترام کے لئے بنیادیں تلاش کرتی رہی ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں ہم نے امتیازات کی مختلف صورتوں کا انسداد کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

اگرچہ میرے ملک میں آج بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں، جنھوں نے ابھی تک انسانی مساوات کی اخلاقی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا ہے، تاہم نسلی امتیاز کا خاتمہ اب نزدیک ہی نظر آرہا ہے۔

آج تمام نسلوں کے صاحب فکر امریکی افریقہ کے حالات اور مسائل میں جس گہری دلچسپی کا اظہار کررہے ہیں، اس سے ہمارے مشترکہ مقاصد کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس دلچسپی کی شہادت افریقہ اور افریقی عوام پر بڑھتی ہوئی کتابوں، فلموں، میگزینوں اور اخبارات کے مضامین سے ملتی ہے۔

بین الاقوامی سیاسیات کے میدان میں ہمارا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ سرد جنگ کو افریقہ سے دور رکھا جائے۔ یہ بات ہمارے مفاد نیز آپ کے مفاد کے بھی مطابق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، آپ اس المناک تصادم کی تلخی، تفرقہ انگیزی اور معاشی تباہی و بربادی سے بچے رہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اس مقصد کی کامیابی کے لئے ہماری بہترین توقعات ایک مستحکم ادارہ اقوام کی موجودگی میں پوری ہوسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متحدہ امریکہ کانگو میں اقوام متحدہ کے پچاس فیصدی اخراجات برداشت کررہا ہے اور ہر جگہ اقوام متحدہ کے پروگراموں کی تائید وحمایت کرتا ہے۔

معاشیات کے میدان میں ہم افریقہ کی نئی قوموں کے ساتھ موثر عملی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جن اقدامات سے آپ کے معاشرے کو استحکام بخشنے میں مدد ملتی ہے ان سے ہمارے معاشرے کو بھی تقویت نصیب ہوگی۔

اکثر افریقی عوام معاشی ترقی کی جس سمت میں پیش قدمی کررہے ہیں، اسے دیکھ کر ہماری ہمت بندھتی ہے۔ مندرجہ ذیل نکات خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں:

اول یہ کہ اگرچہ آپ لوگ صنعتی ترقی کے منصوبوں کی فوری اہمیت کو محسوس کرتے ہیں، آپ نے

زراعت اور دیہی ترقی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ لاطینی امریکہ کی مانند آپ کے عوام کی تین چوتھائی آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ یہی لوگ خوراک پیدا کرتے ہیں اور نتیجۃً عوام کو شہری کارخانوں میں تیار کردہ مصنوعات کی خریداری کے لئے بیشتر قوت خرید فراہم کرتے ہیں۔

دیہاتی علاقوں کی بڑھتی ہوئی خوش حالی، تعلیم اور انصاف کے بغیر ایسی ٹھوس معاشی، سیاسی اور سماجی بنیادوں کی تعمیر ناممکن ہوگی، جن پر ایک ترقی یافتہ معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

دوسرے، آپ انسانی قدروں اور انسانی تعلقات کی اہمیت پر جس طرح زور دے رہے ہیں، ہم اس کے مداح ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ معاشی ترقی نہایت ضروری ہے، لیکن جب تک اس کا حصول بحیثیت افراد عوام کے وقار اور فلاح و بہبود کے احترام کے ساتھ نہ ہو اس وقت تک قوم کے سیاسی استحکام پر اس کا اثر برائے نام ہوتا ہے۔

تیسرے، تعلیم کی اہمیت پر آپ جتنا زور دے رہے ہیں وہ ہماری نظر میں لائق تحسین ہے۔ آپ کے پرائمری اور ثانوی اسکولوں کی تیز رفتار ترقی اور اعلیٰ تعلیم کے ترقی پسند اداروں کے وجود سے ظاہر ہوتا ہے کہ افریقہ تعلیم کے اس بنیادی کردار کو سمجھنے کی پوری کوشش کرتا ہے، جو وہ ایک جدید طرز کے معاشرے کی تعمیر میں ادا کرتی ہے۔

چوتھے ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ میں سے بہت سے حکومت کے سرمائے کی حدود سے تجاوز کر کے اس نجی سرمائے کے ساتھ اپنی توقعات وابستہ کر رہے ہیں، جو بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں موجود ہے۔ ہماری دولت کا سب سے بڑا حصہ نجی سرمائے کی صورت میں ہے، جو ہمارے عوام کی پس انداز کردہ رقموں کا مجموعہ ہے۔

بہرحال امریکی حکومت مختلف بنیادوں پر افریقہ کے لئے اپنی مالی امداد میں بتدریج اضافہ کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۲ء میں ہمارے قرضوں، امدادی رقموں، فنی امداد، زرعی پیداوار کی فروخت اور عطیوں اور افریقہ کے لئے اقوام متحدہ کے پروگراموں کے واسطے ہمارے عطیات کی مجموعی رقم غالباً ۵۲۰ ملین ڈالر سے زائد ہوگی۔

عوام سے عوام کے اشتراک باہم کے سلسلہ میں ہمارے پروگرام بھی کافی ترقی کر رہے ہیں پیس کارپس کے توسط سے امریکی ثانوی اسکولوں کے سینکڑوں اساتذہ آپ کے بہت سے ملکوں میں تعلیم دے رہے ہیں اور مزید سینکڑوں اساتذہ اسی مقصد کے لئے وہاں پہنچنے والے ہیں۔

اس تجربے سے انھیں بھی اسی قدر معلومات حاصل ہوں گی، جس قدر کہ وہ دوسروں کو بہم پہنچائیں گے۔ تین ہزار افریقی طلبا بھی امریکہ میں زیر تعلیم ہیں، جو خود تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی تعلیم دے رہے ہیں۔

ہمارے نوجوان خصوصاً افریقہ کو ایک ایسا براعظم سمجھتے ہیں، جہاں نئے نئے واقعات رونما ہو رہے ہیں، جہاں نئی سرحدیں، نئی امیدیں اور نئے مواقع پیدا ہو رہے ہیں، میں امریکی نوجوانوں کے اس رجحان سے اچھی طرح واقف ہوں، کیوں کہ پچھلے ڈیڑھ سال سے میرا لڑکا اور میری لڑکی نائجیریا کے ایک ثانوی اسکول میں حکومت نائجیریا کے ملازمین کی حیثیت سے تعلیم دے رہے ہیں۔ ان کے خطوط سے مجھے افریقی رہنماؤں کے دل و دماغ تک رسائی حاصل ہوئی ہے۔

آخر میں، میں افریقہ کی معاشی یکجہتی کے ساتھ آپ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے لئے آپ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

اتحاد کے متعدد راستے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا، جو آپ کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہو، آپ کا کام ہے۔ البتہ ایک بات بالکل واضح ہے: اب اعلیٰ درجہ کی صنعتی ترقی یافتہ "مادر" قوموں اور ان کی مصنوعی طور پر قائم کی ہوئی نوآبادیاتی منڈیوں کا دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ اس تبدیلی نے بعض نئے معاشی حقائق کو جنم دیا ہے۔ علاقائی معاشی گروہ بندیاں ان حقائق کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اس سب کے باوجود افریقہ کے علاقائی اشتراک اور یکجہتی کے راستہ میں بعض بڑی بڑی رکاوٹیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر افریقہ کی طرح کسی دوسرے براعظم کے اندر اتنی زیادہ خود مختار حکومتیں قائم نہیں ہیں، جن میں سے بہت سی حکومتیں طویل فاصلے پر واقع نوآبادیاتی دارالحکومتوں میں بیٹھے ہوئے غیر ملکیوں نے باہمی معاہدوں کی رو سے بنا ڈالی تھیں۔

آج ان ملکوں کی یہ جداگانہ ہستیاں قومی حقائق بن چکی ہیں، جن میں کروڑوں عوام بڑی تیز رفتار اور فخر کے ساتھ اپنے قومی مستقبل کی نشوونما میں مصروف ہیں، تاہم آزادی کے ان ابھرتے ہوئے جذبات فخر اور علاقائی اشتراک باہم کے درمیان کسی نہ کسی طرح مفاہمت پیدا ہونی ضروری ہے، کیونکہ تیز تر معاشی ترقی کے لئے اس کی شدید ضرورت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی افریقی ملک ایسا بھی ہے، جو کسی وسیع تر علاقائی گروہ کا سرگرم رکن ہونے کے باوجود تیزی کے ساتھ ترقی نہ کر سکے۔

آپ نے ایک زبردست مہم کا صحیح طریقے پر آغاز کیا ہے یعنی غالباً دنیا کے سب سے زیادہ متمول اور سب سے زیادہ پُر توقعات براعظم کی نئی پیدائش کی مہم کا۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے تیزی اور کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچائیں۔

× × ×

لاطینی امریکہ

۳۶ ۔ لاطینی امریکہ میں زمین کے لئے واویلا

لاطینی امریکہ میں امریکی نائب صدر کے طوفان خیز خیر مقدم نے لاطینی امریکہ سے متعلق متحدہ امریکہ کی پالیسی کے بارے میں تشویش اور بے چینی پیدا کردی ہے ۔ نیو یارک ٹائمز میگزین نومبر ۱۹۵۹ء میں شائع شدہ اس مضمون میں مسٹر باؤلز نے ایک ایسے عظیم سماجی اور سیاسی مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، جو اس خطّے کے عوام کی بے چینی کے پسِ پردہ کارفرما ہے ۔

لاطینی امریکہ کے قوم پرست رہنما، جن میں سے اکثر کمیونزم کے شدید مخالف ہیں، عوام کی مفلسی، جہالت، مسلسل قرضداری اور خوف و اندیشے کو دور کردینے کے لئے سرگرم طریقے سے کوشاں ہیں، جن کی بدولت معدودے چند کے علاوہ باقی تمام لوگ گزشتہ نسلوں سے اپنے ممالک کی معقول درجے کی ترقی میں حصہ لینے سے قاصر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ زرعی اصلاحات کے نفاذ کو اپنے حصول مقصد کا سب سے اہم ذریعہ بنائیں گے، جس کی بدولت اکثر کاشتکار خاندان اپنی زمینوں کے آپ مالک بن سکیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ لاطینی امریکہ کے کمیونسٹ اس عوامی تحریک کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے کے لئے اپنی کوششوں میں اضافہ کردیں گے ۔
زرعی اصلاحات کی کمیونسٹ جو تعریف کرتے ہیں وہ اجتماعی زراعت کی جانب محض ایک پہلا قدم ہے ۔ جس کی رو سے ہر کسان اسٹیٹ کا تابعدار بن کر رہتا ہے ۔ پھر بھی زرعی اصلاحات اس بھولے بھالے کسان کے لئے بڑی کشش کا باعث ثابت ہوتی ہیں، جسے ان کے اندر اپنی آزادی کی امید جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے ۔
سوال یہ ہے کہ اس سارے قصے میں حل طلب مسائل کیا ہیں ؟ اور انھیں جمہوری طریقوں پر حل کرنے کے امکانات کس حد تک موجود ہیں ؟
آج لاطینی امریکہ میں ۵ء۱ فیصدی ایسے افراد موجود ہیں جن میں سے ہر ایک تقریباً ۵ ہزار ایکڑ یا اس سے بھی زائد آراضی کا مالک ہے ۔ یہ لوگ لاطینی امریکہ کے ممالک کی کل آبادی کا ایک بڑا حصہ ایسے مفلوک الحال لگان دار کسانوں پر مشتمل ہے، جو اپنے آقا جاگیرداروں کے بے انتہا

مقروض ہیں۔

زرعی زمینوں کی ملکیت کا ڈھانچہ اس وقت سے قائم ہے، جب سے ہسپانوی، پرتگالی باشندے، ان مقامات کو فتح کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے اور اس جاگیردارانہ نظام کی بنیاد ڈالی تھی۔ اُنیسویں صدی کے اوائل میں جب نوآبادیاتی نظام کی زنجیریں توڑ دی گئیں تو اس وقت بھی بڑے بڑے جاگیرداروں کے سابقہ کردار میں کوئی تبدیلی عمل میں نہ آسکی۔

اگر دیہی معیشت کا یہ قدیم اور فرسودہ نظام عوام کو مناسب قیمتوں پر خوراک اور کپڑا مہیا کرتا رہے تو اس سے سماجی اور معاشی ناانصافیوں کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ تاہم، چوں کہ زیادہ تر زرعی زمین کافی اور شکر جیسی نفع بخش تجارت کے لئے مخصوص کر دی جاتی ہے، جس سے صرف چند ہی اشخاص فائدہ اُٹھا پاتے ہیں، اور اس کے علاوہ کاشتکاری کے طور طریقے نہایت پرانے اور دقیانوسی ہیں، اس لئے لاطینی امریکہ کے بیشتر عوام غذائی قلت کا مسلسل طور پر شکار رہتے ہیں۔

دریں اثنا، چونکہ آبادی میں ۲ء۵ فیصدی سالانہ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے جو دنیا بھر میں سب سے اونچی شرح ہے، اس لئے غذا کی ناکافی فراہمی اور بھی مشکل مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔

لاطینی امریکہ کے طول و عرض میں صحیح معنوں میں جمہوری عناصر اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس خطہ میں امن اور استحکام پیدا کرنے کے لئے زمین کی لگان داری کے نظام کی اصلاح ناگزیر ہے۔ پھر بھی بعض زمیندار طبقے یہ نہیں سمجھ پاتے کہ کسانوں کو جمہوری طور طریقوں کی مدد سے پرامن انتقال اختیار میں مدد دینے کے سلسلہ میں ان کی ذمہ داریاں کتنی عظیم ہیں۔

ایک یا دو نسل پہلے کے میکسیکو کے انقلاب کی سخت گیریاں اور اس سے بھی زیادہ روس اور چین کے انقلابات کے ہولناک واقعات۔ ان سے انھوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا ہے۔

لاطینی امریکہ کے زرعی ماہرین خصوصی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جاگیروں کو ضبط کر لینا یا انھیں قومی ملکیت قرار دے دینا ہی اس مسئلہ کا واحد حل نہیں ہے، خواہ ایسا کرنے میں کیسی ہی انصاف پسندی سے کام کیوں نہ لیا جائے۔ ہر ملک کو ایک جداگانہ نوعیت کے مسئلہ کا سامنا ہے۔

بہر حال، اس میں کوئی شک نہیں کہ لاطینی امریکہ کے زرعی نظام کے اندر زبردست تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اب ہمارے سامنے صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ تبدیلیاں کس طرح لائی جائیں گی —— آیا خونیں انقلاب کے ذریعہ یا ایک طویل المیعاد جمہوری منصوبہ بندی کے تحت؟ —— اس سلسلہ میں ماضی کے بعض تجربات سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

میکسیکو میں ۱۹۱۶ء میں اور ۱۹۳۴ء کے درمیان تقریباً ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ جاگیردارانہ زمین، زمینداروں سے چھین کر کسانوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ نئے نظام کے اس ابتدائی مرحلے میں

۹ لاکھ سے زائد کسانوں کو اپنے لئے چھوٹے چھوٹے کھیت مل گئے۔ صدر کارڈینس کے عہد میں جنھوں نے ۱۹۳۴ء میں اپنے عہدے کی ذمہ داری سنبھالی تھی مزید پانچ کروڑ ایکڑ زمین ضبط کر کے زمینوں سے محروم کاشتکاروں میں تقسیم کی گئی۔

کچھ عرصہ کے بعد میکسیکو کی زرعی اصلاحات کے ابتدائی اقدامات کے نقائص واضح ہونے لگے۔ زمین کے نئے نئے انڈین مالک کام کرنے کا پورا پورا جذبہ رکھنے کے باوجود کھیتوں کے لئے اچھے بیج، مویشی اور ضروری آلات حاصل نہ کر سکے۔ وہ منصوبہ بندی کی ٹیکنیکوں اور اپنی پہلی پیداوار کو منڈیوں میں لانے کیلئے نفع بخش طریقوں سے ناآشنا تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زرعی پیداوار کم ہونے لگی۔ اور میکسیکو کی خاص پیداوار غلّہ اور ریشم وغیرہ کی شدید قلّت پیدا ہوگئی۔

اس وقت سے لے کر آج تک میکسیکو کی حکومت نے ان خامیوں کی اصلاح کے لئے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ اور امریکی حکومت اور نجی ذرائع سے امداد لے کر دیہی ترقی کے لئے کاشتکاری کے جدید طریقوں کی براہ راست تعلیم دی جاتی ہے جس سے ان کی زرعی پیداوار میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

وینزولا میں صدر رومولو بیٹن کورٹ نے گزشتہ جولائی میں کانگریس کے سامنے ایک بل پیش کیا تھا، جو ملک کے از کار رفتہ زرعی نظام کے مسئلہ سے پوری قوت کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ وینزولا کے اس اصلاحی پروگرام میں میکسکو کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور کسانوں کو زرعی آلات کی خریداری اور اچھے بیج اور کھاد فراہم کرنے کے لئے فیاضانہ سرکاری قرضے منظور کئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں مناسب صلاح و مشورہ دینے کے لئے زرعی توسیع کا ایک مستقل شعبہ قائم کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ یہاں کسانوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ انھیں کس زمین میں کب اور کیا چیزیں اگانی چاہئیں۔

اس وقت بیٹن کورٹ دوسری بار برسر اقتدار آئے ہیں۔ ۱۹۴۸ء جب ان کی ایکشن ڈیماکریٹک پارٹی وینزولا کے پہلے جمہوری انتخاب میں پہلی بار برسر اقتدار آئی تھی تو اس نے زرعی اصلاح کا ایک قانون منظور کیا تھا، جس کی رو سے معاوضہ دے کر زمینیں ضبط کرنے کا اور انھیں کاشتکاروں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ۳۶ دن کے بعد وینزولا کی فوج نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

بولیویا میں زرعی اصلاح کا نفاذ انقلابی حکومت کے اولین کارناموں میں سے ہے۔ یہ انقلابی حکومت ۱۹۵۲ء میں برسر اقتدار آئی تھی۔ بولیویا کے جاگیردار غلامی کے سلسلہ میں کافی بدنام رہے ہیں، جس کے تحت انھیں زرعی غلاموں سے ذاتی خدمت لینے کا حق حاصل تھا۔

بولیویا کی انقلابی حکومت نے یہ طے کیا تھا کہ ہر کسان کو ۲۵ ایکڑ سے لے کر دو ہزار ایکڑ تک،

زمین دی جائے گی، جس کا انحصار زمین کی پیداواری قوت پر ہوگا۔ مگر بولیویا میں زرعی زمینوں کا کبھی کوئی سروے نہیں کرایا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے پاس اس قسم کے اطمینان بخش نقشے بھی موجود نہ تھے جن سے یہ اندازہ ہوتا کہ ان کے پاس کتنی زرعی زمین موجود ہے۔

نتیجہ کے طور پر پریشان حال کسانوں نے مسلح انقلاب برپا کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ آج بولیویا میں زرعی اصلاحات کے معاملہ میں ایک ابتری اور اختلال نظر آتا ہے، لیکن ایک بات بالکل یقینی ہے، اور وہ یہ کہ بولیویا کے زرعی مزدور آئندہ کبھی جاگیردارانہ غلامی کو خاموشی کے ساتھ برداشت نہیں کریں گے۔

باوجود اس کے کہ لاطینی امریکہ کے ذمہ دار رہنما اس کوشش میں ہیں کہ عوام کی سرکشی کی یہ صورت اختیار کرنے سے قبل زمین کی باقاعدہ تقسیم کے لئے قوانین بنا دیئے جائیں، موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنے کی حمایت کرنے والے عناصر بدستور سرگرم عمل ہیں۔

سوال یہ ہے کہ تاریخ ان سب چیزوں کا کب تک انتظار کرے گی؟ موجودہ صدی میں صرف چار ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جہاں جمہوری حکومتوں نے وسیع پیمانے پر زرعی اصلاحات نافذ کی ہیں، زیکوسلواکیہ میں ۱۹۲۶ء میں، انقلاب سے قبل میکسیکو میں ہندوستان کے کچھ حصوں میں اور پیورٹو ریکو میں جس کے لئے امریکی کانگریس نے ۱۹۰۰ء میں ایک ایسا قانون منظور کیا تھا جس کے تحت کارپوریشنوں کی زمینی ملکیت کی حد پانچ سو ایکڑ تک رکھی گئی تھی۔

یہ صورت حال متحدہ امریکہ کے سیاسی تدبّر کو کل لاطینی امریکہ میں ایک چیلنج پیش کرتی ہے۔ متحدہ امریکہ کے شہریوں نے اس علاقے میں اپنا ۹ کھرب ڈالر ذاتی سرمایہ لگا رکھا ہے۔ یہ مقدار دنیا کے کسی اور حصے میں لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ ہے، اور یہ سب کا سب سرمایہ قانونی معاہدات کے تحت نہیں ہے۔ اگرچہ اس کثیر سرمائے کا صرف تھوڑا سا حصہ ہی زمینوں میں لگایا گیا ہے، لیکن اگر لاطینی امریکہ کے ملکوں میں بڑی بڑی جاگیروں کے ختم کرنے کا کوئی قانون نافذ ہوا تو اس سے بعض امریکی باشندوں کا مالی مفاد شدید طور پر مجروح ہوگا۔

اس لئے یہ گمان غالب ہے کہ لاطینی امریکہ کے فرسودہ زرعی نظام کی اصلاح کی جو بھی کوشش کی جائے گی وہ خواہ کیسی ہی ضروری جمہوری اور مناسب کیوں نہ ہو، اسے غلط طریقے پر "اشتراکی استحصال اور جبر" سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور یہ ممکن ہے کہ یہ دباؤ اب یا آگے چل کر متحدہ امریکہ کو، جس کی پشت پر انفرادی زرعی ملکیت کی ایک طویل تاریخ ہے، اس حیثیت میں واپس لے آئے جہاں وہ ایسے مفاد پرست عناصر کی تائید کرنے پر آمادہ ہو جائے، جو اس علاقے کی ترقی کا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہیں، جس پر خود ہمارے اپنے تحفظ کا دارومدار ہے۔

موجودہ تاریخ میں سب سے اہم زرعی اصلاحات گزشتہ جنگ عظیم کے فوراً بعد جنرل ڈگلس میک آرتھر نے جاپان میں نافذ کی تھیں۔ پرل ہاربر کے معرکے سے قبل دو تہائی جاپانی کاشت کار لگان ادا کرتے تھے۔ آج ۹۲ فیصدی جاپانی دیہی خاندان اپنی زمینوں کے مالک ہیں اور ان کی فی ایکڑ پیداوار پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

امریکی اثرات نے چیانگ کائی شیک کو بھی تائیوان (فارموسا) میں زمین کی نجی ملکیت کا ایسا انتظام قائم کرنے میں مدد دی ہے، جو اگر سرزمین چین میں دس سال قبل نافذ کر دیا جاتا تو تقریباً تمام کسان ان کے حامی بن گئے ہوتے۔

جنرل اسمو چیانگ کائی شیک کے پروگرام کے تحت کسی بھی کسان کو دس ایکڑ سے زائد آراضی رکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ ایسی زمین کا مالک بھی نہیں بن سکتا، جس پر وہ بذات خود کاشت نہ کرتا ہو۔ تائی پے کے سرکاری افسروں کا کہنا ہے کہ تائیوان میں چاول کی فی ایکڑ پیداوار میں زرعی اصلاحات کی بدولت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔

ان زرعی اصلاحات کی مخالفت اتنی شدید تھی کہ انھیں صرف ایک فرمان کے ذریعہ ہی نافذ کرنا ممکن ہو سکا۔ جنرل میک آرتھر کی فوجی حکومت کو خاص طور سے جاپانی جاگیرداروں کی مخالفت کی وجہ سے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

کیا متحدہ امریکہ کا سیاسی تدبّر اور مصلحت اندیشی، خوش تدبیری، مطابقت پذیری اور اثر و رسوخ سے کام لے کر لاطینی امریکہ کی حکومتوں کو اپنے ممالک کی زراعت میں ایک پُر سکون انقلاب پیدا کرنے پر آمادہ کر سکتی ہیں؟

اگرچہ ہماری حکومت واقعات کی سمت متعین نہیں کر سکتی، مگر وہ اکثر حالات میں ایک تعمیری اثر ڈال سکتی ہے۔ مثال کے طور پر:

ہم کچھ ایسے معقولیت پسند اقدامات کے حق میں اپنی روایتی حمایت کا اعادہ کر سکتے ہیں۔ جن کے تحت کسانوں کی ایک وسیع تعداد کو زمینوں کا مالک بنانے کا اطمینان دلایا جائے۔ ہم اپنے عالم گیر تجربہ کی بنیاد پر لاطینی امریکہ کی حکومتوں کو زمینوں کے معاوضہ کے ایسے منصوبے عمل میں لانے میں مدد دے سکتے ہیں، جن کے تحت ایک زمینداروں کو مناسب معاوضہ ادا کیا جائے اور دوسری طرف زمینوں کے نئے مالکوں پر غیر مناسب قیمتوں کا بار نہ ڈالا جائے۔

ہم اپنے آپ کو پہلے ہی سے اس یقینی نتیجہ کے مطابق ڈھال سکتے ہیں کہ معقولیت پسندی اور انصاف ہمیشہ ہی کامیاب نہیں ہوتا ہے۔ ناانصافیوں کا وقوع میں آنا یقینی ہے اور ایک طویل المیعاد استحکام کے لئے مختصر المیعاد قیمت کا ادا کرنا اکثر حالتوں میں گراں ثابت ہو سکتا ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ ہم اصل موضوع سے اپنی توجہ اِدھر اُدھر نہ کریں۔ ایشیا اور افریقہ

کی طرح لاطینی امریکہ میں بھی ہمارے سامنے انتخاب کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی شہری حقوق یا زرعی غلامی، امید یا مایوسی، تدریجی سیاسی ارتقا یا خونی ہنگامہ آرائی، ان ہی میں سے ہمیں ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ اگر ہم اس طریق کار کو سمجھنے سے قاصر رہے یا ان نئے اور اہم عناصر کی حوصلہ افزائی نہ کر سکے، جو قیادت کا پُر زور دعوی کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ تباہ کن ثابت ہو گا۔

۴۷ - معاہدۂ ترقی کیا ہے؟

نائب سکریٹری امور خارجہ مسٹر باؤلز نے اکتوبر ۱۹۶۱ء میں میکسیکو کے نارتھ امریکن کلچرل انسٹی ٹیوٹ سے خطاب کرتے ہوئے اس پروگرام کے کچھ تاریخی عوامل و نتائج بیان کئے، جس کی ضرورت متحدہ امریکہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کے لئے ایک عرصۂ دراز سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔ آپ نے اس تقریر میں دو ٹوک الفاظ میں جرأت مندانہ داخلی اصلاحات کی ضرورت واضح کی ہے۔

معاہدۂ ترقی کا اصل مقصد یہ ہے کہ سارے لاطینی امریکہ میں افلاس اور ناانصافی کے بنیادی اسباب کی بیخ کنی جائے تاکہ ہما ۲۱ قوموں کی حکومتیں اور عوام پُرامن جمہوری طریقوں کے ساتھ اپنے جمہوری دستور و روایات کو مستحکم بنا سکیں۔

اس نئے اشتراک عمل کے حسن و قبح پر غور کرتے وقت، میں سمجھتا ہوں، کہ ہمیں بعض دشوار حقائق کا کھل کر سامنا کرنا چاہیئے۔

مثال کے طور پر ہمیں اپنے تجربے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ایک بیرونی قوم خواہ اس کے وسائل کتنے ہی کثیر کیوں نہ ہوں، وہ ایک خاص حد تک ہی دوسروں کی مدد کر سکتی ہے۔ ایک قوم نہ تو دوسری قوم کو خوشحالی عطا کر سکتی ہے اور نہ آزادی فراہم کر سکتی ہے۔ یہ دونوں نعمتیں پیش قدمی، محنت اور اکثر حالتوں میں قربانی دے کر ہی حاصل کرنی پڑتی ہیں۔

علاوہ ازیں لاطینی امریکہ کی ترقی یافتہ اقلیت کے لئے لازم ہے کہ وہ آزاد اور جمہوری معاشروں کے قیام کی کوشش میں اپنے بعض وقتی مفادات کو قربان کر دینے کے لئے اور زیادہ آمادگی ظاہر کرے، کیوں کہ ایسے معاشروں کا قیام ہی پُرامن طریقے پر سیاسی، سماجی اور معاشی نشوونما کا یقین دلا سکتا ہے۔

لاطینی امریکہ کے بہت سے ملکوں میں جب عظیم حریت پرست رہنما نوآبادیاتی بندھنوں کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے تو انقلاب کی چنگاری بجھ گئی۔

بہت سے جمہوریت پسند رہنماؤں کی نہایت جرأت مندانہ اور انتھک کوششوں کے

باوجود معاشی اور سماجی اصلاحات، جو کسی بھی معاشرے کو گہرائی اور عظمت بخشنے کا واحد ذریعہ ہیں اکثر یا تو عمل میں آنے سے پہلے ہی دبا دی گئیں یا ان کا رُخ موڑ دیا گیا۔
اور چونکہ ضروری اقتصادی اور سماجی اصلاحات عمل میں نہیں آ سکی تھیں اس لئے انتہا درجہ کے افلاس کے ساتھ ساتھ کثیر دولت کا وجود بھی قائم ہے۔
معاہدہ ترقی قوموں کے ایسے اشتراک عمل کی بنیاد فراہم کرتا ہے جسے مغربی نصف کرۂ زمین کے معاشی اور سماجی مسائل کو ایک نئے جمہوری طریقے سے حل کرنے کے لئے عمل میں لایا جائے۔ اس اشتراک عمل کو فروغ دینے کی بہترین صورت کیا ہے اور پھر ہر ایک شریک عمل کے کردار کو کس طرح متعین کیا اور سمجھا جا سکتا ہے؟
ستمبر ۱۹۶۰ء میں بگوٹا ایکٹ کی رو سے اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ معاشی اور سماجی ترقی صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب وہ ایک دو طرفہ شاہراہ ہو۔
اس قانون میں کہا گیا تھا کہ معاشی اور سماجی ترقی کے کسی مشترکہ پروگرام کی کامیابی کے واسطے ضروری ہوگا کہ امریکہ کی ہر جمہوری حکومت اپنی مدد آپ کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے اور بہت سی صورتوں میں اپنے موجودہ اداروں اور طور طریقوں خصوصاً ٹیکسوں کے نظام زمین کی ملکیت و استعمال، تعلیم و تربیت، صحت اور رہائشی مکانات کے پروگراموں کی اصلاح کی جائے۔

پھر ۱۹۶۱ء میں پونٹا ڈیل ایسٹے (ESTE) میں 'امریکی عوام کا اعلان' جاری ہوا جو اور بھی زیادہ واضح تھا۔ اس اعلان میں زمینوں کے لگان اور استعمال سے متعلق مروجہ غیر منصفانہ ڈھانچے کی مذمت کی گئی اور پوری قوت کے ساتھ زرعی اصلاحات کے ایسے پروگراموں کی منظوری دی گئی، جو ہر ملک کی جداگانہ خصوصیات کے مطابق ہوں، جن کے تحت یہ یقین دلایا گیا کہ "زمین اسی شخص کی ملکیت ہوگی، جو اس سے اپنی روزافزوں فلاح و بہبود اور اپنی آزادی اور عظمت کا اطمینان حاصل کرنے کے لئے کام لے۔"
اس اعلان میں ٹیکسوں کے "ایسے قوانین" کی سفارش کی گئی تھی، "جن کے تحت دولتمند ترین اشخاص پر سب سے زیادہ ٹیکس عائد کئے گئے تھے۔ ٹیکسوں کی چوری کرنے والوں کے لئے سخت سزاؤں اور قومی آمدنی کو اس طرح تقسیم کرنے "کی سفارش کی گئی تھی کہ" اس سے وہ لوگ سب سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں، جو سب سے زیادہ ضرورت مند ہوں، ساتھ ہی بچت اور سرمایہ کاری کو فروغ دینے"، کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا۔ اعلان کے آخر میں یہ یقین اور اعتماد ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ "دور رس معاشی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں ہر ایک ملک کی اپنی کوششوں سے ہی عمل

ہیں لائی جاسکتی ہیں۔"

اوائل ستمبر میں متحدہ امریکہ کی کانگریس (پارلیمنٹ) نے ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے معاشی امداد کا ایک قانون منظور کیا اور امدادی رقوم کو مختلف ضروریات کے لئے مخصوص کرنے کے سلسلہ میں صدر کینیڈی کی ذمہ داریوں کی وضاحت کی گئی۔

مثال کے طور اس نئے قانون میں کہا گیا ہے کہ ترقی پذیر قوموں کے لئے قرضے اور عطیات منظور کرتے ہوئے صدر امریکہ اس بات کا خیال رکھیں گے کہ جس ملک کو یہ قرضے اور امدادی رقوم دی جا رہی ہیں، وہ اپنے عوام کے بنیادی، معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کے حل سے کس حد تک دلچسپی اور ہمدردی کا ثبوت دیتا ہے اور خود کوشی کے اصول پر عمل کرنے کا کس حد تک عزم رکھتا ہے۔"

اس قانون میں ایسے جامع اور سوچے سمجھے ہوئے منصوبوں کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا تھا جو حاصل شدہ امدادی رقوم کو بربادی اور بدعنوانی کی نذر ہونے سے بچا سکیں۔ اس میں دیہی علاقوں کی خصوصی حوصلہ افزائی کی سفارش کی گئی تھی، تا کہ زمین جوتنے اور بونے والے کسانوں کو ترقی اور انصاف کے بہتر مواقع حاصل کرنے میں مدد دی جا سکے۔

لاطینی امریکہ کے ملکوں کے سلسلہ میں معاشی امداد کے نئے پروگرام میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ امداد قانون بگوٹا کے اصولوں کے مطابق دی جانی چاہیئے۔

یہ ہیں ہمارے وضاحت شدہ اغراض و مقاصد لیکن یہ پروگرام بجائے خود کیا ہے؟ اگرچہ اس سلسلہ کی ٹیکنیکیں، معیار اور مخصوص پروگرام ابھی زیر ترتیب ہیں، تاہم چند عمومی نکات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

ایک ایسا چیلنج جس پر فوری اور گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے، ان دیہاتوں میں درپیش ہے، جہاں اس وقت لاطینی امریکہ کے ۷۰ فیصدی عوام آباد ہیں۔

اس سوال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے ہمیں ایسے عمومی نعروں سے آگے بڑھ کر بھی دیکھنا ہوگا، جو مبہم طریقے پر "زرعی اصلاحات" کی بات کرتے ہیں۔ اگرچہ حرکت پذیر دیہی معاشروں کی ترقی کے لئے زمین کا شخصی یا اجتماعی ملکیت میں ہونا ضروری ہے لیکن صرف اتنی بات اپنی جگہ کافی نہیں ہے۔

اگر دیہی گھرانوں کو بڑھتی ہوئی قدر و منزلت اور مواقع کے حصول میں کامیاب ہونا ہے، جس کی انھیں فوری جستجو ہے، تو حکومت کو لازمی طور پر ایسے توسیعی شعبوں کا قیام عمل میں لانا چاہیئے، جو کسانوں میں زراعت کے جدید طریقوں کو فروغ دینے اور انھیں اپنے وسائل سے اور زیادہ بہتر

استعمال میں مدد دے سکیں۔ ایسے توسیعی شعبوں میں، ہسپتالوں، اسکولوں اور سڑکوں کی ترقی کے سوچے سمجھے مربوط پروگرام لازمی طور سے شامل ہونے چاہئیں۔

کسانوں کو کمتر شرح سود پر قرضے مہیا کئے جائیں اور امدادِ باہمی کی انجمنیں قائم کی جائیں تاکہ پورے کے پورے معاشرے اپنی موجودہ پستی سے اٹھنے کے لئے کام کرنا سیکھ سکیں۔ جہاں جہاں ممکن ہوسکے چشموں کے اوپر بند باندھے جائیں اور ٹیوب ویل کھودے جائیں تاکہ ان سے کھیتیاں سیراب ہوسکیں۔

دیہاتی آبادی کے تمام جسمانی طور پر تندرست افراد کو ان سہولیتوں کے حصول کے لئے رضاکارانہ طور پر محنت کرنے کی ترغیب دلاکر توسیعی کارکن ان کی شخصی خودداری اور احساس اشتراک میں اور بھی اضافہ کرسکتے ہیں۔

دیہی سماجوں میں کام کرنے کے حالیہ تجربہ سے ہمیں ایک اور بڑا سبق حاصل ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتیں صرف اسی وقت بروئے کار آتی ہیں جب دیہی فلاح وبہبود کے پروگرام پورے طور سے ہم آہنگ کئے جاتے ہیں۔

میں اس بات کو نہایت زور کے ساتھ کہوں گا کہ دنیا کا کوئی بھی ایسا ملک، جو معاشی ترقی کی خواہش رکھتا ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم نہ دلانے پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے عوام کی صحت و تندرستی کی حفاظت نہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔

خودکوشی کی ایک اور لازمی صورت، جس پر بگوٹا ایکٹ اور لونٹا ڈیل اسٹے کی حالیہ کانفرنس میں زور دیا گیا تھا، یہ ہے کہ ٹیکسوں کا نفاذ آمدنی کی شرح کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس قسم کے ٹیکس مفت حاصل کئے گئے منافع کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں، اور ان سے نئے منافع بخش کاموں میں سرمایہ لگانے کی ترغیبات پیدا ہوتی ہیں۔

ہمیں دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کی کوئی خواہش نہیں ہے لیکن ہم اپنے تلخ تجربات کی بنا پر یہ جانتے ہیں کہ غریب اور امیر کے درمیان شدید اور نمایاں اختلافات سے کم مرفہ حال عوام کے اندر سخت بے چینی اور مایوسی پیدا ہونے لگتی ہے۔

بڑھتی ہوئی گھریلو سرمایہ کاری اور کامیاب ترقی کی ایک لازمی شرط یہ ہے کہ ترقی پذیر قوم اور اس قوم کی کرنسی کے درمیان، جس کے ساتھ وہ تجارت کرے، ایک معتدل تعلق اور تناسب قائم ہونا چاہیے۔

کوئی وجہ نہیں کہ میری حکومت یا امداد دینے والی کسی اور قوم سے دیسی سرمائے کی جگہ

ایسے قرضے اور امدادی رقمیں منظور کرنے کے لئے کیوں کہا جائے جسے اسی قسم کی بندشیں عائد کر کے ملک کے اندر روکا جا سکتا ہے، جن سے حکومت برطانیہ کو جنگ عظیم کے بعد اپنی معاشیات کو استحکام بخشنے میں مدد ملی تھی۔

نہ ہی اس بات کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ کسی ایسی قوم کی مدد کرنے کے لئے ہم پر کیوں بار ڈالا جائے، جو یا تو اپنے ملک کے دولت مندوں پر کسی قسم کا بار ڈالنے میں ناکام رہتی ہیں یا ٹیکسوں کی چوری سے چشم پوشی اختیار کرتی ہیں۔ متحدہ امریکہ میں ہم گزشتہ نصف صدی سے انکم ٹیکس ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔

اب یہ سوال ہے کہ متحدہ امریکہ ان ملکوں کی مدد کرنے کے لئے کیا اقدامات کرے گا، جو قانون بگوٹا کی غرض و غایت کی روشنی میں اپنی مدد آپ کرنے کے ضروری اقدامات کر رہے ہیں۔؟

ہر ایک قوم اپنی ضروریات اور مواقع کا خود اظہار کرے گی۔ لیکن ترقیاتی پروگراموں کے لئے متعدد اداروں کی طرف سے معقول رقمیں قرضوں اور عطیات کی صورت میں میسر آ سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ منصوبہ بندی کے تحت عملی کاموں اور ترقیاتی سرگرمیوں کے ماہرین زرعی پیداوار مثلاً گندم، مکئی، دودھ کا پاؤڈر، چکنائیاں اور پیس کارپس کے وہ رضا کار، جو زیادہ تر ہماری یونی ورسٹیوں سے بھرتی کئے گئے ہیں، سروے کرنے، تعلیم دینے اور دوسرے ترقیاتی منصوبوں میں مدد دینے کے لئے فراہم کئے جا سکتے ہیں۔

اس قسم کے تحقیقاتی مطالعے بھی زیر عمل لائے جا رہے ہیں، جن کے نتیجہ میں ایسے معاہدات کی توقع کی جا سکتی ہے، جو ایسی بہت سی اشیاء کی مناسب قیمتوں کی ضمانت دے سکیں گے جو لاطینی امریکہ کے ملکوں کی خوشحالی کے لئے ضروری ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے جو سوال ہے اسے دو ٹوک الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ بگوٹا ایکٹ کی شرائط میں ہم نے مشترکہ طور پر جو عہد کیا ہے، وہ ایک ایسے مسلسل امن پسند جمہوری انقلاب سے کسی صورت میں کم نہیں ہے، جو لاطینی امریکہ کے ہر ایک ملک میں پہنچ رہا ہے، اور طرز ذہن میں متعدد طریقوں سے تبدیلی کا مطالبہ کر رہا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اس قول کے عواقب و نتائج کی اہمیت ہم نے کس حد تک محسوس کی ہے؟ ہم نے ان عظیم مشکلات کا کس حد تک احساس کیا ہے جو آگے پیش آنے والے ہیں؟

ان مشکلات کے متعدد سرچشمے ہیں۔ مثلاً کروڑوں مفلوک الحال کاشتکاروں اور گندے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے اندر ناامیدی کا احساس، بہت سے اہم سیاسی رہنماؤں کا یہ مستحکم خیال کہ پُر امن تعمیری انقلاب ایک ناممکن چیز ہے اور ایسے اقتصادی مفادات کی مخالفت، جو آج

کی انقلاب پسند دنیا میں ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔
ان مشکلات کی اہمیت کو کم سمجھنا ہماری حماقت ہوگی۔ تاہم یہ دیکھ کر اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ ان ملکوں کے ذی اثر رہنما ایسے پروگراموں کی روزافزوں حمایت کر رہے ہیں، جو ہمارے بیان کردہ مقاصد کی تکمیل کے لئے لازمی ہیں۔

قوی دل اور گہرا اعتقاد رکھنے والے افراد کے لئے ہمارا دور جمہوری ترقی کی عظیم الشان بین الاقوامی جدوجہد کی قیادت اور اس میں شریک ہونے کا ایک ولولہ انگیز موقع فراہم کرتا ہے۔ نوجوان مردوں اور عورتوں کے لئے وقت کا یہ چیلنج خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے، جنھیں اس تحریک کی کامیابی سے زبردست فوائد اور اس کی ناکامی سے عظیم نقصانات برداشت کرنے پڑیں گے۔

اس چیلنج کا جواب دینا کسی بودے یا بے عمل نظریہ پرست کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمیں دنیا میں راتوں رات کوئی انقلاب برپا کر دینے کے سادہ لوح نقصوں اور نظریاتی شیطانوں کے خوفناک اندیشوں کے درمیان ایک اعتدال کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔

یہ وقت کو ضائع کرنے کا موقع نہیں ہے جیسا کہ صدر سوسٹر ہیٹس نے حال ہی میں کہا تھا "پنٹا ڈیل اسٹے میں عوام کے لئے امیدوں کے دروازے کھل گئے ہیں اور اس پر عملدرآمد کے بارے میں جو کچھ طے ہوا ہے اگر اس میں کسی قسم کی سستی یا کاہلی سے کام لیا گیا تو اس کے نتیجہ میں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اس چیلنج کی اہمیت میں کسی قسم کا مبالغہ ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

حصہ چہارم

کمیونسٹ چیلنج

ہماری پالیسی دنیا کی ان انقلابی قوتوں کے سلسلہ میں نہایت واضح اور ممکن العمل ہونی چاہیئے، جن سے دنیا کے مستقبل کی تعمیر ہو رہی ہے۔
اس کو اس درجہ مستعد ہونا چاہیئے کہ دور دراز کمیونسٹ دنیا کے اندرونی اختلافات کا ادراک کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکے۔
اس کو کمیونسٹ ممالک کے اقدامات کی بدولت مجہول بن کر رہ جانے کے خطرے کو ختم کر دینا چاہیئے اور دنیا کے تمام لوگوں کی آزادی کی خواہشات کی ہر امکانی حد تک حمایت کرنی چاہیئے۔
اور سب سے اہم یہ کہ اسے اس رجحان کو باقی رکھنا چاہیئے جسے ہمارے آباؤ اجداد نے "اعلان آزادی" میں بنی نوع انسان کے خیالات کے احترام سے تعبیر کیا ہے۔

۲۸، فروری ۱۹۵۲ء

۳۸- اگر آج مارکس واپس آئے تو....

۱۹۵۲ء میں مارکسزم کو ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں ایک اقتصادی نظریہ کی حیثیت سے عام مقبولیت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے غیر کمیونسٹ طلباء بھی اس سے متاثر تھے۔ اسی سال اکتوبر کے مہینے نئی دہلی میں سیاسیات کے ہندوستانی طلباء کے ایک اجتماع میں سفیر امریکہ مسٹر باؤلز نے ہندوستان کی سیاسی و اقتصادی ترقی پر مارکس کے فرسودہ نظریات کے اطلاق کی بنیادی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کارل مارکس کی تعلیمات کا اس کی زندگی اور اس کی تحریرات کے پس منظر میں ہی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۴۸ء میں جب کمیونسٹ مینی فیسٹو شائع ہوا تو یورپ میں صنعتی انقلاب جنم لے رہا تھا اور ایک اوسط درجے کے شہری کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ تھے۔

ہر طرف افلاس کا دور دورہ تھا۔ آٹھ، دس اور بارہ بارہ سال کے بچے کارخانوں میں چند آنہ ہفتہ پر روزانہ طویل اوقات تک کام کیا کرتے تھے۔ جو لوگ دولت مند تھے، وہ انتہائی دولتمند تھے اور روز بہ روز زیادہ دولتمند ہوتے جا رہے تھے۔ غریبوں کو افلاس سے نجات کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔

تلاش معاش میں نوجوان دہقانوں کے شہر میں آنے کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا جس کی بدولت اُجرتیں کم ہو رہی تھیں۔ اور اس طرح ایک نئی بدحالی اور پریشانی پیدا ہو رہی تھی۔ نوآبادیاتی علاقے کے لوگوں سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جا رہا تھا۔ اور یورپ کی بڑی قوموں میں خام مال کے لئے آویزش سے نئی کشمکش پیدا ہو رہی تھی۔

یہ ایک ایسا دور تھا جس میں چند لوگ فائدہ اُٹھا رہے تھے اور زیادہ لوگ تکلیف کا شکار تھے۔ انیسویں صدی کے فنونِ لطیفہ، تمدن اور تعلیم معدودے چند لوگوں کے قبضے میں تھے۔

انیسویں صدی کے وسط کی اس ناخوشگوار دنیا کو جس میں لالچ اور مفاد پرستی کا دور دورہ تھا، مارکس نے دیکھا تو وہ بعض ایسے نتائج پر پہنچا جو اُسے بدیہی اور ناگزیر معلوم ہوئے۔

وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سرمایہ دارانہ نظام بالآخر تباہ ہو جائے گا، حکمران طبقے "مسندِ اختیار

سے اُتار دیے جائیں گے۔ اس کے بعد "عوام الناس پرولتاری آمریت" کی بنیاد ڈالیں گے جو مارکس کے خیال کے مطابق اپنا کام پورا کر کے ختم ہو جائے گی۔ معاشرے کے مختلف درجات ختم ہو جائیں گے اور دنیا کے لوگ ایسے نظام کی توقع کر سکیں گے جس میں سب لوگوں کو زیادہ آزادی اور ترقی کے زیادہ مواقع حاصل ہوں گے۔

کارل مارکس نے جن حالات میں مفلسی اور مفاد پرستی کے خلاف قلم اُٹھایا تھا اس کے پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ تلخ نتائج قابل فہم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر مارکس آج ہماری اس دنیا میں واپس آجائے جو ہنوز تشنۂ تکمیل ہے تو وہ ہکا بکا رہ جائے گا۔

مثال کے طور پر بہت زیادہ توسیع اور صنعتی ترقی، بڑھتی ہوئی قوت خرید تمام لوگوں کے لئے ترقی کے بڑھتے ہوئے مواقع جو نجی ملکیت کے امریکی نظام کے تحت وجود میں آئے ہیں، یا ہمارا تعلیمی نظام جو اٹھارہ سال تک لڑکے اور لڑکیوں کی مفت تعلیم کا بندوبست کرتا ہے، یا ہمارے قوانین جو سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے کی ممانعت کرتے ہیں، یا دراثتی محصول، یا ۶۵ برس کی عمر سے شروع ہونے والے بڑھاپے کی پنشن، یا طبی اور بے روزگاری کے بیموں کا نظام، سرکاری مکانات کی تعمیر اور بچوں کے لئے اسکول کی طرف سے مفت کھانا، ایسے امور ہیں جن کا مارکس کبھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

یہ تصورات جدید اور صحیح معنوں میں انقلابی ہیں۔ کوئی بھی شخص یہاں تک کہ مارکس جیسا ذہین آدمی بھی ان کی پیش بینی نہیں کر سکتا تھا۔ امریکہ میں ایک صدی سے زیادہ عرصے سے ایک نئے انداز کا پرامن انقلاب جنم لے رہا ہے، اور ہمارے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے برابر آگے بڑھ رہا ہے۔

مزید برآں، بیسویں صدی کی یہ ترقیات صرف امریکہ تک محدود نہیں۔ کیا کارل مارکس سویڈن، فن لینڈ، ڈنمارک اور ناروے کی امداد باہمی انجمنوں کا تصور کر سکتا تھا، جہاں بڑی صنعتیں عوام کی ملکیت ہیں جو خود ان کی مصنوعات کے خریدار ہیں؟ وہ امداد باہمی کی تقسیم کار انجمنوں کا کیسے تصور کر سکتا تھا، جنھوں نے اشیائے صرف کی قیمتوں کو اور کم کر دیا ہے؟

مارکس کے تصور میں یہ بات کیسے آسکتی تھی کہ نجی ملکیت کے ساتھ ساتھ اور اس سے مقابلہ کرتے ہوئے سرکاری ملکیت کا وجود بھی آسانی کے ساتھ ممکن ہو سکتا ہے؟ اس کے تصور میں یہ بات کیسے آسکتی تھی کہ پیداواری معاشیات کی تین مختلف صورتیں ―― امداد باہمی کی معاشیات، نجی سرمایہ داری کی معاشیات، اور اشتراکی معاشیات ―― ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے بھی، مقابلے کے اس جذبے کے ساتھ کام کر سکتی ہیں کہ کم سے کم قیمت پر کون سب سے بہتر سامان بنا سکتا ہے؟ مزدوروں کو کون زیادہ اجرتیں دے سکتا ہے؟ اور کون لوگوں کے لئے سب سے زیادہ خوشگوار مستقبل پیش کر سکتا ہے۔؟

اس کے ذہن میں یہ بات کیسے آسکتی تھی کہ انگلستان میں لیبر حکومت فولاد کے کارخانوں اور کوئلے کی کانوں کو قومیانے کی پشت پناہی کرنے کے ساتھ ساتھ ہر امکانی حد تک نجی ملکیت کو بھی اجازت دیدے گی؟

وہ برطانیہ کے دارالعلوم میں بیٹھ کر ممبران کو ہندوستان، پاکستان، برما اور لنکا کے ۵۰ کروڑ انسانوں کی آزادی کی حمایت میں رائے دیتے دیکھتا تو کیا محسوس کرتا؟ گاندھی جی کے لائے ہوئے پُرامن اور غیر خونیں انقلاب مارکس کیسے تصور کر سکتا تھا؟

اس کے ذہن میں یہ بات کیسے آسکتی تھی کہ دنیا بھر کی قومیں اقوام متحدہ میں آکر یکجا ہو جائیں گی، جو اپنے جملہ نقائص کے باوجود دنیا کا پہلا عالمی ادارہ ہے؟ وہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، یونیسکو، فوڈ اینڈ ایگری کلچرل آرگنائزیشن اور چلڈرنس فنڈ وغیرہ کا کیسے تصور کر سکتا تھا۔

کارل مارکس ان انقلابی واقعات کا تصور نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ اُسے یقین تھا کہ وہ معاشی نظام جو انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں اس قدر مضبوط و مستحکم معلوم ہوتا تھا اور جس پر اس نے نہایت کامیاب طریقے پر نکتہ چینی کی تھی، اپنی برائیوں کو دور نہیں کر سکے گا، اور یہ دنیا لازمی طور پر خونیں ہنگامہ آرائی کا شکار ہو جائے گی۔

مارکس معاشی ناگزیریت میں یقین رکھتا تھا۔ جس چیز کو اس نے نظر انداز کر دیا وہ جمہوری حکومتوں میں عمل پیرا انسانوں کی خود کو منظم کرنے اور اپنے ماحول پر قابو پانے کی صلاحیت تھی، جس سے معاشی جد و جہد کو فلاح عامہ کے مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

مالتھس کے نظریات، صنعتی ترقی کا ادراک کرنے میں ناکام رہے تھے۔ مارکس نے انسانی عوامل کو نظر انداز کر دیا، جن پر بعد میں گاندھی جی نے اپنے عقیدے کی بنیاد رکھی۔

کارل مارکس اور سوویت یونین میں کیا تعلق ہے؟ موجودہ عالمی کمیونسٹ تحریک کا اس پر کیا ردّ عمل ہوگا؟

مجھے شک ہے کہ کارل مارکس اس زمین پر واپس آنے کے بعد آہنی پردہ کی حدود میں داخل بھی ہو سکے گا۔ لیکن اگر وہ کسی طرح سوویت یونین اور اسکے حلقہ بگوش ممالک کا ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو وہاں کے حالات دیکھ کر اسے سخت حیرانی ہوگی۔ وہ کمیونزم جس کا آج ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اس کمیونزم سے کم ہی مشابہت رکھتا ہے جو مارکس کے ذہن میں تھا اور جس کے لئے اس نے جد و جہد کی تھی۔

پہلی چیز جو اسے حیرت میں ڈال دے گی وہ شخصی آزادی کا فقدان ہوگا۔ اپنی تحریرات کی روشنی میں وہ کہے گا ــــ "یہ کمیونسٹ حکومت ۳۵ سال سے برسرِ اقتدار ہے۔ اب یقیناً اس

کا اختتام قریب ہوتا جا رہا ہے۔ پرولتاری طبقہ اب اپنے معاملات خود چلائے گا، جس میں ریاست کی پابندیاں کم سے کم ہوں، اور انفرادی آزادی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جائے گا۔

دانس آف ماسکو، کو سن کر مارکس کو وقتی طور پر اطمینان ہوگا، کیوں کہ بہت سے مانوس فقرے اس کے کانوں میں پڑیں گے، وہ سوویت رہنماؤں کو یہ پیشین گوئی کرتے سُنے گا کہ سرمایہ دارانہ نظام بالآخر خود بخود تباہ ہو جائے گا اور یہ کہ نام نہاد "سرمایہ دار" ممالک (جس کا مطلب کمیونسٹ اصطلاح میں ان تمام ممالک سے ہے جو سوویت توسیع پسندی اور تشدد کے مخالف ہیں) اس جنگ میں اپنے آپ کو تباہ کرلیں گے، جس سے سرمایہ دار دنیا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ لیکن جب کارل مارکس دورِ جدید کے حقائق کا مطالعہ کرے گا تو اسے یہ مانوس فقرے مہمل معلوم ہونے لگیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا اس کی پیشین گوئی کے مطابق تقسیم ہو چکی ہے۔ لیکن وہ دیکھے گا کہ تنازعہ سرمایہ پرستی اور کمیونزم میں نہیں ہے، بلکہ ان ممالک کے مابین ہے جو قطع نظر اس کے کہ ان کا طرزِ حکومت کیا ہے، آزاد رہنے کا عزم کئے ہوئے ہیں اور دوسرے وہ جو طاقت کے ذریعہ تشدد پر مائل ہیں۔

دورِ حاضرہ کے اس موجودہ ناخوشگوار تنازعہ میں وہ دیکھے گا کہ برطانیہ اور اسکنڈے نیویا کی جمہوری اشتراکیت امریکہ کی جمہوری نجی ملکیت اور یوگوسلاویہ کی خودمختار کمیونسٹ حکومت ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑی ہیں۔

کارل مارکس دیکھے گا کہ اس دور میں "سرمایہ داری بنام اشتراکیت" کا پرانا تنازعہ محض ایک دکھاوے کی چیز بن کر رہ گیا ہے اور حقیقی کشمکش آزادی و خودمختاری اور جبر و تشدد کی قوتوں کے درمیان ہے۔

۳۹ - "سوویٹ کو سب سے بڑا خطرہ کس بات سے ہے؟"

سنہ ۱۹۵۳ء میں جنگ کوریا کے اختتام کے بعد کمیونسٹوں کی مزید جارحانہ کارروائیوں کا ایک بڑا خدشہ پیدا ہو گیا تھا - اسی سال ماہ اکتوبر میں پی، آئی، ایم، سی، اے ہارٹ فورڈ (کنکٹیکٹ) میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر باؤلز نے ان خدشات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے -

ذرا ایک لمحے کے لئے اس بات پر غور کیجئے کہ ہم امریکہ والے نہیں بلکہ سوویت رہنما جب اس تغیر پذیر دنیا کے بارے میں سوچتے ہیں تو کس چیز کا خدشہ محسوس کرتے ہیں -

مجھے یقین ہے کہ ان کو سب سے زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ جمہوریت پسند قومیں جمہوریت کی ایک ایسی کامیاب مثال پیش کریں گی اور عالمی مسائل کو ایسی کامیابی کے ساتھ حل کریں گی کہ جمہوریت کا تصور ہر جگہ یہاں تک کہ ایک روز خود سوویٹ یونین میں بھی ناقابلِ مزاحمت ہو جائیگا۔

ان کو اندیشہ ہے کہ ہمارے مثبت عمل سے جمہوری دنیا اس قدر مستحکم ہو جائے گی کہ داخلی کمیونسٹ انقلاب ناممکن ہو کر رہ جائے گا -

وہ ڈرتے ہیں کہ چار نکاتی پروگرام میں توسیع کی جائے گی اور اقتصادی ترقی کے مسئلہ پر اس کا پورا پورا اطلاق کیا جائے گا اور ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کی اقوام امریکی مدد کے ذریعہ استبداد اور جبر و تشدد کے بغیر ترقی کر سکیں گی -

ان کو خوف ہے کہ ہم اس وقت کا انتظار کئے بغیر جب معاشی بدحالی کی بدولت انتشار اور اس کا لازمی یعنی کمیونزم ترقی پانے لگے، ان اقوام کو اس قدر سرمایہ اور فنی امداد بہم پہونچا دیں گے کہ وہ اپنی جمہوری کوششوں میں کامیاب ہو سکیں -

ان کو خطرہ ہے کہ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہو جائیں گے کہ ایشیا میں حتمی مقابلہ کمیونسٹ چین اور جمہوری ہندوستان کے درمیان ہے جنھیں نیم ترقی یافتہ دنیا کے دو مہرے کہا جا سکتا ہے اور یہ کہ روس چین کو جتنی کچھ امداد دے سکتا ہے اس کے مقابلے میں ہم ہندوستان کو زیادہ موثر امداد دے سکیں گے -

وہ ڈرتے ہیں کہ ہم اپنے اس موجودہ لاحاصل رویے کو ترک کر دیں کہ "آپ کو یا تو ہمارے

موافق ہونا چاہیئے یا مخالف" جس نے بہت سی غیور اور دوستانہ قوموں کو ہمارا مخالف بنا دیا ہے اور جو اس "غیر جانبداری کے منافی ہے" جس پر جنگ عظیم اول سے پہلے ایک صدی تک ہم خود کاربند رہے تھے۔

ان کو ڈر ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں جہاں ابھی تک کچھ نوآبادیاتی علاقے باقی ہیں، امریکہ کی خارجہ پالیسی قومی آزادی کی حمایت اور نوآبادیاتی نظام کی مخالفت کرے گی جس سے کریملن کا یہ دعویٰ کہ صرف وہی شہنشاہیت کا حریف ہے، بے نقاب ہو کر رہ جائے گا۔

وہ ڈرتے ہیں کہ امریکہ غیر جمہوری اور عوام میں غیر مقبول ... حکومتوں کو مدد دینا بند کر دے گا، کیونکہ وہ بڑی آسانی سے کمیونسٹ جارحیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔

وہ ڈرتے ہیں کہ ہم ایسی حکومتوں کو خصوصی مدد دینا شروع کریں گے جو ضروری زرعی، اور سماجی اصلاحات نافذ کرنے کے ساتھ محصولات کا ایک منصفانہ نظام بھی قائم کریگی۔

وہ ڈرتے ہیں کہ ہم ایسی اصلاحات کو اپنی اقتصادی مدد کے لیے شرط بنا دیں گے تاکہ دنیا کے عوام کو معلوم ہو جائے کہ ہم ان کے حامی ہیں

ان کو خوف ہے کہ ہم اقوام متحدہ کی حمایت کریں گے اور اسے استحکام بخشیں گے، صرف جارحیت کی اجتماعی مزاحمت کے لئے ہی نہیں بلکہ دنیا کے معاشی مسائل کا ایک حل تلاش کرنے کی غرض سے بھی۔

وہ ڈرتے ہیں کہ ہم اپنے سلیقہ اور شعور سے اقوام متحدہ کو جمہوری اقوام کی وفاداری کا اجتماعی مرکز بنا دیں گے۔

وہ ڈرتے ہیں کہ امریکہ میں ہم اپنی اقتصادیات بغیر کسی انحطاط کے بدستور جاری رکھ سکیں گے۔

وہ ڈرتے ہیں کہ اپنے پُرعزم نئے قومی اور بین الاقوامی ترقیاتی پروگراموں کے ذریعے ہم بھرپور پیداوار اور مکمل روزگار کو عمل میں لائیں گے جس سے ان کی تمام مارکسی پیشین گوئیاں باطل ہو جائیں گی۔

وہ ڈرتے ہیں کہ ہم نہ صرف گزشتہ بیس سال سے نسلی تعلقات کو بہتر بنانے کی جس پالیسی پر عمل پیرا ہیں اسے مؤثر تر بنائیں گے بلکہ اپنے تمام شہریوں کے مساوی حقوق اور وقار کے لئے بھی پوری تندہی سے کوشش کرتے رہیں گے۔

وہ ڈرتے ہیں کہ امریکی لوگ کمیونسٹ خطرہ کے پیش نظر اسکول کی تنظیموں اور دیگر اداروں میں مختلف گروہوں میں بٹے رہنے کی بجائے اپنے آزاد اصولوں کے عقیدہ پر متفق ہو جائیں گے۔

وہ ڈرتے ہیں کہ ہم کمیونزم کے خلاف لڑتے ہوئے بھی اپنی شہری آزادیوں کو مکمل طور پر باقی

رکھ سکیں گے اور جمہوری نظام کو دنیا کے سامنے ایک تجزیہ مثال کے طور پر پیش کر سکیں گے ۔
مختصر یہ کہ وہ ڈرتے ہیں کہ آج کا بیدار امریکہ جو تامس جیفرسن، ابراہیم لنکن اور فرینکلن روز ولٹ کے نظریات کا علمبردار ہے۔ اس کی رہنمائی میں جمہوری دنیا کمیونزم کی ترقی کے اسباب کا انسداد کر کے کمیونسٹوں کی عالمی حکمرانی کی توقعات پر پانی پھیر دے گی ۔

× × ×

۴۰ ۔ جس خطرہ سے ہم دوچار ہیں وہ انتظار نہیں کریگا

۱۹۵۵ء میں سوویٹ یونین کے طور طریقے کھلم کھلا جارحیت سے ہٹ کر اقتصادی، سیاسی اور نظریاتی جدوجہد کی طرف منتقل ہو گئے ۔ اس صورت حال نے ریاستہائے متحدہ کو ایک نئے خطرے اور چیلنج سے دوچار کر دیا ہے جس پر مسٹر باؤلز نے ۲۷ نومبر کے نیویارک ٹائمز میگزین میں شائع شدہ اس مقالہ میں روشنی ڈالی ہے ۔

جولائی ۱۹۵۵ء کی چوٹی کانفرنس میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ موجودہ حالات میں ایٹمی جنگ لازمی طور پر فریقین کو تباہ کر دے گی؛ اور اسی لئے اس نوعیت کی جنگ عملی طور پر ناممکن ہے۔ اس فیصلہ کے پیش نظر جنیوا کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سوویٹ یونین نے اپنے طویل المدت عالمگیر مقاصد کو ترک کر دیا ہے ۔
خروشچیف اور بلگانن نے اس نکتہ کو سمجھ لیا ہے جسے نظریہ پرست اسٹالن نے سختی کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا۔ اور وہ یہ کہ فوجی جمود اور تعطل کی صورت میں عالمی کمیونزم کے لئے فوجی جارحیت اور جارحیت کی دھمکی اب قطعاً بے اثر اور ناکارہ ہو چکی ہے ۔
چوٹی کانفرنس سے پہلے، اور اس کے بعد بھی بڑی تیزی کے ساتھ سوویٹ رہنماؤں نے ایٹمی طاقت کے نئے توازن سے پیدا شدہ اثرات کو جرأت مندی کے ساتھ تسلیم کر کے ان کے مطابق عمل بھی شروع کر دیا تھا۔ گزشتہ چند ماہ میں انھوں نے نہایت سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے روس کی خارجہ پالیسی کی تمام تر توجہ کو تصادم کے ایک بالکل مختلف میدان یعنی سیاسی، اقتصادی نظریاتی اور سفارتی داؤ پیچ کی طرف منتقل کر دیا ہے ۔
اس عرصہ میں امریکہ کی پالیسی ایسے طور طریقوں کے ساتھ وابستہ رہی ہے جو سرد جنگ

کے دوران انتہائی محدود ثابت ہو چکے ہیں اور جو نئی قسم کی مقابلہ بازی کی روشنی میں اور بھی زیادہ ناکارہ معلوم ہوتے ہیں۔ آج بھی دنیا کے اکثر علاقوں میں ہماری پالیسی کا انحصار فوجی مصلحتوں پر ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے حصوں میں ہماری بے لوچ پالیسی نے ہمیں فرسودہ اور مایوس کن حالات کا غلام بنایا ہوا ہے۔

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ایٹمی جنگ کے نہ ہونے کے مقابلہ میں ہونے کے امکانات زیادہ ہیں تو طویل المدت اقتصادی، نظریاتی اور عوامل کی اہمیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن اگر جنیوا کی چوٹی کانفرنس کا کوئی مطلب ہے تو محض یہ کہ جبتک فوجی ایٹمی طاقت کا موجودہ توازن قائم ہے، اس وقت تک عالمی جنگ ایٹمی ہتھیاروں کے خوف کی وجہ سے بھی خارج از بحث رہے گی۔

ایسی صورت میں ایک ایسی خارجہ پالیسی جو ہر موقع پر فوجی مصالح کو ترجیح دیتی ہو اور ان سیاسی، اقتصادی اور نظریاتی قوتوں کی اہمیت کو کم کرتی ہو جن سے اس زمانے کی تاریخ مرتب ہو رہی ہے انتہائی ناموزوں ہے۔

روس کی چالوں سے خوفزدہ ہونے کے بجائے ہمیں ان کو خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ اقتصادی ترقی اور نظریات ہمارے جمہوری نظام کے اہم اجزا ہیں۔ ہمارے حریف نے مقابلہ کو آزمائش کے ایک ایسے میدان میں منتقل کر دیا ہے جہاں ہماری قوت مسلم ہے۔ لہذا ہم اس نئے چیلنج کو اعتماد کے ساتھ قبول کر سکتے ہیں۔

امریکہ کو آج جس مقابلہ سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اس کی طرف کانگریس اور عوام کی توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے زیادہ جرأت مند اور پُراعتماد قیادت اور وسیع النظری کے ایک نئے تخلیقی احساس کی ضرورت ہے۔ ۱۹۵۶ء میں اور اس کے بعد موجودہ رجحان کو بدل دینے کے لئے جن اقدامات کی ضرورت ہے، وہ نظریاتی اعتبار سے کسی طرح بھی ان اقدامات سے کم اہم اور کم فکر آمیز نہیں ہیں جو دس سال قبل یورپ کی آزادی کو برقرار رکھنے میں مدد دینے کے لئے عمل میں لائے گئے تھے۔

ذیل میں ایجنڈے کے چند غور طلب نکات کی فہرست دے رہا ہوں تاکہ اس چیلنج کی غایت معلوم ہو سکے۔

۱ - ایک ایسا فوجی دفاعی پروگرام جو ماسکو کی طرف سے پیدا شدہ کسی بھی فوجی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ہو۔

۲ - ایک ایسا اقتصادی پروگرام جو ایشیا اور افریقہ کے لئے وہ سب کچھ کر سکے جو مارشل پلان نے یورپ کے لئے کیا تھا۔

۳ - جرمنی کے لئے ایک ایسی پالیسی کا فروغ جو اصل مسئلہ یعنی اس بات پر اپنی توجہ مرکوز کرکے

سُرخ فوج کو کسی طرح اس کی اپنی سرحدوں کے اندر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۴۔ ایک ایسے یورپی اتحاد کی ہمت افزائی جو NATO کے تحت ٹھوس اقتصادی اور سیاسی بنیادوں کی تخلیق کر سکے اور مشرقی یورپ کی حاشیہ نشین قوموں کو مغرب کی طرف راغب کر سکے۔

۵۔ ایک نوآبادیاتی پالیسی جو ایشیا اور افریقہ کے انسانوں کی اکثریت کا یہ اعتماد حاصل کر سکے کہ ہم بلاشبہ آزادی کے حامی ہیں، اور جو باقی نوآباد قوموں کے لئے ذمہ دارانہ اور تدریجی عمل کی ہمت افزائی کرے۔

۶۔ مشرق وسطیٰ کے بارے میں ایک ایسی پالیسی جو اس کے بنیادی مقاصد یعنی ملکی تعمیری قوتوں کی حوصلہ افزائی اور اس علاقے میں سوویٹ اثر ورسوخ کی روک تھام کے لئے موزوں ہو۔

۷۔ مشرق بعید کے معاملات کو حقیقت پسندانہ طریقے پر طے کرنے کی ایسی کوشش جو کمیونسٹ چین کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے امکان کے ساتھ ساتھ ہند چینی کی آزادی — کم از کم سترھویں خط متوازی سے نیچے کے حصے میں، فارموسا کے تحفظ اور آزادی اور جاپان کی قابل رشک معاشی حالت کی ضمانت دیتی ہو۔

۸۔ ایشیا میں جاپان اور ہندوستان کی کلیدی فوجی اہمیت کا احساس غیر کمیونسٹ ایشیا کے مستقبل کا یقین اس امر سے ہی ہوگا کہ آئندہ دس سالوں میں ہندوستان کیا کچھ کرتا ہے یا کیا کچھ کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ جاپان کس حد تک ترقی کرتا ہے۔ ہمیں ہندوستان کی غیر جانب داری کے بارے میں اپنی کدورت کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اور ایک مثبت، سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ راہ عمل اختیار کرنی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں پہلے دو نکات کلیدی ہیں۔ ہمیں اپنی فوجی طاقت کو برقرار رکھنا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دور رس اقتصادی اور سیاسی محاذوں پر کمیونسٹ جارحیت کا انسداد بھی کرنا چاہیئے۔

بعض لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ امریکی قوم اس نئے معاشی، سیاسی اور نظریاتی مسابقت کے چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے سالانہ اخراجات خواہ کسی قدر بھی ہوں بارہ ارب ڈالر کی اس رقم کے ایک معمولی جزو سے زیادہ نہیں ہو سکتے جس کا ہم نے صرف ایک سال یعنی ۱۹۵۵ء میں اپنی قومی آمدنی میں اضافہ کیا ہے۔

کمیونسٹوں کو جنوبی کوریا سے باہر نکالنے کی قیمت امریکہ اور اس کے حلیفوں نے ہزار ہا جانیں اور پچاس ارب ڈالر سے زیادہ کے ساز و سامان کی صورت میں ادا کی ہے۔ اگر ہم نے اب ٹھوکر کھائی تو یورپ، مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور افریقہ سے کمیونسٹوں کو باہر رکھنے کی قیمت اس سے کہیں

زیادہ ادا کرنی ہوگی۔ ہماری جوابی کارروائی نئے روسی چیلنج کے حسب حال ہی ہونی چاہیئے۔
مستقبل کے مورخ کو یہ کہنے کا موقع نہ دیجئے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد بیس سال کے اندر ہی ریاست ہائے متحدہ کی رہنمائی میں پوری دنیا کی آزادی ایک متوازن بجٹ کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی۔

۴۱ - اس مقابلہ میں ہم نہیں ہار سکتے

۱۹۵۷ء میں مسٹر باؤلز نے سوویٹ یونین کا دورہ کیا تو وہ اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ روسی نوجوان امریکہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ امریکی روسی تہذیبی لین دین میں تخفیف کرنے کی اس وقت کی پالیسی کے خلاف یہ احتجاج اس کا ایک نتیجہ ہے۔

(۲۴، اگست ۱۹۵۷ء کے سیٹرڈے ریویو سے ماخوذ)

سوویٹ روس کے حالیہ دورے میں میں نے سوویٹ نوجوانوں میں اضطراب اور بے چینی کے کافی آثار دیکھے۔ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اس نظام کے خلاف بغاوت کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بات ضرور تھی کہ وہ حکومت کی سخت گیری میں تخفیف چاہتے تھے۔ قدیم نظریات پر شک کیا جا رہا تھا۔ ہر جگہ متجسس اور ہمدرد نوجوانوں نے گرمجوشی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور ہم سے بہت سے سوالات کیے۔

ایک انتہائی پریشان کن سوال جو مجھ سے پوچھا گیا یہ تھا کہ اسٹالن کے بعد کمیونسٹ ممالک نے فراخ دلی کی جو پالیسی اختیار کی ہے، آیا ہم اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہے ہیں یا نہیں۔ زیادہ وضاحت کے ساتھ اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ آیا ہم تبدیلی اور تغیر کے اس عمل کی ہمت افزائی کر رہے ہیں یا نہیں جو پوری کمیونسٹ دنیا میں رونما ہو رہا ہے۔

ماسکو میں چھٹے ورلڈ یوتھ فیسٹیول کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور میں نے روس میں اسکا کافی چرچا سنا تھا۔ اس میلے میں دنیا بھر کے ہزاروں نوجوانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ مارچ میں وطن آنے کے بعد میں نے سنا کہ نوجوانوں کے بہت سے گروپ خصوصاً ذہین قسم کے نوجوان طلبا کے گروپ امریکہ کے جمہوری نظریات کو پیش کرنے کے موقعہ کا احساس کر کے اس سال کے میلے میں شریک ہونا چاہتے ہیں، افسوس ہے کہ سرکاری طور پر ان کے اس ارادے کی ہمت شکنی کی گئی۔

اس مقصد کے لئے کوشش کرنے والوں کو جواب میں جو خطوط بھیجے گئے ان میں ہماری حکومت کے نقطۂ نظر کی اس طرح وضاحت کی گئی تھی :- " آپ کی حکومت آپ کو پاسپورٹ دینے سے انکار نہیں کرے گی، لیکن اس میلے کا اہتمام سوویٹ حکومت نے اپنے سیاسی مقاصد کے پیش نظر کیا ہے - لہٰذا جو امریکی اس میں شرکت کریں گے وہ گویا کمیونسٹ مفاد کو تقویت پہنچائیں گے "

نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی وفد کی تعداد گھٹ کر سو سے بھی کم رہ گئی - ان میں سے بعض جمہوریت کے ایسے لائق نمائندے تھے، جو کسی بھی بحث مباحثہ میں اپنی بات کو اونچا رکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں - لیکن جو لوگ ہنوز جانے کا ارادہ کر رہے ہیں ان میں اکثر سیاسی اعتبار سے بالکل سادہ لوح اور محض ہم سفر تھے - چند ایک کو چھوڑ کر باقی جو مرد اور عورتیں امریکہ کے جمہوری نظریات کو نہایت موزوں طریقے پر پیش کر سکتے تھے - وہ حکومت کی ناراضگی کے ڈر سے اس میلے میں شرکت کرنے سے باز رہے -

میلے کی ابتدائی اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ہماری بزدلی کے باعث، انفرادی رابطے پیدا کرنے کا، جس میں امریکی نوجوانوں کو کمال حاصل ہے، ایک نادر موقع ہاتھ سے جاتا رہا - ۱۰۲ ممالک سے آئے ہوئے مردوں اور عورتوں کی مجموعی تعداد تقریباً . . . . ۲۲ (دو لاکھ بیس ہزار) تھی - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آزادی کے مفہوم سے واقف اچھے بولنے والے امریکی نوجوانوں کے لئے فضا کافی سازگار ہو گئی تھی -

لائف میگزین کے حالیہ شمارے کی اطلاع ہے کہ " میلے میں جس آزادانہ میل جول کی اجازت دی گئی تھی اس نے فراموش کردہ آزادی کا مزہ یاد دلا کر روسیوں کو اچنبھے میں ڈال دیا " سماجی رابطوں کی سہولت اور سیاسی تبادلۂ خیال کی آزادی کو دیکھ کر نامہ نگار فلورا لیوس کو یاد آیا کہ " گذشتہ ۱۹۵۵ء کے وارسا کے میلے کے بعد کمیونسٹ دنیا میں بے چینی کی دبی دبی چنگاریاں بھڑکنے لگی تھیں " ماسکو میں ایک پولستانی نے اس سے کہا تھا " مجھے تشک ہے خروشچیف اس بات کو سمجھتے ہیں کہ وہ کیا خطرہ مول لے رہے ہیں "

بہر حال یہ صرف پہلا ہی موقع نہیں ہے جب ہم ایسے شخصی رابطوں سے جہاں ایک آزاد اقوام کی بہترین نمائندگی ہو سکتی تھی، جان بوجھ کر علیحدہ رہے ہوں - جب میں ماسکو میں تھا تو وہاں ہاکی کا ایک بین الاقوامی مقابلہ ہونے والا تھا - اس میں ایک امریکی ٹیم کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن اس نے عین وقت پر آنے سے انکار کر دیا - ماسکو یونی ورسٹی کے روسی طلبا نے مجھ سے دریافت کیا —— " آپ کی ٹیم نے نہ آنے کا فیصلہ کیوں کیا ؟ کیا اس وجہ سے کہ ہم نے آپ کو اولمپک کھیلوں میں شکست دے دی تھی ؟ "

میں نے حتی الامکان ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور ان سے بار بار وہی کہا جو اس واقعہ

کی سرکاری توجیہہ کے طور پر مجھے بتایا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ہنگری کی شورش کے بعد ہم احتجاجاً سوویٹ یونین سے ثقافتی رابطے ختم کر رہے ہیں ۔

روسیوں نے سوال کیا "کس چیز کے لئے احتجاج کے طور پر؟" اس سے مجھے کم از اس بات کا موقعہ مل گیا کہ ہنگری کے انقلاب کے ان حقائق کو پیش کر سکوں جو ابھی تک ان کو معلوم نہیں تھے۔ لیکن آہنی پردے سے باہر کے ایسے احتجاجات اگر اور کچھ نہیں تو لاحاصل ضرور رہیں۔

کوئی احتجاج اسی حالت میں موثر ثابت ہو سکتا ہے جب کہ وہ شخص جس کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہے' اس سے واقف ہو۔ اور روسیوں کے لئے امریکی تصورات سے واقف ہونے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ امریکی لوگوں سے ملیں اور ان سے گفتگو کریں' اور یہ اسی ثقافتی رابطے کے ذریعہ ممکن ہے جس پر ہم اپنی بزدلی کی وجہ سے پابندیاں عائد کر رہے ہیں ۔

ہر ذی شعور مبصر اس بات سے متفق ہے کہ سوویٹ نوجوانوں میں بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ لہٰذا ہم اس بیداری میں اعانت کرنے کے کسی بھی معقول موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیں ؟ یقیناً ہماری حکومت کسی چیز سے خائف ہے ؟

خروشچیف کے حالیہ بیانات سے اس بات کی کوئی امید نہیں ہوتی کہ سوویٹ حکومت مستقبل قریب میں سیاسی حالات میں کوئی نرم رویہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آہنی پردہ تھوڑا تھوڑا اوپر اٹھ رہا ہے ۔

ماسکو یونیورسٹی میں مجھے طالب علموں کا اخبار دکھایا گیا۔ اس میں حال ہی میں انڈیانا یونی ورسٹی کے طلباء کا ایک خط شائع ہوا تھا جس میں اطلاعات اور طلباء کے تبادلہ کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ روسی اس تجویز سے بے حد خوش ہوئے ۔

یونی ورسٹی کے ریڈیو اسٹیشنز پر اکثر امریکی جاز کی دُھنیں بجائی جاتی ہیں۔ جب ہم نشرگاہ میں پہنچے تو واقعتاً لوئی آرمس اسٹرانگ کے بول Love on Love , Ocareless Love نشر کئے جا رہے تھے۔ جب طلباء کو یہ معلوم ہوا کہ ہمارے پاس نیویارک ٹائمز کے یورپی ایڈیشنوں کی کاپیاں ہیں تو انھوں نے انھیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔

میں جہاں بھی گیا مجھ پر خود میرے تین بچوں کے بارے میں سوالات کی بوچھار کر دی گئی ۔ "وہ کیا پڑھ رہے ہیں ؟ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر کیا کریں گے ؟" اور بار بار یہ کہ "کیا دنیا میں امن و امان قائم رہے گا ؟" اس کے باوجود ہم ذاتی رابطوں سے کترا رہے ہیں۔ حالاں کہ ہر ہمارے کے روسیوں کے ساتھ ہمیں ان سے بڑی تقویت ملے گی ۔

چند ماہ ہوئے مجھے بتا گیا تھا کہ روسی امریکہ کے نجی سرمایہ کار شہریوں کے ایک گروپ کو اس بات کی اجازت دینے پر رضا مند ہو گئے ہیں کہ وہ ماسکو میں ایک زراعتی میلہ لگا لیں۔ ہمیں مناسب زمین کے انتخاب کا موقع دیا گیا تھا۔ ہم اپنی مرضی کے مطابق نمائش کی کوئی بھی چیز پیش کر سکتے تھے اور خود کفیل ہونے کے لئے کافی فیس وصول کر سکتے تھے لیکن ہمارے بزدل حکام نے پہلے تو اس تجویز کو نجی ہاتھوں سے اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اسے خاموشی کے ساتھ ختم کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ ہم لوگ کس چیز سے خائف ہیں؟ کمیونسٹ نظریات اور ہمارے نظریات کے کھلم کھلا اور رو برو مقابلے میں ہمیں کیسے شکست ہو سکتی ہے؟ ہمیں اس بات کا یقیناً خدشہ نہیں کہ امریکی عوام جو آزادی کی روایات میں پلے بڑھے ہیں، روس کے ان لوگوں سے کیسے متاثر ہو جائیں گے جنھیں صرف اپنے جامد اور مشتبہ نظریات ہی کا علم ہے۔

روس کے سخت گیر نظام کو دیکھتے ہوئے اور ان بلند بانگ اور بے روح نظریاتی فقروں کو سنتے ہوئے، جو سوویٹ نوجوانوں کی موجودہ نسل کے لئے انتہائی غیر دلچسپ ہو چکے ہیں۔ میری رائے اس کے برعکس ہے۔

کیوں نہ کریملن سے کہا جائے کہ وہ اپنے پانچ سو چیدہ اور قابلِ اعتماد طلباء کو امریکہ بھیجے اور ہم اپنے پانچ سو فہمیدہ طلباء کو سوویٹ یونین بھیجیں۔ اگر ایسا ہو تو اس کے نتیجہ میں کمیونسٹ نظریات کو زبردست صدمہ پہنچے گا۔

روسی طلبا جب امریکہ سے لوٹ کر جائیں گے تو اپنی حکومت کے گمراہ کن پروپیگنڈے اور آزاد اداروں کی متحرک قوت کے نئے احترام سے بخوبی واقف ہو چکے ہوں گے۔ ادھر امریکی طلباء اپنے دلوں میں روسی لوگوں کے لئے انسانی ہمدردی اور ذاتی پسندیدگی کے جذبات لے کر آئیں گے۔ ساتھ ہی ان کو اس بات کا بھی علم ہو جائے گا کہ ایک مطلق العنان حکومت کے تحت زندگی کس قدر ناخوشگوار ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ ہماری کامرانیوں اور جمہوریت کے لامحدود امکانات کی زیادہ قدر کر سکیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ کریملن کی طرف سے ایسی کوئی تجویز منظور نہیں کی جائے گی۔ لیکن یہ تجویز پیش کر کے ہم دنیا کو کیوں نہ دکھا دیں کہ امریکی نوجوانوں کے پیش کردہ جمہوری تصورات کی قوت اور اثر انگیزی پر ہمیں کتنا اعتماد ہے۔

کریملن آج بھی وائس آف ماسکو کے ذریعہ ثقافتی رابطوں کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ کیا وقت نہیں آگیا ہے کہ ہم اس چیلنج کو قبول کریں۔

× × ×

۴۲ - سرزمینِ چین پر ایک غائر نظر

۱۹۵۹ء میں کمیون سسٹم کے تحت چین میں خوراک کی پیداوار کو بڑھانے کا دشوار معرکہ پریشان کن مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔ سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ مورخہ ۴ اپریل ۱۹۵۹ء میں شائع شدہ اس مقالے میں مسٹر باڈلز نے دیرینہ خطرات اور چین کے کروڑہا انسانوں کا پیٹ بھرنے کے لئے خوراک کی اس جدوجہد کی اہمیت اور اس میں مضمر طویل المدت خطرات پر غور کیا ہے۔

کیا کمیونسٹ معاشی نظام جس نے دو ہی نسلوں کی مدت میں روس کو جدید صنعتی ریاست بنا ڈالا، ایشیا میں کامیاب ہو سکتی ہے؟ یا یہاں کے بالکل مختلف حالات ایشیائی کمیونزم کو ناکامی کے غار میں دھکیل دیں گے؟

اس سوال پر امریکہ کی دونوں جماعتوں کو مدبرین کی فوری اور پُر مغز توجہ کی ضرورت ہے۔ کل کو دنیا کے حالات کیا ہوں گے، اس کا انحصار زیادہ تر انھیں کے جواب پر ہو گا۔

کمیونسٹ چین کو آج ایسے بہت سے خوفناک مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کی بدولت ان کے سیاسی اور معاشی نظریات کی سخت ترین حالات میں آزمائش ہو رہی ہے۔

اگر پیکن سرکار روس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تیزی کے ساتھ صنعتی انقلاب کی کوشش پر کاربند رہے تو یہ چین کی دیہی معاشیات پر ناقابل تصور بار ڈال دے گی، جسے ایک طرف ۶۵ کروڑ لوگوں کے لئے خوراک مہیا کرنا ہے اور دوسری طرف بعض انتہائی ضروری درآمدی اشیا کی ادائیگی کے لئے وافر زراعتی پیداوار بھی مہیا کرنی ہے۔

اگر پیکن سرکار کاشتکاروں کو خوش کر کے خوراک کی پیداوار کے اضافے کی ہمت افزائی کرتی ہے تو اسے لازمی طور پر کمیونسٹ مقاصد کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ یہی مختصراً وہ دشواری ہے جس کا آج چین حکومت کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

پوری قوم سے جبراً کام لینے کا وہ طریقہ جو روس میں اپنا لیا گیا تھا اور جس کے لئے انھیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی حالات کے مختلف ہونے کی وجہ سے چین میں ناکام ہو سکتا ہے۔

روس اور چین کے اہم ترین اختلافات زمین، غذا اور عوام سے متعلق ہیں۔

سوویٹ یونین دو براعظموں کے تقریباً دس ہزار میل علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ امریکہ کے مغربی علاقے کی طرح، یورال کے اس پار کے وسیع اور سیر حاصل رقبے گزشتہ دو سو سال ہی میں زیر تصرف آئے ہیں اور انہیں ابھی تک پورے طور پر کام میں نہیں لایا گیا ہے۔

کمیونسٹوں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے روس کے عوام بھوک سے واقف نہیں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ شروع ہونے سے قبل زار کے روس سے ایک کروڑ ٹن گیہوں ہر سال برآمد کیا جاتا تھا۔

اتنے وسیع اور داخلی طور پر اس قدر مستحکم زراعتی معاشرے میں بھی روسی تجربے نے ۱۹۳۰-۴۰ء میں خوراک کی کمی کے باعث تقریباً دم توڑ دیا تھا۔ اسٹالن نے دیکھا کہ سوویٹ یونین کی تیز رفتار صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہوگا کہ بڑھتی ہوئی صنعتی آبادی کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے خوراک کی ایک بڑی مقدار شہری علاقے کی طرف منتقل کر دی جائے۔

لینن نے زمین کی نجی ملکیت اور ہر کسان خاندان کے لئے ترقی کے بہتر مواقع کا وعدہ کیا تھا۔ اسٹالن نے ان سب کو نہایت جرأت کے ساتھ ختم کر کے تمام دیہاتی روس کو حکومت کے اشارے پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا۔

بیس سال سے زیادہ عرصہ تک روسی کاشتکاروں کو پیداوار بڑھانے کے لئے پریشان اور دہشت زدہ کیا جاتا رہا۔ کھیتوں پر زراعتی پیداوار کی کم سے کم قیمت مقرر کر کے اور سرکاری پرچون کی دکانوں میں ان کی بھاری قیمتیں وصول کر کے کاشتکاروں سے بے پناہ نفع وصول کیا گیا جس سے صنعت کی تیز رفتار ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ سرمایہ فراہم ہوا۔

دیہی ترقی پر بہت کم صرف کیا گیا۔ کھیت کی اشیاء تقریباً مفقود تھیں۔ سوویٹ یونین نے ایک عرصہ تک اپنے پس انداز کردہ خوراک کے اس ذخیرے پر گزارہ کیا جو کمیونزم کی نہیں بلکہ قدرت کی دین تھا۔

بہرکیف طویل المدت نتیجہ کے طور پر اس خطرناک قمار بازی کا حساب بے باق ہوا۔ عوام کو اگرچہ سخت مصائب اور مشکلات کا سامنا پڑا لیکن اسٹالن کے عزم اور روسی اراضی کے لامحدود وسائل کی بدولت سوویٹ حکومت دو نسلوں سے بھی کم عرصے میں ایک طاقتور صنعتی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

چینی حکومت نے چین کی ترقی کے لئے اسٹالن کے اس پروگرام کو نمونہ بنایا۔ ایسا کرنے کے لئے چینی حکومت اپنے انتہائی دشوار حالات میں، تاریخ کی سب سے زیادہ جرأت مندانہ اقتصادی اور سیاسی بازی لگا بیٹھی۔

لینن کی طرح ماؤ نے بھی اپنے انقلاب کی بنیاد اس انتہائی ڈرامائی وعدے پر رکھی، جو کاشتکار طبقے سے کیا جا سکتا ہے۔ "زمینداروں کو ختم کرو۔ زمین کاشتکار کی ہے۔" لیکن جب وقت آیا تو لینن کی طرح ماؤ نے بھی اس وعدے سے انحراف کرنے میں تامل نہ کیا۔ اور چینی کسانوں کو ایک ایسے اقتصادی اور سیاسی نظام میں جکڑ دیا جس میں زمین کی نجی ملکیت کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔

۱۹۵۸ء تک عملی طور پر تمام چینی دیہی خاندان ..... ۴۷ اجتماعی گروہوں میں منظم ہو چکے تھے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ۱۹۵۸ء میں ماؤ نے ایک اور دلیرانہ اقدام کیا۔ اس کے بعد سے تمام زراعتی اجتماعی گروہ، دیہی صنعت اور مقامی رضاکار فوج کمیونوں میں ختم کر دی گئی۔ یہ ایک ایسا حیران کن، انتہا پسندانہ اور سنگ دلانہ اقدام تھا کہ اسٹالن کو بھی اس کے آزمانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

باوجود اس کے کہ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ پیکن حکومت کو دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، یہ قیاس کرنا محض خوش فہمی ہو گی کہ وہاں کوئی بڑی تبدیلی عمل میں آ رہی ہے۔ البتہ کمیون پروگرام کے مقاصد کی نئے سرے سے وضاحت کی جا رہی ہے۔

کمیونسٹ چین کے رہنما جانتے ہیں کہ ان کی کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ زیادہ تر دیہاتوں میں ہی ہو گا۔ اگرچہ ان کو عظیم دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، تاہم ان کی طرف سے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ کم از کم اس معاملہ میں وہ روسی رہنماؤں سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔

روسی انقلاب پارٹی کے صرف دو لاکھ ارکین کی مدد سے ظہور میں آیا تھا۔ ان میں سے بیشتر ایسے دانشور کارکن تھے جن کا تعلق شہروں سے تھا۔ لینن نے "تمام زمین کاشت کار کے لئے" ہونے کا اعلان ایک ایسے وقت پر کیا تھا جب ماسکو اور سینٹ پیٹرزبرگ کی انقلابی شورشیں اپنی انتہا پر تھیں۔

اس طرح اسے روسی کسانوں کا تعاون حاصل ہو گیا لیکن ان کسانوں کو کبھی یہ احساس نہیں دلایا گیا کہ وہ خود بھی اس تحریک کے رکن ہیں۔

دوسری طرف چینی انقلاب کی جڑیں دیہاتوں میں تھیں۔ پارٹی کے پچاس لاکھ ممبران جو دیہاتوں میں سرخ فوج کی کامیابی کا پیش خیمہ بنے تھے اب بڑھ کر تیرہ لاکھ ہو گئے ہیں اور ان میں سے اکثر کسان طبقہ سے ہیں۔ دیہات میں تشکیل پانے والی کمیونسٹ قیادت کے تحت چین کے دس لاکھ دیہات میں سے بہت سے اس نو پذیر نظم و ضبط کو بیس سال دیکھ چکے ہیں۔

چینی رہنماؤں کو یقین ہے کہ اپنے ان طور طریقوں کی مدد سے وہ اس انقلابی جوش وخروش کو باقی رکھ سکیں گے، جس کی بدولت چین ارتقا کے اس پرُخطر دور سے گزر کر تیز رفتار صنعتی ترقی کے لئے سرمایہ فراہم کرے گا۔

غیر یقینی لیکن انتہا درجہ کے ذاتی تحفظ کے احساس کی جگہ جو گھرے خاندانی تعلقات اور مذہبی تصورات میں مضمر تھا، انھوں نے ایک ایسا نظام قائم کیا ہے جس کے ماتحت عوام کو مرکزی حکومت کی بلا چون وچرا اطاعت کرنے کے عوض روکھے پھیکے انداز میں روزمرّہ خوراک مہیا کر دی جاتی ہے۔

صارفین کے زیادہ سامان کے روایتی اقتصادی محرک کے بجائے انھوں نے میلوں ٹھیلوں، پیتل کے بڑے بڑے گرجتے ہوئے گھڑیالوں، پٹاخوں، رقص، پریڈ اور "عوام کے دشمنوں" کی عام مذمّت کو رواج دیا ہے۔

لاکھوں سرکاری لاؤڈ اسپیکر مسلسل ہونے والی اسٹیڈی میٹنگوں کے ساتھ مل کر لوگوں کو اور زیادہ محنت کے لئے اُکساتے رہتے ہیں۔ اکثر اس مقصد کے لئے خارجی تنازعات کے شعلوں کو بھی ہوا دی جاتی ہے۔ اس عمل میں ریاست ہائے متحدہ کو خاص طور پر دشنام کا نشانہ بنایا جاتا ہے، جس کی نظیر آج کے اس دور میں بھی نہیں مل سکتی کہ جب بین الاقوامی طور پر ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنا عام ہوگیا ہے۔

لیکن تقریباً تمام انسانی قوت کو کام میں لانے اور موسم کے نہایت موزوں اور مناسب ہونے کے باوجود دوسری حکّموں کی طرح چین کی غذائی پیداوار کو بھی بعض تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا رہا ہے، جن سے کمیونسٹ نعروں کے ذریعہ فرار ممکن نہیں ہے۔ چین کی اس کوشش میں سب سے بڑی رکاوٹ وہاں کی کثیر آبادی ہے۔ جس میں ۱۶ ملین نفوس سالانہ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے چین کا رقبہ وسیع سہی لیکن بہرحال محدود ہے۔

موجودہ اوسط کے مطابق چین کے ہر دیہی خاندان کے لئے دو ایکڑ سے بھی کم زمین موجود ہے، بعض مغربی علاقوں کو چھوڑ کر، چین کی کل قابلِ کاشت زمین میں بھرپور کاشت کی جارہی ہے مغربی علاقے میں مزید رقبہ بھاری مصارف ادا کرنے کے بعد ہی زیرِ کاشت لایا جاسکتا ہے۔

یہ بات کہ لوگ زیادہ تر چاول، گیہوں اور ترکاریوں پر گزر کر رہے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اسٹالین کی طرح مویشیوں کی خوراک کو کم کر کے بہت کم غلّہ ہی پس انداز کیا جاسکتا ہے مزید برآں یہ کہ فی ایکڑ پیداوار پہلے ہی بہت زیادہ ہو چکی ہے، چین کے کمیونزم کی گود میں جانے سے پہلے وہاں کاشتکار دیگر نیم ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں بہتر بیجوں اور بوائی اور کٹائی کے بہتر طریقوں کا استعمال کرتے تھے۔

اگرچہ جاپان کی فی ایکڑ پیداوار تقریباً دوگنی ہے۔ لیکن مستقبل قریب میں یہ معیار چین کی دسترس سے باہر معلوم ہوتا ہے۔

تیزی کے ساتھ ترقی کرتی ہوئی صنعتوں کے بارے میں پیکن کے فخریہ دعووں کے ساتھ ساتھ چین کی دیہی معاشیات کے یہ تلخ سماجی اور اقتصادی حقائق بھی قابل غور ہیں۔

۴۳ - مسئلہ چین پر ایک نظر

چین کے مسئلے اور فارموسا اور سرزمین چین سے متعلق امریکی پالیسی کے اس مفصل تجرباتی مقالے میں مسٹر باؤلز نے ریاستہائے متحدہ کی حیثیت کو مضبوط اور مؤثر بنانے کے لئے بعض مفید مشورے دیئے ہیں۔ یہ مقالہ فارن افیرس کے اپریل کے شمارے میں شائع ہوا تھا، ان نظریات کی ماؤ سی تنگ نے پیکنگ میں اور قوم پرستوں نے ٹائیوان میں شدید مذمت کی تھی۔

کیا ابھی "چینی مسئلہ" کے بنیادی حقائق کے ساتھ دو بدو ہونے کا وقت نہیں آیا ہے؟ جب تک کہ ہم ایسا نہیں کریں گے یہ مسئلہ پورے ایشیا کے ساتھ ہمارے تعلقات میں ایک رکاوٹ پیدا کرتا رہے گا۔

موجودہ حالات میں امریکہ کی طرف سے کمیونسٹ چین کو تسلیم کئے جانے کی بحث کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اگر ہم سفیروں کے باہمی تبادلے کی تجویز پیش کریں تو ماؤ سی تنگ یقیناً یہ سوال کریں گے کہ آیا ہم "صوبہ فارموسا" پر بھی کمیونسٹ اقتدار تسلیم کرتے ہیں؟ اگر ہمارا جواب نفی میں ہوا تو وہ یقیناً ہماری تجویز کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیں گے۔ اگر ہم یہ تجویز پیش کریں کہ اقوام متحدہ میں "دونوں چینیوں" کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کا نتیجہ یہی ہوگا۔ ادھر چیانگ کائی شیک بھی اس قسم کی تجویز کو رد کر دیں گے اور مسئلہ جوں کا توں باقی رہے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دو بنیادی سوال جن کی وجہ سے امریکہ میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ فی الحال حل نہیں ہو سکتے۔ بعد میں کسی وقت چینی کمیونسٹوں کے پُرامن ارادوں کی اس طرح آزمائش کی جا سکتی ہے کہ ہم یہ تجویز پیش کریں کہ طرفین کسی ایسی صورت حال پر رضامند ہو جائیں، جسے کوئی بھی فریق جنگ کے بغیر تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس وقت تک کے لئے ہمیں رسمی تعلقات کے

سوال سے دور رہتے ہوئے اپنی توجہ فوری اور شاید قابلِ حصول تعلقات پر مرکوز کردینی چاہیئے۔
اگر کمیونسٹ چین کے ساتھ مفاہمت کی نئی راہیں تلاش کرنے کی اور کوئی وجہ نہ بھی ہوتی تو ترک اسلحہ کا نازک مسئلہ ہی اس کے لئے بہت کافی تھا۔ کیونکہ اس بات میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں کہ ترک اسلحہ کا کوئی بھی منصوبہ چینی شرکت کے بغیر بے معنی ہوگا۔ اسکے پاس صرف دنیا کی عظیم ترین فوج ہی نہیں، بلکہ وہ ایٹمی اسلحہ کی تیاری کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ نہ ہی یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں سوویٹ یونین کو پیکن کے لئے ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ یا تو ہمیں اس خیال کو ترک کردینا چاہیئے کہ عالمی ترک اسلحہ کے کسی محفوظ طریقہ پر اتفاق رائے ہوجائے گا۔ پھر چین میں ہونے والے تعلقات پر اثر انداز ہونے کے لئے راہیں تلاش کرنی چاہئیں۔
ہم خواہ کمیونسٹ چین کے روزمرہ کے واقعات پر ذرا بھی اثر نہ ڈال سکیں، لیکن چینی مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں کو متاثر کرنے کی ہم اپنے اندازے سے کہیں زیادہ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔
فارموسا (تائیوان)، اس کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ یہ جزیرہ کافی متمول ہے اور اس کی اقتصادی ترقی قابلِ دید ہے۔ لیکن اس کی سیاسی حیثیت بڑی غیر مستحکم ہے، صرف کیمونسٹ چین سے تعلقات کے پیشِ نظر ہی نہیں، بلکہ جاپان سے لے کر ہندوستان تک آزاد ایشیا کے نیم دائرے کے ساتھ تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ فارموسا کی سیاسی حیثیت کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ چیانگ کائی شیک جسے گیارہ سال بیشتر چین کی سرزمین سے نکال دیا گیا تھا، ابھی تک ۶۵ کروڑ چینیوں کا حکمراں ہے۔ اس مفروضہ کو بہت سے ایشیائی ممالک، نالوں میں ہمارے حلیف، ہمارا قریب ترین دوست کناڈا، اور خود امریکیوں کی ایک بڑی تعداد تسلیم نہیں کرتی، لیکن واشنگٹن کے شدید دباؤ کے تحت تین یا چار ایشیائی ممالک، ہمارا اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور کانگریس کے بعض ممبران اس خیال کے حامی ہیں، اگر اس مفروضے کو باقی رکھا گیا تو یہ ایک ایسے وقت میں فارموسا کو باقی دنیا سے الگ تھلگ کردے گا جب کہ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے رہنما غیر کمیونسٹ اور آزاد ایشیا کے فکر و عمل کے دھارے میں اپنے مستقبل کے یقین کی ہر امکانی کوشش کرتے۔
امریکیوں اور چینی قوم پرستوں کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے حلیفوں اور دوستوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی راہیں تلاش کریں، اور اپنی پالیسیوں کو ان قوتوں کے ساتھ زیادہ معقول طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں جو آئندہ دس پندرہ سال میں ایشیا کے حالات کا رخ متعین کریں گی۔
میرا خیال ہے کہ ذیل کے مفروضات کو ایسی پالیسیوں کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے:
۱۔ پیکن حکومت اپنی مشکلات کے باوجود چین کی سرزمین پر پوری طرح قابض رہے۔

۲۔ بنیادی وسائل کی کمی، بڑھتی ہوئی آبادی، سخت گیر کمیونسٹ قیادت اور انتہائی قوم پرستانہ جذبات کی موجودگی میں سرزمین چین کے جنوب کی کمزور ریاستوں۔۔۔۔۔ کی طرف توسیع پسند رجحانات پیدا کرنے کا شدید امکان ہے۔

۳۔ امریکی پالیسی کا بنیادی مقصد جنوب مشرقی ایشیا میں اس مسلح توسیع پسندی کی روک تھام ہونا چاہیے جو کمیونسٹ رہنما اختیار کرنے پر مائل ہو سکتے ہیں۔

۴۔ ترک اسلحہ کے کسی پروگرام کی کامیابی کے لئے چینی شرکت لازمی ہوگی۔

۵۔ موجودہ حالات میں پیکن حکومت کے ساتھ ہمارے بڑے بڑے اختلافات کے سلسلے میں کوئی بات چیت نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔

۶۔ فارموسا کے ۸۰ لاکھ باشندے اور فارموسا میں آباد ۲۰ لاکھ چینی باشندے اس بات کا استحقاق رکھتے ہیں کہ وہ کمیونسٹ حلقہ سے باہر رہتے ہوئے اپنے محفوظ اور آزادانہ وجود اور ثقافتی ارتقا کو جاری رکھ سکیں گے۔ اور یہ کہ فارموسا کی اس طور پر نشوونما امریکی قوم کے مفاد میں ہے۔

۷۔ فی الحال فارموسا کی آزادی امریکہ کے فوجی تحفظات اور اقتصادی امداد کے بل بوتے پر ہی قائم رہ سکتی ہے۔

۸۔ فارموسا کے لوگوں کے تحفظ اور خوش حالی کا دارومدار بالآخر ایشیا کے غیر کمیونسٹ ممالک خصوصاً ہندوستان اور جاپان کی باضابطہ سیاسی نشوونما اور فارموسا کی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات پر ہوگا۔

۹۔ اگر کسی وقت یہ بات ممکن ہو سکے تو چین کی سرزمین کے لوگوں کے ساتھ ہمارے روایتی دوستانہ تعلقات کی تجدید خود ہمارے قومی مفاد میں ہوگی۔

اب ان مفروضات کی روشنی میں ہمیں ان حقائق کا جائزہ لینا چاہیے جن سے امریکی پالیسی کو دوچار ہونا ہے۔

× × ×

فارموسا کا سیاسی اقتدار آج کلیتاً جنرل اسمو کی مطلق العنان قوم پرست حکومت کے ہاتھوں میں ہے۔ مرکزی حکومت کا بیشتر عملہ اور اس کی ۶ لاکھ فوج کا دو تہائی حصہ سرزمین چین کے ان بیس لاکھ باشندوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۴۹ء میں چیانگ کائی شیک کے ساتھ آبنائے فارموسا کو پار کر کے آئے تھے۔ گزشتہ دس سال کے اندر قوم پرست چینیوں کی یہ برسر اقتدار اقلیت فارموسا سے متعلق امریکی پالیسی

کی توجہ کا مرکز رہی ہے جب کہ اس جزیرے کی قسمت کا فیصلہ فارموسا کے ان ہی ۸۰ لاکھ باشندوں کو کرنا ہے۔ لیکن ہم ان کی خواہشات، ان کی توقعات اور خدشات کی طرف بہت کم کان دھرتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے حال ہی میں "فارن افیرس" میں لکھتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ نہ فارموسا کے کوئی آزاد اخبارات ہیں اور نہ ہی اس کی کوئی تسلیم شدہ سیاسی جماعتیں ہیں۔

۱۹۴۵ء سے قبل تقریباً دو نسلوں تک فارموسا کے لوگ صرف جاپان کی حکومت سے واقف تھے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر جنوب مشرقی چین کی ایک بولی فوکن بولتے تھے، لیکن ان کی تعلیم جاپانی اسکولوں میں ہوتی تھی۔ ان حالات میں جونکہ جزیرہ خوشحال ہوتا جارہا تھا، اس لئے وہ خود کو اصل ملک کی نسبت ٹوکیو سے زیادہ قریب محسوس کرتے تھے۔ لیکن پچھلے پندرہ سال میں قوم پرست حکومت نے اہم تبدیلیاں کی ہیں۔ وقت قربت اور تعلیم کی بدولت جزیرہ میں آباد چینیوں اور فارموسا کے باشندوں خصوصاً نوجوان طبقہ میں تدریجاً ایک اختلاط پیدا ہو رہا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک نئی قومیت اُبھر کر سامنے آسکتی ہے، جو تہذیب کے اعتبار سے چینی لیکن مزاج کے اعتبار سے فارموسائی ہوگی۔

۱۹۴۹ء سے کہ اب تک قوم پرست حکومت نے بعض ایسے تعمیری اقدامات کئے ہیں جو وہ اصل سرزمین پر نہیں کر سکتی تھی۔ ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے دیہاتیوں کی فیصلہ کن حیثیت کو تسلیم کیا ہے، جو ایشیا کی دوسری قوموں کی طرح، نہ صرف یہ کہ اکثریت میں ہی ہیں، بلکہ غذا کی بہم رسانی کا کام بھی انھیں کے قبضے میں ہے اور اسی لئے باضابطہ ترقی میں انھیں اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

چیانگ کی رہنمائی میں زمین کی نجی ملکیت کو دس ایکڑ فی کس تک محدود کرنے اور لگان میں بھی بہت کافی تخفیف کرنے کے ایک اصلاحی پروگرام کے ساتھ ساتھ ایک بااختیار دیہی توسیعی ادارے اور آسانی کے ساتھ قرض دینے اور کھاد کی ایک وسیع صنعت کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر چاول، اور کپاس کی فی ایکڑ پیداوار میں کافی اضافہ ہوا ہے، اور دہقانوں کو زیادہ پُرآرام اور خوش حال زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہے۔ فارموسا کا بلند معیار زندگی ایشیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ صرف جاپان اس سے بڑھا ہوا ہے۔

فارموسا کے اندرونی سیاسی حالات میں بہتری پیدا ہو رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے، کہ آج بھی جو لوگ قوم پرست حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں، وہ سب کے سب چینی ہی ہیں۔ اسمبلی کے ۱۵۷ ممبران میں صرف ۲۶ فارموسائی ہیں۔ لیکن اوسر فارموسائی باشندوں کی جمہوری معاملات میں شرکت کے معاملہ میں بھی کچھ ترقی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر صوبائی اسمبلیوں اور ضلع واری نظم ونسق میں آزادانہ انتخابات کی بدولت جزیرہ والوں کی کافی اکثریت

ہو گئی ہے۔ بہت سے شہروں کے میئر فارموسا کے ہی باشندے ہیں۔

تیس سال سے زیادہ کے عرصہ میں، فتح اور شکست کے دوران، جنرل اسمو نے تن تنہا کومنتانگ کا اتحاد قائم رکھا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ تو حکومت نہیں کرتے رہیں گے۔ فارموسا کے مستقبل کا دار و مدار اس حکومت کے استحکام پر ہوگا جو ان کے بعد وجود میں آئے گی۔

جب تک مشرقی ایشیا میں ریاستہائے متحدہ کی معقول پیمانے پر ہوائی اور بحری قوت، اور اس کے استعمال کا عزم موجود ہے اس وقت تک ماؤ سی تنگ فارموسا پر صرف ایک طریقے سے اپنا اقتدار قائم کر سکتے ہیں اور وہ ہے اندرونی بغاوت جس کے ذریعہ چیانگ کائی شیک یا اس کے جانشین کو معزول کر کے جزیرہ پر ایک ایسی نئی حکومت قائم کر دی جائے جو پیکن کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو۔

چینی سرزمین پر طاقتور استبدادی قوتیں، چینی معاشرے کی تشکیل نو میں مصروف ہیں، چینی تصورات کو نئے سانچے میں ڈھال رہی ہیں، اور لینن، اسٹالن، ماؤ نظریات کی روشنی میں چین کی تاریخ کو از سر نو ترتیب دے رہی ہیں۔

اس کے مقابلے میں ایک آزاد چینی فارموسائی قوم ایک ایسے جدید غیر کمیونسٹ چینی معاشرے کی مثال پیش کر سکتی ہے جو عام گروہ بندی سے آزاد ہو، جس میں سیاسی آزادی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا گیا ہو اور جس میں تمام شہریوں کو وسعت پذیر اقتصادی مواقع حاصل ہوں۔ ایسے معاشرے کی تشکیل کے لئے تائیوان اور چین کی موجودہ نسلوں کو مشترک مقصد کا احساس ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی وہ سمندر پار کے تیرہ لاکھ چینیوں کے لئے تہذیبی اساس بھی مہیا کر سکتی ہیں۔

× × ×

ہم اپنی پالیسی میں کیا تبدیلی کریں کہ اس عمل کو تقویت نصیب ہو سکے؟

ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیئے کہ خواہ کتنی ہی خیر خواہی کی جائے اور خواہ کتنے ہی ڈالر خرچ کر دیئے جائیں، غیر کمیونسٹ ایشیا میں فارموسا کا کوئی مثبت کردار امریکہ کے ارباب حل و عقد کی مرضی کے تابع نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی سرزمین چین سے آئے ہوئے قوم پرست پناہ گزیں فارموسا کی اکثریت پر اس کو تھوپ سکتے ہیں۔ ہمارا کردار ایک سچے دوست کا کردار ہونا چاہیئے۔ فارموسا کے اصل باشندوں، قوم پرست چینیوں اور عالمی رائے عامہ کو اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ ہمارا مقصد سرزمین چین پر حملے کے لئے کوئی فوجی اڈہ قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ ہمارا مقصد سرزمین

چین پر حملے کے لئے کوئی فوجی اڈہ قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ ہمارا مقصد ایک نئی آزاد قوم کی باضابطہ نشو و نما میں اس کی ہمت افزائی کرنا ہے۔

اپنی موجودہ حیثیت میں وہ صرف اس خام خیالی کو باقی رکھے ہوئے ہیں کہ سرزمین چین پر عنقریب قوم پرستوں کا حملہ ہونے والا ہے اور اس سے پیکن کو "جوابی" حملے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمیں ہمت افزائی اس بات کی کرنی چاہیئے کہ چینی ساحل سے قریب کے جزیرے جنگ کے خدشے سے محفوظ ہو جائیں۔

دوسری طرف ہمیں اس یقین دہانی کو استحکام اور وسعت بخشنے کے لئے کہ ہم فارموسا کے خلاف کسی بھی کمیونسٹ حملے کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کریں گے، اس میں داخلی بغاوت کو روکنے کے لئے ضروری اقدامات بھی شامل کر دینے چاہئیں۔ ایسی بغاوت کی صورت میں ہمیں پیکن حکومت کے باقاعدہ قبضہ کو روکنے کے لئے اقتصادی اور بحری ناکہ بندی کر دینی چاہیئے۔

فارموسا کو اقوام متحدہ میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے تسلیم کئے جانے میں ابھی کچھ وقت لگے گا، ایک بار ایسا ہو جائے تو اس کے تحفظ کی پشت پناہی کے لئے اقوام متحدہ کی مکمل ضمانت حاصل ہو جائے گی۔ اسی اثنا میں فارموسا کے دفاع کے لئے ہماری یک طرفہ فوجی ذمہ داری کی وضاحت ہو جانی چاہئے۔ جس طرح ہم مغربی برلن کے لوگوں کے ساتھ کوئی بے توجہی نہیں برت سکتے اسی طرح ہم فارموسا کے لوگوں کے ساتھ بھی بے توجہی نہیں برت سکتے۔

امریکی پالیسی اور مالی امداد کا ایک کام یہ بھی ہونا چاہیئے کہ فارموسا غیر ممالک میں آباد غیر کمیونسٹ چینیوں کے ایک تہذیبی مرکز کی حیثیت سے ترقی کرے۔ امریکہ کے سرکاری اور نجی سائل سے فارموسا کے کالجوں کی بھرپور امداد اس سلسلہ کا ایک اہم اقدام ہوگا۔ فارموسا میں تعلیم حاصل کرنے والے فارموسائی اور چینی باشندوں کے وظائف میں اضافہ ہونا چاہیئے۔

اسی طرح امریکہ کے ذہین اور لائق طلبا کو فارموسا کے تعلیمی اداروں میں چینی علوم کا مطالعہ کرنے کے لئے تعلیمی وظائف دینے سے تعلقات کی نئی بنیادیں استوار ہوں گی۔ چینیوں کے ساتھ ہمارے دیرینہ تعلقات کے باوجود امریکیوں کی ایک بڑی تعداد چینی تاریخ و تمدن سے بالکل ناواقف ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ قوم پرست حکومت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے کہ وہ ایشیا کے غیر کمیونسٹ ممالک کے ساتھ زیادہ حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کرے۔ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے فارموسا کا مستقبل آزاد ایشیا خصوصاً ایشیا کے دو عظیم جغرافیائی اور سیاسی ستونوں، جاپان اور ہندوستان — کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔

× × ×

اب سرزمین چین کے عقریب یعنی "دوسرے چین" کو لیجئے - یہاں ہمارے تعمیری عمل کا میدان کافی محدود ہے -

چین کی کمیونسٹ حکومت اپنی ۶۵ کروڑ آبادی کو ایسے وسائل کی مدد سے صنعتی بنانے کی عظیم جدوجہد میں مصروف ہے جو انتہائی ناکافی ہیں - اس تجربے کے تین نتیجے ہو سکتے ہیں -

شدید اقتصادی مشکلات کی وجہ سے چینی کمیونسٹ رفتہ رفتہ اپنی پالیسیوں میں ترمیم کرنے اپنے مقاصد میں تخفیف کرنے اور اپنی غذائی اور دیگر اشیاء کی قلت کو پرامن غیر ملکی تجارت کے ذریعہ پورا کرنے کے لئے مجبور ہو سکتے ہیں - لیکن ان کی تشدد آمیز گہری اور اصول پرست کمیونسٹ قوم پرستی کے پیش نظر مستقبل قریب میں اس صورت حال کے پیش آنے کا کوئی امکان معلوم نہیں ہوتا -

ایک دوسرا امکان یہ ہے کہ وہ اپنی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے ایک حصہ کو چینی سرحدوں سے متصل سوویٹ یونین کے وسیع میدانوں میں آباد کرنے کی کوشش کریں لیکن اندرون ایشیا کے ان شدید اور غیر یقینی آب وہوا والے علاقوں کو بڑے پیمانے پر ترقی دینا آسان نہیں ہے - اور ان شرائط کا تصور بھی مشکل ہے جن کی رو سے سوویٹ یونین اتنی بڑی تعداد میں چینیوں کے داخلے کو منظور کرے گی -

تیسرا امکان چین کی جنوب مشرقی ایشیا کی طرف توسیع کا ہے - جہاں کم آبادی، غذا سے بھرپور علاقے اور تیل، ٹن، ربر اور دوسرے معدنی ذخائر موجود ہیں، جن کی چین کو سخت ضرورت ہے - لہذا ہم کو ان علاقوں کی ایسی فوجی، سیاسی اور اقتصادی ناکہ بندی کر دینی چاہیے، جو ایسی تمام کوششوں کو زیر کر سکے -

اٹمی جنگ کی دھمکیوں سے صرف یہ ہوگا کہ ایشیا کی غیر کمیونسٹ قومیں خوف زدہ ہو جائیں گی - اس سے جارحیت پسند چینی قوم پرستی کو شہ ملے گی - تاہم یہ بات ضروری ہے کہ ہم نرم لہجہ میں سفارتی ذرائع کی مدد سے واضح کر دیں کہ ہم چینی حملے کے خلاف جنوب مشرقی ایشیا کے دفاع کے قطعی طور پر ذمہ دار ہیں، اور فارموسا پر حملہ کے برعکس جنوب کی طرف چین کی کسی پیش قدمی کی صورت میں اقوام متحدہ کے دستور میں موجود تحفظات بھی بروئے کار آجائیں گے -

جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کی غیر کمیونسٹ قوموں کے مستقبل کا فیصلہ دو باتوں پر منحصر ہے جن پر ہم بالواسطہ طور پر ہی اثر انداز ہو سکتے ہیں - اول ان کا اپنا اقتصادی اور سیاسی استحکام اور یہ خواہش کہ وہ اپنی خود مختاری میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کریں گے - اور دوسرے اس علاقے کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوستان اور پاکستان کی اس بات پر آمادگی کہ وہ چینی تشدد کی مزاحمت میں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کریں گے -

دانشمندانہ اور باشعور ڈپلومیسی کے ذریعہ ہم ان تغیرات میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں، فوجی اعتبار

سے ہمارا رول یہ ہونا چاہئے کہ ہم کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اسی طرح خاموشی سے تیار رہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح ہماری انیسویں صدی کی غیر جانب داری کے دوران برطانوی بیڑے کی بدولت "منرو ڈاکٹرین" وجود میں آئی تھی۔ ہمیں اپنی اقتصادی امداد کے سلسلہ میں ان قوموں کو سب سے زیادہ ترجیح دینی چاہئے جو خود اپنی مدد کرنے کیلئے آمادہ ہیں اور اس کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اور جو خام مال کی قیمتوں کے ایسے معیار متعین کرسکتی ہیں جو آجرین کے لئے مناسب اور قابل قبول ہوں گے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم ایشیا میں اپنا صحیح کردار ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ آیا ہم میں ضروری تدبّر، دقت نظر اور لچک بھی ہے۔ سب سے پہلی بات جو ہمیں انجام دینی چاہئے وہ یہ کہ ہم اپنے اصولی مفروضات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چینی روسی تعلقات کی پیچیدہ نوعیت پر ایک حقیقت پسندانہ نظر ڈالیں۔

ان دونوں ملکوں کے تہذیب و تمدن، تجربات اور قیادت کے انتہائی مختلف ہونے کی وجہ سے چین اور روس کے کمیونزم میں شدید اختلافات موجود ہیں۔ اس حقیقت سے یہ دونوں سماج ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کی تائید ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان میں سے ایک اعلیٰ درجہ کا ترقی یافتہ صنعتی ملک ہے اور اپنے لامتناہی وسائل اور وسیع رقبہ کا مالک ہے اور دوسرا زرعی اعتبار سے پسماندہ ہے، اس کے وسائل ناکافی ہیں، اور آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

باہر کا کوئی آدمی چینی روسی اتحاد کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کے تغیرات کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے لیکن اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال کرنا کہ یہ صورت حال مستقل، پائدار اور ناقابل تغیر ہے، ماضی کی ایک چیز بن چکا ہے۔

اس نوعیت کے پیش نظر اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے نمائندوں کی یہ حالیہ کوشش کہ وہ خروشچیف کو "عالمی کمیونسٹ تحریک کا رہنما" کہہ کر اپنے طنز کی داد وصول کرنے کی کوشش اور اس کے چین کو ساتھ نہ رکھ سکنے، پر طعنہ زنی کریں، سادگی اور خود فریبی کی بات ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کمیونسٹ اتحادات اور کمیونسٹ قومیں، اقتصادیات، قوم پرستی اور تاریخ کے ایسے ضابطوں کی پابند ہیں جو بڑی سے بڑی قوت کا زور توڑ دیتے ہیں۔

۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۳ء تک کے درمیان ریاستہائے متحدہ اور سوویٹ یونین میں سفارتی تعلقات نہیں تھے۔ تاہم اس دوران میں ہزاروں امریکیوں نے روس کی سیاحت کی اور روس میں رونما ہونے والے تغیرات کے بارے میں ہماری معلومات اور روسی لوگوں میں ہمارے متعلق واقفیت

اور مفاہمت میں اضافہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ آج ہمیں سرزمینِ چین کے ساتھ شخصی اور انفرادی رابطے قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ سرخ چین کے ساتھ نامہ نگاروں کے تبادلے کی ایک نئی کوشش کے سلسلہ میں یہ بات ابتدائی اقدام کے طور پر مفید ہو سکتی ہے۔ ہمیں ان حقائق اور معلومات کی سخت ضرورت ہے۔ جو ذہین اور لائق امریکی نامہ نگار مہیا کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی چینی صحافی امریکہ میں جو کچھ دیکھیں گے ہمیں اس سے ہراساں ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اس قسم کے دو طرفہ تبادلے میں پیکن اور خود ہماری حکومت دونوں کی طرف سے رکاوٹ ڈالی جاتی رہی ہے۔ البتہ یہ قیاس کرنا محض ہماری خوش فہمی ہو گی کہ چین کے لوگوں کے ساتھ سلسلۂ مواصلات جاری کرنے کی اس کوشش کو پیکن حکومت کی طرف سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ اکثر و بیشتر حالات میں کمیونسٹ ہمیں عوام دشمن ہی قرار دے کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ نامہ نگاروں کی سیاحت کے سلسلہ میں ہماری طرف سے جو دشواریاں حائل ہیں ان کو دور کر دیا جائے" تاکہ باقی رکاوٹوں کی ذمہ داری واضح طور پر پیکن کے اوپر رہ جائے۔

لیکن خبروں کا تبادلہ محض اس سلسلہ کا آغاز ہو گا۔ معلمین، سیاست داں، تاجر، غرض کہ امریکہ کے وہ تمام باشندے جو چینی انقلاب کی براہِ راست تفہیم سے مستفید ہوتے اور جو اپنے علم کو ہم لوگوں تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، ان کو چین جانے کی اجازت ملنی چاہیئے، بلکہ ہماری حکومت کو ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔

× × ×

انجام کار یہ بات بالکل واضح ہے کہ چین کے لئے جنوب مشرقی ایشیا کے مادّی اور ارضی وسائل پر طاقت کے ذریعہ تصرّف حاصل کرنے کی صرف ایک ہی متبادل صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ چین ایک وسیع تجارتی پروگرام کا سہارا لے۔ اور چونکہ عالمی امن کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ چین کون سا راستہ اختیار کرتا ہے، اس لئے یہ سوال امریکی مدبرین کی فوری توجہ کا محتاج ہو جاتا ہے۔

صرف اس وقت جب کہ ہم مشرقی ایشیا کے بے جان مرکز سے ہٹنا شروع کر دیں اور اس کا آغاز ایک ایسی سوچی سمجھی پالیسی کی تخلیق اور اس کو عملی جامہ پہنانے سے ہو گا جس کی بنیاد دو چینیوں کے وجود پر قائم ہو، ہم آئندہ واقعات کی تشکیل پر کوئی تعمیری اثر ڈال سکیں گے۔ جب ہم ایسا کرنا شروع کر دیں گے تو یہ توقع بعید از قیاس نہیں ہو گی کہ مشرقی ایشیا میں جنگ کے خطرہ کی شدّت اس علاقے میں سوویت یونین اور ریاستہائے متحدہ میں ایک خاموش اشتراکِ عمل پیدا کر دے گی۔ اپنے نظریاتی، اور سیاسی مقاصد میں شدید اختلافات کے باوجود اس بات میں ہمارا مشترکہ مفاد ہے کہ ایشیا میں ایک ایسا

فوجی، اقتصادی اور سیاسی توازن قائم ہو جائے جس میں کم سے کم خطرات مضمر ہوں۔

فارموسا کے انتہا پسند قوم پرست میری مجوزہ پالیسیوں سے خوش نہیں ہوں گے۔ اور پیکن کے کمیونسٹ بھی ان کی شدت کے ساتھ تردید کریں گے۔ محبِ وطن لیکن حقیقت سے دور فارموسانی قوم پرست جن کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم چیانگ کو برطرف کر دیں۔ اور ان کی اپنی حکومت کے قیام میں مدد کریں وہ بھی ان پالیسیوں کو رد کر دیں گے۔

اس موقع پر ہماری پالیسی کو چینی کمیونسٹ رہنماؤں پر مندرجہ ذیل باتیں ثابت کر دینی ضروری ہیں:۔

۱۔ جنوب مشرقی ایشیا میں ان کی پیش رفت کی ہم ہر ممکن طریقے سے مخالفت کریں گے۔

۲۔ ہم ان کو اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیں گے کہ وہ براہ راست حملے یا تخریبی کارروائیوں کے ذریعہ فارموسا کو تباہ و برباد کر دیں۔

۳۔ فارموسا میں ہمارے فوجی اڈے اس مقصد کے لئے نہیں ہیں کہ چین کی سرزمین پر قوم پرستوں کو حملہ کرنے میں مدد دیں۔

۴۔ فارموسا کی آزادانہ حیثیت برقرار رہنی چاہیئے اور اس کے طرزِ حکومت کے بارے میں یہاں کے لوگوں کی رائے لی جانی چاہیئے۔

اگر ہم نے ان مقاصد کو اپنایا تو یہ بات عین ممکن ہے فارموسا کی خوش حالی اور استحکام کے پایۂ ثبوت کو پہنچ جانے کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پیکن گورنمنٹ بادل ناخواستہ جزیرہ کی آزادی کو غیر کمیونسٹ ایشیا کی زندگی کی ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرے۔

× × ×

۴۴۔ کریملن ترکِ اسلحہ کے لئے رضامند نہیں ہوگا۔ کیوں؟

۱۹۶۰ء کے نیویارک ٹائمز میں مسٹر باڈلر نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ روسی اسلحہ پر پابندی کے معاہدہ پر بات چیت کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں اس سلسلہ میں انھوں نے امریکہ کی موثر حیثیت کے لئے اپنی تجاویز کا خاکہ پیش کیا ہے۔

مایوسی اور بظاہر ایک ناقابلِ حل مشکل کا شکار ہو جانے کے بعد دنیا اس فکر میں مبتلا ہے کہ آج بھی اسلحہ کی دوڑ کے بڑے چکر سے گریز کا کوئی موثر طریقہ ممکن ہو سکتا ہے۔ روس کا اندازِ فکر بظاہر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ روسی رہنما اسلحہ پر پابندی کے کسی قابلِ عمل

سمجھوتے کو پسند نہیں کرتے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ترک اسلحہ کے ہمہ گیر پروگرام پر کیوں زور نہیں دیتے ؟ ان کو ایسا کیوں کرنا چاہیئے ؟ اس کے دو قوی اسباب ہیں۔ اول یہ کہ سوویٹ یونین فوجی مصارف کو کھپت کی اشیاء کی پیداوار پر لگا سکتا ہے، جس سے ملک میں اور بیرون ملک فوری فوائد حاصل ہونگے۔ دوسرے کریملن کے خود ساختہ نظریہ کے مطابق مغربی سرمایہ داری کی خوشحالی کا انحصار زیادہ تر اسلحہ سازی پر ہی ہے۔

جہاں تک پہلے سبب کا تعلق ہے سوویٹ یونین کی پیداواری صلاحیت کا ۲۲ فی صدی حصہ فوج کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے۔ مجموعی قومی پیداوار تقریباً ۱۹۰ ارب ڈالر میں سے یہ خرچ تقریباً ۴۲ ارب ڈالر سالانہ ہوتا ہے، ترک اسلحہ کے معاہدے سے کریملن کے منصوبہ ساز اس بڑی رقم کو دوسرے کاموں میں لگا سکینگے۔ جس سے روس کی حالت بہت زیادہ استحکام نصیب ہوگا۔

اندرونی طور پر سوویٹ یونین میں رہائشی مکانات کی قلت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جد و جہد کی جا سکتی ہے۔ دس پندرہ سال کے عرصہ میں ملک کی اکثر شہری اور دیہاتی گندی بستیوں کو صاف کیا جا سکتا ہے۔ سوویٹ یونین میں خود کار مشینوں اور کھپت کے دیگر سامان کی پیداوار کو تیزی کے ساتھ بڑھایا جا سکتا ہے۔

ساتھ ہی کریملن اعلیٰ پیمانے پر برآمد کی ہمت افزائی کر کے نیم ترقی یافتہ براعظموں میں اور خود یورپ میں سرمایہ دار طاقتوں کی تجارتی حیثیت کو صدمہ پہنچا سکتا ہے۔ ٹائپ رائٹر، موٹر، ٹرک اور دوسرے آلات کی قیمت امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمن سامان کے مقابلہ میں ۲۰، ۴۰ اور ۵۰ فی صدی تک کم کی جا سکتی ہے۔ مسٹر خروشچیف یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ پُرامن مقابلہ ہو تو کمیونزم ہر آزمائش میں بازی لے جا سکتا ہے۔

روس کے ترک اسلحہ پر اصرار کے دوسرے سبب کا جہاں تک تعلق ہے وہ یہ ہے کہ کمیونسٹ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جیسے ہی اسلحہ کے امریکی کارخانے بند ہوں گے تیزی سے بڑھتی ہوئی سرد بازاری کے باعث امریکہ میں دیوالیہ پن، عسرت اور سیاسی اختلافات پیدا ہو جائیں گے جس سرمایہ داری کی عمارت منہدم ہو جائے گی اور کمیونسٹوں کی فتح ہو گی۔

اگرچہ یہ مارکسی تجزیہ ہمارے مسئلہ کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ تاہم ہمارا انتہائی پختہ کار سرمایہ دار بھی اس بات سے اتفاق کرے گا کہ اسلحہ کی کھپت میں بہت زیادہ کمی امریکی صنعت لئے ناقابل عبور مشکلات پیدا کر دے گی۔

یہ سچ ہے کہ اگر کانگریس محصولات میں بھاری تخفیف کر دے تو اربوں ڈالر سرکاری اسلحہ کی خرید سے بچا کر گھریلو سامان کی خرید یا روزگار پیدا کرنے والے کاموں پر صرف کئے جا سکتے ہیں، اسی طرح کثیر رقمیں بچا کر پسماندہ علاقوں میں قومی فلاح کی خانگی ضروریات مثلاً رہائشی مکانات، سڑکیں

دیہات سدھار، شفاخانوں، اسکولوں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں پر صرف کی جاسکتی ہیں۔

علاوہ ازیں ہم ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے لئے موجودہ ناکافی اقتصادی امداد کے پروگرام میں توسیع کرکے ایک وسعت پذیر برآمدی تجارت کی بنیاد قائم کرسکتے ہیں۔

لیکن جب تک ان تدابیر کے اثرات مرتب ہوں، ہمیں کافی عرصہ ان مشکلات کے ساتھ جدوجہد میں صرف کرنا ہوگا۔ اس اثنا میں ہمارے روسی حریف ایک ایسی رفتار کے ساتھ جو صرف استبدادی نظام ہی میں ممکن ہے، نئی نئی منڈیاں کھول دیں گے۔ ہمیں پرانی منڈیوں سے نکال باہر کریں گے اور کمیونزم کی مادی کامیابیوں سے دنیا بھر کے کروڑوں انسانوں کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے۔

ان دونوں وجوہ کی بنا پر سوویٹ یونین کے لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر ترک اسلحہ کے ایک معاہدے کے لئے جدوجہد کرے۔ روسی رہنماؤں نے امن کے نام پر توپیں داغی ہیں۔ پرچم لہرائے ہیں، اور فاختائیں چھوڑی ہیں، لیکن گفت وشنید کے موقع پر نہ کبھی کوئی مثبت اور قابل عمل تجاویز کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکے ـــــ ایسا کیوں ہے؟

اس سلسلہ میں پہلا جواب مغربی مبصرین کے اس گروہ نے پیش کیا ہے جس میں زیادہ ایسے پیشہ ور فوجی شامل ہیں (لیکن یہ فوج کے مختلف طبقات کی رائے کی نمائندگی نہیں کرتے) جو مستقبل کو انقلابی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس دلیل کے مطابق ترک اسلحہ کے مسئلہ کو حل کرنے سے روس کا انکار اس بات کا ثبوت ہے کہ سوویٹ یونین کا واحد اور ناقابل ترمیم مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا پر طاقت کے ذریعہ اپنا اقتدار قائم کرے۔

دوسری طرف ایک اور گروہ ہے، جس کا جواب اس سے قطعاً مختلف ہے، یہ لوگ، جو ہماری اصل خامیوں سے واقف اور انتہا سے زیادہ نظریہ پرست ہیں اور اسی لئے تمام نوع انسانی سے حتیٰ کہ روسی رہنماؤں سے بھی بہتر توقعات رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ کریملن نے ترک اسلحہ کو اس لئے منظور نہیں کیا کہ ہم نے اس کے لئے مناسب کوشش ہی نہیں کی۔

مگر میرا خیال ہے کہ اس کا جواب اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ روس کے موجودہ رویہ کی توضیح میں ذیل کے عوامل بھی شامل ہونے چاہئیں۔

۱۔ سوویٹ رہنماؤں کا ان قوتوں سے خائف ہونا، جنھیں وجود میں لانے کے لئے وہ خود ذمہ دار ہیں، یعنی مسئلہ جرمنی "ناٹو" اور امریکہ کے ایٹمی اڈوں کا عالمگیر نظام۔

۲۔ ۶۵ کروڑ کی آبادی پر مشتمل، حرکت پذیر لیکن زمین کا بھوکا چینی ہمسایہ، جو جلد یا بدیر عالمی کیمونسٹ تحریک کی قیادت کا دعویدار ہوگا

۳۔ روس کی روایتی رازداری کی وہ انتہا جس کے سوویٹ رہنما خود شکار ہیں، اور وہ فوائد جو

ان کو اس راز داری کی بدولت اسلحہ بندی کی دوڑ میں ہمارے کھلے سماج کے مقابلے میں حاصل ہیں۔

۴۔ پالیسی میں تذبذب اور کشمکش کا دباؤ ۔ مثال کے طور پر کمیونسٹ پارٹی میں اندرونی طور پر اور اسکے اور مسلح فوجوں کے درمیانی اختلافات جن سے کریملین کی آزادی عمل محدود ہوتی ہے۔

آخر میں میں اپنی ذاتی رائے کا اضافہ کروں گا اور وہ یہ کہ جن اسباب کی بنا پر کریملن ترک اسلحہ کے سوال پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہے ان میں سے ایک کو صرف ایک لفظ "ہنگری" میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ جنیوا میں ۱۹۵۵ء کی چار بڑوں کی میٹنگ کے بعد عالمی کشیدگی میں جو کمی پیدا ہوئی تھی اس سے کمیونسٹ قلمرو کے اندر بعض نئے امکانات کا احساس پیدا ہونے لگا تھا جس کا نتیجہ پولینڈ میں ہنگامہ آرائی اور ہنگری میں بغاوت کی صورت میں پیدا ہوا۔

اسی لئے سرد جنگ میں کسی قسم کی کمی اور تخفیف سوویٹ رہنماؤں کو خوفناک معلوم ہوتی ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے ایک انتہا پسند ریاست بڑے تذبذب کے بعد راضی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی بدولت وہ تمام خوف اور اندیشے ختم ہو جائیں گے جنھوں نے سوویٹ یونین کو یکجا رکھا ہوا ہے۔

ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب مشکل ہے، کیونکہ روس کے ارادوں کے بارے میں ہمارے اندازے صرف قیاس پر مبنی ہیں، اس لئے ہمیں کسی بھی صورت حال کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ میری رائے میں اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہماری پالیسی مندرجہ ذیل تین نکات پر مبنی ہونی چاہیئے:

۱۔ ہمیں بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ بعض خوفزدہ مبصرین کا یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے، کہ ترک اسلحہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے روسیوں کا احتراز اس بات کا ثبوت ہے کہ کریملین موقع اور محل دیکھ کر جنگ شروع کر دینے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہے۔ لہذا ہم کوئی خطرہ نہیں مول لے سکتے۔

۲۔ ساتھ ہی ہمیں دنیا پر یہ واضح کر دینا چاہیئے کہ ہمارے فوجی پروگرام میں کسی قسم کا اضافہ کریملین کی پیدا کردہ دشوار صورت حال کے منطقی نتیجہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور یہ کہ ہم بڑے پیمانے پر ترک اسلحہ کی گفت و شنید کرنے کے لئے کوشاں اور آمادہ ہیں۔

ترک اسلحہ کے بارے میں ہماری حکومت کی اگر کوئی واضح، قابل اعتماد اور مصالحت آمیز پالیسی ہے تو وہ کسی کو معلوم نہیں۔ اس بات سے کہ سوویٹ یونین اس کوشش میں برابر کا حصہ نہیں لے رہی ہے، ہماری ان کوتاہیوں کے لئے کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ جو ہم سے اس دشوار مسئلہ پر غور کرنے اور امن عالم کے قیام کے لئے ایک ایسا حقیقت پسندانہ اور متوازن پروگرام مرتب کرنے میں سرزد ہوئی ہیں، جسے ہم باقاعدہ اور تعمیری طور پر دنیا کے سامنے پیش کر سکتے۔

۳ - آخر میں، ہمیں بہتر حالات کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے یعنی اس امکان کے لئے کہ روس کسی وقت ترکِ اسلحہ پر آمادہ ہو جائے گا۔

اس کے لئے ہمیں ان اثرات کا صحیح صحیح اندازہ لگانا ہوگا، جو اسلحہ کی دوڑ میں تخفیف سے ہماری اقتصادیات پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ کانگریس کی جوائنٹ اکانومک کمیٹی یا کوئی ایسا ادارہ یا کمیٹی جسے خاص مقصد کے لئے تشکیل کیا گیا ہو۔ اس قسم کا جائزہ لے سکتی ہے۔ جہاں تک ماہرینِ اقتصادیات کا سوال ہے وہ مختلف صنعتوں، مزدور تحریک اور یونیورسٹیوں سے مل سکتے ہیں۔

اس جائزے میں ان امور پر علاقہ وار غور ہونا چاہیئے کہ اسلحہ سازی کی تخفیف کے نتیجہ میں کس حد تک بے روزگاری پیدا ہو گی؟ اس کے نتیجہ میں اجتماعی محصولات میں ہونے والی کمی کی کیا نوعیت ہو گی؟ اور محصولات کی تخفیف سے اجتماعی سرمایہ کاری اور صارفین کی قوت خرید پر کیا متوقع اثرات پڑینگے؟

اس جائزے کے دوران اس بات کی تحقیق بھی کرنی ہوگی کہ ترکِ اسلحہ سے جو لوگ بیکار ہوں گے شہری علاقوں کے توسیع شدہ ترقیاتی کاموں مثلاً مکانات شفاخانے، اسکول، اور سڑک بنانے کے پروگرام اور سمندر پار سرمایہ کاری کے پروگرام میں ان میں سے کتنے لوگوں کو کھپایا جا سکتا ہے؟ اور عبوری دور میں بے روزگاری کے معاوضہ کی مطلوبہ تعداد اور نوعیت کیا ہوگی۔

بہت سے امریکی خوفزدہ ہو کر ترکِ اسلحہ کے اقتصادی نتائج پر کھلم کھلا گفتگو کرنے سے گریز کریں گے، لیکن مارکس کے برعکس میرا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے خدشات بالکل بے بنیاد ہیں۔

۱۹۴۵ء میں میں نے وار پروڈکشن بورڈ کے ایک ممبر کی حیثیت سے امریکی اقتصادیات کو جنگ سے امن کی طرف منتقل کرنے کی منصوبہ بندی میں حصہ لیا تھا۔ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ہم نے اپنی تقریباً نصف صنعت کو زمانۂ جنگ کی بنیادوں سے ہٹا کر زمانۂ امن کی ضرورتوں کی طرف منتقل کر دیا۔ اور ایسا کرنے میں نہ کوئی سرد بازاری پیدا ہوئی اور نہ بے روزگاری۔ حالانکہ اچانک ایک کروڑ فوجی حصولِ روزگار کے میدان میں آگئے تھے۔

آج اگر پھر یہی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ ہم اس میں بھی اسی طرح کامیاب ہوں گے۔ اسلحہ سازی پر ہماری مجموعی کوششوں کا بہت تھوڑا سا حصہ صرف ہوتا ہے اور صحت عامہ، غیر ملکی امداد اور دوسرے میدانوں میں ابھی بہت کچھ کرنے کو باقی ہے جن کی ایسی صورت میں تکمیل کی جا سکیگی۔

نہیں کہا جا سکتا کہ امریکہ کی کسی نئی پیش کش یا نئیا یا امن کے لئے کسی ایسی جامع پالیسی سے جس میں فوجی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہو، کریملن اگر ہوا بھی تو کس حد تک متاثر ہوگا؟ لیکن یہ ایک تیز رفتار دور ہے ـــ لامتناہی امکانات کا دور ـــ اسٹالن کی وفات کے بعد خود سوویٹ یونین میں بڑی قابلِ غور تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں۔

ہماری اس انقلابی صدی میں پالیسی سازی کے لئے ضروری ہے کہ خطرات میں ایک نازک توازن قائم کیا جائے۔ اگرچہ اس مقصد کے حصول کی کوئی یقینی اور محفوظ راہ نہیں ہے، لیکن اس وقت جب کہ اسلحہ کی دوڑ شدت اختیار کرتی جا رہی ہے، کچھ نہ کرنا سب سے زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا امریکہ کے لئے ایک ایسے مستحکم، عملی اور پُر فکر نقطۂ نگاہ کی تخلیق جس کو لے کر ہم آگے بڑھ سکیں ایک قومی ذمہ داری ہے، جسے نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ التوا میں ڈالا جا سکتا ہے۔

۵۴۔ دفاع، ترکِ اسلحہ اور امن

مسٹر باؤلز نے برق رفتاری سے ترقی کرتی ہوئی ملٹری ٹیکنالوجی اور اس کی بدولت وجود میں آنے والی مناسب اسلحہ بندی اور ترکِ اسلحہ کی سچی کوشش کے درمیانی خطرناک فرق پر تبصرہ کرتے ہوئے ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ (ماڈرن فورم لاس اینجلز کے سامنے مارچ ۱۹۶۰ء کے ایک خطبہ سے ماخوذ۔)

آج بھی دنیا اسلحہ سازی پر سو ارب ڈالر سالانہ سے زیادہ خرچ کر رہی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہم یہ سب کچھ انتہائی معین نتائج کے لئے کر رہے ہیں۔ جو قومیں اسلحہ بندی کی دوڑ میں مبتلا ہیں، ان کے ماہرینِ حرب ایسے ہی لوگ ہیں جو ان مصارف کے اضافے پر اصرار کرتے ہیں۔

اسلحہ بندی کی دوڑ میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ترکِ اسلحہ کی عقلی اور اخلاقی ضرورت اور اہمیت میں بھی اضافہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس احساس کے گرد بے یقینی کی ایک فضا چھائی رہتی ہے اور عملی مقاصد کے لئے زیادہ مستحکم اور قابلِ قبول دفاع کی بدیہی ضرورت اس پر غالب آجاتی ہے۔

بہت سی قابلِ فہم وجوہات کی بنا پر واشنگٹن اور ماسکو میں اکثر اربابِ اختیار کے ذہنوں پر ترکِ اسلحہ کا نہیں، بلکہ اسلحہ بندی کے مقابلہ کا خیال چھایا رہتا ہے۔ وہ اکثر اپنے دل کو اس مغالطہ آمیز نیم صداقت سے مطمئن کر لیتے ہیں کہ زیادہ اسلحہ بندی سے ترکِ اسلحہ میں مدد ملے گی۔ کیونکہ چرچل کے الفاظ میں " ہم گفت و شنید کے لئے مسلح ہوتے ہیں"۔

لیکن اسلحہ بندی کے ضمنی اثرات اس درجہ مثبت نہیں ہیں۔ اگر روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلہ میں معقول دفاع کی تعمیر سے انکار کرنا کچھ زیادہ حماقت آمیز نہ بھی ہو تب بھی ہمارا اپنے دل کو یہ سمجھاتے رہنا ضرور حماقت آمیز ہے کہ اسلحہ بندی میں اضافے کا مطلب امن کے مقاصد کو فروغ دینا ہے۔ پہلے خواہ کبھی یہ صورت رہی ہو، لیکن آج امن کوئی سیدھا سادہ، یکطرفہ اور روحانی داعیہ

نہیں ہے آج یہ اخلاقی، فوجی، اقتصادی اور ٹیکنالوجیکل مسائل کا ایک حیران کن گورکھ دھندا بن گیا ہے۔

آج ہمارے بہت سے ذہین مبصر شانے جھٹکا کر یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ موجودہ صورت حال اس درجہ پیچیدہ اور پراگندہ ہے کہ اس کو دیکھتے ہوئے کوئی باقاعدہ اور منضبط پالیسی مرتب نہیں کی جا سکتی۔ یہ قنوطیت پسند آج غلطی پر ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان عوامل کی پیچیدگی میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو کل ان کا یہ قول ضرور صحیح ثابت ہو کر رہے گا۔ امن کا مسئلہ سال بہ سال برابر دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہی بات دفاع اور ترکِ اسلحہ کے پیچیدہ مسائل کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ان مسائل کو برتنے کے لئے ہم جتنا زیادہ وقت دیں گے یہ اتنے ہی ناقابلِ حل ہوتے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ پر کس طرح قابو پا سکتے ہیں؟

اٹیمی توانائی کمیشن کے سابق کمشنر ٹامس۔ ای۔ مرے کے قول کے مطابق "اٹیمی توانائی نے ایک حد تک خود اپنے جدلیاتی اصول کے مطابق ترقی کی ہے۔ ابتدا میں ہم اس لامحدود طاقت کو عسکری مصالح کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے حتمی نتائج کے تصور سے خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ اس لئے کہ ان مصالح کی رو سے موجودہ جنگی تیاریوں کا عام مقصد شہری آبادی کی بڑے پیمانے پر تباہی تھا۔ لیکن ہم نے ایک قدم آگے بڑھا کر ان میں ضروری ہم آہنگی پیدا کر دی۔ اپنی غیر حاضر دماغی میں ہم نے اپنی عسکری پالیسی کو جنگی ٹیکنالوجی کا پابند بنا دیا... اس طرح ہم ایک ٹیکنالوجیکل فراڈ کا شکار ہو کر رہ گئے۔

۱۴ جنوری ۱۹۶۰ء کو سپریم سوویٹ کے سامنے خرشچیف نے جو تقریر کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی کی بوقلمی روس میں بھی اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کا صفایا کئے دے رہی ہے۔ جس انداز اور جس رفتار سے آج اٹیمی ہتھیار پہنچانے کا اہتمام ہو رہا ہے اس سے یہ بات ناگزیر ہو جائے گی کہ سرد جنگ میں ایک سمت کی ٹیکنالوجی دوسری طرف کی ٹیکنالوجی کو نیچا دکھانے کے لئے ہمہ وقت اور انتہائی تیز رفتار کے ساتھ کام میں مصروف ہے۔ اس خواہش کا میلان بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ مخالف کی کسی بھی نئی متوقع ٹیکنالوجیکل ترقی کے پیشِ نظر فوری قدم بڑھا کر عارضی فائدہ حاصل کر لیا جائے۔ مطمحِ نظر یہ ہے کہ نئے توازن کو غیر متوازن کرنے کے لئے جدوجہد کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم رکھا جائے، جس کی قیمت سرمایہ اور خطرات کے اعتبار سے برابر بڑھ رہی ہے۔

اس رجحان کے ساتھ ہی جارحیت کے صلہ اور دفاع کے خمیازے کے درمیان کا خلا بھی برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ تفاوت اس قدر بڑھ گیا ہے کہ روس کے سلیم العقل اور ہوشمند ماہرین حرب بھی شاید جلد یہ بات محسوس کرنے لگیں کہ ریاستہائے متحدہ پر اچانک اٹیمی حملہ کر دینا روس کیلئے بڑا معقول فیصلہ ہوگا۔

اسلحہ سازی کی ٹیکنالوجی کے جس دور میں ہم داخل ہو رہے ہیں، استعجاب، سرعت، غلط اندازے اور حادثے کے خطرناک عناصر اس کا اہم جزو بن چکے ہیں۔ اگر یہ اسباب اب بھی کافی نہ ہوں تو ہم اس میں

سرد جنگ کے ماہرین کے نئے ہلاکت خیز تصور کو شامل کر سکتے ہیں جو آہنی پردے کے دونوں سمتوں کے لوگوں کے ارادوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے رہتے ہیں۔ عدم استحکام کے اس سے بڑے کسی نئے عنصر کا تصور کرنا مشکل ہے۔

امریکہ کی موجودہ نسل کے وسائل، صلاحیتیں، نفری اور ذہنی طاقت روز بروز اس بات پر مرکوز ہوتی جارہی ہے کہ نصف گھنٹے کے ہلاکت خیز ایٹمی ہنگامے سے جان بچانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ لقا کے اس مسئلہ سے ذراسی دیر کے لئے بھی توجہ کا منتقل کرنا بہت خوفناک ہے۔ ہماری سیاسی بصیرت، غیر ملکی امداد اور تعلیم یہ سب چیزیں ہمارے اس بنیادی حربی غور و فکر کے سامنے، ہیچ ہیں۔

کروڑہا لوگوں کی ہلاکت کی دھمکیاں اور جوابی دھمکیاں اس ایٹمی دور کی مزاحمت اور جوابی مزاحمت کی مرکزی خصوصیت بن کر رہ گئی ہیں۔ اور ہمیں یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہم اپنی دھمکیوں کو اور زیادہ "قابل یقین" بنانے کے نئے نئے طریقے تلاش کریں۔

لیکن چونکہ ٹیکنالوجی مسلسل ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے، اس لئے اس کی دہشت انگیزی کی وجہ سے دھمکیوں کا اعتبار ختم ہوتا جارہا ہے۔ ہیروشیما پر جو ایٹم بم گرا وہ دوسری عالمگیر جنگ میں استعمال ہونے والے سب سے زیادہ دھماکہ خیز بم سے بھی ہزارہا گنا طاقتور تھا۔ لیکن اس کے بعد سے جو ہم نے ہائیڈروجن بم بنائے ہیں ان میں سے بعض دوسری عالمگیر جنگ میں استعمال ہونیوالے بموں کی مجموعی طاقت سے بھی ہزار گنا زیادہ طاقتور ہیں۔

اس میں کوئی راز کی بات نہیں کہ ایٹمی ٹیکنالوجی کے مقابلہ کا انجام کیا ہونا ہے۔ اگر یہ مقابلہ بلا روک ٹوک اسی طرح جاری رہا تو اس کا انجام دنیا کے خاتمے کی صورت میں نکلے گا۔ کسی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ ہمارے ارد گرد بعض سیاروں کے غیر آباد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سائنسداں ہمارے سائنسدانوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔

× × × × × ×

آج جب ہم ترک اسلحہ کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اپنی ان عادات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے جو دوسری عالمگیر جنگ یا ایٹمی دور یا میزائیلی دور سے پہلے کے لئے موزوں تھیں۔ ۱۹۶۰ء کی یہ دنیا پہلے سے مختلف ہے اور ہمیں پرانے دقیانوسی نظریات کو رد کر کے اس کی موجودہ حالت پر ہی نظر رکھنی چاہیئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ مسٹر خرشچیف بسا اوقات اپنے غیر ادعائی اور جمہوری مخالفین سے زیادہ آزادروی اختیار کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر فروری ۱۹۵۷ء میں ان کے کریملن کے دفتر میں میں نے

ان سے سوال کیا کہ کیا وہ خود اپنے مارکسی عقائد سے انحراف نہیں کر رہے ہیں؟ ہم ترک اسلحہ پر گفتگو کر رہے تھے اور میں نے ترکِ اسلحہ کے کسی مؤثر معاہدے کے متعلق گفت وشنید کے لئے ان کی آمادگی پر شک وشبہہ کا اظہار کیا تھا۔

میں نے کہا کہ مارکسی نظریہ یہ ہے کہ سرمایہ پرست مغرب کی مسلسل خوشحالی کا دارومدار اسلحہ سازی کی صنعت پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ترکِ اسلحہ کمیونزم کی کامیابی کی رفتار کو اور تیز کر دے گا۔ امریکہ کی اسلحہ سازی کی صنعت ختم ہوتے ہی بے روزگاری بڑھ جائے گی۔ قوتِ خرید کم ہونے لگے گی، اور بڑھتی ہوئی کساد بازاری سے ابتری اور انتشار پھیل جائیگا اور سرمایہ داری کی عمارت منہدم ہو جائیگی۔

پھر مسٹر خروشچیف نے اس مارکسی منطق پر عمل کرتے ہوئے اس بات کی حتی المقدور کوشش کیوں نہیں کی کہ ترکِ اسلحہ کا کوئی قابل عمل سمجھوتہ ہو جائے جو سرمایہ دارانہ نظام کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا۔ کیا ان کا ایسا نہ کرنا ان کے اصولوں سے منحرف ہونے کے مساوی نہیں ہے؟ کیا وہ اپنے زیادہ اصول پرست ساتھیوں کے ردعمل سے فکر مند نہیں تھے؟ ان کے پُر مسکراہٹ ردعمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا اسی لئے وہ مطمئن نظر آتے تھے۔

یہ ایک ایسی مثال ہے جہاں ہم اس بات کو پسند کریں گے کہ موجودہ دور کے مارکسسٹ اپنے اصولوں کو بالائے طاق رکھنے کی بجائے اس پر قائم رہیں اور عمل کریں۔

ساتھ ہی ہم امریکیوں کے بعض ایسے مفروضات ہیں جن پر ہمیں اسلحہ پر پابندی کے سلسلہ میں قابو پانا ہوگا۔ ہم کتنی بار سن چکے ہیں کہ سب سے زیادہ پیچیدہ مسائل سیاسی مسائل ہیں جن میں برلن، جرمنی، مشرقی وسطی، کوریا، ویتنام اور آبنائے فارموسا وغیرہ شامل ہیں۔ اور کتنی بار یہ کہا جا چکا ہے کہ اسلحہ پر کسی قسم کی پابندی لگائے جانے سے پیشتر ان مسائل کا حل ہونا ضروری ہے۔

اس بات کا اعادہ بے معنی ہے کہ اسلحہ محض ایک علامت ہے سبب نہیں ہے۔ اسلحہ پر کنٹرول کی خود اپنی ایک اہمیت پیدا ہوگئی ہے اور چونکہ دنیا کے بہت سے بڑے مستقل سیاسی مسائل ناقابل گفت وشنید ہوگئے ہیں۔ ان پر صحیح طریقے پر گفت وشنید نہیں کی جا سکتی ہے اس لئے اسلحہ پر کنٹرول کے مسئلہ کو امتیازی اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

اس مسئلہ کی تہ میں دو بنیادی حقیقتیں ہیں، پہلی بات تو یہ کہ تاریخ کے ہر دور میں اسلحہ کی دوڑ جنگ پر آ کر ختم ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ عدم تیاری یا یک طرفہ یا غیر محفوظ ترکِ اسلحہ کا نتیجہ قومی تباہی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔

یہ دونوں حقیقتیں مساوی طور پر اہمیت رکھتی ہیں اور ان پر ایک ساتھ ہی غور ہونا چاہیئے۔ ہماری [illegible] دشواریاں اس بات سے پیدا ہوئی ہیں کہ ہم ان مسائل پر غور و فکر کرتے وقت

ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو خاص طور پر فوجی دفاع کی تکمیل پر مصر ہیں، اسلحہ پر کنٹرول کے حامیوں کو اکثر شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ پر امن ترک اسلحہ پر مصر ہیں وہ فوجی لوگوں کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

بقا کے مسئلہ پر دفاعی انداز سے نظر ڈالئے تو ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اسلحہ کی دوڑ میں کس طرح بازی لی جائے؟ اور انسانی نقطۂ نظر سے سوچئے تو یہ کہ اس میں کس طرح تخفیف کی جائے۔

جنوری ۱۹۵۹ء کے فورین ایفیرس میں لکھتے ہوئے مسٹر البرٹ ووسٹر نے کہا تھا "کیفیت میں کمی جسے ہر شخص اچھا خیال کرتا ہے کسی شخص کے حفاظتی انتظامات میں کمی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جسے ہر شخص خیال کرتا ہے۔"

دفاع اور ترک اسلحہ سے متعلق متضاد نقطۂ نظر بھی معائنہ کے سوال پر آکر یک جا ہو جاتے ہیں، اگر سائنسی تیاریوں کے بارے میں معتبر معلومات فراہم ہو جائیں تو ہمارا بہت سا وقت بچ جائے اور ہمیں تشکیک اور بے چینی سے نجات مل جائے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ متعلقہ حکومتوں کی داخلی طاقتیں آزمائشی تجربہ کرنا چاہتی ہیں، قطع نظر اس کے کہ ان تجربوں کا پتہ لگایا جا سکے سراغ رسانی کے مسئلہ کا حل اس اختلاف کو ختم نہیں کر سکتا لیکن یہ جنیوا میں ایک بہت بڑی الجھن اور رکاوٹ کے ایک ذریعہ کو ختم کر دے گا۔

ایک ایسے معاملہ میں جہاں ہمہ جہتی پیش رفت مشکل ہو مصلحت اندیشی کی بات یہ ہوگی کہ ان پہلوؤں کو نظر انداز نہ کیا جائے جہاں زیادہ صحیح سائنسی معلومات پالیسی سازی کے کام میں معاون ثابت ہو سکیں۔ کوشش کے لئے ایک ظاہری پہلو یہ ہے کہ زمین دوز تجربوں کے سراغ پر جو اختلاف ہے اسے سائنسی انداز میں کم کیا جائے۔ چونکہ ماضی میں ہم نے اس عظیم خلا کو پر کرنے کے لئے مناسب جدوجہد نہیں کی تھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کام کو اب کیا جائے۔

ایٹمی اسلحہ کی ملکیت میں مختلف طاقتوں کی شمولیت پر اختلاف اس بات کی ایک اور بڑی مثال ہے کہ سائنسی اور صنعتی کنٹرول کے نقطۂ نظر سے دفاع اور ترک اسلحہ سے متعلق مختلف انداز فکر کس طرح یک جا ہو جاتے ہیں۔

ایک نقطۂ نظر اس ضرورت پر زور دیتا ہے کہ ایٹمی اسلحہ میں زیادہ سے زیادہ اقوام کی شرکت ہونی چاہیئے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم اپنے حلیفوں کو اس استعداد سے محروم رکھیں جو ہمارے کسی امکانی دشمن کے پاس پہلے سے موجود ہے تو یہ اس منقسم محاذ کے دور میں بڑا مہلک ہوگا۔

دوسرا نقطۂ نظر ایک ایسے ہی حقیقی خطرے کی اہمیت پر زور دیتا ہے کہ اسلحہ کے مزید پھیلاؤ سے اس بات کا امکان بڑھ جائے گا کہ پھر کبھی اس اسلحہ کو کنٹرول میں نہیں لایا جا سکے گا۔ اور یہ کہ

اس کی بدولت اتفاقی طور پر یا بالقصد ایٹمی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔

لیکن اگر ان متضاد نظریات کو گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ اختلاف ایسا نہیں ہے جو ختم نہ ہو سکے۔ میں پھر اس بات کو دہراؤں گا کہ اگر مصالحت کا کوئی امکان ہو سکتا ہے تو وہ کنٹرول کے طریقوں میں ہی مضمر ہے۔ یہ غالباً اس قسم کے سوالات کے جدید یا ضابطہ جوابات پر مشتمل ہو گا۔ ایسے کون سے اقدامات ہیں جو دفاع اور ترک اسلحہ دونوں پر یکساں طور پر حاوی ہوں۔ NATO میں داخلی طور پر ایسے کون سے انتظامات ہو سکتے ہیں جو بہ یک وقت تیز رفتاری کے ساتھ دفاع بھی کر سکیں اور بیرونی جارحیت کے لئے کم سے کم اشتعال کا باعث بنیں؟ ایسا کیا طریقہ ہو سکتا ہے جس سے ایٹمی ٹیکنالوجی کو زیادہ سے زیادہ عام مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکے اور محرومی کے اس احساس کو کم کیا جا سکے جس کی بدولت غیر نیوکلیائی طاقتوں کو نیوکلیائی بننے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔

ان سوالوں کے جواب ہمیں اس بات میں نہیں ملیں گے کہ ہم اپنے حلیفوں کو بغیر دیکھے بھالے ایٹمی ہتھیار دینا شروع کر دیں۔ اسی طرح اس کا جواب اس بات میں بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ ہم خود اسلحہ کا ذخیرہ اکٹھا کر کے مطمئن ہو جائیں اور ہمارے اعتراض کے باوجود اور ہماری مدد کے بغیر ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کا جو واقعی امکان ہے اس پر غور کرنے سے انکار کر دیں۔

کنٹرول، نگرانی، دیکھ بھال اور کارکردگی کی منصوبہ بندی میں اندرونی طور پر "ناٹو" کے غیر نیوکلیائی ممبران کی شرکت بعض ممبروں کے دل میں یہ خیال پیدا کر سکتی ہے کہ وہ فرانس کی آزادانہ راہ اختیار کر لیں۔ اگر "ناٹو" کا مجموعی طور پر قابل اطمینان نیوکلیائی دفاع کر دیا جائے تو اس سے جداگانہ نیوکلیائی دفاع کے لئے بہت کم خواہش پیدا ہو گی۔ اور اس سے روسیوں کو بھی اطمینان ہو جائے گا۔ "ناٹو" میں داخلی طور پر اسلحہ سازی اور اسلحہ کے کنٹرول کے سلسلہ میں مشترک خطرات کی موجودگی میں ایسے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں جن سے مشترک مفاد پر مبنی سمجھوتے ممکن ہو جائیں۔

"روس اور مشرقی یورپ" کے عنوان سے کولمبیا، ہارورڈ ریسرچ گروپ نے سینیٹ کی تعلقات خارجہ کی کمیٹی کے لئے جو اہم روداد تیار کی اسے تیار کرتے وقت اس گروپ کے ذہن میں یہی بات رہی ہو گی، تب ہی اس نے کہا تھا "اسلحہ سازی کے بعض پہلوؤں کی حد بندی کرنے میں مشترک مفاد کے امکانات معلوم ہونے پر شاید ہم آخرالامر روس کو اپنا قدامت پسند اور ذمہ دار حریف خیال کرنے لگیں گے۔" یہ بات بعض امریکیوں کو بڑی عجیب سی معلوم ہو گی لیکن یہ کسی طرح بھی ناممکن نہیں ہے۔

× × ×

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہم نے اسلحہ پر کنٹرول کے مسئلہ کو وہ اہمیت اور اولیت دینے میں جس کا وہ مستحق ہے تاخیر کی ہے اور اب بھی تاخیر کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہ ہمارے دل میں اس بات کا احساس ہی

پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ کہ اس احساس کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔
گزشتہ ہفتہ یکم مارچ ۱۹۵۰ء کو دس سال ہوئے جب کنکٹیکٹ کے ایک ممتاز سنیٹر آنجہانی برٹن میکماہن نے سینیٹ کے اندر تقریر کرتے ہوئے ہمیں اس اہم کام کی دعوت دی تھی جو ہم نے ابھی تک نہیں کیا۔ اس وقت انھوں نے فوری عمل کی ضرورت کا احساس دلایا تھا اور ان کا پیغام آج بھی فوری اہمیت رکھتا ہے۔ جن الفاظ کے ساتھ انھوں نے اپنی تقریر ختم کی تھی میں بھی انھیں الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ جو دس سال پرانے ہونے کے باوجود آج بھی نہایت تازہ ہیں۔

"گھنٹے کے ٹنکن کی ہر حرکت پر تہذیب کو بچانے کا وقت کم ہوتا جا رہا ہے۔ آخر ہم اس کام کی طرف کب توجہ کریں گے؟ قضائے مبرم ہماری اس بے اعتنائی کو نظر انداز نہیں کرے گی۔ اگر ہم اب بھی عمل نہیں کرتے تو اس تباہ شدہ سیارے کے سورث ابدالآباد تک ہم پر نفرین کرتے رہیں گے۔
"ہمیں بے وقوف کہہ کر ملامت نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ بے وقوف لوگ بھی بڑے خطرات کو بھانپ لیتے ہیں، بلکہ ہمیں بزدل کہہ کر ہم پر ملامت کی جائے گی اور یہ درست ہوگا۔ کیونکہ صرف بزدل ہی ان دہشتناک حقائق سے گریز کرتے ہیں جو ہم سے تحمل اور جرأت کے ساتھ عمل کا مطالبہ کرتے ہوں۔ بہت بڑے خطرے کا یہ دور ایک بہت بڑا موقع فراہم کرتا ہے۔ ایٹمی امن کا انعام منتظر ہے کہ اسے کوئی جیت لے اور اس کے ساتھ ہی ایک نئی عجیب و غریب دنیا انتظار کر رہی ہے۔"

۴۶ - روس کی بے خطائی کا افسانہ

نئی حکومت نے ۱۹۶۱ء میں "علاقائی مشاورتی مجالس" کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کا مقصد ریاست ہائے متحدہ کی خارجی پالیسی کے سلسلہ میں امریکہ کے ممتاز صحیفوں اور رائے عامہ کے چوٹی کے رہنماؤں سے صلاح مشورہ کرنا تھا۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں ڈلاس (ٹیکساس) کی ایسی ہی ایک مجلس میں انڈر سکریٹری باولز نے سرد جنگ میں روسی داؤ پیچ کے متعلق ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔

ایک ایسی قومی پالیسی جس میں روسی طاقت اور عزائم کا پورا پورا اندازہ لگایا گیا ہو بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ لیکن ایسا سوچتے ہوئے ہمیں اپنے توازن کو ہاتھ سے نہیں کھو دینا چاہیئے۔ روس سے ضرورت سے زیادہ خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ہم جس بات کو اکثر اور خصوصاً ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قوموں کے ساتھ اپنے معاملات کے سلسلہ میں نظر انداز کر دیتے ہیں وہ یہ واضح حقیقت ہے کہ سیاسی اور اقتصادی میدان میں کریملین سے کثرت کے ساتھ اور شدید غلطیاں ہوئی ہیں اور اسی اعتبار سے ان کی محرومیاں بھی زبردست ہیں۔

حالات کا احاطہ کرنے کے لئے ہم گزشتہ پندرہ سال کے واقعات پر اس انداز میں نظر ڈالیں جس انداز میں کہ خود کریملین کے ارباب قضا و قدر انھیں خود کسی وقت ٹھنڈے دل اور حقیقی نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے مطالعہ سے خود ہمیں اپنی قوتوں کا جائزہ لینے اور عالمی معاملات کا بہتر توازن قائم رکھنے میں مدد ملے گی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ میں سیاسی اور اقتصادی خلا پیدا ہو گیا تھا، بہت سے کارخانے تباہ ہو چکے تھے اور تمام قوموں کی اقتصادیات افراطِ زر اور بڑے پیمانہ پر بیروزگاری کا شکار تھیں۔ اسی اثناء میں ریاستہائے متحدہ میں دونوں پارٹیوں کے ناعاقبت اندیش رہنماؤں کے ایماء پر اس بات کی دیوانہ وار کوشش کی گئی کہ ہم اپنی فاتح فوجوں کو توڑ کر اپنے ملک میں واپس آجائیں۔

مشرقی یورپ کا بیشتر حصہ سُرخ فوجوں کے زیرِ نگیں آچکا تھا اور روسی فوج کے تقریباً دو سو جنگ آزمودہ ڈویژن مسلح تیار تھے۔ اسٹالن کو یقین تھا کہ کمیونزم یورپ کے اس خلا کو تیزی سے پُر کر دے گا۔ یورپ کو کمیونسٹوں کے زیرِ نگیں لانے کے لئے انھوں نے جو داؤ پیچ استعمال کئے ان میں فوجی طاقت کی دھمکی، کمیونسٹوں کے ایماء پر ہڑتالیں، تفرقہ انداز پروپیگنڈہ، اور یونان اور دیگر مقامات میں گوریلا جنگیں شامل تھیں۔

لیکن نتیجہ کیا ہوا؟

زارشاہی کے قدیم انداز میں ترکی اور روم سے ہوتے ہوئے جو روسی دباؤ بحر روم کی طرف بڑھ رہا تھا، ٹرومین پالیسی کے تحت بڑے پیمانے پر اور بر وقت امریکی فوجی اور اقتصادی امداد اور حصول آزادی کے لئے یونانیوں کی جاں نثاری نے اس کو مسدود کر دیا

چند ماہ کے اندر ہی مغربی یورپ کی جنگ سے تباہ شدہ اقتصادیات کی از سر نو تعمیر کے لئے مارشل پلان کے تحت امداد دی گئی۔ اس کے بعد ناٹو کا وجود عمل میں آیا جو ہمارے حلیفوں اور کمیونسٹ دنیا کے درمیان ایک سپر کا کام دیتا ہے۔

یہ بھول جانا آسان ہے کہ صرف پندرہ سال پیشتر ہی بہت سے امریکی مایوسی کے ساتھ یہ پیشین گوئی کرتے تھے کہ مغربی یورپ جلد ہی کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ لیکن زیکوسلواکیہ کو چھوڑ کر روسی طاقت ان علاقوں سے آگے نہیں بڑھ سکی، جن پر سرخ فوجوں نے فتح حاصل کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ ایک بروقت جرأتمندانہ اور متحدہ کوشش کے ذریعہ یورپ کی آزادی کو بچا لیا گیا۔ اور آج یہ علاقہ اس قدر طاقتور اور خوشحال ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں نہیں رہا ہوگا۔

۱۹۴۸ء میں سوویٹ یونین نے برلن کی ناکہ بندی اور اسے محصور کرنے کے لئے سرد جنگ کا ایک اور وار کیا تھا لیکن یہاں بھی امریکی اور برطانوی قوت اور تدبر نے اس آزمائش کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ برلن میں فوج اتارنے کے جرت انگیز واقعہ کی بدولت روس کی پیش قدمی مسدود ہوگئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب بیدار ہوکر کمیونسٹ خطرے سے آگاہ ہوگیا۔

۱۹۴۸ء ہی میں یوگوسلاویہ کے لوگوں نے سوویٹ بلاک سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا اور پھر تیرہ سال تک روس کی دھمکیاں اور سبز باغ اس کو پھر اپنے حلقۂ اثر میں نہ لا سکیں۔ روس کی مفروضہ متحدہ سلطنت میں یہ پہلا بڑا انشگاف تھا۔ باوجود اس کے یوگوسلاویہ کے لوگ اب بھی خود کو کمیونسٹ ہی کہتے ہیں، وہ ایک ایسی خوشحال معاشیات کی تعمیر کر رہے ہیں جو سوویٹ اثر سے آزاد ہے۔

انیس سو اڑتالیس کا سال دراصل اسٹالن اور ان ضرورت سے زیادہ پرامید ساتھیوں کے لئے بڑا مصروف سال تھا۔ اسی سال ایشیا میں کریملن کے اشارے پر چھ ممالک میں کمیونسٹ بغاوتیں ہوئیں۔ جن میں فلپائن، انڈونیشیا، فرانسیسی ہند چینی، ملایا، برما، اور ہندوستان شامل ہیں۔

ان چھ میں سے ۵ قومیں حال ہی میں آزاد ہوئی تھیں اور کسی قدر غیر منظم اور غالباً ابتری اور کمزوری کا شکار تھیں۔ کریملن کے خیال میں وہ منظم، مالی اعتبار سے مضبوط، اور ملکی تحریک پر مبنی کمیونسٹ بغاوت کا آسانی کے ساتھ نشانہ بن سکتی تھیں۔ لیکن پانچوں جگہوں پر یہ کوششیں بُری طرح ناکام ہوئیں۔

چھٹا علاقہ ہند چینی کا تھا۔ اسے کمیونسٹ اپنے پروپیگنڈے کا نشانہ بنانے اور سفید فام نوآبادیاتی طاقت یعنی فرانس کے خلاف دباؤ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور صرف یہی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ان کی قوتوں کو جزوی کامیابی نصیب ہو سکی۔

پھر چند سال ہی کی بات ہے کہ تمام صاحب فکر مبصرین مشرق وسطیٰ میں روس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے پریشان تھے۔ مثال کے طور پر بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مصر جلد روسی حلقۂ اثر میں آنے والا ہے۔ لیکن آج ناصر کی قوم پرستی ملکی کمیونزم کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ اور روس کے ساتھ ان کے تعلقات میں سرد مہری آتی جا رہی ہے۔ اگرچہ مشرق وسطیٰ کے حالات ابھی تک مستحکم اور قابل اعتماد نہیں ہیں، لیکن روسی مفاد ان کی توقعات سے کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔

۱۹۵۵ء میں روسیوں نے ہندوستان اور جاپان میں خرشچیف کی قسم کا ایک سیاسی اقتصادی پروگرام جاری کیا۔ قسم قسم کے وعدے وعید سننے میں آئے تھے، لیکن ایک بار پھر ان کی ان کوششوں کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

آج ہندوستان اپنے تمام مسائل کے باوجود ایک جمہوری قوم ہے، جو تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور جس کے اعتماد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اور جنگ کے بعد کا جاپان بھی رفتہ رفتہ اپنے اندرونی

خلفشار پر قابو پایا جا رہا ہے اور جمہوری حکومت کے تحت اقتصادی اور سیاسی کامیابیوں میں غیر معمولی نظیر قائم کر رہا ہے۔

اب افریقہ پر غور کیجئے۔ یہ روسی خواہشات کا سب سے اہم نشانہ ہے اور اسی سے ساتھ ان کی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

گزشتہ دس سال میں افریقہ ۲۴ نئے آزاد ملک اُبھر کر سامنے آئے ہیں جب کمیونسٹوں نے اس وسیع اور پُر انتشار براعظم پر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تو اس بات کا بہت چرچا رہا کہ اب افریقی ممالک کا روس کے غلبہ سے آزاد رہنا مشکل ہے۔

لیکن سوائے اس کے کہ افریقی راجدھانیوں سے بعض اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں، اور تعلقات میں بھی کسی قدر کشیدگی اور بے اطمینانی رہی افریقی قوم پرستی روسی ترغیبات کی آج تک مزاحمت کرتی چلی آئی ہے۔

کانگو میں روسیوں کو خاص طور پر ایک ڈرامائی صدمہ نصیب ہوا۔ یہاں خود اقوام متحدہ روس کی حریف و مخالف بن گئی۔ اس صدمے کے بعد کریملن نے کوشش شروع کی کہ ایک سکریٹری جنرل کے بجائے "سہ نفری" انتظامی مجلس قائم کر کے اقوام متحدہ کی مؤثر حیثیت کو ختم کر دے۔ روسی بلاک سے باہر کسی ایک ملک نے بھی اس تجویز کی حمایت نہیں کی اور یہ بات روس کے لئے ایک اور صدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اقوام متحدہ میں ہر کام ہماری منشا کے مطابق ہو رہا ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ روس نے اب تک اس ادارے کو تباہ کرنے یا اس کی بیخ کنی کی جتنی کوششیں بھی کیں وہ سب کی سب ناکام رہی ہیں۔

کمیونسٹ چین میں بھی کہ جہاں روسیوں نے کمیونزم کی حیران کن فتح پر خود کو مبارکباد دی تھی، ایسی دشواریاں اور ایسے خطرات درپیش ہیں جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ عالمی کمیونسٹ تحریک کی قیادت کے لئے شدید رقابت موجود ہے ___ پیکن اور ماسکو کے درمیان بار بار کے نظریاتی جھگڑوں میں اسی رقابت کا اظہار ہو چکا ہے۔

اب ان سیاسی اور اقتصادی دشواریوں کے ایک اور پہلو پر نظر ڈالئے، جن کی طرف کریملن کو توجہ کرنی ہوگی۔ کریملن کی طرف سے کئی سال سے" دونوں نظاموں کے درمیان پُر امن مقابلے، کا ذکر کیا جا تا رہا ہے۔ لیکن کیا انھوں نے بالکل ایسے ہی ایک مقابلہ کا تجربہ خود اپنی دہلیز پر نہیں کیا ہے۔

پندرہ سال سے مغربی جرمنی ایک نظام کے ماتحت ترقی کر رہا ہے اور مشرقی جرمنی دوسرے کے تحت۔ نتیجہ کیا ہے؟ مغربی جرمنی ہمارے سامنے جدید دور کی عظیم اقتصادی سماجی اور سیاسی ترقی کی

مثال پیش کرتا ہے ـــــ ایک آزاد، خوش حال اور متحرک معاشرہ، جس میں بڑی توانائی اور مستقبل کے لئے عظیم امکانات ہیں۔

برخلاف اس کے مشرقی جرمنی کی حکومت کو شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ہے اور ذہنی حیثیت سے دیوالیہ ہے اور خود اس کے شہری اسے نفرت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی جرمنی میں روس کو ایسی زبردست ناکامی ہوئی ہے کہ مشرقی جرمنی کے "لوگوں کو اجتماعی طور پر" کمیونسٹ" قید سے بھاگ کر مغربی جرمنی کے "سرمایہ پرست بازو" میں جانے سے روکنے کے لئے کمیونسٹوں کو ایک دیوار تعمیر کرنی پڑی، جس پر مشین گنوں اور ٹینکوں کا پہرہ ہے

اس طرح مایوس اور ناکام ہو کر کمیونسٹ رہنماؤں نے دنیا پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ اپنے عوام کو دنیا سے الگ تھلگ کر کے ہی اپنا تابع فرمان رکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ مشرقی برلن مغرب کے لئے ایک زحمت کا باعث بنا ہوا ہے۔ لیکن یہ یورپ میں روسی پالیسی کے دیوالیہ پن کی زبردست علامت ہے

کمیونسٹوں کو خود اپنے عوام کی حمایت حاصل نہ ہونا صرف مشرقی جرمنی ہی کی بات نہیں ہے، بلکہ پولینڈ، ہنگری اور حقیقتاً ان کی باقی تمام حاشیہ نشین مصیبت زدہ ریاستوں کا یہی حال ہے۔ اور یہ اس پر ہے کہ پندرہ سال سے کمیونسٹ اسکولوں، کمیونسٹ ریڈیو، کمیونسٹ کتابوں اور اخبارات کے ذریعہ جنگ کے بعد کی نسل کے نظریات کو منظم طور پر اور نہایت شدت کے ساتھ بدلنے کی کوشش کیجاتی رہی ہے۔

انفرادی آزادی اور قومی آزادی کی اس شدید خواہش سے روس کی ناکامی کا اظہار ہوتا ہے، جس نے روسی انتہا پسندی کی مزاحمت میں تامل نہیں کیا ہے۔

پانچ سال ہوئے بڈاپسٹ کی سڑکوں پر روسی ٹینکوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ہنگری کے پچیس ہزار نوجوانوں نے اپنی جان دے کر ہمارے اس بیان کی تصدیق کی اور مشرقی جرمنی کے تقریباً چالیس لاکھ لوگوں نے، جن میں اکثریت تیس سال سے کم عمر لوگوں کی تھی، مغرب میں آزادی اور سالمیت کے حصول کے لئے اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر اس بات کا ثبوت دیا ہے۔

اگرچہ ہمیں سوویٹ یونین کی فوجی اور مادی طاقت کے بارے میں کسی بیچ مقدار ی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے، لیکن روس کی سیاسی اور اقتصادی جارحیت یورپ میں ناکام ہو چکی ہے، مشرق بعید میں ناکام ہو چکی ہے، مشرق وسطیٰ میں ناکام ہو چکی ہے اور افریقہ میں ناکام ہو چکی ہے اور کیوبا کو چھوڑ کر اسے لاطینی امریکہ میں بھی ناکامی نصیب ہوئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ سرد جنگ میں روس کو فتح نہیں، بلکہ شکست نصیب ہو رہی ہے۔

x x x

۴۷ کمیونسٹ نظریہ کی زوال آمادگی

جولائی ۱۹۶۲ء کے فورین افیرس۔ ایک فکر انگیز مقالے میں مسٹر باؤلز نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قوم پرستی کی قوت اور مغربی معاشرے کی مسلمہ کامیابی نے کمیونسٹ نظریات کی کشش کو ختم کر دیا ہے۔

کمیونزم جس کا مقصد نئے ملکوں اور پرانی قوموں کو اپنی قوت اور ناگزیریت کی رو میں بہا کر لے جانا تھا، کیا آج اسے ایک عالمی نظریہ کی حیثیت سے تقویت نصیب ہو رہی ہے؟ پارس نے فی زمانہ اپنی موزونیت اور قوت کو کھو کر خود کو تاریخی صداقت اور دور جدید کے حقائق سے بیگانہ کر لیا ہے۔

چار براعظموں میں سفر کرنے کے بعد مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ایک نظریاتی قوت کی حیثیت سے کمیونزم کو زوال نصیب ہو رہا ہے۔ کمیونسٹ عقاید اور موجودہ دور کی دشوار اقتصادی اور سیاسی حقیقتوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تضاد سے اب زیادہ سے زیادہ لوگ واقف ہوتے جا رہے ہیں۔

خود روس میں ہونے والی نظریاتی تبدیلیاں کے طریق کار کی تبدیلیوں کا پتہ دیتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا اس راستہ پر چلنے سے انکار کر رہی ہے جس پر کمیونسٹ نظریات اس سے چلنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مارکسی عقائد کی رو سے کمیونزم ایک ایسی بین الاقوامی مشعل راہ کا کام دیگا جس کے گرد، سیاسی حدود سے قطع نظر، تمام قوموں کے مزدور طبقے جمع ہو جائیں گے۔ اسی طرح لینن کو یہ امید تھی کہ روسی انقلاب کے ذریعہ کلیدی ملکوں میں ایک ایک کر کے مغربی یورپ کے تمام ملکوں میں بین الاقوامی انداز فکر کا حامل مزدور طبقہ برسر اقتدار آجائے گا۔ اس کو سخت مایوسی ہوئی کہ ایسا نہیں ہوا۔

جب اسٹالن نے عالمی انقلاب کو چھوڑ کر "ایک ملک میں اشتراکیت" کے اصول پر زور دیا تو اس نے فی الواقع ایک مدافعتی چال چلی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ سوویٹ کو ایسے دوسرے اقدامات کے لئے تیار ہونے کا وقت اور وسائل حاصل ہو جائیں جو عالمی اقتدار کے لئے قابل عمل ثابت ہو سکیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جب سُرخ فوجیں مشرقی یورپ پر چھا گئیں تو وہ وقت آپہنچا۔ سوویٹ یونین میں تعلیم کی اشاعت اور صنعتی ترقی کے ذریعہ وسائل فراہم کر لئے گئے تھے۔ تقریباً اسی وقت مغربی یورپ کے جنگ زدہ ممالک کمیونسٹ دباؤ محسوس کیا گیا۔ لیکن یہاں بھی یورپی قوموں کی تیز رفتار اقتصادی بحالی کی بدولت جس کی پشت پناہی مارشل پلان اور جس کا تحفظ بعد کو "ناٹو" کے ذریعہ کیا گیا، روسی منصوبے کی راہیں مسدود کر دی گئیں۔

اس کے بعد اسٹالن نے ایشیا اور افریقہ کی طرف رُخ کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ایشیا میں کیمونسٹوں کے ایماپر چھ ممالک میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان میں چین کا وہ بے مثال کیمونسٹ انقلاب شامل نہیں جو وہاں ایک عرصہ سے نشوونما پا رہا تھا۔ نئے آزاد شدہ ممالک ہندوستان، انڈونیشیا، برما، ملایا اور فلپائن میں یہ انقلابی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ صرف ہند چینی میں جہاں فرانس نے ناقابل عمل نوآبادیاتی حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی، کیمونسٹوں کو اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔

اس کے بعد سے ان مشکلات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے جو کیمونسٹ تحریک کو ایشیا اور افریقہ میں درپیش ہیں۔ اس کا ثبوت کیمونسٹ پروپیگنڈے کے تضاد، ماسکو اور بہت سی دیسی کیمونسٹ کیمونسٹ جماعتوں کے درمیان اختلافات، مقامی جماعتوں کی تفرقہ اندازی اور ماسکو س بار بار کی ان تبدیلیوں اور تحریکوں سے ملتا ہے جنھیں وہ ایک اطمینان بخش عملی تعلق قائم کرنے کی غرض سے عمل میں لاتا ہے۔

کیمونسٹ تحریک کا ایک قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس کے ماہرین پروپیگنڈہ کیمونزم کی منفرد اقتصادی اور سماجی خوبیوں کا ذکر کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس کی بجائے وہ کیمونزم کو قوم پرستی کی قوتوں کے حلیف کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس سے پھر ایک نظریاتی کنجلک پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مشرقی یورپ کے حاشیہ نشین ملکوں میں سوویٹ یونین کے خلافِ قومیت عمل سے دنیا واقف ہو چکی ہے۔ پھر یہ کہ قوم پرستی کی اس زبانی مدح سرائی کے ذریعہ روس والے ایک ایسی قوت کی حمایت کر رہے ہیں جو نہ صرف کیمونسٹ عقائد بلکہ خود ان کے طویل المدت مقاصد کے ساتھ بھی کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔

مثال کے طور پر آج جنوبی ویٹنام میں کیمونسٹ پروپیگنڈہ مارکسی اصطلاح میں "مزدور طبقہ" اور "محنت کش عوام" کو بغاوت کی دعوت دینے کے بجائے سفید فام غیر ملکی مداخلت کے خلاف دھمکیاں دینے کو زیادہ موثر تصور کرتا ہے۔

دیگر ممالک میں کیمونزم کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والا پروپیگنڈا ایک مثبت رکاوٹ ثابت ہوا ہے، اس لئے اسے ترک کر دیا گیا ہے تاکہ روسیوں کے روایتی مقاصد کو زیادہ موثر طریقے پر آگے بڑھایا جا سکے۔

مثال کے طور پر افغانستان میں آپ کو کوئی کیمونسٹ اشتہار، کوئی کیمونسٹ نعرہ یا مظاہرہ اور کوئی علانیہ کیمونسٹ پروپیگنڈا نہ دکھائی دے گا نہ سنائی پڑے گا۔ بجائے اس کے گروہ بندی انداز میں شاہی خاندان کے خلاف طلبا، مزدوروں اور کسانوں میں کوئی منافرت پیدا کرے،

روس کی کم از کم فی الحال یہ پالیسی ہے کہ وہ حاکم و محکوم دونوں کو اس بات پر آمادہ کرے کہ ان کے پڑوسی ملک یعنی روس کی اقتصادی امداد یعنی فنی رہنمائی، جس میں مبینہ طور پر کوئی نظریاتی تلقین مضمر نہیں ہے، افغانستان کو تیزی کے ساتھ بیسویں صدی میں لانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔

بہت سے دیگر مقامات پر سوویٹ پالیسی اور کمیونسٹ نظریات کے مفادات میں شدید تضاد پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر الجیریا میں روس ڈیگال کی حکومت کو خوش کرنے پر اس طرح تلا ہوا تھا کہ اس نے جنگ بندی کے بعد بھی الجیریا کی عارضی حکومت کو نہ تسلیم کر کے نظریاتی کامیابی کا ایک بڑا امید افزا موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ اس کے اسباب خالصتاً روس کے قومی مفادات تھے۔

اسی طرح سوویٹ یونین کو جہاں بھی منڈی ملتی ہے، وہ اپنا تیل بے دریغ فروخت کرنے لگتی ہے اور اس بات کو قطعاً نظر انداز کر دیتی ہے کہ مشرق وسطی کی تیل پیدا کرنے والی ریاستوں کی کمیونسٹ تحریک پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

اسی اثنا میں تقریباً ۵۰ ممالک میں عدالتی احکامات یا قوانین کے ذریعہ کمیونسٹ پارٹی کو ممنوع قرار دیدیا گیا ہے۔ اس میں افریقہ کے وہ بہت سے ممالک شامل نہیں ہیں جہاں کمیونسٹ پارٹی کو اپنی داغ بیل ڈالنے میں بھی کامیابی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ افریقی ممالک میں قانونی طور پر دو ممالک میں کمیونسٹ پارٹیاں کام کر رہی ہیں۔ اول ٹیونس میں جہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور دوسرے مدغاسکر میں جہاں کمیونسٹ خود کو Titoists کہتے ہیں۔

حتیٰ کہ جن ممالک میں کمیونسٹوں کو ان کی مختلف شکلوں میں سے کسی ایک میں بھی برداشت کر لیا گیا ہے، وہاں بھی وہ کچھ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ جہاں وہ دوسری جماعتوں میں مدغم ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں، وہاں ان کی انفرادی حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ اور جہاں وہ خود کو مدغم نہیں کر سکے ہیں، ان کو اکثر جیلوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔

افریقہ کے نئے ممالک میں جو طبقاتی امتیازات سے نسبتاً آزاد اور شدید قسم کے قوم پرست ہیں، گنی ان مشکلات کا مظہر ہے، جن سے کمیونسٹ نظریات دوچار ہیں۔ گنی کی ایک جماعتی ریاست میں مقام حاصل کرنے کے لئے کمیونسٹوں کو حکومت کے نہایت قوی قوم پرست مقاصد کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ گزشتہ دسمبر میں جب انھوں نے ایسا کرنے میں بے توجہی برتی تو روسی سفیر کو ملک سے چلے جانے کی ہدایت دے دی گئی تھی۔

ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن جماعت کا اندرونی خلفشار انھیں مشکلات کی غمازی کرتا ہے جن سے دوسرے ترقی پذیر ممالک کے کمیونسٹ دوچار ہیں۔ اپنے ووٹوں کی تعداد کو برقرار رکھنے کے لئے کمیونسٹوں کو اپنی نظریاتی کشش کو بالائے طاق رکھنے اور گوا اور کشمیر جیسے

قومی مسائل کے لئے اپنی حمایت کا اعلان کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ خود جماعت کے اندر ماسکو نواز اور پیکن نواز گروپ ایک دوسرے کے خلاف خطرناک اور تباہ کن نظریاتی جنگ میں مصروف ہیں۔

کسی ترقی پذیر ملک میں آپ کو مقامی کمیونسٹ قیادت سوویٹ مقاصد کے لئے ظاہری یا باطنی طور پر کارندے کی حیثیت سے کام کرتی ہوئی نظر نہیں آئے گی۔ جہاں اس پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے یا جہاں اس کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، وہاں اسے صرف یہ سمجھ کر کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ بے کار شور شرابے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی۔

انڈونیشیا کے معاملے میں ایک خاص استثنا برتنا پڑے گا۔ یہاں کی کمیونسٹ جماعت روسی بلاک سے باہر سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی کی بیشتر قوت کار اس بات میں مضمر ہے کہ اس نے انڈونیشیا کی سیاست میں نوآبادیاتی مسئلہ یعنی مغربی نیوگنی کے سوال پر خود کو قوم پرست قوتوں کا ہمنوا بنا لیا ہے۔ اگر یہ مسئلہ پرامن طور پر طے ہو جائے اور اقتصادی ترقی کے لئے جان توڑ کوشش کی جائے تو یہ توقع غلط ہوگی کہ انڈونیشیا میں کمیونزم کی موجودہ طاقت میں انحطاط آنے لگے گا۔

× × ×

جب سے سوویٹ یونین کو یہ اندازہ ہوا ہے کہ ارتقا پذیر ممالک میں کمیونسٹ نظریات کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے، اس وقت سے اس نے سیاسی مداخلت کے دو بڑے ہتھیاروں یعنی تخریبی کارروائیوں اور بیرونی امداد کی طرف تیزی کے ساتھ توجہ کرنی شروع کر دی ہے۔

جنوبی ویٹ نام اور لاؤس کی جغرافیائی صورت حال کمیونسٹ مداخلت اور تخریب کاری کے لئے بہت موزوں تھی۔ لیکن ایسی صورتوں میں جہاں کمیونسٹ پارٹی کا براہ راست کوئی اثر نہیں تھا، ماسکو اور پیکن دونوں کی تخریبی کوششوں کے خلاف عوام میں نفرت اور بیزاری کا جذبہ پیدا ہونے لگا اور کئی مقامات پر سرکاری طور پر اس کے خلاف موثر کارروائی کی گئی۔

لاطینی امریکہ کے سفر کے دوران مجھے خاص طور پر اس بات کا اندازہ ہوا۔ جاسوسی پروپیگنڈہ اور مظاہروں پر بہت زیادہ محنت اور بھاری رقوم خرچ کرنے کی وجہ سے، یا اس کے باوجود لاطینی امریکہ کے ۲۰ ممالک میں کیسٹرو کی سیاسی نمایندگی ختم ہو چکی ہے۔ کیوبا سے باہر اپنی سیاسی ناکامیوں کی تلافی کرنے کی کوشش میں اس نے حال ہی میں خود اپنے ملک میں زیادہ کٹر قسم کے کمیونسٹ عناصر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اپنے سیاسی مقاصد کو آگے بڑھانے کے ثانوی ذریعہ کے طور پر کمیونسٹ حکومتیں تیزی کے ساتھ غیر ملکی امداد کے پروگرام چلا رہی ہیں۔ سنہ ۱۹۵۵ء سے سنہ ۱۹۶۱ء تک چینی روسی بلاک نے آہنی پردے سے باہر کے ۲۸ ممالک کو تقریباً ۴ء۴ ارب ڈالر کی اقتصادی امداد اور بیشتر قرضے دیئے ہیں۔

اسی کل رقم کا تقریباً تین چوتھائی حصہ سوویٹ یونین نے دیا ہے۔ ۱۹۶۱ء کے آخر میں کمیونسٹ بلاک کے تقریباً ۸۵۰۰ فنی ماہرین کام میں مصروف تھے۔

کئی صورتوں میں یہ امداد ان ممالک کو ملی ہے جنھوں نے علی الاعلان کمیونسٹوں کی مخالفت کی تھی۔ امریکی اور یورپی غیر ملکی امداد کے پروگراموں کو درہم برہم کرنے کی ان کوششوں کا سیاسی نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو ان کا مارکس اور لینن کے نظریات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلحہ کے کنٹرول کے نازک سوال پر بھی کمیونسٹ نظریات اور روسی قوم پرستی کے مفروضہ مفادات میں کشمکش ہو رہی ہے۔

مارکس کے مطابق سرمایہ دارانہ اقتصادی بقا جنگ یا جنگ کی دھمکیوں پر منحصر ہے۔ اگر روسی رہنما خود اپنے معتقدات پر یقین رکھتے ہیں تو انھیں تخفیف اسلحہ کے ایک حقیقی اور موثر پروگرام کا داعی ہونا چاہیئے۔ اس یقین کے ساتھ اگر ریاست ہائے متحدہ اپنے دفاعی بجٹ میں کمی کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اسے بے روزگاری کے ایک ناقابل حل مسئلہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور انکار کی صورت میں عالمی رائے عامہ کی خجالت کا سامنا کرنا ہوگا۔ لیکن رازداری کے ساتھ روسی قوم پرستی کی روایتی دلچسپی نے کرملن کو معائنہ کے اصول کی کسی ایسی قابل عمل تدبیر کو مان لینے کے لئے آمادہ نہ ہونے دیا جس سے اسلحہ کا کنٹرول ایک حقیقت بن جاتا۔

جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواہ کمیونسٹ پروپیگنڈے میں مصروف رہے ہوں، یا سیاسی اقدام میں، تخریب کاری میں مصروف ہوں یا غیر ملکی امداد میں، کمیونسٹ نظریات یا روسی خارجہ پالیسی کی مدد کرنے سے قاصر رہے ہیں یا اس کے راستہ میں رکاوٹ بنے رہے ہیں۔ اور یہ کہ جیسے جیسے روسی تجربے کے تحت کوئی تدبیر یا تطبیق عملی حقیقتوں کے لئے موزوں یا ضروری ہوتی رہی، یہ نظریہ خود مبہم اور پیچیدہ ہوتا گیا یا اکثر مقامات پر اسے قطعاً نظرانداز کر دیا گیا۔

کمیونسٹ نظریہ ان قوموں کے درمیان جو اس کو ماننے کا دعوی کرتی ہیں، رابطہ اتحاد قائم کرنے میں بھی ناکام رہا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمیونسٹ نظریہ کی اہمیت کا پتہ خود کمیونسٹ بلاک کے مناقشات اور سب سے بڑھ کر ماسکو اور پیکن کے درمیان نظریاتی اختلاف سے ہی چلتا ہے۔ یہ اختلافات مارکسی نظریہ کی سیاسی اور اعتقادی راسخ الاعتقادی کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور ماسکو کی ان کوششوں کے لئے صدمہ کا باعث بن رہے ہیں جن کی روسی ماسکو ہی کی توجیہہ اس انداز میں کرنا چاہتا ہے جو روسی تجربے اور قومی صورتوں کے مطابق ہو۔

خود قوم پرستی طبقہ دارانہ نظام میں مارکس اور لینن کے نظریات کی مخالف ہے۔ کیونکہ یہ تغیرات کی بنیاد مفروضہ طور پر ناگزیر اقتصادی اور تاریخی حادثوں پر رکھنے کی بجائے کسی خاص فرد یا افراد کے گروپ کی توجیہات اور ضرورتوں پر رکھتی ہے۔ اور یہ بات ماسکو، پیکن، بلگراڈ، ترانا اور مشرقی یورپ کے

حاشیہ نشین ملکوں کے باہمی اختلافات میں نمایاں طور پر نظر آتی۔

یہ حقیقت کہ کمیونسٹ ممالک اتنا کچھ داؤ پر لگا دینے کے بعد بھی ایک مشترکہ محاذ قائم نہیں کر سکے ہیں، "اشتراکی کیمپ" کی حیثیت سے ان کے سیاسی مستقبل پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی، بلکہ اس قوت کو بھی متاثر کرتی ہے جو مارکسی نظریہ کو ناقابل شکست اتحاد کے نتیجہ میں عالمگیر حیثیت سے حاصل ہونی چاہیے۔

میں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے سلسلہ میں کمیونسٹ نظریہ ناکام رہا ہے اور خود کمیونسٹ محسوس کر رہے ہیں کہ سیاسی آلۂ کار اقتصادی تاثیر بخشی اور ڈپلومیسی کے ذریعہ کی حیثیت سے اس کی قدر و قیمت کم ہوتی جا رہی ہے۔

اگرچہ یہ رجحان آگے چل کر ہمارے لئے مفید ثابت ہوگا، لیکن میں پوری شدت کے ساتھ اس بات پر زور دوں گا کہ اس سے کسی بھی طرح اس قلیل المدت چیلنج کی اہمیت کم نہیں ہوتی جو سوویٹ یونین نے امریکی عوام و مدبرین کے سامنے پیش کر رکھا ہے۔

جیسے جیسے روسی رہنما اپنے معتقدات سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں، یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی عظیم قوتوں کو اور زیادہ تعمیری انداز میں استعمال کرنے لگیں۔ یا پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سوویٹ یونین میں عقاید متزلزل ہونے لگیں گے۔ "عقیدہ پرستوں" اور "حقیقت پسندوں" میں مقابلہ ہونے لگے گا۔ یہ صورت حال کمیونسٹ دنیا میں مایوسی اور جارحیت کا سبب بنے گی جس کے نتائج عالمی امن کے لئے خطرناک ہو سکتے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ کمیونسٹ ممالک میں اصول پرستی کے جذبہ کے زوال اور قوم پرست مقاصد کے ان کی جگہ لینے کی صورت میں یہ نتائج پیدا نہ ہوں بلکہ اس کے برعکس آنے والے وقت میں یہ کامیاب گفت و شنید اور ہمارے اور ہمارے دوستوں کے ساتھ پُرامن تعلقات رکھنے کے نئے نئی بنیادیں استوار کرنے میں مددگار ثابت ہو۔

سوال یہ ہے کہ خود امریکہ کیا کرے؟ اگر یہ درست بھی ہو کہ ایک عالمی نظریہ کی حیثیت سے کمیونزم کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے تو یہ بات ہماری آئندہ نسلوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تاوقتیکہ جمہوری عقائد جن پر کہ ہم عمل کرنے کی توقع رکھتے ہیں، ان میں مستقبل کی دنیا کے ساتھ کوئی مطابقت پیدا کی جا سکے۔

اگر یہ صورت پیش آتی ہے تو امریکی قوم کو ایک ایسا کردار ادا کرنا ہوگا جو آج تک بنی نوع انسان کی تاریخ میں کسی خوشحال اور طاقتور قوم نے ادا نہیں کیا ہے۔ اسے نہایت جرأت مندی کے ساتھ خود کو ان سماجی، اقتصادی اور سیاسی تغیرات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوگا جو روئے زمین کے کروڑہا کروڑ لوگوں کی زندگیوں میں ایک انقلاب لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمارے لئے ایسا کردار ادا کرنے میں زبردست رکاوٹیں موجود ہیں، تاہم ہمارے لئے اور کل نوعِ انسانی کے لئے امکانات بھی قریب قریب لامحدود ہیں۔

۴۸۔ تین محاذ جو کمیونسٹ دنیا کو ہماری دنیا سے جدا کرتے ہیں

مسٹر باؤلز کا خیال ہے کہ فوجی محاذ کے تحفظ کے لیے اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اقتصادی اور ثقافتی محاذوں پر "زیادہ سے زیادہ کٹرپن" کے بجائے زیادہ سے زیادہ تدبیر سازی کی پالیسی کو اپنانا چاہیے۔

۲۱ر جون ۱۹۶۲ء کو نیبراسکا یونیورسٹی میں خطبہ سے ماخوذ۔

کیا امریکہ میں خارجہ پالیسی کے بارے میں قومی پیمانہ پر اتفاق رائے موجود ہے" مجھے یقین ہے کہ خارجہ پالیسی کے تین اہم پہلوؤں کے بارے میں جواب اثبات میں ہے:

۱۔ طاقت ور مسلح افواج کی ضرورت، اور ضرورت پڑنے پر جارحیت کے خلاف اس کو استعمال کرنے کا عزم۔

۲۔ یہ حقیقت کہ ایٹمی ہتھیاروں سے فوجی صورت حال کو ایک نیا زاویہ نگاہ ملا ہے اور یہ کہ جنگ بہت جلد فریقین کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔

۳۔ سیاسی اور اقتصادی قوتوں کی اہمیت جنھوں نے بیس سال سے کم عرصے میں دنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ قوتیں ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب لے آئی ہیں۔

ہمارے باقی اختلاف کا تعلق طریق کار اور ترجیحات سے ہے، یا زیادہ واضح الفاظ میں کمیونسٹ قوموں اور غیر وابستہ قوموں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت سے ہے۔ ان اختلافات پر کھل کر بحث ہونی چاہیے تاکہ ہم اس اختلاف کو دور کر سکیں اور قومی اتفاق رائے کا ایک ایسا خاکہ تیار کر سکیں جس کی حدود میں رہتے ہوئے ہماری حکومت کے اعتبار کے ساتھ کام کر سکے۔

ان سوالوں پر غور کرتے ہوئے اکثر امریکی دو میں سے ایک گروپ کے ساتھ وابستہ نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پُرامن اور پُرسکون دنیا کی خواہش رکھتا ہے اور ہر ایک اس بات سے واقف ہے کہ ہمارے پاس کوئی اکسیر نہیں ہے، پھر بھی امریکی خارجہ پالیسی کے غیر فوجی پہلوؤں پر ان کی رائیں بہت مختلف ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک گروپ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ "زیادہ سے زیادہ کٹرپن" کا حامی ہے اور دوسرا "زیادہ سے زیادہ تدبیر سازی" کا۔

جو لوگ "زیادہ سے زیادہ کٹرپن" کے حامی ہیں۔ وہ مختصراً اس قدیم کہاوت میں یقین رکھتے ہیں

کہ جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارا مخالف ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اختلافات کے خطوط ہر جگہ واضح ہونے چاہئیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو لوگ دنیا کے بارے میں ہماری توجیہات کو نہیں مانتے، ان کے ساتھ تعاون کی کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی اور یہ کہ بالآخر کمیونسٹوں یا جمہوریت پسندوں میں سے کوئی ایک فریق پوری دنیا پر غلبہ حاصل کرے گا۔

خارجہ پالیسی کے بعض مخصوص پہلوؤں کے سلسلہ میں "زیادہ سے زیادہ کٹرپن" کے اس اندازِ فکر کا عملی مظاہرہ ریاستہائے متحدہ کی سینیٹ کے حالیہ عمل سے ہوا جب اس نے پہلی بار ہندوستان کی امداد میں تخفیف کرنے اور پولینڈ اور یوگوسلاویہ کی امداد بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ بعد میں اس قرارداد کو بل سے خارج کر دیا گیا۔ لیکن سینیٹ کے عمل سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس مکتبِ فکر کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

اس کی مخالف پالیسی یعنی "زیادہ سے زیادہ تدبیر سازی" کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کمیونسٹ دنیا کے قوت کے توازن میں تغیرات کا ایک غیر منقطع سلسلہ موجود ہے اور یہ تغیر ہر ملک کے اندرونی طور پر اور دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات میں تبدیلی پر مجبور کرتا ہے ان کا عقیدہ ہے کہ ہماری پالیسی ایسی ہونی چاہیئے کہ اس کے ذریعہ اس عمل کی ہمت افزائی ہو۔

وہ فوج کی تمام تر ضروریات سے واقف ہوتے ہوئے بھی "قوت" کی تعریف میں ذہن، اسلحہ اور صنعتی ترقی کے علاوہ عوام اور ان کو متاثر کرنے والے نظریات کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس لئے وہ انصاف، وقار اور ترقی کی اس شدید خواہش کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ جس سے ترقی پذیر قوموں کے تصورات اور پالیسیاں تشکیل پاتی ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ ہم ان دونوں اندازِ فکر یعنی کٹرپن اور تدبیر سازی پر اس نقطۂ نظر سے غور کریں گے کہ کمیونسٹ اور خود ہمارے مفادات کے درمیان تین محاذوں — یعنی عسکری، اقتصادی اور ثقافتی محاذوں پر ان کا کیا اثر ہوتا ہے۔

اگرچہ تینوں محاذوں کی کیفیت اور اہمیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن کٹرپن کے حامی ان اختلافات کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیں گے، ان کے خیال میں ہر محاذ ایک ایسی حد فاصل ہے جس پر ہمیں مضبوطی کے ساتھ قابض ہونا چاہیئے صرف ٹینکوں کے مقابلہ ہی میں نہیں بلکہ تجارت، امداد، عوام اور تصورات کے مقابلہ میں بھی۔

اس کے برعکس "تدبیر سازی" کے حامی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان تینوں محاذوں کے اختلافات ہی اس نیوکلیائی دور میں ہماری مؤثر خارجہ پالیسی کے لئے فیصلہ کن کلید ثابت ہو سکتے ہیں سوال یہ ہے کہ یہ اختلافات کیا ہیں؟

فوجی محاذ آہنی پردے کے ساتھ ساتھ بحیرۂ بالٹک سے لے کر باسفورس تک پھیلا ہوا ہے جہاں روس اور نیٹو کی فوجیں، ٹینک، طیارے، خاردار تاروں، مشاہداتی میناروں اور سرنگ والے علاقوں کے دونوں طرف ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہوئی ہیں۔

سینٹو، سیاٹو اور بہت سے دیگر کثیر القوی اور کہیں کہیں قومی فوجی معاہدوں کے ذریعہ یہ سلسلہ کم و بیش انڈونیشیا کے ساتھ چین کے جنوبی سمندر تک چلا گیا ہے۔ فوجوں اور اتحادیوں کے اس جال کے پیچھے دو مخالف طاقتور بلاکوں کی خوفناک قوت موجود ہے۔

ہماری خارجہ پالیسی کے اس فوجی محاذ کے بارے میں واضح طور پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ "کٹر پن" اور "تدبیر سازی" کے دونوں مکاتیب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ مسلح جارحیت یا جارحیت کے خطرے کی صورت میں کمزوری کے اظہار سے جارحیت کو شہ ملے گی، اس لئے یہ قابل قبول نہیں ہے۔

لیکن یہاں آکر اس اتفاق کی حدود یک لخت ختم ہو جاتی ہیں۔ کٹر انداز فکر کے حامی فوجی محاذ کی طرح اقتصادی محاذ کو بھی بے لوچ سمجھتے ہیں۔ وہ صرف فوجوں کی ہی نہیں، بلکہ تجارت، ماہرین اور سرمایہ کی راہ میں بھی رکاوٹیں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

"تدبیر سازی" کے حامی اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ وہ اقتصادی محاذ کو جرات تغیر اور آغاز کار کا موقع تصور کرتے ہیں۔

یوگوسلاویہ کی اقتصادی امداد کے سوال پر دونوں مکاتیب فکر کے اختلافات ابھر کر سامنے آگئے تھے۔ کٹر پن کے حامیوں کا یقین تھا کہ اس مدد سے محض ہمارے ایک امکانی حریف کو تقویت نصیب ہوئی ہے۔ اس کے برعکس تدبیر سازی کی پالیسی کے حامیوں کا کہنا یہ تھا کہ یہ امداد دانشمندانہ اور نتیجہ خیز ثابت ہو رہی ہے۔

آئیے ذرا ان حالات پر غور کریں جو ۱۹۴۸ء کے اوائل میں، جب یوگوسلاویہ کا سوال پہلی بار زیر بحث آیا تھا، موجود تھے

اس وقت یونان میں خانہ جنگی زوروں پر تھی۔ اور کمیونسٹ گوریلے روس کے اشاروں پر جنوبی یوگوسلاویہ کے اڈوں سے یونان کی جمہوریت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اٹلی میں ایک ناخوشگوار انتخابی مہم عروج پر آرہی تھی۔ عام افلاس، جنگ سے پیدا شدہ تباہی، اور سیاسی بدحالی کے باعث بہت سے مبصرین کو خدشہ تھا کہ تاریخ میں پہلی بار کمیونسٹ آزادانہ انتخاب میں کامیابی حاصل کریں گے۔ دنیا کے دوسرے سرے پر چینی خانہ جنگی میں کمیونسٹوں کی عظیم الشان کامیابی بھی ناگزیر نظر آرہی تھی۔

اس طرح ہمیں فرانس کی سرحدوں سے لے کر بحر جاپان تک کے علاقوں کا احاطہ کرتی ہوئی ایک متحدہ کمیونسٹ سلطنت کے قیام کا امکان نظر آرہا تھا ۔ جنگ کی ماری ہوئی یورپی قوموں اور ایشیا کی نئی آزاد شدہ قوموں پر اس صورت حال کے اثرات مبالغہ آرائی سے مبرا ہیں ۔

اس فیصلہ کن سال کے فروری اور مارچ میں اسٹالن کے ساتھ ٹیٹو کی عرصہ دراز کی پوشیدہ نا اتفاقی پہلی بار طشت از بام ہوئی ۔ جون میں یوگوسلاویہ نے جرأت مندی کے ساتھ روسی تسلط سے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور ہم سے مدد کے لئے درخواست کی ۔

اس نے صدر ٹرومین اور آرتھر وینڈن برگ کے زیر قیادت ریپبلکن کانگریس کو آزمائش کے ایسے دوراہے پر لاکر کھڑا کر دیا جو تاریخی اعتبار سے انتہائی اہم ہے ۔ جنگ کے دوران یوگوسلاویہ نے نہایت جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے تقریباً تیس ڈویژن نازیوں کو محصور کیا تھا، البتہ اب حال میں آکر یوگوسلاویہ کمیونسٹ بلاک میں انتہائی متعصب دشمن ممبروں میں سے ایک رہا تھا، اور امریکہ رائے عامہ اس کی سخت مخالف ہو گئی تھی ۔

لیکن اگر ہم ٹیٹو کو قومی آزادی کے قیام کی کوشش میں مدد نہ دے سکتے تو یوگوسلاویہ پھر اسٹالینی مدار میں جانے پر مجبور ہو جاتا اور کمیونسٹ سلطنت کا پہلا شگاف مکمل طور پر پُر ہو جاتا ۔

بہت کافی غور و خوض کے بعد دونوں جماعتوں میں اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ یوگوسلاویہ کی آزادی میں بھرپور امداد سے امریکی مفادات کا بہترین تحفظ ہو سکے گا ۔ فوراً ہی فوجی اور معاشی سامان سے لدے جہاز یوگوسلاویہ کی طرف روانہ ہو گئے ۔ ۱۹۵۲ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد صدر آئزن ہاور نے اس پالیسی کو جاری رکھنے کا اعلان کیا ۔ اس کے آٹھ بعد صدر کینیڈی نے بھی ایسا ہی کیا ۔

اس امدادی پروگرام کے فوری نتائج غیر متوقع طور پر امید افزا ثابت ہوئے ۔ یوگوسلاویہ کے انحراف کی خبروں سے اٹلی کی جمہوریت پسند قوتوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ۔ اپریل ۱۹۴۸ء کے انتخابات میں انھیں معرکۃ الآرا کامیابی نصیب ہوئی ۔

اس کے ایک سال کے بعد یونان کے کمیونسٹ گوریلوں کو یوگوسلاویہ میں اپنی سابقہ کمین گاہوں سے محروم ہو جانے کے سبب مغلوب ہو جانا پڑا ۔

اس کے بعد سے خود یوگوسلاویہ میں قابل قدر تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں ۔ روسی طرز کی دیہاتی اجتماعی تنظیمیں ترک کر دی گئی ہیں ۔ دس میں سے نو کاشتکار آج خود اپنے کھیتوں کے مالک ہیں، صنعتی ترقی کا کمیونسٹ تصور بھی بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے، اب یوگوسلاویہ کی ستر فیصدی بیرونی تجارت غیر کمیونسٹ ممالک کے ساتھ ہوتی ہے ۔ غیر ممالک میں لوگ طنزیہ

طور پر کہتے لگے ہیں "اگر آج بھی کسی کو اس بات کا یقین ہے کہ یوگوسلاویہ ایک کمیونسٹ ریاست ہے تو وہ صرف یوگوسلاوی اور امریکی باشندے ہی ہیں۔"

سیاسی مسائل پر اقوام متحدہ میں آج بھی یوگوسلاویہ کے نمائندے بیشتر روس کی حمایت کرتے ہیں اور ان کے رہنما اکثر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس سے امریکیوں کو شدید اختلاف ہوتا ہے۔

اس کے باوجود یوگوسلاویہ کو روس کا حاشیہ نشین نہیں کہا جاسکتا۔ ایک سکریٹری جنرل کے بجائے نام نہاد (TROIKA) منصوبے کے کلیدی مسئلہ پر کانگو میں اقوام متحدہ کی فوجوں کو مالی امداد دینے پر اور گزشتہ اکتوبر میں روس کے پچاس میگا ٹن کے ہائیڈروجن بم داغنے پر یوگوسلاویہ کے نمائندوں نے ریاست ہائے متحدہ کی موافقت اور روس کی مخالفت کی تھی۔ اس کے علاوہ یوگوسلاویہ کی طرف سے کمیونسٹ چین کی بھی مسلسل اور شدید مخالفت ہوتی رہی ہے۔

خود کمیونسٹ بلاک میں بھی یوگوسلاویہ کی آزادی کی مثال کا بڑا اثر پڑا ہے۔ مثال کے طور پر بہت سے مبصرین کا خیال ہے کہ اس کی شہ پاکر پولینڈ نے اجتماعی آراضی جیسے بہت سے کمیونسٹ نظریات کو ترک کر دیا ہے۔

سوویٹ یونین اور مشرقی جرمنی کی سرخ فوجوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے پولینڈ خارجہ پالیسی کے مسائل پر مستقلاً روس کی حمایت کرتا ہے۔ لیکن فوجی سرحدوں کو پار کرکے ریاستہائے متحدہ کی معمولی سی اقتصادی امداد سے پولستانیوں میں اعتماد و آزادی کا ایک نیا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ پولینڈ کی ۴۲ فی صدی غیر ملکی تجارت غیر کمیونسٹ ممالک کے ساتھ ہوتی ہے۔

یوگوسلاویہ کے لئے ہماری امدادی کوششوں کا مقصد شروع سے یہ رہا ہے کہ حکومت کو اس بات کا یقین رہے کہ وہ بنیادی طور پر اپنی پسندیدگی و ناپسندیدگی کے معاملہ میں آزاد ہے، اور وہ دوسری کمیونسٹ قوموں میں بھی آزادی کے ایسے ہی احساسات کی ہمت کی ہمت افزائی کریں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

آیئے اقتصادی محاذ کے ایک اور کلیدی حصے پر غور کریں۔ جس کے بارے میں دونوں مکتب خیال کے لوگوں کے درمیان آج بھی بحث جاری ہے، یعنی افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کی نئی اور ترقی پذیر قومیں۔

انتہائی گریز کے حامی صرف ان قوموں کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں جن کی حکومتیں ریاستہائے متحدہ کی پالیسیوں کی حمایت کرتی ہیں۔ "زیادہ سے زیادہ تدبیر سازی" کے حامیوں کا خیال ہے کہ ہمارے اس دو ٹوک انداز فکر سے نئی ترقی پذیر قومیں اس بات پر مجبور ہوں گی کہ وہ یا تو ماسکو یا واشنگٹن کی تابعداری اور بصورت دیگر ابتری اور مسلسل بدحالی میں سے ایک کو پسند کریں۔

اگر ہم ان حالات پر نظر ڈالیں جن سے آج ہمیں ترقی پذیر براعظموں میں دوچار ہونا پڑ رہا ہے، تو یہ معاملہ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

آج ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ابھرتی ہوئی قومیں ناخواندگی، بیماری، مفلسی اور بے انصافی کے خوفناک مسائل کے ساتھ دست و گریباں ہیں۔ جب تک ان کے عوام کو یہ اطمینان نہ ہو کہ ان برائیوں کے انسداد کے معاملہ میں معقول پیش رفت ہو رہی ہے، اس وقت تک باضابطہ سیاسی ارتقا ناممکن ہوگا۔

ان نئی اقوام کو امداد دینے کی امریکی کوششوں میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بعض ایسے رہنماؤں کے جھگڑالو سیاسی رویہ کی وجہ سے پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے، جنھیں اقتصادی طور پر برتر اور بعض صورتوں میں نسلی امتیاز برتنے والی مغرب کی سامراجی طاقتوں کے ساتھ ان کے دور گزشتہ کے تجربے نے تند خو بنا دیا ہے۔

جب یہ افریشیائی نمائندے اقوام متحدہ میں یا کسی اور جگہ ریاست ہائے متحدہ کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو ہمارے اداریہ نویس ان کو "ناشکر گزار اور کمیونسٹوں کے فریب خوردہ" کہکر ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور کانگریس کے ممبران مطالبہ کرتے ہیں کہ ایسی "غیر معاون" قوموں کے لئے امدادی پروگرام کو فوراً ختم کر دینا چاہیئے۔

اس قسم کے ردعمل اگرچہ ہمارے ذہنی خلفشار اور بددلی کی وجہ سے قابلِ فہم ہو سکتے ہیں، لیکن ان سے ہماری موجودہ دنیا کی پیچیدگیاں ختم نہیں ہو سکتیں۔

کمیونسٹوں کا ایک کلیدی مقصد یہ ہے کہ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ان وسائل اور منڈیوں پر قبضہ کر لیا جائے جن پر مغرب کی صنعتی قوموں کو دارومدار ہے۔ ریاستہائے متحدہ کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ وہ اس کوشش میں سدِ راہ بن کر ترقی پذیر ملکوں کو سیاسی استحکام اور اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی آزادی کی تکمیل میں ان کی مدد کرے۔

نئے ممالک کے بارے میں پہلے سے کچھ کہنا خواہ کتنا بھی دشوار ہو، ان کے بارے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس بات کی قطعاً خواہش نہیں رکھتے کہ وہ برطانیہ، فرانس، بیلجیم یا ہالینڈ کے اقتدار سے نکل کر جن سے ان کو حال ہی میں آزادی نصیب ہوئی ہے، روس کے اور زیادہ جابرانہ تسلط میں آجائیں۔ پھر ان کی اپنی تہذیب اور تاریخ ایک ایسے اختلاف کی ہمت افزائی کرتی ہیں جس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور جو خارجی دباؤ یا نظریات سے آسانی کے ساتھ متاثر نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ خود کریملن کے ماہرین حرب کو اپنے تلخ تجربے سے اندازہ ہو رہا ہے، یہ مقامی حریف قوتیں لینن کے تصور کی کمیونسٹ غلبہ والی دنیا کی راہ میں ناقابلِ تسخیر رکاوٹیں بنی ہوئی ہیں۔

"تدبیر سازی" کے مؤیدین کا خیال ہے کہ اقتصادی امداد کا ایک وسیع دراز منظم اور سوچا سمجھا پروگرام ان رکاوٹوں کی تعمیر کے لئے مزید تقویت کا باعث بنے گا۔ تاہم وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس کوشش کے مقاصد اور حدود کے سلسلہ میں ہمارا ذہن بالکل صاف ہونا چاہیئے۔

ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم ترقی پذیر قوموں کے اقوال و افکار پر اثر انداز ہوں یا روس کے مقابلہ میں عالمی ہر دلعزیزی کا مقابلہ جیتنے کی کوشش کریں۔ یا اقوام متحدہ میں ان کے ووٹ خرید سکیں۔ ایسی حکومتیں جنھیں امریکی ڈالر سے "خریدا" جا سکتا ہے ان پر اس سے زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا جتنا کہ اسی طرح خریدے ہوئے کسی فردِ واحد پر کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی ہم جیسی کسی متمول قوم کو ان قوموں سے محبت کی توقع رکھنی چاہیئے جو ہمارے برابر خوشحال نہیں ہیں۔ اس بارے میں زیادہ سے زیادہ توقع احترام کی کی جا سکتی ہے۔

اس لئے ہمارے اصلی مقاصد دو گونہ ہونے چاہئیں۔ اول یہ کہ ایسی ترقی پذیر قوموں کی اقتصادی ترقی کو فروغ اور وسعت دینے میں مدد دی جائے جو خود اپنی مدد کرنے کی خواہش مند ہیں اور دوم یہ کہ یہ مدد اس طرح کی جائے کہ ملکی کاموں میں عوام کی زیادہ سے زیادہ متمولیت کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور یہ کہ قومی آزادی کے تحفظ میں ہر خاندان کے افراد کو ہاتھ بٹانا نصیب ہو سکے۔

ان دو مقاصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے "کٹر پن" اور تدبیر سازی کے دو متضاد نظریوں کے جمہوریہ ہند پر اطلاق پر غور کیجئے جو نئی آزاد شدہ قوموں میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ اہم ہے۔

پچھلے دس سال سے زیادہ عرصہ سے ہم دنیا کے دو گنجان ترین آبادی والے ممالک ہندوستان اور چین کے درمیان عجیب و غریب تبدیلیوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں جن میں سے ایک نے استبدادی طور طریقوں کو اپنایا ہے اور دوسرا جمہوریت کا علمبردار رہا ہے۔ پچھلے دو ایک سالوں میں ان کے نتائج واضح ہوئے ہیں۔ ہندوستان نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ ایک لائق جمہوری حکومت روٹی، آزادی اور ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کر سکتی ہے، جب کہ چین اپنے داخلی خلفشار کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

پھر بھی آج جب کہ اس صورت حال کے نتائج سامنے آنے لگے ہیں "کٹر پن" کی پالیسی کے حامی یہ تجویز پیش کر رہے ہیں کہ ہمیں ہندوستان کے لئے اپنی امداد میں بھاری تخفیف کر دینی چاہیئے۔ یہ تجویز بہت سے امریکیوں کی ناراضگی کے پیشِ نظر قابلِ فہم ہو سکتی ہے جو انھیں اس بنا پر ہے کہ ہندوستانی حکومت نے دوسروں کے مشورے سے یا دوسروں کی نکتہ چینی کے ڈر سے بعض بعض غلط کام کئے ہیں ——— لیکن جو لوگ ہمارے زمانے کی تاریخ لکھیں گے انھیں یہ بات عجیب و

عزیب معلوم ہوگی۔

اس طرح ہمارے اور کمیونسٹ دنیا کے درمیان یہ اقتصادی محاذ بہت پیچیدہ ہوجاتا ہے "تدبیر سازی" کے حامیوں کی پالیسیوں کے مطابق اس محاذ کو کھلا رکھ کر ہم نے کافی پیش رفت کی ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان تیسرے محاذ یعنی ثقافتی محاذ کی نوعیت کیا ہے؟ "کنٹین" کے مکتب فکر کی رائے یہ ہے کہ ریڈیو پروپیگنڈے کے علاوہ اقتصادی محاذ کی طرح تہذیبی محاذ کو بھی عسکری محاذ کی سختی کے ساتھ بند کر دینا چاہیئے۔ "تدبیر سازی" کا طبقہ یہاں بھی لچک اور پیش قدمی کی حمایت کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے کون سا طریقہ دانشمندانہ ہے؟۔

۱۹۵۵ء کی جنیوا کانفرنس کے بعد سے اہل ہنر، طلبا، مصور، موسیقار، کاشتکار، اور سائنسداں برابر اس فوجی محاذ کو پار کر کے ادھر اُدھر آجا رہے ہیں جو روس کو مغربی دنیا سے جدا کرتا ہے۔ "کنٹین" کے موئدین کو یہ دو رویہ ثقافتی لین دین خطرناک بلکہ غیر اخلاقی، معلوم ہوتا ہے، دوسری طرف "تدبیر سازی" کے لوتح دار پروگرام کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس سے افراد کے درمیان بالمشافہ مفاہمت قائم ہونے اور دونوں دنیاؤں کے شہریوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ کشیدگی جو مشرق کو مغرب سے جدا کئے ہوئے ہے کسی وقت کم ہوئی تو یہ اسی مفاہمت کا نتیجہ ہوگا جو فوجی محاذ کے دونوں طرف آہستہ آہستہ مگر کوشش بسیار کے بعد پیدا ہو رہی ہے۔ کسی نہ کسی حد تک ہم سب ہی روایت کے غلام ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی مسخ شدہ اور مبالغہ آمیز تصویروں پر نظر ڈالتے ہیں۔ تصورات، فن، اور سائنس کی دنیا میں بہتر رابطوں سے ان غلط تصویروں کی از سر نو تشکیل میں مدد ملے گی۔ اور زیادہ واضح طور پر دیکھنے کے بعد ہم زیادہ دانشمندانہ اقدامات کر سکیں گے۔

میرا ذہن ان دونوں باتوں میں سے ایک کو چن لینے کے لئے بالکل صاف ہے۔ ہم آزاد قوم ہوتے ہوئے نظریات سے کیوں خائف ہوں؟ کیا وہ کمیونسٹ نہیں ہیں جنھیں ان سے خوفزدہ ہونا چاہیئے؟۔

× × ×

اب یہ دیکھنا ہے کہ مستقبل کے امکانات کیا ہیں؟

اگرچہ نیوکلیائی جمود اپنی جگہ خطرناک ہے پھر بھی فوجی محاذ پر ہماری حیثیت مضبوط ہے۔ روس کی دھمکیاں آئیں اور چلی گئیں۔ لیکن مغربی برلن جو اس محاذ کی ایک سرحدی چوکی ہے، آج بھی حریت پسند لوگوں کے اپنی آزادی کے دفاع کے عزم کی ایک شاندار مثال کے طور پر قائم ہے۔

گزشتہ دو سال میں ہماری فوجی قوت زیادہ متوازن اور زیادہ متحرک ہوگئی ہے اور اسی لئے ہمارے فوجی محاذ کے دفاع کے لئے زیادہ موثر بھی، ساتھ ہی ہمیں یہ بھی امید رکھنی چاہیئے کہ آخر کار روس کے رہنما دو عظیم صنعتی طاقتوں کے درمیان اس مسلسل مقابلے کی حماقت کو محسوس کریں گے کہ دوسرے کو تباہ

کرنے کے لئے کون زیادہ صلاحیت پیدا کر سکتا ہے۔
اقتصادی اور ثقافتی محاذوں پر بہتری اور تبدیلی کے امکانات زیادہ امید افزا معلوم ہوتے ہیں۔
غیر کمیونسٹ دنیا آج اس درجہ تیز رفتار اقتصادی ترقی کے کنارے پر کھڑی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی ـــــ جوں جوں ہم آزاد قوموں کے زیادہ خوشحال اور مربوط معاشرے کی تعمیر کرتے جائیں گے، روس والے مجبور ہوں گے کہ اپنے نظام کی لاحاصل سختیوں میں ترمیم کریں۔
اس اثنا میں اقتصادی اور ثقافتی محاذ کے پار تجارت، سرمایہ، فنی ماہرین، پیس کارپس کے رضاکار، گیہوں، روٹی، موسیقی اور تصورات کا سیلاب ذہنوں کو بیدار، اصول پرستی کو کم اور تنوع کی ہمت افزائی کرتا رہے گا۔
ہم امریکیوں نے ہمیشہ اس بات پر فخر کیا کہ ہم نئے تجربات کا ذوق رکھتے ہیں، نئے حالات سے مطابقت پیدا کر سکتے ہیں۔ اور عمل کے لئے نئی راہیں اختراع کرنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ ہم نے جمہوری اصولوں کے ساتھ مستحکم وابستگی قائم رکھتے ہوئے قوت حاصل کی ہے خصوصاً اس لئے کہ ہم نے تخلیقی اور ذمہ دارانہ عمل کو لکیر کے فقیر ہونے پر ترجیح دی ہے۔
اب جب کہ ہم ایک معقولیت پسند امن کے لئے راہیں تلاش کرنے میں مصروف ہیں، ہم اپنے اس روایتی تصور کو کیوں ترک کر دیں؟ اور ان نئی ترقی پذیر خود دار قوموں سے کیوں اس بات کی توقع کریں کہ وہ دنیا کو اس نظر سے دیکھیں جس سے کہ ہم دیکھتے ہیں؟ کیا دنیا کی کوئی نئی قوم جیفرسن، جیکسن اور لنکن کے نئے امریکہ سے زیادہ بے باک، حریت پسند اور غیر وابستہ رہی ہے؟

× × ×

لیکن ابھی بنیادی سوال باقی ہے اور وہ یہ کہ آیا ایک جمہوری حکومت کسی ایسی خارجہ پالیسی کی تشکیل کرکے اسے عملی جامہ پہنا سکتی ہے جو موجودہ دنیا کی پیچیدگیوں کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو؟
اس کا جواب ہماری ایک قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کی صلاحیت پر منحصر ہے جس کی بدولت صدر کو ایک ایسی ٹھوس بنیاد حاصل ہو جائے گی جہاں سے وہ عالمی قیادت کا کام انجام دے سکے گا۔
جنگ کے بعد سے ایسی رائے عامہ پیدا کرنے کی بہت سی منزلیں ہم نے طے کر لی ہیں۔ جو کچھ اختلافات باقی ہیں ان کا تعلق ایک طرف کمیونسٹ حاشیہ نشین قوموں کے بارے میں ہمارے اندازِ فکر سے ہے۔ اور دوسری طرف ایشیا اور افریقہ کی نئی غیر وابستہ قوموں کے ساتھ ہمارے تعلقات سے۔
تاریخ کے اس نازک دور میں یہ خلا امریکہ کی خارجہ پالیسی کی موثر حیثیت کے لئے نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کو صرف ایک بے باک اور ذمہ دارانہ عوامی مباحثے کے ذریعہ پُر کیا جا سکتا ہے۔ جن خیالات کا اظہار میں نے کیا ہے یہ اس مباحثے میں ایک فردِ واحد کی شمولیت ہے۔

باب دوم

امریکی خواب کی تعبیر

باب دوم پر ایک ذاتی نوٹ

باب اول میں مذکور عالمی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں ہماری صلاحیت کا تعین خود ہمارے امریکی معاشرے کی نوعیت سے ہوگا۔ اس کی تشکیل پر تین عوامل اثر انداز ہوں گے۔

—— ہمارے ملکی اقتصادیات کی قوت اور حرکت پذیری

—— ہمارے وفاقی اور ریاستی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے سیاسی نظاموں کا توازن، لوچ اور مناسب ردعمل کی صلاحیت۔

—— تمام امریکی شہریوں کے لئے زیادہ سے زیادہ وقار، انصاف اور مساوی مواقع فراہم کرنے کے سلسلہ میں ہماری اخلاقی ذمہ داری کی گیرائی۔

اگر ہم تینوں حیثیتوں سے ناکام ہوتے ہیں، تو ریاستہائے متحدہ امریکہ اس پیداواری قوت سے محروم رہیگی جو عالمگیر اقتصادی چیلنج کا مقابلہ کرسکتی ہے اس سیاسی بصیرت سے محروم رہے گی جس کی مدد سے غیر ممالک میں سیاسی گتھیوں کو سلجھایا جاسکتا ہے، اور اس قومی یکجہتی سے جس کی بدولت دوسری قوموں کا احترام حاصل کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے باب میں وہ مقالات اور تقریریں شامل ہیں جو پچھلے سترہ سال کے عرصہ میں لکھی گئیں اور جن میں ان تمام عوامل پر بحث کی گئی ہے۔ آج جب میں ان تحریروں پر دوبارہ نظر ڈالتا ہوں تو بعض کلیدی مسائل میں پیش رفت سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور بعض دیگر مسائل میں اپنی تقصیرات پر تشویش۔

ہنوز جو کام باقی ہیں ان میں بے روزگاری، نسلی امتیاز، بدعنوانی، غیر تعمیر شدہ اسکول اور مکانات، گندی بستیاں، ہماری ریاستی مجلس قانون ساز میں غیر مساوی نمائندگی، واشنگٹن میں سرکاری رکاوٹیں، ہمارے قومی شعور، اعتماد اور صلاحیت کا ریہ بار بنی ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر دس سال گزرے کنکٹیکٹ کے گورنر کی حیثیت سے جن مسائل کو میں نے ہاتھ میں لیا تھا، وہ آج ۱۹۶۲ء میں بھی قومی مقننہ میں رکے پڑے ہیں۔ ریاستوں کے حقوق کے بارے میں لسانی

فصاحت کا کمال دکھانے والے رہنما اکثر ریاست کی ذمہ داریوں کو رد کرنے والوں میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

ہمارے بہت سے عالمی مقاصد کے بارے میں ذو جماعتی اتفاق رائے حاصل ہو گیا ہے، لیکن خود ہمارے معاشرے کی نوعیت اور ضروریات پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔ اس طرح جو خلا باقی رہ جاتا ہے وہ خطرناک ہے۔

چیسٹر باؤلز

حصہ اوّل

ایک زیادہ متمول معاشرے کی طرف

میرا ایک عقیدہ ہے کہ وہ تنہا راستہ جس پر چل کر ہم اس ملک میں حقیقی اقتصادی آزادی حاصل کر سکتے ہیں، اور امریکی روایات کے مطابق فرد کی زندگی کی نشوونما کر سکتے ہیں، ایک ایسے ماحول میں پوشیدہ ہے، جس میں بھرپور پیداوار اور مکمل روزگار ہو، تجارت میں وافر منافع ہو، کارکنوں کے لئے اچھے کام اور مناسب اُجرتیں ہوں اور اور کاشتکاروں کی معقول آمدنی ہو۔ صرف اسی صورت میں ہم خوف اور عدم تحفظ کی ان بیڑیوں سے رہائی پا سکیں گے جنھوں نے ماضی میں ہم میں سے لاکھوں اشخاص کو جرأت مندانہ اور اختراعی فکر کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔

یکم ستمبر ۱۹۴۵ء

۱۔ امن اور مکمل روزگار

یوم فتح کے تین ہفتہ بعد سینٹ کی بینکنگ اور کرنسی کمیٹی نے مکمل روزگار
کے بل پر بعض اہل الرائے حضرات کے خیالات کی سماعت کی، جس کا مقصد تبدیلی کے
عظیم مسئلہ کا مقابلہ یعنی جنگ کی بعض اقتصادیات میں سب کے لئے روزگار مہیا کرنا
تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۴۵ء کو مسٹر باؤلز نے جو اس وقت پرائس ایڈمنسٹریشن کے دفتر کے
سربراہ تھے، اس کمیٹی کے سامنے اپنا بیان دیا۔

قیام امن کے ساتھ ساتھ امریکی قوم امن، خوشحالی اور افراط کے ایک نئے دروازے پر آپہنچی ہے۔
جنگ کے سالوں کے دوران ہم نے بچشم خود اس کثیر پیداوار کو دیکھا ہے جس کی ہماری صنعتی مشین
اہل ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ ایسے ہیں، جو یہ نہیں جانتے کہ یہی مشین جنگ کی پیداوار سے زمانہ امن کی پیداوار
میں تبدیل ہو کر اعلیٰ معیار زندگی، جدید مکانات اعلیٰ التعلیم، صحت کے بلند معیار تفریح اور فراغت کے لئے
کیا کچھ پیدا کر سکتی ہیں۔

مرے پٹ مین بل میں، جو آپ کی کمیٹی کے سامنے پیش ہے، یہ بتایا گیا ہے کہ امریکی قومی پالیسی
یہ ہوگی کہ اس قسم کی خوش حالی یعنی —— آزاد سرمایہ کاری کے نظام میں مسلسل خوشحالی —— حاصل
کی جائے۔ بہت سے لوگ ہیں جو اس بل کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بعض اس کی مخالفت اس وجہ
سے کرتے ہیں کہ وہ نہ حکومت کو پسند کرتے اور نہ اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور حکومت کے اس محدود
منصوبے سے ڈرتے ہیں جو اس بل کا منشا ہے۔

کیا واقعی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر حکومت ان تجاویز سے کہیں بڑھ چڑھ کر، جن پر یہاں بحث کی
گئی ہے، ہماری امداد کو نہ آئے تو اس صورت میں بھی ہم ۱۹۳۲ء جیسے سخت بحران سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔

بعض دوسرے اس خیال سے اس بل کی مخالفت کرتے ہیں کہ اس سے وفاقی حکومت دیوالیہ
ہو جائے گی۔ لیکن کیا کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچ سکتا ہے کہ جب قومی پیداوار ڈگمگا رہی ہو اور
روزگار کی تلاش میں لاکھوں اشخاص سڑک پر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہوں تو ہم ایک متوازن بجٹ کی حدود
میں وفاقی گورنمنٹ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جو عام شکست خوردگی کے احساس سے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا یہ
خیال ہے کہ آزادی اور تحفظ دو متضاد چیزیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہمیں اپنے آزاد سرمایہ کاری کے

نظام کو قائم رکھنا ہے تو ہمیں لازمی طور پر گرم بازاری اور سرد بازاری کے چکروں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسے چکر میں ہم اس سے پہلے بھی کئی بار پڑ چکے ہیں اور اس کے باوجود ہمارے ملک نے عظیم الشان ترقی کی ہے۔

نجی پیش قدمی کے ذریعہ ہم نے ایک ایسے عظیم الشان صنعتی ڈھانچے اور ایسے اعلیٰ معیار زندگی کی تعمیر کی ہے جس کی روئے زمین پر کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ اور یہ بات ہم نے انفرادی آزادی قربان کئے بغیر حاصل کی ہے۔

تاہم ماضی کے آزاد سرمایہ کاری کے نظام کی عظیم کامیابیوں اور ہمارے مستقبل کی تعمیر میں جو لامحدود خدمات یہ انجام دے سکتا ہے، اس سب کے باوجود اگر اس گرم و سرد بازاری کے چکر کو باقی رکھا گیا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔

کیا فرد کی شخصی آزادی ہمارا اصل مقصد نہیں ہے؟ کیا ہم ہر نوجوان مرد و عورت کے اس حق کا تحفظ کرنے کے خواہش مند نہیں ہیں جس کی رو سے وہ کام کاج کے کسی بھی میدان میں آزادانہ طریقے پر داخل ہو سکتا ہے؟

ان معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر جو ہمارے اقتصادی نظام کو ایک مقصد کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے خود اس کو ایک مقصد تصور کرتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ایسے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ ہوگی جو یہ خیال کرتے ہیں کہ دس سال بیشتر کی سرد بازاری کے دور میں انفرادی آزادی اور ترقی کے مواقع کا کوئی خاص احساس موجود تھا۔

میرا عقیدہ ہے کہ وہ تنہا راستہ جس پر چل کر ہم اس ملک میں حقیقی اقتصادی آزادی حاصل کر سکتے ہیں اور امریکی روایات کے مطابق فرد کی زندگی کی نشو و نما کر سکتے ہیں، ایک ایسے ماحول میں پوشیدہ ہے، جس میں بھرپور پیداوار اور مکمل روزگار ہو، تجارت میں وافر منافع ہو، کارکنوں کے لئے اچھے کام اور مناسب اجرتیں ہوں اور کاشتکاروں کی معقول آمدنی ہو۔ صرف اسی صورت میں ہم خوف اور عدم تحفظ کی ان بیڑیوں سے رہائی پا سکیں گے جنھوں نے ماضی میں ہم میں سے لاکھوں اشخاص کو جرأت مندانہ اور اختراعی فکر کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔

اس بل کا پاس ہونا زمانۂ امن کی پیداوار اور مکمل روزگار کے حصول کی کوششوں کی طرف ایک بڑا اقدام ہوگا۔ لیکن یہ بل خود کوئی پروگرام نہیں ہے۔ یہ صرف ہماری قومی پالیسی کی وضاحت اور اس کے حصول کے لئے ایک پروگرام کی تدوین کا مطالبہ کرتا ہے۔

ایک عام شہری کی حیثیت سے میں ایمانداری کے ساتھ امید کرتا ہوں کہ آئندہ چند ماہ میں ایک ایسا پروگرام مرتب ہو جائے گا، جس میں ہمارے جملہ کام گار طبقات کا سماجی تحفظ، موزوں

ترکم سے کم اُجرت کا قانون، عارضی اور ناگزیر بے روزگاری کے لئے مناسب معاوضہ کا پروگرام،
سماجی تحفظ کے ایک جزو کے طور پر صحت کا بیمہ اور کھیتی باڑی کا ایک ایسا پروگرام شامل ہوگا جو ہماری
قومی پالیسی کی حیثیت سے کاشت کی معقول آمدنی کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ سمندر پار برآمد
کے لئے وافر خوراک کا ذخیرہ بھی مہیا کرے گا۔

یہ اقدامات جرأت مندی کے ساتھ اور جلد عمل میں لائے جانے چاہئیں۔

اس عظیم ترین جنگ کے نتیجہ میں امریکہ روئے زمین کی عظیم ترین طاقت کی حیثیت سے
سامنے آیا ہے۔ اب جبکہ ہم امن کی طرف رجوع کر رہے ہیں، ہمیں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیئے
کہ یہ بات امریکہ اور صرف امریکہ میں ہی ہے کہ یہاں کے لوگ بہت زیادہ سرمائے، بہت زیادہ مزدوروں،
بہت زیادہ مشینوں اور بہت زیادہ خوراک کی بدولت تشویش میں مبتلا ہیں۔

خود اپنی خاطر اور دنیا بھر کے ان تمام لوگوں کی خاطر جنھیں جمہوریت عزیز ہے ہمیں شکست
خوردگی کے احساس کو بالائے طاق رکھ کر اس مستقبل کی تعمیر میں منہمک ہو جانا چاہیئے۔ جس کی
ہم پوری پوری اہلیت و صلاحیت رکھتے ہیں۔

★

۲۔ تغیر پذیر امریکہ کے لئے خاکہ

ایک سابق تجار کی حیثیت سے مسٹر باؤلز نے دوسرے تاجروں کو
مشورہ دیا ہے کہ وہ نجی سرمایہ کاری کے نظام کی کارکردگی اور مابعد جنگ کی بھرپور
پیداوار اور مکمل روزگار کی ضرورت کو زیادہ حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھیں۔
(سیونگ امریکن کیپٹلزم۔ مرتبہ سیمور ہیرس سے ماخوذ)

دوسری عالمگیر جنگ نے ہمارے لئے تباہی کا جو ورثہ چھوڑا ہے وہ ذہن انسانی کی
رسائی سے باہر ہے۔ اس نے شہروں، کارخانوں، دریائی بندوں، بجلی گھروں اور ریل کی پٹریوں
کو تباہ کر دیا ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نے اس کروڑہا کروڑ انسانوں کو توانائی، امیدوں
اور صلاحیتوں کو ناکارہ بنا دیا ہے جن پر دنیا کی تعمیر نو کا دارومدار ہے۔

اس عالمی تباہی کے پس منظر میں امریکہ اقتصادی اعتبار سے ایک خیالی جنت معلوم ہوتا ہے
اس کی وجہ یہ کہ جنگ ہم سے کافی دور رہی، ہمارے وسائل کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا، اور ہمارے

عوام خوشحال اور متحد ہیں۔

اس کے باوجود آج تمام امریکہ میں اقتصادی مستقبل کے متعلق تشویش پائی جاتی ہے۔ ملک سے باہر جب ایشیا اور یورپ کی بدحالی پر نظر پڑتی ہے تو بہت سے لوگ شک کرنے لگتے ہیں کہ آیا اس قلت اور احتیاج کی دنیا میں ہم ایک ایسے جزیرے پر خوش حال رہ سکتے ہیں جہاں افراط و کثرت ہے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں معاشی قلت کے فلسفہ کی بدولت ہماری اقتصادیات کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ پرل ہاربر کے واقعہ کے ایک ماہ بعد جب صدر روزویلٹ نے پچاس ہزار ہوائی جہاز اور پچاس لاکھ ٹن وزن کے بحری جہاز سالانہ تیار کرنے کا مطالبہ کیا تو بہت سے امریکیوں کو یقین تھا کہ وہ ایک ناممکن بات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

لیکن ایسا سوچنے والے غلطی پر تھے، جیسے جیسے مہینے گزرتے گئے ہمارا ملک اپنی عظیم صنعتی صلاحیت کی پوری قوت کے ساتھ پھر سے گونج اُٹھا۔ صدر نے پچاس ہزار ہوائی جہاز سالانہ تیار کرنے کا مطالبہ کیا تھا، ہم نے اسے پورا کیا۔ اور پھر اس کو دوگنا کر دیا۔ ہم نے ان کے پچاس لاکھ ٹن وزن کے بحری جہازوں کے تخمینے سے چوگنے وزن کے جہاز تیار کئے۔ ہمارے کاشتکاروں نے دس فی صدی کم مزدوروں کی مدد سے کام کر کے زراعتی پیداوار میں ۳۰ فی صدی کا اضافہ کیا۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء کے اعداد و شمار سے پتہ لگتا ہے کہ ہم نے ان سالوں میں اتنا غیر فوجی سامان پیدا کیا کہ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی اتنا سامان پیدا نہیں کیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنگی کوششوں کے عروج کے زمانے میں ہم سو ارب ڈالر سالانہ جنگی ساز و سامان اور خدمات کی پیداوار کی شرح پر پہنچ گئے تھے۔

ہمارے دورانِ جنگ کی پیداوار کے اعداد و شمار نے ایک بار پھر ہمارے اس یقین کو پختہ کر دیا ہے کہ ہماری صنعتی مشین ہماری قوم کے لئے کیا کچھ کر سکتی ہے۔ ہم نے اپنے جنگی کارخانوں کو رات دن کام کرتے دیکھا تھا تو ہم نے صارفین کے سامان کی وافر پیداوار کا بھی تصور کر لیا تھا جو یہ کارخانے زمانۂ امن میں تیار کر سکتے تھے۔ اس سے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ سرد بازاری کو کوئی ناگزیر چیز نہیں سمجھنا چاہیئے اور یہ کہ ہمیں فرسودہ اقتصادی نظریات کو پس پشت ڈال دینا چاہیئے اور یہ بھی کہ انفرادی آزادی کو ختم کئے بغیر ہم اپنے کارخانوں اور کھیتوں کو کام میں مصروف رکھیں تاکہ وہ تمام اشیا اور سامان پیدا ہو سکے جس کی ہماری قوم اور دنیا کو سخت ضرورت ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم دورانِ جنگ کے پیداواری معیار کو کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں، جس اصول پر مکمل روزگار اور بھرپور پیداوار کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، اس کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا

ہے : ایک ڈالر کا سامان پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ قوت خرید میں بھی ایک ڈالر کا اضافہ ہونا چاہیے۔

اگر پیداوار کی سطح کو برقرار رکھنا اور اس میں اضافہ کرنا مقصود ہے تو یہ تمام دولت افراد، طبقات یا اداروں کے ہاتھوں فوراً ہی خرچ ہو جانی چاہیئے۔ ورنہ سامان اور خدمات فروخت سے بچ رہیں گی اور اسی تناسب سے ہماری پیداوار گھٹ جائے گی۔

پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے ساز و سامان اور نئے کارخانوں کے آرڈر منسوخ کرنے پڑیں گے، بہت سے منصوبے ترک کرنے پڑیں گے اور بے روزگاری بڑھنے لگے گی۔ قوت خرید کم ہو جائے گی اور سرد بازاری کا سلسلہ چل پڑے گا۔ روزگار میں، ذرا ذرا سی تخفیف اور قوت خرید میں ذرا ذرا سی کمی سے اس صورت حال میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

تین طبقے ایسے ہیں جو مل کر ہماری مجموعی قوت خرید کی مظہر دولت کو خرچ کر سکتے ہیں اور اس طرح وسعت پذیر خوشحال اقتصادیات کی یقین دہانی کر سکتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ تاجروں کا ہے۔ یہ طبقہ ہر سال سرمائے کی ایک کثیر لیکن متنوع مقدار صنعتی توسیع، نئی ایجادات، نئے ساز و سامان اور تعمیرات پر خرچ کرتا ہے۔

ان تین خرچ کرنے والے طبقوں میں دوسرا طبقہ حکومت ہے جس میں وفاقی ریاستی بلدیاتی سب حکومتیں شامل ہیں۔ ہمارے سرکاری ادارے ہر سال اسکولوں، اسپتالوں، سڑکوں، پلوں، آب پاشی کے کاموں، پولیس اور آگ کے محکموں اور بری اور بحری فوجوں پر مختلف مقدار میں رقوم خرچ کرتے ہیں۔

خرچ کرنے والوں میں تیسرا طبقہ خود امریکی عوام ہیں۔ صارفین کی حیثیت سے ہم ہر سال اپنی اجرتوں، تنخواہوں اور منافع کو کھانے، کپڑے، سفر، سینما، دھلائی کی مشینوں، گرد کش مشینوں، گاڑیوں، مکانات اور بالوں کی تراش خراش پر خرچ کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ تینوں طبقے سال بہ سال اپنے اخراجات کے انداز تبدیل کرتے رہیں گے، لیکن ساز و سامان کی پیداوار کے ذریعہ ہونے والے ہر طبقے کی مجموعی آمدنی میں ان تینوں کے مجموعی مصارف کے برابر اضافہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ ہمیں شدید بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان تینوں طبقوں میں کسی نہ کسی طرح ہم آہنگی باقی رہنی چاہیئے، تاکہ ہمارے پیدا کردہ مال کی کھپت کے لئے بازار ملتا رہے، پیداوار اور روزگار کو اعلیٰ معیار پر قائم رکھا جا سکے۔ ایک ایسے معیار پر جس میں ہماری پیداواری قوت کے اضافے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہے۔

ہماری مجموعی قوت خرید کو برقرار رکھنے میں حکومت کا کردار بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

کیونکہ ہمارے موجودہ سرکاری بجٹ ہماری اقتصادیات پر اثرانداز ہوتے ہیں، اس کی زیادہ اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ہماری مجموعی قوت خرید جسے سرکاری اخراجات سے تقویت نصیب ہوتی ہے، اس کے فی صد تناسب میں مناسب حدود کے اندر ہماری ہر سال کی ضرورتوں کے مطابق تغیر ہو سکتا ہے۔

جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ حکومت کو کیا کچھ کرنا ہے اور وہ کیا کچھ کر سکتی ہے تو ہمیں بہت سی رکاوٹوں اور غلط فہمیوں سے دوچار ہونا ہوتا ہے۔ چالیس سال سے زیادہ عمر کے امریکی باشندے ایک ایسے دور میں سن بلوغ کو پہنچے تھے جب حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں میں زیادہ تر جرائم کی روک تھام، ایک مضبوط بری اور بحری فوج کی تنظیم، سڑکوں کی دیکھ بھال، اور ان محدود خدمات کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کم سے کم ٹیکس عائد کرنا شامل تھا۔

ہم سے کہا جاتا تھا کہ حکومت کے کاروبار میں کسی قسم کی توسیع انفرادی آزادی میں مداخلت ہے جس کی پوری پوری مدافعت ہونی چاہیئے۔ اور یہ کہ حکومت کا کم سے کم ضروری کام بھی قابل تعریف ہونے کے بجائے قابل درگزر ہے۔ ہمارے بچپن کے کارٹونوں میں سرکاری افسران کو اس طرح دکھایا جاتا تھا کہ وہ موٹے موٹے سیاست داں ہیں جن کے منہ میں سگار دبے ہیں، سر پر ڈربی ہیٹ ہے اور ہزار ڈالر کے نوٹ جن پر "رشوت" لکھا ہوتا تھا، ان کی جیب سے گر رہے ہیں۔

۱۹۲۹ء کے بعد سے اس تاجرانہ نظریہ کا باقی رہنا مشکل ہوگیا ہے۔ ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ ہماری حکومت کو بڑی بڑی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے ترقی کرنی چاہیئے۔ جوں جوں ہمارے اقتصادی اور سماجی نظام کی نشوونما اور اس میں نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں، حکومت کے بارے میں ہمارے پرانے اندازفکر کی تنقیح ناگزیر ہوتی گئی۔ ایسی تنقیح کے بغیر ہم کس طرح اس بات کی توقع کر سکتے تھے کہ حکومت جس کو بعض دشواریوں کی وجہ سے نئی ذمہ داریوں کو قبول کرنا پڑا تھا، وہ ان ذمہ داریوں کو مستعدی کے ساتھ معقول طریقے پر اور ہماری آزادیوں کو ختم کئے بغیر انجام دے سکتی ہے۔

ایک بڑا نازک مسئلہ جسے ہم نظرانداز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ اگر امریکی قوم بعض ضروری حدود تک حکومت کے اختیارات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو اسے بعد میں بڑی حد تک حکومت کے اختیارات کو برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ بات عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اپنی جگہ صحیح ہے۔ اگر ہم حکومت کو اتنے اختیارات دینے میں تامل کرتے ہیں کہ وہ اپنی ضروری ذمہ داریوں کو سرانجام دے سکے تو غیر حل شدہ امور ہمارے لئے پریشانی کا باعث بننے لگیں گے۔ اور اس سے پیدا شدہ ہنگامی حالات میں ہم مجبور ہوں گے کہ حکومت کو اس سے کہیں زیادہ اختیارات دیدیں جو پہلے ہی مناسب اقدام کر لینے کی صورت میں دینے ضروری ہوتے۔

× × ×

میرے خیال کے مطابق حکومت کی چھ بنیادی ذمہ داریاں ہیں پہلی ذمہ داری روایتی ہے:
یعنی ڈاک خانے کے ایک اچھے نظام اور دوسری بنیادی خدمات کو برقرار رکھنا۔ اس پر کچھ زیادہ اختلاف رائے نہیں ہو سکتا۔

حکومت کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ ہماری اقتصادیات کی تعمیر کرنے والے چار طبقوں یعنی تجارت، مزدور، کاشتکار اور ہم صارفین کے درمیان ثالث کی حیثیت سے کام کرے ہماری معاشی تاریخ کے ابتدائی ایام میں یہ کام نسبتاً غیر اہم تھا۔

لیکن بڑے پیمانے پر تجارت نے بڑے پیمانے پر کاشتکاری اور مزدوری کو جنم دیا۔ اس کی بدولت آگے چل کر بڑے پیمانے کی حکومت کی داغ بیل پڑی —— ایک ایسی مضبوط حکومت کی جو ان چودہ کروڑ شہریوں کے حقوق کے تحفظ کی قوت رکھتی تھی، جو بصورت دیگر تاجر، مزدور اور کاشتکاروں کے منظم طبقوں کے رحم و کرم پر ہوتے۔

اس سلسلہ میں حکومت کی ایک بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کسی بھی طبقے کی طرف سے ہماری قومی اقتصادیات میں اجارہ داری قائم نہ ہونے دے۔ محدود صنعتی پیداوار کا مزدوروں کی کارکردگی پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ تن آسانی اور کام میں ٹال مٹول کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں برائیاں اس تصور سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم اپنے صنعتی اور انسانی تمام وسائل کو استعمال کرنے کی اس لئے جرأت نہیں کرتے کہ ہمارے سامنے کرنے کیلئے کافی کام نہیں ہے۔

حکومت کی تیسری ذمہ داری ان خدمات کی فراہمی ہے۔ جن کی ہم ان افراد سے بجا طور پر توقع نہیں کر سکتے جو نفع، نقصان کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم بجا طور پر یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ٹینیزی ویلی اتھارٹی، جس میں ایک ارب ڈالر سرمایہ کی ضرورت تھی، نجی سرمایہ سے وجود میں آ سکتی تھی۔ ہماری یہ توقع بھی مناسب نہیں ہوگی کہ مسوری، آرکنساس، کولمبیا، سینٹ لارینس، اور ایسے ہی دوسرے بڑے دریاؤں کے پانیوں کو نجی سرمایہ سے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔

اسی باعث ہم نجی سرمایہ کاروں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ہماری گندی بستیوں کو صاف کرنے، اور جدید قسم کے پارک، ہسپتال اور تفریحی علاقوں کی تعمیر میں روپیہ لگا سکتے ہیں۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جس میں ایسی بہت سی خدمات کی گنجائش ہے جن کی امریکی قوم مستحق ہے مگر جو ابھی تک پورے طور پر ان کو نصیب نہیں ہوئی ہیں۔

نجی سرمایہ کارانہ نظام کے تحت حکومت کی چوتھی ذمہ داری یہ ہونی چاہیئے کہ وہ بلا امتیاز

نسل، مذہب اور رنگ کے تمام شہریوں کے لئے جائز مساوات اور ترقی کے مواقع مہیا کرے۔ اپنی پوری تاریخ میں، ہم فخر کے ساتھ ایسے بہت سے لوگوں کے نام لے سکتے ہیں جو افلاس سے نکل کر حکومت، تجارت اور قانون میں ذمہ دار حیثیتوں کے مالک بنے ہیں۔

لیکن ہر دیانتدار مبصر کو اقرار کرنا پڑے گا کہ ابھی ہم اپنے نصب العین سے بہت دور ہیں۔ دولت مند والدین کے لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم، صحت، تفریح اور عمومی ترقی کے جو مواقع حاصل ہیں وہ کم آمدنی والے طبقوں کے بچوں کو میسر نہیں۔

ہماری وفاقی حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس بات کو دیکھے کہ ریاست ہائے متحدہ کے ہر لڑکے اور لڑکی کو اپنے والدین کی آمدنی سے قطع نظر اعلیٰ تعلیم کے مواقع حاصل ہیں۔

ہمیں صحت عامہ کا بھی ایک کم سے کم معیار مقرر کرنا ہوگا۔ اور یہ کم سے کم معیار بھی کافی اونچے درجے کا ہونا چاہیئے۔ طبی بیمہ کے ایک جامع پروگرام کے لئے ضرورت ہوگی کہ کئی ہزار ہسپتال تعمیر کئے جائیں اور ہزاروں ڈاکٹروں، دندان سازوں، اور نرسوں کو تربیت دی جائے۔ ہماری قوم ایک دولت قوم ہے۔ ہم اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں تجمل نہیں کر سکتے۔

تمام لوگوں کیلئے عمدہ مکانات مہیا کرنے میں بھی حکومت کو عجلت سے کام لینا چاہیئے۔ جنگ سے پہلے یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ ایک تہائی سے زیادہ امریکی خاندان ایسی بستیوں میں رہ رہے ہیں جو ان کی رہائش کے لئے بہت ہی ناموزوں تھیں مکان سازی کی صنعت، جس پر چند لوگوں کی اجارہ داری تھی، جو تن آسانی میں مبتلا تھی اور جو سیاسی محرکات سے متاثرہ عمارتی قوانین کے تابع تھی اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو نبھانے میں بری طرح ناکام ہوئی ہے۔

ہماری حکومت کی پانچویں ذمہ داری یہ ہے کہ وہ درآمد اور برآمد کے پروگرام میں اس طرح یکجہتی پیدا کرے کہ اس سے دنیا بھر میں مصیبت زدگان کی امداد اور آبادکاری کا کام باقاعدگی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

دنیا کی عظیم قوموں میں صرف ہماری ہی ایک ایسی قوم ہے جو جنگ سے دور رہی۔ ہم قدرتی وسائل، انسانی ذہانت اور پیداواری صلاحیت کے اعتبار سے دولت مند ہیں۔ جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں وہ روز بروز تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ آج بھی یہ کہتے کہ ہم پر باقی دنیا کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور یہ کہ ہماری کوششیں یہ ہونی چاہئیں کہ ہماری اپنی قومی دولت میں اضافہ ہوتا رہے، ہماری اپنی بہبودی اور دنیا بھر کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ اس نقطۂ نظر کو مسترد کر دیا جائے۔

ہم دنیا کی گندی بستی میں امریکیوں کے لئے محل بنا کر کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک تمام قوموں کا معیار زندگی بلند نہ ہو اس وقت تک خود ہمارے لئے اور بچوں کے لئے امن و اطمینان

نصیب نہیں ہو سکتا۔

اگر ہمیں دنیا کی پیداواری قوت میں اور اس کے ذریعہ دنیا کے لوگوں کے سکون و سلامتی میں اضافہ کرنا ہے تو ضروری ہوگا کہ ہم دنیا بھر کی زراعت کو طرز جدید پر لے آئیں۔ یہ آئندہ نسل کے لئے ایک بنیادی چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے نقل و حمل کے ایک جدید نظام کی تعمیر، برقی قوت کی ترقی، اور بنیادی صنعتی مشینوں کی تعمیر میں مدد کرنی چاہیئے۔ یہاں امریکہ کی انتظامی صلاحیت کے لئے لامحدود مواقع موجود ہیں۔

سوویٹ یونین اور کمیونسٹ جماعتیں بھوکے لوگوں کو اعلیٰ معیار زندگی اور بہتر اقتصادی تحفظ کی امید دلاتی ہیں۔ اگر ہمیں اس چیلنج کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے تو خواہ ہم کتنے ہی حق پر ہوں، صرف اس بات کے لئے دلیلیں پیش کرنا کافی نہیں ہوگا کہ کمیونزم کا مطلب سیاسی جمہوریت کا خاتمہ ہے۔ ہمیں دنیا بھر میں صرف سیاسی آزادی ہی کو نہیں، بلکہ اقتصادی جمہوریت کو بھی فروغ دینا ہے

حکومت کی چھٹی اور آخری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کرے کہ ہم جو بھی کچھ پیدا کریں، ہمیں اس کے لئے منڈیاں ملتی رہیں۔

میرا اصرار اس پر ہے کہ حکومت اس بات کا خیال رکھے کہ ہمارے مزدور کاشتکار، اور تاجر ہر سال جو کچھ پیدا کرتے ہیں اس کے لئے ملک میں قوت خرید بھی موجود رہنی چاہیئے۔ اگر ہمیں بھرپور پیداوار اور مکمل روزگار کو باقی رکھنا ہے تو ہمارے لئے ایسا کرنا نہایت ضروری ہوگا۔ یہ ضمانت جس قدر موثر ہوگی، ہمارے اقتصادی نظریہ میں اسی قدر زیادہ استحکام پیدا ہوگا۔ اور اسی قدر یقینی طور پر ہماری محدود ضروریات تکمیل کا جامہ پہنیں گی۔ یہ نکتہ خاص طور پر توجہ کا مستحق ہے۔

× × ×

نام نہاد عمومی حالات میں ہر تاجر کو دو خطرات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ پہلا اور عمومی خطرہ کا مقابلہ ہے جس میں اس کی صلاحیت کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ اپنی صنعت میں مناسب قیمت پر عمدہ مال پیدا کرنے میں دوسرے تاجروں کا کہاں تک مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ ایک جائز خطرہ ہے اور جو بھی تاجر ہمارے نجی سرمایہ کاری کے نظام کو دل سے تسلیم کرتا ہے اس کو اس کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔

دوسرا خطرہ سرد بازاری کا ہوتا ہے۔ سرد بازاری نااہلوں کے ساتھ صلاحیت والے لوگوں کو بھی دیوالیہ بنا دیتی ہے۔ سرد بازاری کے مستقل خوف سے تاجر مجبوراً اپنی پیداوار کو محدود کرتا رہتا ہے، توسیع کی تجاویز میں تخفیف کرنی ہوتی ہے، اتنا وافر ذخیرہ اکٹھا کرنا ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ سرد بازاری کے زمانے میں بقا کی امید کر سکتا ہے۔

جدید اقتصادیات کی کارکردگی کے بارے میں آج ہم جو کچھ جانتے ہیں، اس کے پیش نظر دوسرا

خطرہ بالکل غیر ضروری ہے۔ دانشمندانہ اور جمہوری عمل کے ذریعہ اس کا انسداد ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم مفاد عامّہ کی تعمیرات میں ہم آہنگی اور ان کے اوقات کا تعین کریں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہوگا کہ ہم اپنی ٹیکس اور مالی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کریں۔ ٹیکس کا قانون جس پر ہم کئی سال سے عمل کرتے چلے آرہے ہیں، ایک پرانے دیہاتی مکان کی مانند ہو گیا ہے۔ جس میں ایک حصے کا اضافہ یہاں ہوا ہے تو ایک کوٹھا وہاں بن گیا ہے، اور کسی دوسری جگہ کوئی اور کمرہ تیار ہو گیا ہے۔ اگر ہمارے ٹیکس کے نظام کو بھرپور پیداوار اور مکمل روزگار میں معاون ہونا ہے تو اس میں سرتاپا ترمیم کرنی ضروری ہے۔

جدید محصول کی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ وہ نئی سرمایہ کاری کی نشوونما کے لئے باعث تحریک ہو۔ نئے کاروبار کو اتنی مہلت ملنی چاہیئے کہ وہ ابتدائی سالوں میں نقصانات کی تلافی کریں جنھیں ان منافعوں سے محسوب کیا جا سکتا ہے جو وہ حالات بدلنے پر کما سکتے ہیں۔

بہت سے ماہرین اقتصادیات اس بات سے متفق ہیں کہ ٹیکس کی بنیادی شرحوں کو ہمارے اس وقت کے معاشی حالات کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ جس دور میں قیمتیں بڑھ رہی ہوں اس دور میں ٹیکس بھی زیادہ ہونے چاہئیں اور ایسے زمانہ میں جب کہ پیداوار میں کمی کا خطرہ ہو، تو ٹیکسوں میں کمی ہو جانی چاہیئے تاکہ قوتِ خرید اور محرکات میں اضافہ ہو سکے۔

میں صدر سے مل کر انھیں یہ مشورہ دوں گا کہ ان کی اقتصادی کونسل کو ایک خاص دائرے میں رہتے ہوئے، ہماری اقتصادی ضرورتوں کے مطابق ٹیکسوں میں کمی بیشی کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ صدر کے اس اختیار کو البتہ واضح طور پر قانون کی پشت پناہی حاصل ہونی چاہیئے۔ اس سے یہ ہوگا کہ ہماری اقتصادیات کے افراطِ زر یا قلتِ زر کے رجحان کے ساتھ ساتھ ہماری قوت خرید بھی گھٹتی بڑھتی رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اقتصادیات کا اتنا علم اور تجربہ ضرور ہے کہ اس کی بدولت اس قسم کا ایک ادارہ تجارت کے ان جھکڑوں کو ہموار رکھنے میں اہم کردار ادا کر سکے گا۔

بہرکیف یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ نجی سرمایہ کاری کے نظام کے تحت حکومت تمام اقتصادی مسائل کو حل کر دے گی۔ سرکاری مصارف میں کتنی بھی ہم آہنگی پیدا کی جائے، نجی سرمایہ کاری نظام میں تاجروں، مزدوروں اور کاشتکاروں کے ان کے اپنے اقتصادی فرائض کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی میں ناکامی کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہمارا نجی سرمایہ کارانہ نظام قائم ہے اور اس کو ختم کرنا یقیناً ایک حماقت ہوگی ـــــ اس وقت تک ہماری اقتصادیات پر تاجروں، مزدوروں اور کاشتکاروں کے نفع، اجرتیں اور قیمتیں مقرر کرنے اور سہولیات کی توسیع کے منصوبے بنانے کے بارے میں انفرادی

فیصلے سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے رہیں گے۔

اگر ہمیں اپنے اقتصادی مستقبل کا کوئی معقول حل تلاش کرنا ہے تو اس کے لئے ذمہ دار مزدور قیادت کی ضرورت ہوگی۔ تن آسانی کے طور طریقوں کو ختم کرکے انفرادی طور پر ہر کارکن کو یہ عزم کرنا ہوگا کہ وہ پورے دن کی تنخواہ کے عوض پورے دن کام کرے گا۔

لیکن سب سے بڑی ذمہ داری ہمارے تاجر کی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نجی سرمایہ کاری کی اقتصادیات تجارتی اقتصادیات ہے۔ تاجروں سے کسی ایسی بات کی توقع کرنا نامناسب ہوگا جو ان کے لئے منافع بخش نہ ہو۔ منافع ہی تجارت کی اصل روح ہے۔

لیکن اگر ہمارے تاجرین کو صرف اپنے تک ہی نہیں بلکہ مجموعی طور پر ہماری پوری اقتصادیات کے تئیں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں تو ان کی منافع اندوزی طویل المدت انداز کی ہونی چاہیئے۔

صرف تین صورتیں ہیں جن میں اُجرتیں بڑھائی جاسکتی ہیں۔ ایک ایسا کاروبار جس میں کافی سے زیادہ نفع ہو رہا ہو، زیادہ اُجرتیں دے سکتا ہے، قیمتوں کی موجودہ سطح کو برقرار رکھ سکتا ہے، اور پھر بھی معقول ـــــــ منافع کما سکتا ہے۔ ایک ایسا کاروبار جو معیار سے کم اُجرتیں دیتا ہے پھر بھی معمولی سے زیادہ نفع نہیں کماتا وہ اپنی قیمتوں میں اضافہ کرکے اُجرتیں بڑھا سکتا ہے اور اسے بڑھانی چاہئیں۔ جہاں اُجرتیں معیار سے کم ہوں وہاں یہ قدم ضرور اُٹھایا جانا چاہیئے۔ جو تاجر یہ اُجرت کا کم سے کم معیار بھی پورا نہیں کرسکتے اُنھیں تجارت میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیئے۔ صارفین کی حیثیت سے ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کم معیار اُجرتوں سے فائدہ اُٹھائے۔

آخری صورت میں قیمتیں خواہ اپنی جگہ پر قائم رہیں یا کم ہو جائیں، اور منافع اپنی اصل جگہ پر قائم رہے یا بڑھ جائے، مزدور کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرکے اُجرتوں میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ آخری طریقہ ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس پر ہم اپنے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے بھروسہ کرسکتے ہیں۔ جنگ سے پہلے بیس سال کے دوران کام کے ایک گھنٹہ کی پیداوار میں چار فی صدی سالانہ کا اضافہ ہوتا تھا۔

کام کے ایک گھنٹہ کی پیداوار میں اضافہ اچھی مشینوں اور بہتر سہولتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ منتظمین اپنی مشینوں کی کارکردگی کو بڑھانے کے لئے منافع کو اس میں لگانے پر مائل ہوں تو ان کو یہ توقع کرنے کا بھی حق حاصل ہے کہ کارکنان کی بڑھتی ہوئی پیداواری صلاحیت کا ایک حصہ ان کو منافع میں اضافے کے طور پر ملے۔ لیکن اتنی ہی واضح یہ بات بھی ہے کہ کارکنان کی فی گھنٹہ بڑھی ہوئی پیداوار کا ایک معتد بہ حصہ اُجرتوں میں اضافہ کے لئے بھی وقف ہونا چاہیئے۔

اگر منتظمین اس نظریہ کو قبول نہ کریں یا مزدور اپنی ذمہ داری کو پورا نہ کریں تو ہم بڑھی ہوئی اس

قوت خرید سے محروم رہیں گے جو سامان کی بڑھتی ہوئی پیداوار کو خریدنے کے لئے ضروری ہے۔ بالکل یہی حالات ۱۹۲۹ء کی تباہ کن کساد بازاری کا باعث بنے تھے۔

نجی سرمایہ کاری کے نظام میں سب سے اہم بات جس میں تاجر کو دور رس فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ قیمتوں کا تعین ہے۔ بعض مرتبہ قیمتیں بہت اونچی مقرر کی جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تاجر پھیلی ہوئی تجارت اور بڑھتے ہوئے اس منافع سے واقف نہیں ہوتے جو نسبتاً کم قیمت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ امریکی تجارت کے ہر شعبہ میں ہم نے ایسی مثالیں دیکھی ہیں کہ نسبتاً کم قیمت کے نتیجے میں تجارت میں بے پناہ توسیع اور منافع میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

نجی فیصلوں کے میدان میں میں جس امر پر اصرار کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ تجارت میں اضافہ ہو، کارکنان و منتظمین کے تعلقات پر زیادہ توجہ دی جائے، تجارت کے ترقی یافتہ طریقوں کو عمل میں لایا جائے اور طویل المیعاد منافع کے امکانات کو جن کی بنیاد وسیع تجارت پر ہو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے۔

اگر ہمیں منڈیوں اور قیمتِ خرید کو، جس پر بھرپور پیداوار کا دارومدار ہے برقرار رکھنا ہے تو اس میں حکومت کی بھی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ لیکن اجرتوں، قیمتوں اور منافع کے تعین کے سلسلہ میں کارکنوں، کاشتکاروں اور تاجروں کی ذمہ داری اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔

اگر کسی وجہ سے نجی فیصلے کے اس میدان میں ہم ناکام ہو جاتے ہیں تو ہماری اقتصادیات میں حکومت کی ذمہ داری یقیناً بڑھ جائے گی۔ اگر قیمتوں کا اضافہ اجارہ دارانہ انداز میں ترقی پاتا رہے تو سرکاری کنٹرول کی ضرورت اور بڑھ جائے گی۔ اگر کارکنان اور منتظمین کے جھگڑے بڑھ کر ہماری اقتصادی زندگی پر بڑے پیمانے پر اثر انداز ہونے لگیں تو اس ضرورت میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔

اگر زمانۂ امن میں حکومت کو ایک بار اس حلقے میں مداخلت کرنی پڑے، جو پرائیویٹ فیصلوں کے لئے مخصوص ہے تو سرکاری کنٹرول پھیلتا چلا جائے گا کیونکہ ایک کنٹرول دوسرے کنٹرول کی ضرورت پیدا کرنے لگتا ہے۔ اس سے بچنے کی ہمیں ہر ممکن کرنی چاہیئے۔

۳ ۔ معاشی افزائش پر ایک نظر

امریکی اقتصادیات میں سست روی کے مسلسل رجحان کے پیش نظر کانگریس کے کارکن مسٹر باولز نے ایوان نمائندگان کے سامنے ایک اہم تقریر کے دوران تیز رفتار افزائش کے لئے موثر نجی اور سرکاری اقدامات کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ (۲۹ رجون ۱۹۵۹ء)

جناب اسپیکر! آج سہ پہر کے وقت اس ایوان میں میں نے اس موضوع پر بولنے کی اجازت مانگی ہے، جو میرے خیال میں ایک اہم ترین مسئلہ ہے جس سے آج امریکی قوم دوچار ہے۔ میرا اشارہ گزشتہ سالوں میں قومی اقتصادیات کی اس مسلسل ناکامی کی طرف ہے جو اسے افراطِ زر کے بغیر زیادہ سے زیادہ روزگار کے ساتھ مسلسل افزائش کی لامحدود صلاحیت کو کام میں لانے کے سلسلہ میں ہو رہی ہے۔

اس چیلنج کے پورا کرنے میں کامیابی سے نہ صرف یہ کہ ہمارے معاشرے کی آئندہ سالوں کی نوعیت متعین ہوگی، بلکہ اس انقلابی دنیا میں ہماری قائدانہ صلاحیتوں کا تعین بھی اسی سے ہوگا۔

دس سال کے اندر ہم تیسری بار اقتصادی پسماندگی سے اُبھر رہے ہیں۔ پہلی پس ماندگی ۱۹۴۹ء میں پیش آئی تھی، دوسری ۵۳-۱۹۵۳ء میں اور تیسری ۵۸-۱۹۵۷ء میں۔

گزشتہ سالوں میں جو پیداوار ضائع ہوئی وہ ہمیشہ کے لئے ضائع ہو گئی اور اس کی مجموعی مقدار بہت زیادہ ہے۔ اگر کوریا کی جنگ کے بعد سے ہماری پیداوار دوسری عالمگیر جنگ کے بعد کی ۴ فیصدی سالانہ کی شرح سے جاری رہتی تو ہم تے اپنی موجودہ اصل پیداوار کے مقابلہ میں ایک سو ستر ارب ڈالر کا ساز و سامان زیادہ پیدا کیا ہوتا۔

اگر ہم اضافہ کی ۵ فی صدی سالانہ شرح تک پہنچ گئے ہوتے، جسے ۱۹۵۶ء کی راک فیلر رپورٹ میں قابلِ عمل اور ضروری قرار دیا گیا ہے تو کوریا کی جنگ کے بعد سے ہماری پیداوار کا مجموعی اضافہ ۴۰۰ ارب ڈالر سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

یہ بڑی زبردست رقم ہے۔ یہ ہماری تقریباً پورے ایک سال کی قومی آمدنی کے برابر اور ہمارے قومی قرضے کی رقم یعنی ۲۸۵ ارب ڈالر سے ڈیڑھ گنی ہے۔

کوریا کی جنگ کے بعد سے ہم اپنے امکانی اقتصادی تقاضوں کو پورا کرنے میں کیوں ناکام

رہے ہیں؟ ایسی کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے؟

اس کے اسباب متعدد اور پیچیدہ ہیں۔ ایماندار آدمی ان کی نوعیت اور ان کے تدارک کے طریقے دونوں ہی سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ یہاں میں یہ خیال ظاہر کرنے کی جسارت کروں گا کہ ہماری اس پسماندگی کو مورخ اس بات سے منسوب کریں گے کہ ہم اس نجی سرمایہ کارانہ نظام کی قوت عمل کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے جس کی ہم زبانی طور پر اس قدر حمایت کرتے رہتے تھے۔

ہماری غلطی یہ نہیں ہے کہ اپنی وفاقی حکومت کی قوت کو اپنی اقتصادیات کے سلسلہ میں استعمال کرنے سے قاصر رہے ہیں، بلکہ ہماری مشکلات اس سبب سے پیدا ہوتی رہی ہیں کہ ہم نے اس طاقت کو غلط مقاصد کے لئے غلط اسباب اور غلط طریقوں سے استعمال کیا ہے۔

حکومت کی طاقت اور اس کے اداروں کو اقتصادی افزائش اور زیادہ روزگار کی ہمت افزائی کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ہم نے اپنی غفلت سے اسے افزائش کو روکنے کے لئے استعمال کیا اور اس خیال خام میں مبتلا رہے ہیں کہ مسلسل افزائش، زیادہ روزگار اور مستحکم قیمتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اگرچہ ہم سب اس بات سے متفق ہیں کہ بعض قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ لیکن تقریباً ایک سال سے ضروریات زندگی کی قیمتیں اپنی جگہ قائم ہیں۔ لیبر ڈپارٹمنٹ کی اطلاع کے مطابق قیمتوں کے استحکام میں پچھلے ۱۹ سال کے عرصہ میں اس وقت سب سے زیادہ ٹھیراؤ پیدا ہوا ہے۔

اضافے کا جہاں تک تعلق ہے، مشترکہ سرمائے اور غیر منقولہ املاک کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کی قیمت اربوں اور کھربوں ڈالر بڑھ گئی ہے۔

جناب اسپیکر! اگر یہ صورت حال جاری رہی تو یہ نام نہاد منڈیں ایک روز جواب دے بیٹھیں گی، جیسا کہ ماضی میں ہو چکا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو چھوٹے چھوٹے لاکھوں حصہ داروں کو سخت نقصان پہنچے گا اور ان میں اکثر وہ لوگ ہوں گے جو افراط زر کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو کی وجہ سے پہلے ہی بازار میں آنے سے خائف تھے۔

ایک مستحکم شرح پر افزائش کے معاملہ میں ہماری اقتصادیات کی ناکامی ایک ایسا معاملہ ہے، جس سے کانگریس کے سامنے آنے والا ہر مسئلہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہم اس سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری سے گریز نہیں کر سکتے۔ اس جذبے کے تحت ہمیں قومی اقتصادیات کے بارے میں اس واضح ترین بیان پر پھر سے غور کرنا چاہیئے جسے کانگریس نے منظور کیا تھا، میرا اشارہ ۱۹۴۶ء امپلائمنٹ ایکٹ کی طرف ہے۔

یہ قانون مابعد جنگ کے تعاون اور اعتماد کے جذبہ کے ماتحت بنایا گیا تھا۔ ایک دو جماعتی گروپ نے اسے کانگریس کے سامنے پیش کیا تھا اور دونوں جماعتوں کی بھاری اکثریت نے

اس کی تائید کی تھی۔

اس بل کا واضح مقصد عام فلاح و بہبود تھا۔ اس میں صدر سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ "ریاست ہائے متحدہ میں روزگار، پیداوار اور قوتِ خرید کے معیاروں اور ان معیاروں کا تعین کرتے ہوئے ایک اقتصادی رپورٹ کانگریس کو پیش کریں جو اعلان شدہ پالیسی پر عمل درآمد کرانے کے سلسلہ میں ضروری تھے"۔

گزشتہ جنوری کی اقتصادی رپورٹ میں صدر آئزن ہاور نے اس ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا ہے: مگر انھوں نے سابقہ اقتصادی رپورٹوں کی قائم کردہ روایات کی پیروی نہیں کی جس کے مطابق ہر سال قومی مقاصد کو حالات کے تحت ڈھالا جاتا تھا اور ان کے حصول کے ذرائع متعین کئے جاتے تھے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس ایوان میں اپنی موجودہ سست رفتار افزائش کے وجوہ کے بارے میں کوئی اتفاق رائے پیدا کرلیں۔ ایک بار متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہوجائے تو ہم عمل کی راہیں متعین کرسکینگے جو ہمیں ایک بار پھر مسلسل اور بڑھتی ہوئی پیداوار اور مستحکم قیمتوں کی شاہراہ پر لے جائیں گی۔

اس سلسلہ میں چند نکات پیش کئے جاتے ہیں۔

اول: مجھے امید ہے کہ جوائنٹ اکانومک کمیٹی کی رپورٹ اور مشاہدات میں اعداد و شمار کا وہ نقشہ شامل ہوگا، جس سے یہ ظاہر ہوسکے گا کہ جب ہماری نفری قوت، مشینوں اور سرمایہ کا پورا پورا استعمال ہونے لگے گا تو ہماری نجی اور سرکاری اقتصادیات کی کیا صورت ہوگی۔

دوسرے: مجھے امید ہے کہ یہ رپورٹ ہماری حقیقی توانائی کا ایک واضح تخمینہ پیش کریگی جو ان نکات پر حاوی ہوگا۔ ہماری وہ قوت خرید جو توسیع پذیر منڈیوں کی صنعت میں مدد کے لئے ضروری ہے، سرمایہ کی نوع اور مقدار جو ہماری صنعتی مشینوں کی مسلسل توسیع و تجدید کے لئے درکار ہے، ان سماجی خدمات کا پھیلاؤ اور تنوع جو روئے زمین کی مالدار ترین قوم ہونے کی حیثیت سے ہمیں حاصل ہوں گی۔

تیسرے: مجھے امید ہے کہ رپورٹ مجموعی حیثیت سے ان توسیعی اثرات کی نشان دہی کریگی جو ہماری اقتصادیات کے عروج کے زمانے میں ہمارے وفاقی، ریاستی اور بلدیاتی مالیات پر مرتب ہونگے۔

چوتھے: مجھے امید ہے کہ ہمارے موجودہ ٹیکس کے نظام کا تجزیہ اور ان میں اصلاحات تجویز کرتے ہوئے "ویز اینڈ میننس کمیٹی" ان طریقوں پر بھی غور کرے گی جن سے ہماری ریاستی اور بلدیاتی حکومتوں کو ٹیکس کی رقوم کا زیادہ حصہ مل سکے۔ اور ٹیکس کے ان مخصوص محرکات پر بھی جو صنعتی توسیع اور پیداوار کے لئے ضروری ہیں۔

چونکہ تجارت میں لگائے ہوئے سرمائے کے ہر ایک ڈالر سے ہر سال خالص قومی پیداوار

کے دو ڈالر بن جاتے ہیں، اس لئے ایسی کوشش ہماری اقتصادیات کے لئے تحریک کا باعث ثابت ہوگی۔

پانچویں: مجھے اُمید ہے کہ ٹیکس سسٹم کی خامیوں، جیسی بڑی تجارت کے مصارف کے حساب پر بھاری تخفیف وغیرہ پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ مختلف طریقوں سے ہر سال تقریباً چار ارب ڈالر کا خسارہ ہوجاتا ہے۔

چھٹے: مجھے اُمید ہے کہ نیم اجارہ دار صنعتوں کی "مقرر کردہ" قیمتوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مختلف تجاویز پر غور کیا جائے گا۔ ان تجاویز پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہئے کہ آیا موجودہ قانون اجارہ داری کو اور وسعت دیدی جائے۔ کیا "حد سے تجاوز" کا مخصوص ٹیکس قابلِ عمل اور موثر ثابت ہوگا؟۔

ساتویں: اس سلسلہ میں مجھے اُمید ہے کہ ایوان کو اس بات کا بھی موقع ملے گا کہ وہ بڑھتی ہوئی قیمتوں یا اجرتوں کے سلسلہ میں جو ہماری قومی اقتصادیات کے استحکام کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہیں، عوام کے خیالات معلوم کرنے کی تجاویز پر بھی غور کرے۔

آٹھویں: اگرچہ ہماری زراعت کا بڑا مسئلہ ان پالیسیوں سے وابستہ ہے جو ہماری صنعتی پیداوار کو تیار کرتی ہیں، تاہم خوراک کی بہت زیادہ کھپت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری وافر زراعتی پیداوار اقتصادی ترقی میں مدد دینے اور کم خوشحال ملکوں کے کروڑوں انسانوں کو بھوک سے نجات دلانے کا ایک قومی ذریعہ بن سکتی ہے۔ یہ ایک غیر دانشمندانہ، خلاف اقتصادیات اور غیر اخلاقی فعل ہوگا کہ ہم اسے یونہی پڑا چھوڑ دیں۔

ہماری فاضل خوراک کی خود امریکہ میں سخت ضرورت ہے۔ اسکولوں میں دوپہر کے کھانے کا توسیع شدہ پروگرام اور فوڈ اسٹامپ پلان دو ایسے مواقع ہیں جو ہمارے آٹھ ارب ڈالر کے خوراک کے ذخیروں کو خانگی استعمال کے قابل بنا سکتے ہیں۔

نویں: مجھے یہ بھی امید ہے کہ جوائنٹ ایکانومک کمیٹی کی رپورٹ میں سود کی شرح اور اس کے صنعتی اور زراعتی پیداوار، تعمیرات، قوت خرید، بے کاری اور ہر سطح پر سرکاری مالیات پر پڑنے والے اثرات کا بھی مفصل تجزیہ کیا جائے گا۔

دسویں: آخر میں میں اس سے ایک بہت ہی قریبی طور پر وابستہ ۔ ۔ ۔ موضوع پر اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں جس سے، میں سمجھتا ہوں کہ کانگریس کو جلد یا بدیر دوچار ہونا پڑے گا۔

کئی سال سے کمیونسٹ دنیا بھر کو یہ بتلاتے چلے آرہے ہیں کہ امریکہ اور چیزوں کے علاوہ ترکِ اسلحہ کے اقتصادی اثرات سے سب سے زیادہ خائف ہے۔

کرملین کا دعویٰ ہے کہ اگر پینٹاگین سے اسلحہ کی زبردست مانگ ختم ہو جائے تو امریکی مزدور

بھوکے مرنے لگیں ۔ ایسی صورت میں سرمایہ داری کا خاتمہ اور کمیونزم کی فتح ناگزیر ہو جائے گی ۔

کارل مارکس کے نظریے کے خلاف، مجھے یقین ہے کہ زمانۂ امن کی اقتصادیات کی طرف منتقل ہونا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے، جتنا کہ ہم میں سے بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں ۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اٹھارہ ماہ کے اندر اندر ہم نے امریکی صنعت کا ۴۵ فی صدی حصہ زمانۂ جنگ کی پیداوار سے زمانۂ امن کی پیداوار میں منتقل کر دیا تھا اور ساتھ ہی فوج سے آئے ہوئے تقریباً ایک کروڑ آدمیوں کو بھی اپنے غیر فوجی اقتصادیات میں جذب کر لیا تھا۔

یہ ضرور ہے کہ اس وقت ہمیں یہ فائدہ حاصل تھا کہ جنگ کی وجہ سے مکان سازی، اسکولوں، اور کھیت کے پائیدار ساز و سامان کے مطالبات کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ لیکن آج دفاعی پیداوار کے لئے ہماری اقتصادیات کا جو فیصدی حصہ وقف ہے وہ ۱۹۲۵ء کے مقابلہ میں صرف ½ ہے ۔ جہاں تک ہماری غیر تکمیل شدہ ضروریات کے انبار کی بات ہے، تو ہر میئر، شہری منصوبہ ساز، ماہر تعلیم، سڑکوں کا انجینئر شفاخانے کا نگراں اور ماہر سماجیات جانتا ہے کہ یہ بے حد و حساب ہے ۔

سینیٹر ہمفری کے زیر صدارت "سینیٹ کی ترک اسلحہ کمیٹی" نے ترک اسلحہ سے پیدا ہونے والی اقتصادی پیچیدگیوں کی ابتدائی سماعت کی تھی ۔ مجھے یقین ہے کہ اس موضوع پر مزید چھان بین کے ذریعہ امریکی قوم کو یقین ہو جائے گا اور دنیا کو ثبوت مل جائے گا کہ سرد جنگ کی کشیدگی کو حقیقی طور پر کم کرنے کی راہ میں ریاستہائے متحدہ نہیں بلکہ سوویٹ یونین رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

ختم کرنے سے پہلے میں اس عظیم ذمہ داری پر ایک بار نظر ڈال لینا چاہتا ہوں جو بہ حیثیت قوم اور بہ حیثیت افراد میرے پیش کردہ سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے سلسلہ میں ہم پر عاید ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر بھرپور روزگار اور تیز رفتار اقتصادی پیداوار کا آئندہ مالی سال میں دفاقی مالیات اور وفاقی بجٹ پر کیا اثر پڑے گا ؟

۱۹۶۱ء کے مالی سال میں توسیع کی چار فیصدی مستحکم شرح سے متوقع اضافوں کے علاوہ جو ۱۹۶۰ء کے مالی سال تک ہو چکے ہوں گے، اٹھارہ یا بیس ارب ڈالر کی زیادہ پیداوار ہوگی ۔

اس سے وفاقی ٹیکس کی آمدنی میں کئی ارب ڈالر کا اضافہ ہوگا۔ سود کے مصارف اور وفاقی امدادی ادائیگیوں میں تخفیف ہو جانے سے ہمارے پاس اتنا کافی سرمایہ اکٹھا ہو جائے گا جس سے ہم بہ یک وقت تعمیر، دفاع، تعلیم، طبی تحقیق، اور عام فلاحی کاموں کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو بھی پورا کر سکیں گے، اور ٹیکس میں تخفیف کر کے اپنے بجٹ میں بھی توازن پیدا کر سکیں گے ۔

آئندہ سالوں میں اگر ہم اپنی پالیسی کو ایسے دانشمندانہ طریقے پر چلا سکے، جس کے نتیجہ میں افراطِ زر کے بغیر سریع رفتار توسیع ہو سکے ۔ تو ہم ٹیکسوں میں کمی کرنے کی طرف ایک اور قدم بڑھا سکیں گے۔

اور قومی قرضے میں بھی موثر تخفیف کر سکیں گے جو ایک عرصہ سے التوا میں پڑی ہوئی ہے۔

اسپیکر صاحب! یہ محض خیالی باتیں نہیں۔ ہماری مسلسل اقتصادی ترقی کا ٹھوس، اور حقیقی حساب کتاب ہے۔

بعض ایسے طبقے ضرور ہوں گے جن میں سے ہر ایک اپنے مخصوص طریقے سے اور اپنی مخصوص وجوہات کی بنا پر ہر اس کوشش کی مخالفت کریں گے جو ہماری قوم کے تحفظ اور ہمارے ہموطنوں کی فلاح وبہبود کیلئے ضروری ہے۔ وہ ڈیم، اسکول اور مکانات تعمیر کرنے کی ہر تجویز کی مخالفت کریں گے۔ اسی اندیشے کی بنا پر کہ اس بجٹ کا توازن خراب ہو جائے اور ہم خطرناک افراطِ زر کا شکار نہ ہو جائیں گے اس سے وہ ہماری موجودہ مشکلات کے سبب تک پہنچنے کی ہر کوشش کو بلیسود اور بیوقت کہہ کر اس کی مخالفت کریں گے۔

امریکہ کے مستقبل کے بارے میں کسی ایسے بودے نظریہ کو اتنی ڈھیل دینا کہ وہ ایوان کی اکثریت کو سیاسی نا اہلی کا شکار بنا دے، ایک شدید غلطی ہوگی۔ میری رائے میں افراطِ زر کے بغیر ہماری اقتصادیات کی مسلسل اور تیز رفتار توسیع اس کانگریس کے اجنڈے کا اہم ترین موضوع ہے۔

× × ×

۴ — فولاد کی قیمتیں اور قومی اقتصادیات

ذیل کا خط ۱۹۵۹ء میں فولاد کی طویل ہڑتال کے چوتھے ہفتے کے دوران صدر آئزن ہاور کو بھیجا گیا تھا۔ کانگریس کے رکن مسٹر باؤلز کا کہنا ہے کہ اقتصادیات اور فولاد کی صنعت دونوں کا طویل المدت مفاد اس بات میں ہے کہ فولاد کی قیمتیں بڑھانے کے بجائے گھٹا دی جائیں۔

جناب صدر!

جنگ کے دوران "پرائس ایڈمنسٹریٹر" اور "ڈائرکٹریٹ آف فوڈ اسٹیبلائزیشن کی حیثیت سے مجھے فولاد کی صنعت میں قیمتوں، اُجرتوں، اور منافعوں کے پیچیدہ تعلق باہمی سے خاص رابطہ رہا ہے۔ اور ہر ہفتے مجھے اس پر غور کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت سے آج تک کی مدت کے دوران میں میں اس کلیدی صنعت کی کارکردگی کو دیکھ کر سخت پریشان ہوتا رہا ہوں جو ہماری پوری اقتصادیات میں روزگار اور مصنوعات سازی کی قیمتوں پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔

ان چودہ سالوں میں کارکنان اور منتظمین کے اختلافات کی بدولت فولاد کی صنعت کو چھ بار بند ہونا پڑا ہے۔ پیداوار کے ۱۹۰ دن ضائع ہو چکے ہیں جس کے نتیجہ میں چار کروڑ پچاس لاکھ ٹن فولاد کی

پیداوار جو اس دوران میں ہونی چاہئے تھی نہیں ہو سکی' اور اُجرتوں اور منافع کا نقصان تو کروڑ ہا کروڑ ڈالر تک پہنچتا ہے۔

موجودہ ہڑتال اب اپنے چوتھے ہفتے میں داخل ہو رہی ہے۔ اگر جلد ہی کوئی سمجھوتہ نہ ہوا تو اس کے نتائج پوری اقتصادیات کے لئے مضرت رساں ثابت ہوں گے۔

اس وقت ہم دس سال کے اندر اپنی تیسری بار کی پس ماندگی سے اُبھر رہے ہیں۔ ان بار بار کے رخنوں سے ہماری سالانہ شرح افزائش کا اوسط اتنا کم ہو گیا ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں میں نہیں ہوا تھا۔

فولاد کی پیداوار اور فولاد کے مزدوروں کی قوت خرید میں مسلسل کمی ہماری خوشحالی میں بھی کمی لے آئے گی۔ مزید برآں جیسے جیسے فولاد کے ذخیرے کم ہوں گے' امریکہ کی تقریباً تمام صنعتیں متاثر ہوتی جائیں گی۔ مزدوروں اور منتظمین کے درمیان کشیدگی جو پہلے ہی پریشان کن حد تک بڑھی ہوئی ہے' اور زیادہ ہو جائے گی۔

اگر مزدوروں اور منتظمین کے کسی سمجھوتے کے نتیجے میں قیمتیں بڑھنے لگیں تو ہماری اقتصادیات پر اس کا اور بھی زیادہ خراب اثر ہوگا۔ فولاد کی قیمت پہلے OPA کی ۱۹۴۵ء کی مقررہ حد ۵۴ ڈالر فی ٹن سے بڑھ کر ۱۹۵۹ء میں ۱۵۵ ڈالر فی ٹن ہو گئی ہے۔ اس چودہ سال کے عرصہ میں تھوک قیمتوں کی سطح میں جو اضافہ ہوا ہے' یہ اس سے چار گنا ہے۔

۱۹۵۳ء سے تھوک قیمتوں کے اوسط میں جو ۹ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اس میں سے ۷ فیصدی براہ راست فولاد سے تیار شدہ مال کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے ہے۔

اگر زراعتی پیداوار کی تھوک قیمتوں میں تخفیف نہ ہوئی ہوتی' جو ۱۹۵۳ء سے اب تک ۹ فیصدی کم ہو گئی ہیں تو فولاد کی صنعت سے پیدا شدہ افراطِ زر کا دباؤ اور بھی زیادہ محسوس کیا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خوراک کی گھٹتی ہوئی قیمتیں فولاد کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کا توازن برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

فولاد کی صنعت سے جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ ان کی قیمتیں اس قدر اور بار بار کیوں بڑھتی ہیں' تو ان کا جواب لازماً یہ ہوتا ہے کہ فی گھنٹہ اُجرت کی شرحیں بھی تین گنی ہو گئی ہیں۔ اس جواب کے بار بار دہرائے جانے سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہونے لگا ہے کہ زیادہ قیمتوں کے لئے صرف مزدور ذمہ دار ہیں' لیکن یہاں بڑا نازک اور اہم نکتہ یعنی فی گھنٹہ اُجرت کی شرحوں اور کارکنوں کی پیداواری صلاحیت کا تعلق باہمی باقی رہ جاتا ہے۔

مجموعی منافع کا تعین کئی چیزوں سے ہوتا ہے۔ مزدوری کی لاگت اس کا ایک پہلو ضرور ہے لیکن اہم بات یہ نہیں کہ فی گھنٹہ مزدوری کی قیمت کیا ہے۔ بلکہ فولاد کی فی ٹن پیداوار کی مزدوری کی قیمت اہم چیز ہے۔ اگرچہ یہ عددی حساب ابھی تک دنیا کا ایک سربستہ راز ہے۔ لیکن خارجی شہادت اس بات کی مظہر ہے' کہ

اُجرت کی شرحوں میں اضافہ سے مزدوروں کی صلاحیت کار میں بھی بڑی حد تک اضافہ ہوتا ہے۔

آج ہمیں جس صورتِ حال کا سامنا ہے وہ بہت اہم ہے، مزید کشیدگی ہماری اقتصادیات کی رفتار میں اور کمی کر دے گی اور ہماری بحالی کے اس نازک مرحلے پر روزگار اور منافع دونوں کو خطرے میں ڈال دے گی۔

مزدوروں اور کارکنوں کے درمیان مقابلہ کے نقطۂ نظر سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ کارکنوں کی پیداواری صلاحیت کے حالیہ اضافے کے پیش نظر فولاد کی اُجرتیں قیمتوں میں کوئی اضافہ کئے بغیر بڑھائی جا سکتی ہیں اور انھیں بڑھایا جانا چاہیئے۔ چونکہ فولاد کی صنعت بہت اعلیٰ سطحوں پر چلائی جاتی ہیں۔ اس لئے وہ اب بھی منافع کے معیار کو باقی رکھ سکتی ہیں۔

پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ سرکاری مفاد کا اس طرح خیال رکھا جا سکتا ہے کہ اُجرتوں کی شرح میں کوئی تبدیلی کئے بغیر فولاد کی قیمتیں کم کردی جائیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ فولاد کی صنعت یہ اہم قدم اُٹھانے کے بعد بھی منافع کا معیار قائم رکھ سکے گی۔

ظاہر بات ہے کہ ایسی کسی تجویز پر نہ تو منتظمین ہی کچھ زیادہ انہماک کے ساتھ غور کر رہے ہیں اور نہ ہی مزدور۔ لیکن بہرحال ایسے بھی وقت آتے ہیں، جب ہمیں مخصوص طبقات کے مفاد پر عوامی مفاد کو ترجیح دینی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فولاد کی صنعت کے سلسلہ میں ایسا ہی وقت آپہنچا ہے۔

فولاد کی قیمتوں میں دس ڈالر فی ٹن کی تخفیف دھلائی کی مشینوں، ریفریجیٹروں اور دوسرے خانگی سامان کی قیمتوں میں کمی کی شکل ظاہر ہوگی۔ اس سے ہماری سڑکوں کی تعمیر پروگرام، صنعتی تعمیر، مشینی اوزار اور دوسری ضروری اشیاء کی قیمتوں میں بھی کمی ہوگی۔

اس سے ہماری اقتصادیات کو مجموعی حیثیت سے وہ توانائی حاصل کرنے میں بھی مدد ملے گی، جو صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ہماری پیداواری سہولیات کا پورا پورا استعمال کیا جا رہا ہو اور ہماری قوم کے لئے بھرپور روزگار مہیا ہو گیا ہو۔ جہاں تک فولاد کی صنعت کا تعلق ہے یہ فروخت میں اضافہ کرنے باقاعدہ طور پر اور بڑے پیمانے پر روزگار کی ضمانت دینے، اور فولاد کی برآمد کے میدان میں ہماری پوزیشن کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

گزشتہ چند ماہ میں افراطِ زر کے متعلق بہت کچھ کہا سنا جاتا رہا ہے۔ لیکن میری رائے میں اقتصادی افزائش کا بہت کم ذکر آیا ہے۔ اس سلسلہ میں میں یہ عرض کروں گا کہ یہ دونوں مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور فولاد کی قیمتوں میں کمی کے ذریعہ دونوں کا کسی نہ کسی حد تک مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا میں انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ آپ کے سامنے یہ تجویز رکھوں گا کہ آپ فولاد

کی صنعت کو ہمارے ملک اور ہماری اقتصادیات کی طویل المدت بھلائی کے لئے یہ جرأت مندانہ اور تخلیقی قدم اُٹھانے کا مشورہ دیں ۔

× × ×

۵ - ساتویں دہائی کی حدودِ فاصل

دورِ مابعد جنگ کے اختتام پر مسٹر باؤلز ہمارے معاشرے میں اُبھرتے ہوئے بعض نئے تقاضوں کو محسوس کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ، اور اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیں پرانے سیاسی تصورات کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے ۔ (ییل لافورم ینوہون ، کنکٹیکٹ میں ۲۱ ر نومبر ۱۹۶۱ء کی ایک تقریر)

آج ہم دنیا ، خود اپنی اقتصادیات اور دوسری قوموں کے ساتھ اپنے تعلقات کے سلسلہ میں ایک حد فاصل پر پہنچ رہے ہیں ۔ جنگ کے بعد کا دور خاتمہ پر آرہا ہے اور ہم انسانی تاریخ کے ایک نئے دور کے دہانے پر پس و پیش کی حالت میں کھڑے ہوئے ہیں ۔

مجھے یقین ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں جو سیاسی ، اقتصادی اور سماجی انتشار اور ابتری نظر آرہی ہے وہ اس زیر و بم کا ایک حصہ ہے جو اہم قومی فیصلوں سے ظہور میں آیا کرتا ہے ۔

ہمارے معاشرے میں آج تین سیاسی طاقتیں کارفرما ہیں ۔ ان میں سے کوئی بھی پرانے سیاسی تصورات کے سامنے جھکنے والی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی آسانی کے ساتھ قدیم اور مانوس سیاسی عقائد کے ساتھ مصالحت کے لئے تیار ہے ۔ لیکن ہم میں سے ہر شخص رفتہ رفتہ مجبور ہوتا جارہا ہے کہ وہ ان قوتوں کے ساتھ طبع آزمائی کرے ، عام مسائل کے بارے میں اپنے انداز فکر پر پھر سے غور کرے اور فرسودہ نظریات کو ترک کر کے نئے طریقوں کو اختیار کرے ۔

ان میں سب سے پہلی قوت جنگ کے بعد کی متحدہ دنیا کا ہمارے امریکی معاشرے پر پڑنے والا انتہائی گہرا اثر اور ایک زیادہ حقیقت پسندانہ ردعمل کے لئے ہماری جستجو ہے ۔

گزشتہ پندرہ سال سے ہم میں سے بہت سے ایک دوسرے کو یقین دلاتے رہے ہیں کہ یہ عالمگیر تقاضے جن کو ہم پورا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ، محض عارضی ہیں ، یہ کہ اگر ہم ذرا سمجھ داری اور جرأت سے کام لیں تو دنیا کی یہ نام نہاد ہنگامی صورت حال کسی نہ کسی طرح رفع ہو جائے گی اور یہ بھی کہ اس کے بعد ہم خوشی خوشی بلا مداخلت غیرا پنے مادی آرام و آسائش سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے ۔

یہ انتہا درجہ کی تنگ نظری کچھ تو ہماری ماضی کی علیحدگی پسندی کی وجہ سے ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ ہمارے سامنے عالمی مسائل کی ایک مسخ شدہ صورت آئی جس کی وجہ وہ سازگار حالات تھے جن کی مدد سے ہم نے جنگ کے بعد کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی۔

صرف امریکہ کی ہی اقتصادیات ایسی تھی جو کسی نقصان کے بغیر جوں کی توں رہی تھی اور زمانۂ جنگ کی سرمایہ کاری سے اس کو تقویت ملی تھی۔ اور اس کے جاری رہنے کا امکان بھی تھا امریکہ کی عسکری طاقت نیوکلیائی اجارہ داری کے اوپر مضبوطی کے ساتھ قائم تھی۔

نتیجہ کے طور پر دوسری قوموں کے مقابلہ میں امریکہ کی طاقت بے پناہ تھی۔ ہم نے دنیا پر نظر ڈالی تو تقریباً کوئی ایسا کام نہ تھا جسے ہم چاہنے کے باوجود نہ کر سکتے۔

گزشتہ چند سالوں میں یہ صورتِ حال کافی حد تک بدل گئی ہے ہم بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں داخل ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ طاقتور جدید یورپ ایک ایسے متحدہ یک جہت معاشرے کی تخلیق کر رہا ہے جو سلطنتِ روم کے بعد نہیں دیکھا گیا تھا، سوویٹ یونین ایک ایسی صنعتی اور عسکری قوت کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آ رہی ہے کہ ہمارے بعد صرف اسی کا نمبر آتا ہے۔ اور چین میں ایک اور سخت گیر حکومت اپنے پڑوسیوں کے بارے میں خطرناک توسیعی ارادوں کی پرورش کر رہی ہے۔

اسی کے ساتھ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ اس حوصلہ افزا حقیقت سے واقف ہو گئے ہیں کہ رفتہ رفتہ ناخواندگی، افلاس اور بیماریوں کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے اور ان علاقوں کے لوگوں کے لئے نئے مواقع فراہم کئے جا سکتے ہیں۔

اس کے نتیجے میں لامحدود امکانات اور انتہائی غیر یقینی حالات کی ایک دنیا ہمارے سامنے موجود ہے۔ لہٰذا یہ بات حیران کن ہے کہ ہم میں سے بعض بودے اور ڈرپوک لوگ اس سے کنارہ کش ہونے، یا اس کو نظر انداز کر دینے، یا ہموں کے خوف سے بعض خیالی پناہ گاہوں میں چھپ جانے کی فکر کر رہے ہیں۔ اس اُمید میں کہ جب وہ باہر آئیں گے تو دنیا اُن کے آبا و اجداد کے وقت کا پُرسکون انداز اختیار کر چکی ہوگی۔

آیئے اب اس دوسری قوت پر نظر ڈالیں، جس کے متعلق میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ موجودہ صدی کی ساتویں دہائی کی سیاسی ہستیوں کے تعین میں معاون ثابت ہوگی۔ اور یہ ہے خود ہماری اقتصادیات کے اُبھرتے ہوئے تقاضوں کی قوت جب ہم ان تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ پرانے تصورات اگر بالکل غیر متعلق نہیں ہیں تو کھوکھلے ضرور ہوتے جا رہے ہیں

اپنے موثر ترین اور متحرک ترین انداز میں کام کرتے ہوئے، ہمارے سرمایہ دارانہ نظام کا انحصار با صلاحیت منتظمین، کم منافع اور کثیر نکاس کی کوشش پر رہا ہے۔ جس کا مقصد پیداوار اور

پیداوار کے ساتھ ساتھ اسی مناسبت سے منافع میں اضافہ کرنا تھا۔

بعض صنعتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ فارمولا قیمتوں اور اجرتوں میں ساز باز کا شکار ہو گیا ہے، جس کا اقتصادی حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض صنعتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ کثیر منافع کے حصول کی غرض سے من مانی قیمتیں مقرر کر دی جاتی ہیں، جب کہ ان کی پیداواری صلاحیت کا ۲۰ فیصدی یا اس سے زیادہ حصہ بیکار پڑا ہوتا ہے۔ بعض دوسری صنعتوں میں ہم مزدور تحریک کو تن آسانی میں مبتلا پاتے ہیں۔ جس سے پیداوار میں کمی نیز لاگت اور قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تفصیل سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں کہ جہاں صرف چند طاقتور مفاد پرست ہی اپنے مفادات کا تحفظ کر پاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ ملک کے لاکھوں آدمی بے روزگار ہوں اور بڑی تعداد میں لوگوں کو اچھی خوراک، اچھے مکانات اور معقول درجہ کی تعلیم میسر نہ آتی ہو۔

یہ بات معلوم کرنے کے لئے کافی چھان بین کی ضرورت ہے کہ ہماری اقتصادیات کے بہت سے شعبے جامد کیوں نظر آتے ہیں، ہماری پیداوار کی شرح بعض اونچے درجے کے صنعتی ممالک سے کیوں پیچھے رہ گئی ہے۔ اور یہ کہ آج بھی بیس فی صدی امریکی گھرانے دو ہزار ڈالر سالانہ سے کم پر کیوں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ایک ایسے دور میں جو زیادہ سے زیادہ پیداوار کا متقاضی ہے، زیادہ آبادی کے علاقوں میں بے روزگاری کا دور دورہ کیوں بدستور چلا آتا ہے۔

ہماری داخلی اقتصادیات کے بارے میں بہت سے سوالوں میں سے، جو عنقریب اُٹھائے جانے والے ہیں اور جن کا ہمیں جواب دینا ہوگا، چند ایک یہ ہیں:

ہم اپنی مکان سازی کی صنعت کو کس طرح منظم کریں کہ وہ کم قیمت پر ہر سال زیادہ اور بہتر مکانات تعمیر کرنے لگے؟

ہم اپنے شہروں کی دوبارہ تعمیر کے کام میں کس طرح تیزی پیدا کریں کہ اس ساتویں دہائی میں ہماری گندی بستیوں کا صفایا ہو جائے۔؟

انتہائی ضرورت مند لوگوں کے لئے بہترین طبی امداد کس طرح فراہم کی جائے۔؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم اپنے سرکاری نظام تعلیم میں کس طرح وہ ضروری استحکام پیدا کریں کہ تمام ذہین امریکی لڑکے اور لڑکیاں کالج میں تعلیم حاصل کر سکیں؟

ان سوالات کے بہتر جواب تلاش کرنے کے لئے اپنی کوششوں کو بلدیاتی، ریاستی اور وفاقی حکومتوں تک ہی محدود نہ رکھنا چاہیئے، اس میں مزدور یونینوں، یونیورسٹیوں، تجارتی اور زرعی تنظیموں کے بہترین دماغوں سے بھی مدد لینی چاہیئے۔

ہماری اقتصادیات ہی وہ اصل ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم اپنے تمام شہریوں کے لئے زیادہ مواقع اور خوش حالی فراہم کر سکتے ہیں، معقول دفاعی نظام کی ضمانت دے سکتے ہیں اور وہ وسائل مہیا کر سکتے ہیں جن سے ان نئی قوموں کی دشواریوں کو کم کیا جاسکتا ہے جو جمہوری اداروں کے ذریعہ اپنے افلاس سے نجات پانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

پُراعتماد اور حرکت پذیر امریکہ ہی ایک ایسا ملک ہے جو اس تقاضے کو پورا کر سکتا ہے۔ لیکن پیداوار کی توسیع کے راستے میں حائل داخلی رکاوٹوں نے ہمیں جمود میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اس سیاسی بیداری کے زمانے میں ہمیں ایک تیسری قوت کا بھی مقابلہ کرنا ہے جو روئے زمین کی اس عظیم ترین جمہوریت میں ہمارے حبشی شہریوں کے مکمل حقوق شہریت کے بڑھتے ہوئے مطالبات میں مضمر ہے۔

کئی پشتوں سے نسلی امتیازات کے خلاف جدوجہد کی قیادت وہ سفید فام امریکی کرتے چلے آئے تھے، جن کے ضمیر نے انھیں یہ بتلایا تھا کہ کسی طبقے کے خلاف امتیاز برتنا ان کے اخلاقی عقائد کے منافی ہے۔ اب قیادت خود امریکہ کے حبشیوں نے سنبھالی ہے۔ جو حبشی شہریوں کو اس بات کے لئے آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ ہمارے آئین کے تحت اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ یہ تحریک روز بروز مقبول ہوتی جا رہی ہے۔

پھر یہ آوازیں آج صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں بلکہ روز بروز دنیا بھر میں سُنی جا رہی ہیں۔ جب تک ہم امریکہ کے ان باشندوں کو مکمل جمہوری حقوق نہیں دیں گے جن کے آباؤ اجداد افریقہ سے آئے تھے، اس وقت تک ہم ایشیا اور افریقہ کی قوموں کے نمائندوں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے جمہوری عقائد کے دعووں کو تسلیم کریں۔

اس طرح یہ تین چیلنج ہیں جن کا ساتویں دہائی میں امریکی عوام کو مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ یعنی اپنی اقتصادیات کو ترقی دینے کے سلسلے میں ہماری صلاحیت اور مذہب، رنگ اور نسل کی بنیاد پر کسی امریکی کے خلاف برتے جانے والے امتیاز کو ختم کرنے کے لئے ہماری کوشش۔

ہماری طرف سے ان سوالات کے متضاد جوابات کے نتیجے میں اس صدی کی ساتویں دہائی میں یقیناً ایک نئی سیاسی ہیئت اُبھر کر سامنے آئے گی۔

چونکہ لبرل، کنزرویٹو، ریڈیکل اور ری ایکشنری جیسے پُرانے سیاسی نظریات کا اثر تیزی سے زائل ہوتا جا رہا ہے، اس لئے جس قدر جلد کوئی نئی ہیئت سامنے آتی ہے اسی قدر ہم سب کے لئے بہتر ہوگا۔ وہ نعرے جو اس صدی کی چوتھی دہائی میں ہمارے خون کو گرما دیا کرتے تھے آج امریکی عوام کی بڑی تعداد پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ ان سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سیاسی استدلال اور عمل کے جو خطوط ہمیں اس صدی کی

ساتویں دہائی سے جُدا کریں گے، ان کا ماضی سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ حریت پسندی ہر عہد میں بعض ایسی عالم گیر اقدار کو اپنانے کا تقاضا کرتی ہے، جنھیں ہر نسل اپنے مقاصد اور تجربات کی روشنی میں نئے سانچے میں ڈھال سکتی ہے۔

پرانے زمانے کی طرح نئے دور میں بھی قدامت پسند مفکرین سے یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ماضی سے زیادہ سے زیادہ اکتساب کریں گے اور مستقبل کی طرف اور زیادہ تشکک کے ساتھ قدم بڑھائیں گے۔

ان میں بھی جو لوگ زیادہ انتہا پسند ہیں ان کا مطالبہ ہوگا کہ ہم اقوام متحدہ اور اپنے حلیفوں سے کنارہ کش ہو جائیں، اپنے سرکاری بجٹ کو کم کر دیں، اپنے شہروں کی نئی تعمیر اور تعلیم کو فروغ دینے کی کوششوں کو کم کر دیں، اور امریکی حبشیوں کو تلقین کریں کہ وہ ابھی کچھ عرصہ اور صبر کریں۔

درحقیقت وہ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ "دنیا کو روک دو ہم اس سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں۔" لیکن دنیا رکے گی نہیں اور نہ ہی ہم میں سے بزدل سے بزدل کوئی شخص اس سے کنارہ کش ہو سکے گا۔

تاریخ کے کسی دور میں ایسے خوفناک مراحل پیش نہیں آتے تھے جتنے کہ آج ہماری تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں پیش آ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ فرد کے ترقی کرنے، اس کے وقار کے ایک حقیقت بن جانے اور انسانی توانائیوں کے عوامی بہبود کے لئے برسرِ عمل ہو جانے کے لئے آج جیسے ساز گار حالات بھی کبھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

اس طرح ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ مستقبل کے حریت پسند اس بات کے لئے زیادہ سے زیادہ زور دیں گے کہ ہمارے اور غیر کمیونسٹ قوموں کے درمیان اور زیادہ عالمی اشتراک ہونا چاہئے، دوسری قوموں کی خیر خواہی اور آزادی کا اور زیادہ خیال کیا جانا چاہیئے، صرف روسی خطرات کے مقابلہ کا ہی نہیں بلکہ اندرونِ ملک ایک ایسے معاشرے کی تخلیق کا بھی عزم کرنا چاہئے جس میں تمام لوگ بلا امتیاز نسل، مذہب اور رنگ کے اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرنے کے لئے آزاد ہوں۔

آج جبکہ نئے حالات میں جمہوریت کے صحیح مفہوم پر بحث کی جا رہی ہے، نئے اختلافات واضح ہو کر سامنے آ رہے ہیں اور نئے سیاسی انداز اختیار کئے جا رہے ہیں، ہمیں امید کرنی چاہیئے کہ فائدے میں وہی لوگ رہیں گے جو انسانی حقوق اور ذمے داریوں کو سب سے بلند مقام دیتے ہیں۔ یہ ایسے ہی لوگوں کا کام ہے کہ وہ آج کی پُر خطر، ولولہ انگیز اور امید افزا دنیا کے نقشے میں جمہوری عقائد کے امکانات کا از سرِ نو تعین کریں۔

حصّہ دوم

ذمہ دار ریاستی حکومتیں: لامرکزیت کی کنجی

★

ہم اپنی ریاستی حکومتوں کی مشنری کو اپنے معاشرے کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے میں کس قدر پیچھے رہے ہیں۔
نتیجہ کے طور پر متعدد موقعوں پر عوامی تقاضے سے مجبور ہو کر ہماری مرکزی حکومت کو بعض ایسے معاملات میں دخل انداز ہونا پڑا ہے جنھیں ریاستی حکومتیں بہتر طریقے پر حل کر سکتی تھیں۔ واشنگٹن میں مرکزیت کے ارتقا کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنی ریاستی حکومت کے طریق کار کو زمانے کے ساتھ لے کر نہیں چل سکے۔

۹ مارچ ۱۹۵۰ء

۶ - گورنری خود گورنر کی نظر میں

اپنے عہدے کی پہلی ششماہی پر تبصرہ کرتے ہوئے کنکٹیکٹ کے گورنر کی حیثیت سے مسٹر باؤلز نے اپنے اس نئے منصب کے فرائض، خطرات اور موقع کا تذکرہ کیا ہے ۔ (نیو یارک ٹائمز میگزین، مورخہ ۲۴ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء)

میری پارٹی، میرے انتخاب کنندگان اور خود میرے لئے حیرانی کی بات تھی کہ میں گزشتہ نومبر میں کنکٹیکٹ کا گورنر منتخب ہو گیا۔ کنکٹیکٹ کے انتخابات کی جدید تاریخ میں سب سے کم ووٹوں سے جیتنے والوں میں میرا دوسرا نمبر تھا۔ میں صرف ۲۲۲۵ ووٹوں سے جیتا تھا۔

کنکٹیکٹ کے ری پبلکن بھی پورے ملک کی طرح خاصے پُر امید تھے۔ کنکٹیکٹ "راسخ عادات کی سرزمین" ہے اور گزشتہ سو سال میں یہاں صرف گیارہ ڈیموکریٹک گورنر ہوئے ہیں۔

میں نے گورنری کے انتخاب میں اس خیال سے حصہ نہیں لیا تھا کہ ۱۹۴۸ء میں کنکٹیکٹ میں ڈیموکریٹک نمائندے کی کامیابی یقینی تھی، بلکہ اور کئی اسباب تھے جو مجھے اہم معلوم ہوئے۔

بہت سی دوسری ریاستوں کی طرح کنکٹیکٹ کو بھی سنگین مشکلات در پیش تھیں۔ اسکولوں اور استادوں کی بھاری کمی تھی اور ہمارے شہر سرکاری امداد کے بغیر اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے یہاں مکانات کی قلت دوسری ریاستوں سے کہیں زیادہ تھی اور گندی بستیاں بھی ہمارے یہاں تناسب سے کچھ زیادہ ہی تھیں۔ دماغی امراض کے اسپتالوں کی سخت ضرورت تھی جو دو پشتوں یا اس سے بھی زیادہ عرصے پہلے کی بنی ہوئی کال کوٹھریوں کی جگہ لے سکیں۔ بے روزگاری کا مقابلہ کرنے کے لئے مزدوروں کے توسیع شدہ قوانین اور عمر رسیدہ لوگوں کے لئے مزید امداد و اعانت کی ضرورت تھی۔

میرا یہ خیال تھا کہ ایسے مسائل ریاستی عملداری میں طے ہو سکتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ واشنگٹن میں حکومت کی حد سے زیادہ مرکزیت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ تاہم اگر کوئی ریاستی حکومت عوام کی مناسب رہائش کا انتظام نہ کر سکتی ہو، یا ان کے بچّوں کو اچھی تعلیم نہ دلا سکتی ہو، یا معمر لوگوں کی دیکھ بھال نہ کر سکتی ہو تو خواہ ضرورت کی وجہ سے ہو یا ان کی تقصیر کی وجہ سے، بالآخر مرکزی حکومت کو اس میں مداخلت کرنی پڑتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ واشنگٹن میں حکومت کی بہت زیادہ مرکزیت کو روکنے کا ایک نہایت اہم

طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی ریاستی سرکاروں کی کارکردگی کی صلاحیتوں کو ابھاریں۔
مجھے توقع تھی کہ اگر ریاستی حکومتیں اپنے مسائل طے کرنے میں ذمہ داری اور مستعدی کے اعلیٰ معیار قائم کرسکیں تو ہمیں واشنگٹن کی طرف رجوع کرنے کی بہت کم ضرورت پیش آئے گی۔
جب انتخاب میں جیت جانے کی حیرانی کچھ کم ہوئی اور میں نے حالات پر نگاہ ڈالی تو مجھے فوری اہمیت کے دو کام نظر آئے۔ اولاً مجھے قانون سازی کا ایک ایسا پروگرام ترتیب دینا تھا۔ جس کی رو سے اس انتخابی منشور پر عمل درآمد ہونا تھا جس کی بنیاد پر میں منتخب ہوا تھا۔ دوسرے مجھے ریاستی بجٹ تیار کرنا تھا۔
میرا خیال تھا کہ مجھے دونوں کاموں میں کافی دشواری پیش آئی گی، کیونکہ جہاں کنکٹیکٹ کی سینٹ میں ڈیموکریٹک پارٹی کی خاص اکثریت تھی، ایوان نمائندگان پر ری پبلکن چھائے ہوئے تھے۔
ان دونوں ذمہ داریوں کے علاوہ مجھے معلوم تھا کہ میری ذمہ داریوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ریاستی حکومت کو حتیٰ الامکان اچھے طریقے پر چلاؤں: اور مقننہ کی اجازت سے وہ تمام تبدیلیاں بھی کروں جن سے انتظامی معاملات میں کوئی بہتری پیدا ہوسکتی ہو۔ لیکن گزشتہ چھ ماہ کے تجربے نے مجھے یہ بتادیا ہے کہ گورنر کی زندگی میں اور بھی بہت سے فرائض اور ذمہ داریاں، خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔
گورنر کے منصب کا سب سے خوش آئند پہلو ریاست کے ہر حصے سے آنے والے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے۔ حقیقت میں گورنر کے دفتر کا منظر ایسا ہوتا ہے بلکہ اکثر ایسا لگتا ہے جیسے نیو انگلینڈ شہر میں کوئی طویل میٹنگ ہو رہی ہو۔
گورنر کے منصب کے اس پہلو کو دیکھ کر مجھے اور زیادہ یقین ہوگیا کہ ریاستی حکومت ایک ایسا مقام رکھتی ہے جسے واشنگٹن کا کوئی شعبہ یا ادارہ پر نہیں کرسکتا۔ ریاستی حکومت میں اور خاص کر کنکٹیکٹ جیسی چھوٹی سی ریاست میں آپ کو ان لوگوں سے قریب رہنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا ہے، جن کے طرز عمل ہی فی الواقع سرکاری پالیسیاں طے کراتے ہیں۔
جب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ صحیح راستہ پر ہیں اور خاص طور پر جب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ غلط راستے پر ہیں تو وہ بہت جلد آپ کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ یہ براہ راست جمہوریت ہے جس کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔
اس کے علاوہ میں ہر گورنر کی طرح اپنی جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے بھی کام کرتا ہوں۔ مجھے ہر وقت اپنی جماعت کے ممبران مجالس اپنی پارٹی کے بلدیاتی چیئرمین اور پارٹی کے دیگر ریاستی اور مقامی عہدہ داروں کی دسترس میں رہنا اور سیاسی فیصلے کرنے میں ان کی مدد کرنا میرا فرض تھا۔

جس دن مقننہ کا اجلاس ہونا تھا مجھے صبح صبح ڈیموکریٹک رہنماؤں سے ملاقات کر کے ان کے طریق کار پر بحث کرنی ہوتی تھی۔ ری پبلکن پارٹی کے ممبران کو بھی مدعو کیا جاتا تھا، لیکن وہ خاص خاص موقعوں پر ہی آتے تھے) میٹنگ کے دوران کسی بھی وقت کمیٹی کے چیمبر میں میرا دروازہ کھول کر آ سکتے تھے، اور آتے رہتے تھے۔ یہ لوگ مزدوروں، تعلیم، مکانات یا دوسرے معاملات کے بلوں کے سلسلے میں نئی نئی ایسی قانونی پیچیدگیاں لے کر آتے تھے جن میں انھیں فوری جواب درکار ہوتا تھا۔

گورنر کے عہدے کے یہ مخصوص فرائض دلچسپ بھی ہیں، دلکش بھی ہیں اور ضروری بھی۔ لیکن جب یہ گورنر کی بنیادی ذمہ داریوں کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں تو اس کے لئے ایک بڑا بار ثابت ہوتی ہیں۔

میں شروع ہی سے جانتا تھا کہ نظم و نسق کو بہتر بنانے کا کام آسان نہیں ہے کنکٹیکٹ کے ۲۰۸ سرکاری ادارے مل کر ایک ایسی انتظامیہ مشینری کی تشکیل کرتے ہیں جس سے روبے گولڈبرگ بھی پریشان ہو جائے۔ ان اداروں کے آٹھ سو سے بھی زیادہ سربراہ کمشنر ہیں، جو کم از کم کاغذی حیثیت سے، براہ راست میرے سامنے جوابدہ ہیں۔ اگر میں کیبنٹ میٹنگ بلانے کی ہمت کروں تو آٹھ سو کی اس کل تعداد کو موجود ہونا چاہیئے۔ ان اداروں میں سے بہت سے یونہی وجود میں آ گئے ہیں۔ بعض صاف طور پر سیاسی ضرورت کی پیداوار ہیں۔

کنکٹیکٹ کے بعض شہری جن میں ری پبلکن اور ڈیموکریٹک دونوں ہی پارٹیوں کے ممبران شامل ہیں اور جو اچھی حکومت میں دلچسپی رکھتے تھے، اس گراں اور عجیب و غریب ریاستی مشینری کی اصلاح کی کوشش کر چکے تھے۔ اس صدی کی چوتھی دہائی میں گورنر دلبر کراس نے اس امر کی کوشش کی تھی اور ان کو کسی حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی تھی، میں نے ایک بار اور کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے اپنے ایک ابتدائی اقدام کے طور پر مقننہ کو ہدایت کی کہ وہ ریاست کی۔ ایک "ہوور کمیٹی" بنا کر حکومت کی از سر نو تنظیم کرے۔ سرکاری تنظیم کے بارے میں تشویش رکھنے والے بعض متجسس ٹیکس دہندگان کی مدد کی بدولت مقننہ نے اس پر آمادگی ظاہر کی۔ اس کمیٹی کی سفارشات آئندہ سال کے شروع میں موصول ہوں گی۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ۱۹۵۱ء تک کنکٹیکٹ کی حکومت کا رخ بدل جائے گا۔

ایک اور عجیب و غریب انتظامی دشواری یہ تھی کہ میرے سولہ چیف کمشنروں میں سب کے سب ری پبلکن پارٹی کے تھے، جن کو ری پبلکن ممبروں نے مقرر کیا تھا اور بعض امور میں وہ میرے پروگرام اور پالیسیوں کی کھلم کھلا مخالفت کرتے تھے۔ چونکہ ان میں سے آدمی لائق ہیں، اس لئے بعض

اوقات میں حیران ہو کر یہ سوچنے لگتا ہوں کہ یہ بالکل ایسا ہی تو نہیں ہے جیسے جنرل موٹرز کمپنی کو کونسل کے مقرر کردہ ڈائرکٹروں کی مدد سے چلانے کی کوشش کی جائے۔

میرا سب سے بڑا اور یقیناً سب سے دشوار کام مقننہ کے لئے ایک پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عمل کرانا تھا۔ اپنے افتتاحی خطبہ میں میں نے وہ پروگرام پیش کیا تھا جس پر میں انتخاب کے دن سے عمل پیرا رہا ہوں۔

میرے اس پروگرام کو ڈیموکریٹک سینیٹ اور جماعت کی پشت پناہی حاصل تھی اور اس طرح شہریوں کے بہت سے طاقتور آزاد گروپ بھی اس کی حمایت پر تھے۔ سینیٹ میں ڈیموکریٹک ممبروں کی اکثریت ہونے کے باعث یہ یقین کیا جا سکتا تھا کہ وہاں اسے منظوری حاصل ہو جائے گی۔ لیکن ری پبلکن اکثریت والے ایوان نمائندگان کا معاملہ بالکل جداگانہ تھا اور اس پر قابو پانا ناممکن تھا۔

اس کا سبب اس حقیقت میں مضمر ہے جسے ترقی پسند ڈیموکریٹک اور ری پبلکن دونوں جماعتوں کے ممبران "رونن بورو سسٹم" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نظام کے تحت ہر قصبہ کو، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو، اگر ۱۸۷۵ء سے پیشتر اس کا انضمام ہو چکا تھا، تو اسے ایوان میں دو نمائندے بھیجنے کا حق حاصل ہے۔ چونکہ خانہ جنگی کے وقت سے تقریباً تمام چھوٹے قصبات میں ری پبلکن اکثریت رہی ہے اور چونکہ ان قصبات کی تعداد شہروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے ایوان میں لازمی طور پر ہمیشہ ری پبلکن اکثریت رہتی ہے۔

اس طرح اگرچہ ایوان میں دو تہائی نمائندے ری پبلکن ہیں، لیکن وہ صرف ایک تہائی آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں، کنکٹیکٹ کے پانچ سب سے بڑے شہروں میں ہماری کل آبادی کا تقریباً ۴۵ فیصدی حصہ آباد ہے، لیکن ایوان زیریں کے لئے ۳۵ فیصدی نمائندے منتخب کرنے کے بجائے وہ صرف تین فیصدی کا انتخاب کرتے ہیں

میں خود ذاتی طور پر چھوٹے قصبات کو بہت پسند کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے چھوٹے سے قصبے اسکیس میں رہنا پسند کیا۔ جہاں کی آبادی صرف ۲۱۰۰ ہے۔ پھر بھی میں اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ ان پانچ بڑے بڑے شہروں کے دس نمائندے جو ۰۰ ۵۶ انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں وہ ہمارے ۶ سب سے چھوٹے قصبوں کے ان ۱۲ نمائندوں سے رائے شماری میں شکست کھا جائیں جو صرف ۲۲۵ ۲ مردوں، عورتوں اور بچوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قطع نظر اس کے کہ وہ مجلس کے اجلاس کے دوران کیا کہتا ہے یا کرتا ہے، کنکٹیکٹ کے ایوان نمائندگان کے کسی بھی ری پبلکن رہنما کے ذہن میں کہیں دور دور تک بھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ

انتخاب میں ہرایا جا سکتا ہے۔ یہ صورت حال ایک مثالی اور ذمہ دار جمہوریت کے حق میں مفید نہیں ہے۔

میرے خیال میں وقت آگیا ہے کہ ہماری ریاستی حکومتیں اس پورے جمہوری نظام کے اوپر نظرثانی کریں۔ ہماری حکومتوں کے مسائل طے کرنے کے لئے واشنگٹن کی طرف دیکھنے کی موجودہ ضرورت آگے چل کر سرکاری طاقت کی خطرناک مرکزیت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے مسائل کو حل ہونا چاہیئے تو جہاں تک ہو سکتا ہے ان کو ہماری ریاستوں کے ذریعہ ہی حل ہونا چاہیئے۔ لیکن ریاست بھی اس وقت تک مؤثر اور مناسب طریقے پر کام نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے جمہوری کل پرزے اسے اس قابل نہ بنا دیں کہ اس سے اس کے شہریوں کی خواہشیں اور ارادے پورے ہونے لگیں۔

ہم کنکٹیکٹ میں ایسی ہی ایک مشینری کو وجود میں لانے کوشش کر رہے ہیں۔

× × ×

۷ — اسکولوں کی ضرورت

جنگ کے بعد کنکٹیکٹ میں اسکولوں کی شدید قلت نے مالیات اور سیاست کے اہم مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ گورنر باؤلز نے نومبر ۱۹۴۹ء میں ریاستی مقننہ کا "اسکول" سیشن طلب کر کے اس کے سامنے یہ پیغام پیش کیا تھا۔ آج ریاست کے تقریباً دو تہائی بچے ان اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں جو اس قانون کی بدولت وجود میں آئے تھے جو اس کے چند ہفتے کے بعد منظور ہو گیا تھا۔

کنکٹیکٹ جنرل اسمبلی کے اس خصوصی اجلاس میں ہم ان اقدامات پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ہماری ریاست میں سرکاری تعلیم کے مستقبل پر زبردست اثر ڈال رہے ہیں۔

کنکٹیکٹ اور شائد پوری قوم بلکہ پوری دنیا کے لئے اس سے زیادہ اہم اور کوئی موضوع نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اپنے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لئے اس وقت کوئی اقدام نہ کر سکے تو ہم جمہوری طرز حکومت کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیں گے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے بچوں کو ایسے بے شمار مسائل سے دوچار ہونا ہوگا جو کسی بھی طرح ان مسائل سے کم پیچیدہ نہیں ہوں گے بلکہ اور زیادہ ہی پیچیدہ ہوں گے جن کو ہماری نسل کے لوگ پچھلے تیس سال سے برابر حل کرنے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں اور پھر بھی انھیں اس میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

اس لئے جب ہم اپنے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہم اپنے بچوں کی ایسی تربیت کی بات کرتے ہیں جس سے وہ مستقبل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے اہل ہو سکیں۔ ہم یہاں اس سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو کوئی بستی یا ریاست یا قوم یا خود اپنے مستقبل کی بھلائی کے لئے اختیار کر سکتی ہے۔

لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جن کی رائے ہے کہ وہ تعلیمی نظام جو ہماری نسل کے لئے موزوں تھا، ہمارے بچوں کے لئے بھی یقیناً موزوں ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ رائے کسی منطق پر مبنی نہیں ہے۔ اگر آج کے بچوں کو ماڈل ٹی کی تعلیم دی گئی جو خود ہمارے والدین نے اسکول کی چھوٹی سی لال عمارت میں حاصل کی تھی تو وہ کل آنکھی دور کے مسائل کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔

تاہم آج ہمیں سرکاری تعلیم کے معیار میں زبردست انحطاط کا خطرہ درپیش ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ہم آگے نہیں بڑھ رہے ہیں، بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ ہم اور پیچھے نہ ہٹ جائیں۔

جیسا کہ میں نے بارہا اصرار کیا ہے۔ ہمیں اپنے تعلیمی نظام میں کنڈرگارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک اساتذہ کی تربیت، ان کے تقرر اور نصاب کی اصلاح کرنی چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں اسکولی عمارتوں کی بڑھتی ہوئی قلت کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔ اسکول کی ایک خراب عمارت میں بہت اچھی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اچھے اسکولوں میں تعلیم خراب دی جاتی ہو۔ اس کے باوجود کنکٹیکٹ کی تعلیم کے معیار کو برقرار رکھنے اور بہتر بنانے کے لئے اسکولی عمارتوں کے ایک وسیع تر پروگرام کی ضرورت ہے اور یہ بھی آج کے اس خاص پیغام کا موضوع ہے۔

اسکولی عمارتوں کے لئے ریاستی امداد کا عام مسئلہ یقیناً پیچیدہ ہے کسی حتمی جواب تک پہنچنے سے پہلے بہت سے سوالوں پر غور کرنا ہوگا۔ میں آپ کے سامنے ان سوالوں پر کچھ روشنی

ڈالوں گا۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اسکولی عمارتوں کی توسیع اور تجدید کس حد تک کی جائے۔ اس بات پر اختلاف رائے کے لئے کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہوسکتی۔

مقامی اسکولی بورڈوں کی حالیہ رپورٹ اسکولی سہولیات کے ناکافی ہونے کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتی ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ اسکولوں میں سے ایک چوتھائی انیسویں صدی کے تعمیر شدہ ہیں۔ یہ کہ آج بھی ایک کمرے پر مشتمل ۵۰ اسکول زیر استعمال ہیں، یہ کہ موجودہ صدی کی چوتھی دہائی میں ہم نے اسکول کی عمارتوں، مرمت، ان میں توسیع کرنے کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اور یہ کہ گزشتہ دس سال میں ہم نے بہت تھوڑے اسکول تعمیر کئے ہیں۔ اور یہ اس صورت میں جب کہ ہماری اسکولوں کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔

رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ صورت حال کے اور زیادہ خراب ہونے کی توقع ہے، لیکن ہمارے بچے آج بھی کم معیار تعلیمی سہولتیں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے شہروں اور قصبوں کی ایک بڑی تعداد اس بات پر مجبور ہے کہ جماعت کو کمرے سے باہر پڑھائے، اور بہت سے اسکولوں میں جماعت کو تہ خانوں، شہری جلسہ گاہوں، حتیٰ کہ غلے کی کوٹھیوں اور غسل خانوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ حقائق اپنی جگہ مسلّم ہیں۔

مستقبل کو نظر میں رکھتے ہوئے رپورٹ میں مجموعی طور پر ان اسکولی عمارتوں کی تعداد کا ذکر کیا گیا ہے جو اسکول کے انتظامیہ ممبران کی رائے میں اگلے دو سال اور پھر آئندہ دس سال میں درکار ہوں گے۔ ان اعداد و شمار کا مجموعہ بہت کافی ہو جاتا ہے۔ وہ اسکولی تعمیرات کے پروگرام کی ضرورت کو ظاہر کرتے ہیں جو اگلے سال یا اس سے اگلے سال نہیں بلکہ ابھی شروع ہونا چاہیئے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا اس مقصد کے لئے ریاستی امداد ضروری ہے۔ اگرچہ صرف چند قصبات ایسے ہیں جو اپنے قانونی قرضے کی حد کو پہنچ چکے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ بڑی تعداد تیزی کے ساتھ اقتصادی قرضے کی عملی حد کو پہنچ رہی ہے یا پہنچ چکی ہے۔ علاوہ بریں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بہت سی بلدیاتی حکومتیں جائداد کے ٹیکس کو پہلے ہی اقتصادی حد تک بڑھانے پر مجبور ہو چکی ہیں۔

ہمارے اکثر و بیشتر قصبوں اور شہروں کو بڑے پیمانے پر تعلیمی عمارتوں کے پروگرام ہی نہیں بلکہ بعض دوسری بڑی ضرورتیں مثلاً پانی کی فراہمی، اور گندے پانی کے نکاس کی بہتر سہولیات، آگ اور پولیس کے محکموں کی سہولیات اور سرکاری عمارتیں وغیرہ —— یہ تمام حالات مقامی اسکول بورڈوں کی تفصیلی معلومات سے ہی ظاہر ہوتے ہیں۔

خصوصاً ١٦ شہروں اور اسکول بورڈ کہتے ہیں کہ اگر انھیں اسکولی عمارتوں کے ضرورت ۲۵

کو آگے بڑھانا ہے تو انھیں ریاستی امداد ملنی چاہیئے۔ مزید، اقصبات کی رائے بھی یہی ہے کہ ایسی امداد ضروری ہے، صرف سات اسکولی بورڈ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ انھیں امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب تک کنکٹیکٹ کی ریاست بھی بہت سی دوسری ریاستوں کی تقلید کرتے ہوئے مقامی لوگوں کو اسکولوں کی تعمیر کے لئے قرض نہیں دیگی، یہ اسکول تعمیر نہیں ہو سکیں گے۔

پھر تیسرا سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے تمام شہروں اور قصبوں کو امداد کی یکساں طور پر ضرورت ہے؟ جواب ظاہر ہے۔ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہمارے شہروں اور قصبوں کی مالیات میں بڑا زبردست فرق ہے۔ ہمارے بعض شہر بہت متمول ہیں، اور بعض بہت نادار اور بعض درمیانی حالت کے ہیں۔ ہر بستی کی ادائیگی کا اندازہ اس کی قابل محصول دولت اور اس کی آبادی کے تناسب سے ہونا چاہیئے۔

ہمارے جمہوری معاشرے میں ہر بچے کو عمدہ تعلیم کے مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ خواہ وہ کسی متمول قصبہ سے تعلق رکھتا ہو یا مفلس قصبے سے، خواہ کسی دولتمند شہر سے تعلق رکھتا ہو یا نادار شہر سے۔ لہٰذا ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ کنکٹیکٹ کے تمام بچوں کے لئے تعلیمی مواقع میں مساوات برتی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں ریاستی امداد کے ذریعہ مختلف بستیوں کی مالی حالت میں یکسانیت پیدا کر دینی چاہیئے تاکہ وہ اپنے بچوں کے تئیں اپنی ذمہ داری کو پورا کر سکیں۔

اب میں چوتھے سوال کو لیتا ہوں۔ اگر اسکولی تعمیرات کے لئے شہروں کو ریاستی مدد کی ضرورت ہے تو آیا کنکٹیکٹ کی ریاست اس وقت ایسی امداد دے سکتی ہے؟

اس سوال کا زیادہ تر جواب ذیل کے حقائق سے مل سکتا ہے۔ ہماری تعلیمی اخراجات کی صلاحیت کا تعلق براہ راست ہماری آمدنی سے ہے۔ گزشتہ دس سال میں کنکٹیکٹ کے لوگوں کی آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے باوجود اگرچہ آج تعلیمی معاملات میں ہمیں واضح طور پر ہنگامی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ہم اپنی مجموعی آمدنی کا بہت ہی کم حصہ تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں جتنا کہ اب سے دس سال پہلے خرچ کیا کرتے تھے، جب کہ ہم بہت کم خوشحال تھے۔

اس میں کسی شک اور شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کنکٹیکٹ کے لوگوں کی مالی حالت ایسی ہے کہ وہ تعلیم جیسی اہم مد میں اور زیادہ سرمایہ لگا سکتے ہیں۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ ریاست کو اس مقصد کے لئے کتنی امداد منظور کرنی چاہیئے اور اس رقم کو کس طرح فراہم کیا جانا چاہیئے؟ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ مساوی بنیادوں پر شہروں اور قصبوں کے لئے ریاستی امداد کا اوسط اسکولی عمارتوں کی مجموعی قیمت کے نصف یا چوتھائی کے درمیان ہونا چاہیئے۔ اگرچہ بعض خاص حالات میں یہ امداد اس اوسط سے کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔

بعض لوگوں کی تجویز ہے کہ ہمیں دوسرے کاموں کے اخراجات میں کمی کر کے ضروری رقم فراہم کرنی

چاہیئے۔ آپ میں جو بھی اس تجویز کے حامی ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ واضح طور پر یہ بتلائیں کہ آپ ہمارے موجودہ محکموں میں کہاں اور کس حد تک کمی کرنا پسند کریں گے۔؟

مثال کے طور پر کیا آپ ریاستی پولیس کے اخراجات میں تخفیف کرنا پسند کریں گے یا آپ ہمارے ضعیف العمر اور نادار لوگوں کی بہبود کے اخراجات میں تخفیف کریں گے؟ اگر یہ درست ہے تو آپ ان مدات میں کس حد تک کمی کرنا پسند کریں گے؟ کیا آپ ریاست کے صحت کے پروگراموں میں کمی کریں گے؟ یا ہمارے دماغی امراض کے اسپتالوں میں جہاں پہلے ہی اسٹاف کم ہے کوئی کمی کرنا پسند کریں گے؟ یا بیروزگاری کے معاوضہ اور مزدوروں کے معاوضہ میں؟ یا نیشنل گارڈ میں؟ محتاج بچوں امداد میں۔؟

آپ میں سے بعض نے، جو یہ جانتے ہیں کہ ہمارا بجیٹ کس قدر تنگ ہے، اور یہ کہ ریاست کے بعض محکموں کی کارکردگی کو خطرے میں ڈالے بغیر اخراجات میں بھاری کمی نہیں کی جاسکتی، تجویز کیا ہے کہ ہم اسکولی عمارتوں کی موجودہ ضرورت کو ٹیکس میں اضافہ کے ذریعہ پورا کرسکتے ہیں۔

یہ ایک دیانت دارانہ اور واقعاتی صورت حال ہے۔ لیکن میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں میرا خیال ہے کہ معاشی بدحالی کے اس دور میں ٹیکس میں اضافہ کا مطلب ریاست بھر میں تجارت اور روزگار کی ترقی میں ایک سنگین رکاوٹ پیدا کردینا ہے۔

علاوہ ازیں میرا خیال ہے کہ ٹیکس میں اضافہ غیر ضروری ہے۔ جب تک کہ ہماری مالی حالت اس سے کہیں زیادہ خراب نہ ہونے لگے جتنی کہ اس وقت بجٹ ڈائرکٹر کو توقع ہے، اس وقت تک ہم محتاط نظم ونسق اور مصلحت اندیش قوانین کے ذریعہ اپنی آمد وخرچ کو متوازن رکھ سکتے ہیں۔ [۱]

اس مسئلہ کو حل کرنے کا ایک اور متبادل طریقہ بھی موجود ہے میرا اشارہ قسط وار منصوبے کے طریقے کی طرف ہے جس کے ذریعہ ریاست مقامی طور پر تعمیر شدہ اسکولوں کے اخراجات میں اپنا حصہ ادا کرسکتی ہے۔

جب کوئی تجارت اپنے کارخانے میں اضافہ کرتی ہے تو اس کو سرمایہ قرض لینا ہوتا ہے جسے وہ اس کارخانے کی بارآور زندگی کے دوران ہی کئی سال کے عرصہ میں واپس کردیتی ہے۔ جب کوئی کنبہ ایک مکان خریدتا ہے تو وہ رہن کے ذریعہ اس مکان کے لئے روپیہ فراہم کرتا ہے، جو کئی سالوں میں بیباق ہوجاتا ہے۔ اسی طریقے سے آج ہم کنکٹیکٹ میں استادوں کے کالج اور پیشہ ور اسکولوں کی عمارتیں بنا رہے ہیں اور کنکٹیکٹ یونی ورسٹی میں اضافے کررہے ہیں۔ لہٰذا اسی طریقے پر کاربند رہتے ہوئے ہم مزید ۲۵ لاکھ ڈالر بھی اکٹھا کرسکتے ہیں جو اسکولوں کی تعمیر کے لئے ہر سال درکار ہوں گے۔

میری رائے میں یہ اجلاس مقننہ کے ہر ممبر اور ہر سیاسی جماعت کے خلوص کی آزمائش کا

---

[۱] گورنر باؤلز کے دور انتظام میں کنکٹیکٹ ان تین ریاستوں میں سے ایک تھی جنھوں نے ٹیکس میں اضافہ کئے بغیر اپنے بجٹ کو متوازن بنائے رکھا۔

موقع فراہم کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام کو مستحکم بنانا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہاں تو کیا ہم اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری اقدامات کرنے کے لئے رضامند ہے یا نہیں؟

یہ سوال اتنا صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ تقریباً ایک سال سے ہم اسکولوں کی تعمیر کی باتیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور ہر موقع پر ہم نے یہ ارادے ظاہر کی ہے کہ اس پر عملدرآمد ہونے والا ہے۔ لیکن اب ہم بحث کے اس مرحلے پر آ پہنچے ہیں کہ جسے عام بول چال کی زبان میں "کر دیا خاموش رہو" کہا جا سکتا ہے۔

اس اجلاس میں شرکت کرتے وقت ہم پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ میری ذمہ داری کا ایک حصہ یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے وضاحت کے ساتھ بیان کر دوں کہ ان نازک مسائل کے بارے میں اپنی رائے کیا ہے اور وہ تمام حقائق آپ کے سامنے لے آؤں جنھیں میں اکٹھا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے باقی کام آپ کو کرنا ہے۔

× × ×

۸- کنکٹیکٹ میں مکانات کی قلت کا مسئلہ

مکانوں کی قلت کا مسئلہ ۴۹-۱۹۴۸ء کا ایک بڑا سیاسی مسئلہ تھا۔ اس سلسلہ میں کنکٹیکٹ کی حکومت نے کم قیمت مکانات کی تعمیر اور ان کی ملکیت کا جو کامیاب منصوبہ بنایا تھا۔ اور جو ایک ایسی کوشش تھی جس پر شاید ہی کسی ریاستی حکومت نے کبھی عمل کیا ہو اس کا اس مضمون میں ذکر کیا گیا ہے۔ آج تقریباً ستر ہزار مرد عورتیں اور بچے اس پروگرام کے تحت تعمیر کئے جانے والے مکانات میں رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں شائع شدہ سمپوزیم "ایک قوم کے دو تہائی حصے" سے ماخوذ۔

کیا عام لوگوں کی رہائش کے سلسلہ میں ہماری ریاستی حکومتوں کو کوئی رول ادا کرنا ہے؟ اس سوال پر صرف رہائشی مکانات سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو ہی غور نہیں کرنا ہے، بلکہ ان تمام لوگوں کو بھی غور کرنا ہے جنھیں اس بات پر تشویش ہے کہ ہم مرکزی حکومت کے زیادہ دست نگر ہوتے جا رہے ہیں۔

شہر کے گندے حصوں کی صفائی، کم قیمت مکانات کی تعمیر، نجی عمارت سازی کی ہمت افزائی اور اوسط آمدنی والے لوگوں کے مکانات کے مشکل مسئلہ کو حل کرنے کا کام۔ ریاستی پروگراموں کے

بجائے زیادہ تر وفاقی بلدیاتی پروگراموں کے تحت ہو رہا ہے۔

شہر کے خستہ حصوں کی صفائی کرنے، ان کو نئے سرے سے ترقی دینے، تعمیراتی کاموں کی تحقیق اور خریداروں و تعمیر کاروں کی سکونت کے لئے اپنی قرضوں کے پروگراموں میں وفاقی حکومت اس قدر اور اس نوعیت کی مدد دے رہی ہے کہ ٹیکس کے موجودہ نظام میں چند ایک ریاستی حکومتیں ہی اس کی ہمسری کر سکتی ہیں۔

کنکٹیکٹ کے گورنر کی حیثیت سے میرے تجربہ نے مجھ پر یہ واضح کر دیا کہ ایک ذمہ دار اور اچھے نظم و نسق کی ریاستی حکومت، رہائشی مکانات کے وسیع پروگرام شروع کر سکتی ہے اور مالی امداد دے کر پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتی ہے۔ ایسا پروگرام مرکزی اور مقامی پروگراموں کے لئے ضروری ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے بیش بہا مددگار بھی ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک مقتدر اور موثر ریاستی حکومت ٹیکس دہندگان پر مزید بار ڈالے بغیر قرض حاصل کر کے اوسط آمدنی والے لوگوں کے عمدہ مکانات کے لئے مالی امداد دے سکتی ہے۔ یہ چھوٹے پیمانے پر رہائشی تعمیر کے پروگراموں اور مالی امداد کے نئے طریقوں کا بھی تجربہ کر سکتی ہے، جو وفاقی حکومت کے لئے ممکن نہیں ہے۔

روزمرہ کے براہ راست رابطہ کے ذریعہ جو فاصلوں کے باعث وفاقی حکومت کے لئے ممکن نہیں ہے، ریاستی حکومت رہائشی تعمیر کے مقامی ذمہ دار افسران کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا کر سکتی ہے اور کارکردگی کے معیار کو بڑھا سکتی ہے۔ اجتماعی عمل کی حوصلہ افزائی کر کے اور مقامی افسران پر بار بار تقاضہ نیز وفاقی حکومت کی منظور شدہ رقم میں اضافہ کر کے ریاستی حکومت شہر کے خستہ حصوں کی صفائی ان کو پھر سے ترقی دینے اور ارزاں کرائے کے مکانات کی تعمیر کی مزید ہمت افزائی کر سکتی ہے۔

پھر یہ سوال رہائشی تعمیر کاری سے بڑھ کر جمہوری حکومت کے بارے میں ہمارے نظریہ بالخصوص وفاقی اور ریاستی حکومت کے اختیارات کے تناسب تک پہنچتا ہے۔ وفاقی اور بلدیاتی حکومتوں سے عام لوگوں کے رہائشی مکانات کے کل بوجھ کو اٹھانے کے مطالبے کا مطلب یہ کہ ہم اپنی ریاستی حکومتوں کے بڑے اہم کردار کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس بات کی حمایت کر رہے ہیں کہ واشنگٹن کے اور زیادہ دست نگر ہو جائیں۔

کنکٹیکٹ میں رہائشی تعمیر کاری پر دو سال سے زیادہ سیاسی اور آئینی گو ماگرم تقریریں سننے کے بعد مجھے اس امر میں کوئی شبہہ نہیں رہا ہے کہ ریاستی تعمیر کاری کا کام چنداں مشکل نہیں ہے۔ سرکاری مکانات کی تعمیر کے مخالفین ریاستی اجلاس گاہوں اور سیاسی جماعتوں میں بھی

اس کے اتنے ہی شدید مخالف ہیں جتنے کہ واشنگٹن میں۔ اس کے باوجود جب میں کنکٹیکٹ کے ۲۵۰۰ پرجوش خاندانوں کو ریاستی مالی مدد سے تعمیر شدہ صاف ستھرے اور عمدہ مکانوں میں داخل ہوتے دیکھتا ہوں تو میرا یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ ریاستی تعمیر کاری کے پروگرام سے جو تغیر پذیر جمہوری معاشرے وجود میں آتے ہیں اس کے مقابلہ میں بعض معمولی سیاسی اور آئینی خرشوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

امریکہ کے لوگوں کا یہ خیال پختہ ہوتا جارہا ہے کہ اچھی رہائش خواہ وہ مناسب قیمت پر ہو یا کرایہ پر، ہمارے آزاد معاشرے کی صحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جب ایسی رہائش کے لئے نجی ذرائع سے سرمایہ حاصل نہ ہو سکے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہمارے نجی کاروباری نظام کی حدود میں کام کرتے ہوئے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرے۔

پورے ملک کی صنعتی ریاستوں میں جنگ کے بعد کنکٹیکٹ کی رہائشی صورت حال بڑی عجیب عزیب تھی، خاص طور پر کنکٹیکٹ کے جنگی صنعت کے کارخانوں میں کام کرنے کے لئے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کے آنے سے یہاں کی آبادی میں دس سال کے اندر تین لاکھ کا اضافہ ہو گیا۔

LANHAM ACT کے تحت ۵۰۰۰ عارضی مکانات کے علاوہ جنگ کے دوران کوئی تعمیر نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ کہ ہماری چھوٹی سی ریاست میں ۲۷۰۰۰ خاندانوں کو اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ مل کر رہنا پڑا۔ جب کہ مزید ۴۲۰۰۰ خاندان ان مکانات میں رہ رہے تھے جن کو ماہرین نے غیر معیاری یا دیگر الفاظ میں خستہ حال قرار دیا تھا۔

اسی دوران میں یہ امر بھی واضح ہو گیا تھا کہ کنکٹیکٹ میں نجی سرمایہ دار ایک سال میں سات ہزار سے آٹھ ہزار مکانات تک کے لئے روپیہ دے سکتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں وفاقی VETERANS EMERGENCY HOUSING PROGRAM کی تنسیخ کے بعد یہ مکانات صرف زیادہ آمدنی والے لوگوں کے لئے بنائے گئے۔ ان کی قیمت فروخت پندرہ ہزار ڈالر سے زیادہ تھی اور کرایہ نوے ڈالر ماہانہ سے زیادہ۔

جنگ سے لوٹ کر آنے والوں نے برہم ہو کر اپنے قریب ترین سرکاری ادارے — اپنی ریاست کی مجلس قانون ساز — سے اپیل کی۔ کم اور اوسط آمدنی والے طبقوں کے لئے ریاستی تعمیر کاری ۔۔۔۔۔۔۔ کے مناسب پروگرام کے ذریعہ نجی سرمایہ سے کام کرنے والے ٹھیکیداروں کی سریع اور موثر امداد کا مطالبہ ۱۹۴۸ء کے موسم خزاں میں گورنری کے لئے میری مہم کا ایک عظیم مسئلہ بن گیا تھا۔

گورنری کا حلف لے چکنے کے بعد میں نے قانون ساز مجلس سے ایسے ریاستی تمسک کے اجراء کی سفارش کی، جس کی مدد سے تیرہ ہزار مکانات تعمیر کئے جاسکتے تھے۔ بالآخر میری تجویز سے اتفاق

کرلیا گیا۔ مگر یہ شرط رکھی گئی کہ ان میں سے نصف کرایہ پر اُٹھائے جائیں اور نصف اوسط آمدنی والے خاندانوں کو فروخت کر دیے جائیں۔

اس منصوبہ کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ اس پروگرام کے لئے درکار سرمائے کا بڑا حصہ یک سالہ نوٹوں کے ذریعہ حاصل ہوا جنھیں ریاستی حکومت نے جاری کیا تھا۔ اور ہر سال ان کی تجدید ہوتی تھی۔ فی الحال ان نوٹوں پر سود کی شرح ایک فی صدی ہے جب کہ ۱۵ سالہ قرضوں پر عموماً ۲ء۶ فی صدی ہے۔ کم لاگت اور قلیل المدت سرمائے کے استعمال سے ہم مکانات کا کرایہ گھٹا کر اوسطاً ۴۳ ڈالر تک لے آئے۔ ریاست کے کسی نقصان کے بغیر اس میں سود کی شرح کے مطابق ہر سال کمی بیشی ہوتی رہے گی۔

فروختگی کے لئے تعمیر شدہ مکانات سے متعلق تھوڑا سا خطرہ باقی رہتا ہے، وہ یہ کہ اگر سود کی شرح میں کافی اضافہ ہو جائے تو خسارہ کی صورت پیدا ہو جائے گی جس کا بھگتان ریاست کو کرنا پڑے گا۔ مکانوں کی قلت کی صورت حال کے پیش نظر سب لوگ یہ خطرہ مول لینے پر آمادہ ہو گئے۔[ل]

جنرل اسمبلی میں اس عظیم منصوبے کو پیش کرنے سے قبل میں نے ریاست بھر کے ماہرین تعمیرات ٹھیکے داروں، عمارتی سامان کے سوداگروں، اور مزدور رہنماؤں سے اس معاملہ پر تفصیلی گفتگو کرلی تھی۔ ان سب نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ کم سے کم قیمت پر اعلیٰ ترین مکان بنانے میں ریاست کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے کی کوشش کریں گے۔

پورے کنکٹیکٹ کی عمارتی ٹریڈ کونسلوں کے نمائندہ مزدور رہنماؤں کی اس یقین دہانی سے مجھے سب سے زیادہ مسرت ہوئی کہ کسی بھی قسم کی آرام طلبی اور ٹال مٹول کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور یہ وعدہ پورا کیا گیا۔

کنکٹیکٹ میں مکانوں کی تعمیر کی کوشش کے ذریعہ ہم نے ریاستی اور بلدیاتی حکومتوں نیز حکومت اور نجی سرمایہ کاروں کے درمیان ایک مشترکہ ذمہ داری کی روایت قائم کر دی میرا خیال ہے کہ ہم نے انتہائی وہمی اشخاص سے بھی اس بات کو منوا لیا کہ ایک منصوبہ بند اور ریاستی سرمائے سے چلنے والا تعمیراتی پروگرام نجی تعمیری سرگرمی اور سامان خانہ داری و فرنیچر مہیا کرنے والوں کے لئے عظیم محرک ثابت ہوگا۔

نجی سرمایہ ریاستی پروگراموں کے ہر مرحلے پر ہاتھ بٹاتا ہے۔ تعمیر کاری کے مقامی حکام غیر سرکاری ماہرین فن تعمیر سے کام لیتے ہیں، وہ غیر سرکاری عمارتی ٹھیکہ داروں کو

ل سود کی شرح بڑھی اور خسارہ بھی بڑھا لیکن مکانوں کی شدید قلت سے نجات پانے کی یہ قیمت بھی کم معلوم ہوتی ہے۔

کام سونپ دیتے ہیں جو پرائیویٹ ذرائع سے عمارتی سامان حاصل کرے اور نجی کاروباری ٹھیکیدار ہی مزدوروں کو کام پر لگاتے ہیں۔
روپے کا سارا لین دین، یہاں تک کہ مکان کی ملکیت کے لئے ریاستی قرضے کے رہن کا کاروبار بھی نجی بینکوں اور نجی قرض دینے والے اداروں کے ذریعہ ہوتا ہے۔
تخمینہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیرہ ہزار نئے مکانات کے پورے پروگرام سے کنکٹیکٹ میں ۱۹۵۰ء کے دوران بنے ہوئے مکانات کی تعداد میں پچھلے سال کے مقابلہ میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہو جائیگا۔ — ان مکانات کی تعمیر ریاستی حکومت کی کوششوں کے بغیر ممکن نہ ہوتی۔
امریکہ کے ہر خاندان کے لئے ایک عمدہ مکان آج کی جمہوریت کے تقاضوں میں سے ایک ہے۔ اس ذمہ داری میں اپنا مناسب حصہ ادا کرنے کے لئے ریاستی حکومتیں نہ صرف اس دن کو ہی جلد سے جلد لانے کی کوشش کریں گی۔ جب اس قسم کی رہائش مکمل طور پر حاصل ہو جائے گی۔ بلکہ وہ اس بات کا بھی مظاہرہ کریں گی کہ ہمارا روایتی وفاقی ریاستی نظام عملاً بھی اتنا ہی موثر ہے جتنا کہ نظریاتی طور پر۔ اور یہ کہ ہمارے شہریوں کو اپنے'' کام کرانے کے لئے'' ہمیشہ ہی واشنگٹن جانے کی ضرورت نہیں۔

× × ×

۹ - ریاستی طبی امداد کے پروگرام کی ایک تجویز

۲۸ اگست ۱۹۵۰ء کو ریڈیو پر ایک تقریر کے دوران گورنر باؤلز نے بتایا کہ ایک ریاستی حکومت بیمہ پروگرام کی جس کا مقصد لوگوں کو'' مہلک امراض'' کے اخراجات برداشت کرنے میں مدد دینا ہو، کس طرح معاونت کر سکتی ہے۔

امریکی قوم سال بہ سال زیادہ صحت مند ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سے ہم نے نومولود بچوں کی امکانی عمر میں تقریباً بیس سال کا اضافہ کر دیا ہے۔ ہم نے تپ دق، نمونیا اور خناق وغیرہ موذی امراض پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اب کینسر، بچوں کے فالج، قلبی امراض اور ایسی ہی دوسری بیماریوں کے خلاف ہماری جدوجہد آگے بڑھ رہی ہے۔
کنکٹیکٹ میں خاص طور پر ہمارے صحت کے اعداد و شمار بہتر ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس لائق ترین ڈاکٹر اور عمدہ شفاخانے ہیں۔ ہمارے لوگ ریاست ہائے متحدہ کے تمام علاقے لوگوں سے

زیادہ تنومند اور دراز عمر ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود طبّی امداد کے سلسلہ میں ایسے سوال ہیں جو میری رائے میں خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ اول یہ کہ مہلک بیماریاں شروع ہونے سے پہلے ہی ان کی روک تھام کے لئے کیا کیا جاسکتا ہے؟ دوم یہ کہ کنکٹیکٹ میں ڈاکٹروں کو مزید ٹریننگ دینے کے لئے کیا اقدامات کئے جاسکتے ہیں؟ اور سوم یہ کہ ان طویل اور مہلک امراض کے علاج معالجے کے روح فرسا اخراجات کے معاملے میں کیا کیا جاسکتا ہے جنھوں نے بہت سے خاندانوں کو مستقل قرضداری میں مبتلا کر دیا ہے؟

پہلے سوال یعنی کسی شدید مرض کی پہلے سے شناخت کے مسئلہ کو لیجئے۔ ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ اگر ابتدائی مراحل میں ہی مرض کی تشخیص ہو جائے تو ان ہزاروں جانوں کو بچایا جاسکتا ہے، جن کے بچنے کا بصورت دیگر کوئی امکان نہیں رہتا۔ اسی لئے اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ ہم سب کو ہر سال مکمل طبّی معائنہ کرالینا چاہیئے۔

ہم میں سے بعض لوگ لاپروائی یا سستی کے باعث اس طرف توجہ نہیں دیتے ہیں وقت تو شاید کبھی بھی نہیں مل سکتا۔ لیکن ہزاروں آدمی ایسے بھی ہیں کہ وہ اس بار کے متحمل نہیں ہوسکتے۔

اس مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں، میں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہم ریاست بھر میں ایسے بیس پچیس تشخیصی مراکز کھول دیں، جن کے انتظام کی ذمہ داری خود ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں ہوگی۔ ان شفاخانوں کے ذریعہ، جن میں سے بعض شہر شہر گشت کر سکتے ہیں کنکٹیکٹ کے تمام شہریوں کا نہایت کم خرچ پر سالانہ یا ششماہی طبّی معائنہ کیا جاسکتا ہے؟

جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے وہ پوری ریاست پر حاوی ایک بیمہ سسٹم کے ذریعہ ہوسکتی ہے جس میں قلیل آمدنی والے خاندانوں کے بار کو کم کرنے کے لئے ریاستی حکومت مالی امداد بہم پہونچائے گی۔

بہت سے ڈاکٹروں نے مجھے بتایا ہے کہ اس قسم کے پروگرام کے ماتحت باقاعدہ طبّی معائنوں کے ذریعہ کنکٹیکٹ میں ہر سال ہزاروں جانوں کو بچایا جاسکتا ہے۔ تپ دق کے سلسلہ میں عوام الناس کے ایکس رے کے معائنوں سے جو فوائد حاصل ہوئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا مسئلہ طبّی وسائل کی توسیع کا ہے، تاکہ ہمارے عوام ان اعلیٰ طبّی سہولیات سے مستفید ہوسکیں جو طب جدید انھیں فراہم کرسکتا ہے۔ آئندہ سالوں میں ہمیں اور زیادہ اسپتال کھولنے چاہیئیں، ان میں اور بہتر ساز و سامان مہیا کرنا چاہیئے اور زیادہ تعداد میں ڈاکٹروں،

نرسوں اور دیگر خصوصی معالجین کی تربیت کرنی چاہیئے۔

اسکولوں میں طبی سہولیات کے مہیا کئے جانے کا مجھے خاص طور پر خیال ہے۔ اگرچہ ییل یونی ورسٹی میڈیکل اسکول ریاست ہائے متحدہ کے بہترین میڈیکل اسکولوں میں سے ایک ہے۔ وسائل کی قلت کے باعث یہاں سے سالانہ صرف ۶۵ ہزار مرد اور عورتیں طبی تعلیم کی تکمیل کر سکتی ہیں۔ یہ تعداد پچیس سال قبل کی تعداد سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

ایک نیا کنکٹیکٹ یونی ورسٹی میڈیکل اسکول جس کا انحصار ہمارے اعلیٰ درجے کے ہارٹ فورڈ ہاسپٹل پر ہے، ہر سال کنکٹیکٹ کے ان بہت سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو طبی تربیت دے سکتا ہے جنھیں آج ڈاکٹر بننے کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔

تیسرا مسئلہ جس کا ہم سب کو حل تلاش کرنا ہے ان سب سے اہم ہے یعنی طویل المیعاد بیماریوں کے لئے طبی خدمات کے انتہائی زبردست اخراجات کا۔ جو کنکٹیکٹ کے بہت سے خاندانوں کی آمدنی سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔

اعلیٰ طبی امداد کی اس درجہ گراں ہونے کے معقول اسباب موجود ہیں۔ جدید اسپتالوں کی تعمیر، ان میں ضروری آلات کا مہیا کرنا اور ان کو چلانا، بہت پُر مصارف کام ہیں۔ ایک ڈاکٹر کی تربیت میں ہی سات آٹھ سال لگ جاتے ہیں۔ بہت سی نئی مگر ضروری مفرد ادویہ کی تیاری اور تقسیم پر کافی لاگت آتی ہے۔

یہ گرانقیمتیں ہمارے ہزاروں شہریوں پر نہایت تباہ کن اثرات ڈالتی ہیں۔ بعض لوگوں نے مجھے بڑے دلدوز خط لکھے ہیں۔

میں آپ کے سامنے ایک خاص نوعیت کا واقعہ بیان کروں گا جو ابھی چند روز پہلے میرے علم میں آیا ہے۔ اس خاندان میں باپ کی عمر ۴۷ سال اور اس کی ہفتہ وار آمدنی ۶۵ ڈالر ہے جو کنکٹیکٹ کے تقریباً تمام خاندانوں کی اوسط آمدنی کے برابر ہے۔ سخت محنت اور محتاط اخراجات کے طفیل اس شخص اور اس کی بیوی نے کئی سال کی کوشش کے بعد ۳۱۰۰ ڈالر پس انداز کئے تھے۔ ان کے اس احساس کافی طمانیت بخش تھا کہ اس رقم سے وہ اپنے ذہین لڑکے اور لڑکی کو کالج کی تعلیم دلا سکیں گے۔

لیکن تین سال ہوئے کہ ماں کے والد جو ان کے ساتھ مقیم تھے خطرناک عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے۔ بیماری طویل تھی۔ طویل علاج اور طبی امداد کی قیمت چار ہزار ڈالر سے زیادہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پس انداز کئے ہوئے ۳۱۰۰ ڈالر جلد ہی ختم ہو گئے اور دونوں بچوں کے لئے کالج کی تعلیم ناممکن ہو گئی۔

یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ یقیناً آپ کے شہر کے ایسے بہت سے دردناک واقعات آپ کے علم میں ہوں گے۔

بلیو کراس (BLUE CROSS) جیسے صحت کے بیمہ کے رضا کارانہ پروگرام مسئلہ کی شدت کو کم کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔ لیکن کسی بھی ذریعہ سے تمام شہریوں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی، نہ ہی وہ ہر قسم کے کیس اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔

اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی غرض سے میں خاص کنکٹیکٹ کے لئے صحت کے بیمہ کی تجویز پیش کر رہا ہوں جو موجودہ رضا کارانہ پروگراموں کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔

پروگرام کے اخراجات کی فراہمی کے لئے ہم میں سے ہر شخص سالانہ ٹیکس کے ذریعہ ایک معمولی رقم مشترکہ فنڈ میں دے گا۔ اس مشترکہ فنڈ کو معمولی بیماریوں کے لئے صرف نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ صرف ان میعادی، خطرناک اور بھاری اخراجات والی بیماریوں کے لئے اس کا استعمال ہوگا۔ جن کی قیمت بہت سے خاندان اپنے معمولی اخراجات کے ایک حصے کے طور پر ادا نہیں کر سکتے۔

اب میں آپ کے سامنے اس تجویز کے عملی پہلوؤں کی اچھی طرح وضاحت کر دوں گا۔ آمدنی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر خاندان کے لئے ایک حد مقرر کر دی جائے گی جس سے نیچے کے تمام طبی مصارف معمولاً اور براہ راست ادا کئے جائیں گے۔ اور اس سے زیادہ کے لئے اس خاندان کو مرکزی بیمہ فنڈ سے امداد دی جائے گی۔ مثلاً ایسی بیماری کے لئے جس کے اخراجات خاندان کی سالانہ آمدنی کے دس فیصدی سے کم ہوں، مریض یا اس کے خاندان کے لوگ خود کفیل ہوں گے۔ بیمہ فنڈ سے رقم اسی وقت لی جا سکے گی، جب خاندان کی بیماری کے اخراجات سال بھر میں دس فیصدی سے زیادہ ہو جائیں۔

ابھی میں نے جس خاندان کا ذکر کیا ہے، اس منصوبے کے تحت اس کی اس طرح مدد کی جائیگی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، باپ کی آمدنی ۶۵ ڈالر فی ہفتہ یا ۳۳۸۰ ڈالر سالانہ ہے۔ معمولی بیماری یا بیماریوں کا خرچ جو ۳۳۸ ڈالر ہے یا دوسرے الفاظ میں، ۳۳۸۰ ڈالر کے دس فیصدی تک ہو، خاندان اپنی حسب معمول آمدنی یا پس انداز شدہ رقم یا دوسرے ذرائع سے پورا کرے گا۔

لیکن نانے ابا کی طویل بیماری کا خرچ، اسپتال اور ڈاکٹر کے بل کو ملا کر ۴۰۰۰ ڈالر ہوا۔ ان غیر معمولی اور کثیر اخراجات کے لئے خاندان ریاست کے بیمہ فنڈ سے رقم حاصل کر سکتا ہے۔

مناسب جانچ پڑتال کے بعد اس فنڈ سے بیماری کے مجموعی خرچ یعنی چار ہزار ڈالر اور ۳۳۸ ڈالر (جو خاندان کی آمدنی کا دس فیصدی حصہ ہے، اور جسے خاندان براہ راست ادا کرے گا) کے فرق کی رقم ادا کی جائے گی۔ اس صورت میں فنڈ ۳۶۶۲ ڈالر کی ادائیگی کرے گا۔

اس کل ریاستی پروگرام سے ذاتی آمدنی کے مطابق تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہر شخص فائدہ اٹھا سکے گا۔ مثال کے طور پر جس شخص کی سالانہ آمدنی ۲۵۰۰۰ ڈالر ہے، اس سے یہ توقع کی جائے گی کہ وہ کسی ایک سال میں، کسی بیماری یا بیماریوں کے اخراجات کا پہلا دس فی صدی حصہ

یعنی ۔۔ ۲۵ ڈالر تک خود برداشت کرے گا۔

اس تجویز میں بہت سی ترمیمات ہو سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تفصیلی بحث اور ماہرین کے غور و خوض کے بعد اس کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر صحت کے بیمہ کی رضاکارانہ انجمنوں کا مشورہ مفید ہوگا، کیونکہ ان کو اس قسم کے کاموں کا کافی تجربہ ہے۔

بہرکیف مسئلہ کی پیچیدگیوں کے باعث کام میں رکاوٹ نہیں پیدا ہونی چاہیئے طبی اخراجات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ صورت حال اور زیادہ دشوار ہو جائے گی۔ لہٰذا ایک ایسا قابل عمل منصوبہ تیار ہونا چاہیئے جس سے کم اوسط آمدنی والے خاندانوں کے اخراجات کے شدید بار کو کم کیا جا سکے، جو ڈاکٹروں کی اصطلاح میں "تباہ کن امراض" کا شکار ہوتے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ہونی ضروری ہے کہ اس قسم کے پروگرام کے لئے علاج معالجے پر سرکاری کنٹرول یا بعض انتہا پسندوں کے کہنے کے مطابق "اشتراکی معالجے" کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اس پروگرام کا انصرام معتمدین کے ایک ایسے بورڈ کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جس میں زیادہ تعداد اسی پیشہ کے لوگوں ـــــ مثلاً ڈاکٹروں، ہاسپٹل سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کی ہونی چاہیئے۔

اس سے ڈاکٹروں یا مریضوں کے آزادانہ انتخاب یا ان کے آپس کے تعلقات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔ اس میں علاج معالجے کے اعلیٰ معیاروں کے تحفظ اور اصلاح کی گنجائش ہوگی۔ اس پروگرام کا تعلق صرف کنکٹیکٹ سے ہوگا، جس میں صحت کے نجی ذرائع مثلاً ڈاکٹروں، نرسوں، اسپتالوں اور دوا فروشوں وغیرہ کا استعمال کیا جائے گا اور جس کا واشنگٹن کی وفاقی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

اس سے بڑے زبردست فوائد مرتب ہوں گے۔ صرف کنکٹیکٹ کے ان لاکھوں خاندانوں کے لئے ہی نہیں جنھیں طبی خدمات کی مہنگائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بلکہ ان ڈاکٹروں، نرسوں، دوا فروشوں اور اسپتالوں کے منتظمین کے لئے بھی، جو اکثر اپنی پیش کردہ خدمات کا معاوضہ حاصل کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا تین مسائل نے کافی عرصے سے میرے ذہن کو خلفشار میں مبتلا رکھا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح میں سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے بہت سے لوگوں کا ذہن بھی اس سلسلہ میں پریشان رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگ میری تجویز سے بہتر کوئی تجویز پیش کر سکیں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہم اس ضرورت کو محسوس کریں اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نہایتی قابلِ عمل اور موثر اور انتہائی ارزاں تدابیر کی تلاش کریں۔

ہم کنکٹیکٹ کے لوگ اپنی عظیم دولت اور طبی خدمات کے اعلیٰ ترین ریکارڈ کی موجودگی میں اس بات کے غیر معمولی طور پر اہل ہیں کہ دوسروں کو راہ دکھائیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ وفاقی حکومت کا سہارا تلاش کئے بغیر ہی ہم ریاستی سطح پر اپنے مسائل کے مؤثر حل تلاش کرلیں۔

ہماری وفاقی حکومت نے اڑتالیس ایسی "ریاستی تجربہ گاہیں" قائم کی ہیں، جہاں سماجی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نئے طریقے اختراع اور ایک خاص حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچائے جا سکتے ہیں۔

اسی روایت کے تحت مغرب بعید کی بعض ریاستوں نے موجودہ اجرت اور اوقات کے قوانین وضع کئے۔ زراعت سے متعلق ہمارا موجودہ قومی توسیعی تحقیقی پروگرام اس سلسلہ میں کنکٹیکٹ کا عظیم کارنامہ ہے۔

۱۔ میری تجویز یہ ہے کہ کنکٹیکٹ ایک ایسا ریاستی طبی خدمات کا پروگرام وضع کرنے کے کام میں پہل کرے جس کی بدولت ہمارے عوام کی معقول طبی امداد ڈاکٹروں اور نرسوں، زیادہ اسپتالوں اور کلنکوں (جو پیشہ ور لوگوں کے زیر نگرانی ہوں گے) کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے۔

اس قسم کی جدوجہد میں ہمیں نہایت سمجھ داری کے ساتھ ڈاکٹروں اور مریض دونوں کی آزادی کو سرکاری مداخلت سے محفوظ رکھنا ہوگا، اور اپنے اعلیٰ طبی معیاروں کی خاص طور پر حفاظت کرنی ہوگی۔

لیکن حکومت کے تعاون کی کوششوں کے بارے میں اپنے روایتی خوف کا سہارا لے کر ہمیں خاموشی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے۔

ہمیں اپنے موجودہ طبی ذرائع کو بیماریوں کی روک تھام اور انسداد کے لئے ترقی دینی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اعلیٰ درجہ کی طبی امداد کو کنکٹیکٹ کے ہر خاندان کے لئے مالی حیثیت سے ممکن بنا دینا چاہیئے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم سب یعنی نجی طبی ادارے، حکومت اور دیگر تمام گروہ مل کر کام کریں، اور قابلِ عمل باکفایت پروگراموں اور امریکی طریق کار کے ذریعہ ان مقاصد کی تکمیل کی راہیں تلاش کریں۔

قومی صحت کا جو پروگرام آج کل واشنگٹن میں زیر بحث ہے، طبی پیشہ کے لوگوں کی طرف سے اس کی شدید مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی تشکیل میں اس پیشے کے لوگوں کا بہت کم ہاتھ رہا ہے۔

لہذا میری خواہش ہے کہ اس قومی مسئلہ کے حل کے لئے، کنکٹیکٹ کے لئے میری پیش کردہ تجویز کے بارے میں کنکٹیکٹ کے ڈاکٹر، نرسیں، طبی اساتذہ اور اس پیشے سے متعلق دوسری

یعنی . . ۲۵ ڈالر تک خود برداشت کرے گا۔

اس تجویز میں بہت سی ترمیمات ہو سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تفصیلی بحث اور ماہرین کے غور و خوض کے بعد اس کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر صحت کے بیمہ کی رضا کارانہ انجمنوں کا مشورہ مفید ہو گا، کیونکہ ان کو اس قسم کے کاموں کا کافی تجربہ ہے۔

بہر کیف مسئلہ کی پیچیدگیوں کے باعث کام میں رکاوٹ نہیں پیدا ہونی چاہیئے طبی اخراجات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ صورت حال اور زیادہ دشوار ہو جائے گی۔ لہٰذا ایک ایسا قابل عمل منصوبہ تیار ہونا چاہیئے جس سے کم اوسط آمدنی والے خاندانوں کے اخراجات کے شدید بار کو کم کیا جا سکے، جو ڈاکٹروں کی اصطلاح میں "تباہ کن امراض" کا شکار ہوتے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ہونی ضروری ہے کہ اس قسم کے پروگرام کے لئے علاج معالجے پر سرکاری کنٹرول یا بعض انتہا پسندوں کے کہنے کے مطابق "اشتراکی معالجے" کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اس پروگرام کا انصرام معتمدین کے ایک ایسے بورڈ کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جس میں زیادہ تعداد اسی پیشہ کے لوگوں ـــــ مثلاً ڈاکٹروں، ہاسپٹل سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کی ہونی چاہیئے۔

اس سے ڈاکٹروں یا مریضوں کے آزادانہ انتخاب یا ان کے آپس کے تعلقات میں کوئی خلل واقع نہیں ہو گا۔ اس میں علاج معالجے کے اعلیٰ معیاروں کے تحفظ اور اصلاح کی گنجائش ہو گی۔ اس پروگرام کا تعلق صرف کنکٹیکٹ سے ہو گا، جس میں صحت کے نجی ذرائع مثلاً ڈاکٹروں، نرسوں، اسپتالوں اور دوا فروشوں وغیرہ کا استعمال کیا جائے گا اور جس کا واشنگٹن کی وفاقی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔

اس سے بڑے زبردست فوائد مرتب ہوں گے۔ صرف کنکٹیکٹ کے ان لاکھوں خاندانوں کے لئے ہی نہیں جنھیں طبی خدمات کی مہنگائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بلکہ ان ڈاکٹروں، نرسوں، دوا فروشوں اور اسپتالوں کے منتظمین کے لئے بھی، جو کہ اپنی پیش کردہ خدمات کا معاوضہ حاصل کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا تین مسائل نے کافی عرصے سے میرے ذہن کو خلفشار میں مبتلا رکھا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح میں سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے بہت سے لوگوں کا ذہن بھی اس سلسلہ میں پریشان رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگ میری تجویز سے بہتر کوئی تجویز پیش کر سکیں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہم اس ضرورت کو محسوس کریں اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نہایت قابلِ عمل اور موثر اور انتہائی ارزاں تدابیر کی تلاش کریں۔

ہم کنکٹیکٹ کے لوگ اپنی عظیم دولت اور طبی خدمات کے اعلیٰ ترین ریکارڈ کی موجودگی میں اس بات کے غیر معمولی طور پر اہل ہیں کہ دوسروں کو راہ دکھائیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ وفاقی حکومت کا سہارا تلاش کئے بغیر ہی ہم ریاستی سطح پر اپنے مسائل کے مؤثر حل تلاش کر لیں۔

ہماری وفاقی حکومت نے اڑتالیس ایسی "ریاستی تجربہ گاہیں" قائم کی ہیں، جہاں سماجی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نئے طریقے اختراع اور ایک خاص حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچائے جا سکتے ہیں۔

اسی روایت کے تحت مغرب بعید کی بعض ریاستوں نے موجودہ اُجرت اور اوقات کے قوانین وضع کئے۔ زراعت سے متعلق ہمارا موجودہ قومی توسیعی تحقیقی پروگرام اس سلسلہ میں کنکٹیکٹ کا عظیم کارنامہ ہے۔

ا۔ میری تجویز یہ ہے کہ کنکٹیکٹ ایک ایسا ریاستی طبی خدمات کا پروگرام وضع کرنے کے کام میں پہل کرے جس کی بدولت تمام عوام کی معقول طبی امداد ڈاکٹروں اور نرسوں، زیادہ اسپتالوں اور کلنکوں (جو پیشہ ور لوگوں کے زیر نگرانی ہوں گے) کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے۔

اس قسم کی جدوجہد میں ہمیں نہایت سمجھ داری کے ساتھ ڈاکٹروں اور مریض دونوں کی آزادی کو سرکاری مداخلت سے محفوظ رکھنا ہوگا، اور اپنے اعلیٰ طبی معیاروں کی خاص طور پر حفاظت کرنی ہوگی۔

لیکن حکومت کے تعاون کی کوششوں کے بارے میں اپنے روایتی خوف کا سہارا لے کر ہمیں خاموشی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے۔

ہمیں اپنے موجودہ طبی ذرائع کو بیماریوں کی روک تھام اور انسداد کے لئے ترقی دینی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اعلیٰ درجہ کی طبی امداد کو کنکٹیکٹ کے ہر خاندان کے لئے مالی حیثیت سے ممکن بنا دینا چاہیئے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم سب یعنی نجی طبی ادارے، حکومت اور دیگر تمام گروہ مل کر کام کریں، اور قابلِ عمل با کفایت پروگراموں اور امریکی طریق کار کے ذریعہ ان مقاصد کی تکمیل کی راہیں تلاش کریں۔

قومی صحت کا جو پروگرام آج کل واشنگٹن میں زیر بحث ہے، طبی پیشہ کے لوگوں کی طرف سے اس کی شدید مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی تشکیل میں اس پیشے کے لوگوں کا بہت کم ہاتھ رہا ہے۔

لہذا میری خواہش ہے کہ اس قومی مسئلہ کے حل کے لئے، کنکٹیکٹ کے لئے میری پیش کردہ تجویز کے بارے میں کنکٹیکٹ کے ڈاکٹر، نرسیں، طبی اساتذہ اور اس پیشے سے متعلق دوسری

جماعتیں اپنی رائے دیں۔

یہاں میں اتنا اور عرض کردوں کہ میں نے کنکٹیکٹ کے مشہور ڈاکٹروں، سرجنوں اور اعلیٰ طبی ماہرین کی ایک غیر سرکاری کمیٹی سے نجی ملاقاتوں میں اس موضوع پر کئی بار گفتگو کی ہے۔ ان مذاکرات کے نتیجہ میں میں نے ایک خاص کمیٹی، "گورنرس کمیٹی آن ہیلتھ رسورسز" کا تقرر کیا ہے۔

عملے اور تحقیقی کاموں کے مصارف کو پورا کرنے کے لئے اس کمیٹی کو میرے اتفاقی مصارف کے فنڈ سے ایک معتد بہ رقم دیدی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کمیٹی کی ابتدائی رپورٹ اور سفارشات چند ہفتے بعد تیار ہو جائیں گی[1]۔

× × ×

۱۰ ایک جدید ریاستی حکومت کی طرف

اپریل ۱۹۵۰ء کے ایک خاص اجلاس میں گورنر باؤلز نے تمام مجلس مقننہ پر اس بات کے لئے زور دیا تھا کہ وہ اس "لٹل ہوور کمیشن" کی سفارشات کو منظور کرے جو انھوں نے کنکٹیکٹ کی ریاستی سرکار کے دقیانوسی اور غیر مؤثر نظام کا جائزہ لینے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اگرچہ اس میں سے بہت سی سفارشات کو ایوان نمائندگان کے ری پبلکن ممبروں کی شدید مخالفت نے مسترد کر دیا تھا۔ لیکن اس کے دس سال بعد، سو سال میں پہلی بار وجود میں آنے والی ڈیموکریٹک اسمبلی کی مدد ابراہیم ربیکوف کی گورنری کے زمانے میں یہ سفارشات من وعن منظور کرلی گئیں۔

گزشتہ ایک دستر ۱۷۰ سال سے ہماری ریاستی اور وفاقی حکومتوں میں تعرض اور تعادل کا سسٹم Checks and Balances ایک ایسی چٹان بنا رہا ہے، جس پر ہماری جمہوریت کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس کی عملی قوت کا ثبوت بعض ایسے نازک مرحلوں پر ملا ہے کہ جن میں سے کوئی ایک بھی کسی کمزور تر نظام حکومت کو تباہ کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ مجرب اصول ماضی کی طرح مستقبل میں بھی کام آتے رہیں تو ہمیں

---

[1] جنوری ۱۹۵۱ء میں گورنر باؤلز کے اس عہدہ سے سبکدوش ہو جانے کے بعد یہ امید افزا منصوبہ ختم کر دیا گیا تھا۔

مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ تینوں شعبوں میں سے ہر ایک کو اور زیادہ استحکام بخشنے کے لئے مستقل کوشش کرنی ہوگی۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک شعبہ عوام سے قریب تر اور ان کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو وہ ضروری مشینری مہیا کرنی پڑے گی جس کی مدد سے موجودہ معاشرے کے مسائل اور تنازعات کو جمہوری طریقے پر اور تیزی کے ساتھ طے کیا جا سکے۔

ہماری وفاقی حکومت کے نظام کی کارکردگی کو بخوبی جاری رکھنے کے سلسلے میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ مرکزی کانگریس اور عدالتوں کے طریقہ کار اور ضابطے متواتر بہتر ہو رہے ہیں اور وفاقی حکومت کے انتظامیہ کی کئی بار از سر نو تنظیم کی جا چکی ہے۔ وفاقی حکومت کی کارکردگی کا بار بار جائزہ لینے کی بدولت ہمیں ان تینوں شعبوں کے باہمی نازک توازن کو برقرار رکھنے کا موقع ملا ہے۔

لیکن ہمارے آئین سازوں نے ہمارے نظام حکومت میں ایک اور بنیادی توازن بھی قائم کیا تھا، اور وہ ہے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے اختیارات اور ذمہ داریوں کی تقسیم — میرے خیال میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمیں اس ضروری اور بنیادی توازن کے قائم رکھنے میں بہت کم کامیابی نصیب ہو سکی ہے۔

معاشرے کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق ہماری ریاستی حکومتوں کے نظام میں ترقی نہیں ہوئی ہے۔

ہم اپنی ریاستی حکومتوں کی مشینری کو اپنے معاشرے کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے میں کسی قدر پیچھے رہے ہیں۔ نتیجے کے طور پر متعدد موقعوں پر عوام کے تقاضے سے مجبور ہو کر ہماری مرکزی حکومت کو بعض ایسے معاملات میں دخل انداز ہونا پڑا ہے جنھیں ریاستی حکومتیں بہتر طریقے پر حل کر سکتی تھیں۔ واشنگٹن میں مرکزیت کے ارتقا کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنی ریاستی حکومت کے طریق کار کو زمانے کے ساتھ نہیں چلا سکے۔

آئیے ذرا خود اپنی ریاست کنیکٹیکٹ کی صورت حال پر غور کریں۔ ہمارے ریاستی آئین اور اس سے پیدا شدہ حکومت کے ڈھانچے کی اب سے ۱۳۰ سال پہلے ۱۸۱۸ء میں تشکیل کی گئی تھی۔ اس کی تشکیل اس عہد کے مطابق کی گئی تھی جو آج سے بہت مختلف اور سادہ تھا، جب صنعت ہمارے کھیتوں، دیہاتوں اور قصبوں میں نہیں پہنچی تھی، جب نہ ریل گاڑیاں تھیں، نہ ہوائی جہاز، نہ ریڈیو تھا اور نہ موٹر گاڑیاں، نہ بڑے بڑے صنعتی کارخانے تھے اور نہ گنجان آبادی والے شہر، نہ عام بے روزگاری اور نہ عالمی جنگیں۔

کنیکٹیکٹ کی ریاستی حکومت شروع میں صرف ۱۲ معمولی شعبوں پر مشتمل تھی۔ اب سے

پچاس سال بیشتر بھی موجودہ ۲۰۲ شعبوں اور تنظیموں کے اسّی فی صدی حصّے کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ۱۹۰۳ء تک گورنری اور بہت سے شعبوں کی سربراہی جز وقتی منصب تصور کئے جاتے تھے لیکن اب ہمارے مشینی دور کی ضروریات اور طور طریقوں نے رفتہ رفتہ اس سست رفتار اقتصادیات کی جگہ لے لی ہے۔

اسی دوران میں اچھے اور برے دونوں حالات میں ری پبلکن اور ڈیموکریٹک دونوں کے عہد حکومت میں ریاستی حکومت کے کاموں میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے اور اس میں اکثر کارگزاری اور مصارف کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

کئی نسلوں سے یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ دوسری ریاستوں کی طرح کنکٹیکٹ میں بھی حکومت کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے ساتھ انتظامی عملے کی اصلاح و درستی ضروری ہے، یہ کہ جز وقتی حکومت بیکار اور نکمی ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ اس اصلاح و درستی کی ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔

بہتر جمہوریت اور بہتر کارکردگی کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کئی موقعوں پر ریاستی حکومت کی از سر نو تنظیم کی تجاویز پیش کی جاچکی ہیں۔ ری پبلکن گورنر جارج پی میکلین نے ۱۹۰۲ء میں اور ڈیموکریٹک گورنر ولبر کراس نے ۱۹۳۶ء میں ریاستی آئین کی تجدید کے لئے جرأت مندانہ جدوجہد کی لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔

ان اور ان جیسی دوسری کوششوں کے بارآور نہ ہونے کے اسباب واضح ہیں یعنی ہم نے ہمیشہ ان افراد اور اداروں کی تعداد اور قوت کو کم سمجھا ہے جن کا مفاد نکمی حکومت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ مفاد پرست جن پر یہ تبدیلیاں اثر انداز ہوتیں اس سارے قصے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کرتے رہے جبکہ وہ لوگ جن کو ان سے فائدہ پہنچتا وہ گراں خوابی میں مبتلا رہے۔

۵ جنوری ۱۹۵۵ء کو اپنے افتتاحی پیغام میں میں نے اشارہ کیا تھا کہ آپ اور میں یعنی انتظامیہ اور مقننہ ــــ مل کر کنکٹیکٹ کی حکومت کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ ریاست کے لوگوں کی بہبود کے لئے ضروری تبدیلیاں عمل میں لائیں، اسراف بے جا کو ختم کریں اور جہاں جہاں ہو سکے، حکومت کے کاروبار کے مصارف کو کم کریں۔

۳۱ ــــ مارچ ۱۹۴۹ء کو ہم نے طے کیا کہ ایک پانچ نفری اسٹیٹ آرگنائزیشن کمیشن مقرر کیا جائے۔ جس کا کام یہ تھا کہ وہ ریاستی حکومت کے ہر شعبہ کا جائزہ لے دوسری اچھی نظم و نسق والی ریاستوں کے ساتھ ہماری حکومت کے نظم و نسق کا مقابلہ کرے اور اس سلسلہ میں جامع سفارشات پیش کرے۔ اس کمیشن کی سفارشات آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ان کا خلاصہ یہ ہے کہ : کمیشن کی رائے میں ہماری ریاستی حکومت کا نظم ونسق، جو ۱۳۲ سال پرانے آئین پر مبنی ہے، خوفناک اور مایوس کن حد تک پرانا ہو چکا ہے۔ انتظامی معاملات میں ایسی تکنیک پیدا ہو گئی ہے جو مقننہ، گورنر، عدلیہ اور قوم سبھی کے اقتدار و اختیار کی راہ میں فراہم ہوتی ہے جس کی بدولت چاروں طرف اصراف بے جا در کیے ہیں، اور محرومی کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے ہزار ہا ریاستی ملازمین، نیز رضا کارانہ انجمنوں اور کمیشنوں کے سینکڑوں ممبروں کے صبر و استقلال، قابلیت اور خدمات خلق کے جذبہ نے ہماری ریاستی حکومت کو ایک نہایت ناکارہ اور لڑکھڑاتی ہوئی دفتر شاہی کا مکمل طور پر شکار ہونے سے بچا لیا۔

کمیشن کی سفارشات میں بنیادی باتوں کو لیا گیا ہے۔ جو حل پیش کیے گئے ہیں، ان کا کچھ حصہ کامیاب کاروباری اداروں کے انتظامی تجربے سے لیا گیا ہے۔ کچھ اعلیٰ انتظام کے ان اصولوں سے جن کی، ہور کمیشن توثیق کر چکا ہے، کچھ ان ریاستوں کے تجربوں سے جو نظم ونسق کی اصلاح کو عمل میں لا چکی ہیں اور کچھ خود کمیشن کے ممبران کے ذاتی تجربے سے جو کنکٹیکٹ، اس کی روایات اور اس کے مخصوص مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں، اکتساب کیا ہے۔

ان سفارشات کو کئی مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اول یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ریاست کے مالی ڈھانچے کی اس طرح از سر نو تشکیل ہونی چاہیے کہ ہم کو ہر وقت اپنی آمدنی اور اخراجات کا صحیح اندازہ رہے۔ اس وقت ہمارے عام بجٹ اور روپے کے لین دین کی ذمہ داری تقریباً پانچ مختلف تنظیموں پر بٹی ہوئی ہے، جو اتنے ہی مختلف نظریات اور انداز فکر کی حامل ہیں۔

دوسرے اس بات کی سفارش کی گئی ہے کہ حکومت کے انتظامیہ شعبہ کی ۲۰۲ ایجنسیوں اور کمیشنوں، کو ایک بالکل کاروباری انداز میں ۱۸ محکموں میں ضم کر دیا جائے۔

تیسرے کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ضلع داری نظام کو، جو کئی پشتوں سے حکومت کے پانچویں پہیے کی حیثیت سے کام کر رہا ہے، ختم ہونا چاہیئے۔ ٹیکس دہندگان کو اس دقیانوسی ضلع داری نظام کے لئے دُہری قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ یعنی بھاری قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ یعنی بھاری قیمتیں اور غیر ضروری سیاسی کاروبار۔

چوتھے، کمیشن کی رائے ہے کہ شہروں اور قصبوں کے لئے حکومت خود اختیاری کا دیانتدارانہ منصوبہ بنایا جائے۔ موجودہ نظام میں ہماری مقامی حکومتیں دراصل ریاستی حکومتوں کی غلام ہیں جو جنرل اسمبلی کی منظوری کے بغیر بہت سے معاملات میں خود کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتیں۔ بہترین

حکومت وہ ہے جو لوگوں سے قریب ترین ہو۔ جیسا کہ کمیشن نے اشارہ کیا ہے، اس نظریہ کا منشا یہ ہے کہ حکومت خود اختیاری اور لامرکزیت کو ترقی دی جائے۔

پانچویں: کمیشن کی تجویز ہے کہ ہمارے عدالتی نظام کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ ماتحت عدالتوں کے کل وقتی جج ہوں، اعلیٰ اور عام عذرداری کی عدالتیں ایک دوسرے میں ضم کر دی جائیں، اس اقدام سے ہمارے پورے عدالتی نظام کی اصلاح ہو جائے گی۔ اور جہاں کہیں بھی سیاسی اکھاڑے بازی کے آثار باقی ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔

چھٹے: کمیشن کی تجویز ہے کہ جنرل اسمبلی کے لئے معقول عملہ ہونا چاہیئے، اس کی معقول طریقے پر تنظیم ہونی چاہیئے۔ اور طویل اوقات تک بے لوث کام کرنے کا مناسب معاوضہ ملنا چاہیئے۔

ساتویں: کمیشن کی سفارش ہے کہ ہمیں ایک سادہ اور واضح قسم کے ریاستی آئین کو منظور کرنا چاہیئے جس میں ہماری روایتی شہری آزادیوں کا پورا پورا تحفظ کیا گیا ہو۔

ان تجاویز کی بدولت دورِ حاضرہ کی تاریخ میں کنکٹیکٹ کو پہلی بار جدید طرز کا نظام حکومت حاصل ہو سکے گا۔ ہماری حکومت کے تین بنیادی شعبوں کو تقویت پہنچا کر ہماری جمہوریت کی رگوں میں تازہ خون دوڑایا جا سکے گا۔ ان تجاویز کی بدولت ہمیں ان سہولیات کو بہتر بنانے میں زبردست مدد ملے گی جو آج ہم اپنے عوام کے لئے مہیا کرتے ہیں۔ مزید برآں ان کے ذریعہ ہم معقول بچت بھی کر سکیں گے، جو کمیشن کے اندازے کے مطابق دو سالہ مدت میں کم از کم ۱۲ ملین ڈالر ہوگی۔

کمیشن کی رپورٹ صرف ایک حیثیت سے مایوس کُن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میں سے بہت سے میرے اس تاسف میں شریک ہوں گے کہ کمیشن پانچوں ممبران ہماری مجلس قانون ساز میں نمائندگی کے دقیانوسی نظام کو درست کرنے کے طریقوں پر متفق نہیں ہو سکے۔

جن اصولوں پر سینیٹ اور عوام نمائندگان کے ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے، وہ پہلے پہل ہمارے ۱۸۱۸ء کے اصل آئین میں پیش کئے گئے تھے۔ اس نظام کے تحت سینیٹ کے ممبران مساوی نمائندگی کی بنیاد پر منتخب ہوتے تھے۔ دوسری طرف ایوان کے ممبر انتخابی حلقوں کی مساوی تعداد کی نہیں، بلکہ بعض مخصوص شہروں اور قصبوں کی نمائندگی کرنے کی غرض سے منتخب کئے جاتے تھے۔

۱۸۱۸ء کے زمانہ میں یہ بات ناموزوں نہیں تھی۔ ان ابتدائی ایام میں کنکٹیکٹ کے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے قصبوں کے معمولی فرق نسبتاً زیادہ اہم نہیں تھے۔ آج ان سب چیزوں میں بے انتہا وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اور اسی مناسبت سے حالات میں بھی تبدیلی آ گئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ایوان نمائندگان کے لئے انتخاب کے اس دقیانوسی طریقے کی بدولت تقریباً دیہاتی آبادی کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔

آج کل ہماری آبادی کا ایک تہائی حصہ ایوان نمائندگان کے دو تہائی ممبروں کو منتخب کرتا ہے۔ کنکٹیکٹ کی اس صورت حال کو پوری ریاستہائے متحدہ میں نمائندہ حکومت کی غیر جمہوری اور دقیانوسی شکل کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

کمیشن نے ایمانداری کے ساتھ کافی وقت اس کوشش میں صرف کیا کہ کوئی ایسا متبادل طریقہ وضع کیا جائے جس پر پانچوں ممبر متفق ہو سکیں۔ بدقسمتی سے وہ اپنے اختلافات کو ختم نہ کر سکے اور یہ طے کیا کہ اس معاملہ کو پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھا جائے۔ بہر کیف شہری نمائندگی کا یہ غیر مساوی طریقہ کنکٹیکٹ میں مکمل جمہوریت کے حصول میں سدّ راہ بنا ہوا ہے۔ یہ سدراہ جلد یا بدیر دور ہونی چاہیئے۔

دوسرے مقامات کی طرح کنکٹیکٹ میں بھی سیاسی کٹرپن کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔ اسی دور میں ہمارے عوام حکومت کے طریق کار سے گہری دلچسپی لے رہے ہیں، اور تاریخ کے ہر دور کے مقابلہ میں آج اس بات کی سب سے زیادہ کوشش کر رہے ہیں کہ یہ طریق کار ان کے صحیح مفادات کی نمائندگی کرتا ہو۔

اب میں اپنی حیثیت اچھی طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ نمائندگی کے اس سوال کو چھوڑ کر میں ان سفارشات کو دل و جان سے منظور کرتا ہوں، اور اس کی تائید کرتا ہوں۔ میں آپ لوگوں ـــــ یعنی کنکٹیکٹ کی جنرل اسمبلی ـــــ سے پورے خلوص کے ساتھ اصرار کروں گا کہ ان سفارشات کو قانونی شکل دینے کے لئے ضروری کارروائی کی جائے۔

× × ×

آزاد انسان اور آزاد ذہن

انفرادی آزادی کی جدوجہد آج ہمارے دور کا ایک نازک سیاسی مسئلہ بن گئی ہے۔ آزادی کے بارے میں امریکہ جو کچھ سوچتا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آزادی کے بارے میں امریکہ جو کچھ کرتا ہے وہ ہر حکومت کی پالیسی اور ہر قوم کے لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ کے کسی بھی دور سے زیادہ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ امریکہ کے لوگ اس بارے میں کسی انتشار میں مبتلا نہ ہوں کہ آزادی کیا چیز ہے، بلکہ اس بات پر عام اور گہرا اتفاق ہونا چاہیئے کہ آزادی کا مفہوم کیا ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۲۸ مئی ۱۹۵۰ء

۱۱ - حریت کی تلاش

نیو یارک ٹائمز میگزین (۲۸ مئی ۱۹۵۰ء) میں شائع شدہ اس مضمون میں گورنر باؤلر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ موجودہ نسل اس بات کے لئے ذمہ دار ہے کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ "انسانی حقوق" کو کامیابی کے ساتھ اٹھارھویں صدی سے بیسویں صدی میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔

لنکن نے ۱۸۶۴ء میں کہا تھا "دنیا کے پاس کبھی بھی حریت کی کوئی اچھی تعبیر نہیں تھی۔ اور امریکہ کے لوگوں کو اس وقت اس کی سخت ضرورت ہے۔ ہم سب حریت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن اس ایک ہی لفظ کا استعمال کرتے ہوئے ہم سب کا مفہوم ایک نہیں ہوتا۔"

آج بھی ہم سب حریت کا ایک مفہوم نہیں لیتے ہیں۔ اس کے باوجود انفرادی آزادی کی جدوجہد آج ہمارے دور کا ایک سیاسی مسئلہ بن گئی ہے۔ آزادی کے بارے میں امریکہ جو کچھ سوچتا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آزادی کے بارے میں امریکہ جو کچھ کرتا ہے وہ ہر حکومت کی پالیسی اور ہر قوم کے لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ کے کسی بھی دور سے زیادہ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ امریکہ کے لوگ اس بارے میں کسی انتشار میں مبتلا نہ ہوں کہ آزادی کیا چیز ہے، بلکہ اس بات پر عام اور گہرا اتفاق ہونا چاہیئے کہ آزادی کا مفہوم کیا ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

"حریت" ایک بڑا پہلودار لفظ ہے۔ حریت کی خود کئی قسمیں ہیں۔ حریت کو ناقابلِ تقسیم قرار دینا نہ دیانت داری کی بات ہے اور نہ حقیقت پسندی کی۔

ظاہراً طور پر سب سے پہلے سیاسی آزادی ہے۔ یعنی اراکین کانگریس، صدر، گورنر، وزیر اعظم اور ٹیکس کنندگان کے انتخاب کے لئے ووٹ دینے اور حکومت کی پالیسیوں کو پسند یا ناپسند کرنے کی آزادی۔

پھر شہری آزادیاں ہیں: اپنا مافی الضمیر ادا کرنے، پُرامن اجتماعات میں جمع ہونے، بہبودی خدمات مساویانہ طور پر حاصل ہونے، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ گھومنے اور انصاف حاصل کرنے کی آزادیاں۔ اور اس بات کی آزادی کہ بلاوجہ تلاشی، گرفتاری یا جلاوطنی نہ ہو۔

پھر ذاتی آزادیاں ہیں: اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کی آزادی، اپنی پسند سے شادی کرنے اور اپنے عقائد کے مطابق اپنے بچوں کی پرورش کرنے اور اپنی مرضی کے مطابق سیر کا خود سامان ہو

یا گوشہ نشین بننے کی آزادی۔

پھر کچھ انسانی آزادیاں: ہر شخص کے لئے یہ آزادی کہ وہ نسل، مذہب، قومیت یا اقتصادی حیثیت سے قطع نظر آزادی کے ساتھ اور اپنی صلاحیت کے مطابق انسانی وقار کے ساتھ مسلسل ترقی کر سکے۔ یہ نظریہ نسبتاً نیا ہے۔ اس پر میں بعد میں تفصیل سے بحث کروں گا۔

پھر اقتصادی آزادیاں ہیں: یہ آزادی کہ ہم جہاں چاہیں کام کریں، اپنے لئے پیشے کا انتخاب کریں، یا تجارت کریں، نئی مصنوعات کی ایجاد کریں یا فروخت، جتنی قیمت یا مزدوری ہم مناسب طور پر لے سکتے ہوں لیں، جو ملازمت چاہیں حاصل کریں یا چھوڑ دیں، جائداد کی خرید و فروخت کریں، جن کا سب کا دار و مدار ہماری صلاحیت، ذہانت اور کام کرنے کی لگن پر ہے۔

بہت سی تہذیبوں نے ان میں سے بعض آزادیاں دی ہیں، لیکن آج تک کسی نے بھی ان سب کے دینے کا دعویٰ نہیں کیا۔ گزشتہ تہذیبوں میں اکثر یہ سب، یا ان میں سے بعض آزادیاں ایک مخصوص طبقہ کو دی جاتی تھیں، اور دوسروں کو ان سے محروم رکھا جاتا تھا۔

جدید جمہوری معاشرے کی کسوٹی یہ نہیں کہ ان میں سے کس قدر آزادیاں واقعی اور عملی طور پر حاصل ہیں، بلکہ یہ کہ امکانی طور پر کتنی آزادیاں موجود ہیں اور وہ کتنے لوگوں کے لئے ہیں۔ اپنی ابتدا کے زمانہ سے امریکہ نے دوسرے ملکوں اور تہذیبوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے تاریخ میں سب سے بلند مقام حاصل کیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آج ہم دنیا کے تمام ملکوں کے مقابلے میں زیادہ لوگوں کو زیادہ آزادیاں دے رہے ہیں۔

چونکہ تمام آزادیوں کا انحصار سیاسی آزادی پر ہے اس لئے ہم سب سے پہلے اسی پر بحث کریں گے۔

ہمارے ملک کی بنیاد اس کے شہریوں کی سیاسی آزادی کے بنیادی اصول پر رکھی گئی تھی گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہم اس بنیادی آزادی کو نظریاتی اور عملی طور پر مستحکم کرنے کی کوشش کرتے چلے آئے ہیں۔ جب پہلے پہل ریاستہائے متحدہ کا قیام عمل میں آیا تھا تو ہمارے بالغ شہریوں کی ایک معمولی سی تعداد کو ووٹ دینے یا سرکاری منصب حاصل کرنے کا اختیار تھا۔ حبشیوں، عورتوں اور بعض ریاستوں میں جائداد نہ رکھنے والوں کی حکومت کے کاروبار میں کوئی آواز نہیں تھی۔

آج عام محصول والی بعض ریاستوں میں چند لاکھ حبشیوں کو چھوڑ کر امریکہ کے اکیس سال سے زیادہ عمر کے ہر شہری کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔

شہری آزادی کے بارے میں صورت حال کیا ہے؟ یہ بھی ایک بنیادی آزادی تھی جسے ہمارے "فرمان آزادی" ہمارے آئین اور ہمارے "دوبل آف رائٹس" میں خاص جگہ دی گئی ہے۔

بہت سے ممالک اور خصوصاً استبدادی ممالک کے مقابلہ میں امریکہ نے قابلِ رشک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ لیکن ہم ایمانداری کے ساتھ یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ ہم خود ابھی تکمیل سے بہت دور ہیں۔

جنوب کے حبشیوں کو وہ شہری آزادی کبھی حاصل نہیں ہوئی، جسے امریکہ سفید فام لوگوں کا حق سمجھتا ہے۔ کانگریس میں اور اس سے باہر آج ہم چند خرد ماغوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کی شہری آزادیوں کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتے ہیں جو ان کے انداز فکر سے متفق نہیں ہیں۔ یہ نظریہ کہ ہم کمیونزم کی بدترین خصوصیت ـــــــ یعنی شہری آزادی کے استیصال ـــــــ کو اپنا کر اپنی آزادی کو مستحکم کر سکتے اور کمیونزم کو شکست دے سکتے ہیں بڑا خطرناک ہے۔

لیکن ان دلخراش واقعات میں بھی امید کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ ہر انصاف پسند آدمی اس بات سے اتفاق کرے گا کہ جنگ کے بعد حبشیوں کی شہری آزادی کے معاملہ میں ہماری پوری تاریخ کے مقابلہ میں زبردست پیش رفت ہوئی ہے۔ جہاں تک ہماری قتل الذات کی موجودہ عادت بد کا تعلق ہے، اس بات کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں کہ امریکی لوگوں کی روایتی انصاف پسندی اور بصیرت پھر بروئے کار آرہی ہے۔

اگرچہ تاریخ کے ہر دور میں شہری آزادی پر کافی اختلافات رہے ہیں، لیکن اقتصادی آزادی کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ متنازعہ فیہ اور غلط فہمیوں کا مرکز رہا ہے۔

امریکہ نے اپنے ابتدائی دور میں اقتصادی آزادی کا ایک ایسا نظریہ پیش کیا تھا جو تاریخ تمدن میں اپنی مثال آپ ہے۔ نئے لوگ اور نئی قوم کی حیثیت سے ہم نے اپنے آپ کو ایسے وسیع ملک میں پایا جہاں قدرتی وسائل کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، جس کی بے پناہ دولت کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ لامحدود زمین تھی جس کا کوئی مالک نہ تھا، غرضیکہ ہر اس شخص کے لئے جس کے پاس ایک پھاوڑا، کدال یا ہل ہو، بے پناہ اقتصادی مواقع تھے۔

لیکن جواں مردی اور جفاکشی کے اس دور میں ہمارے وطن پرستی کے جوش و خروش میں یہ بات چھپ کر نہ رہ جانی چاہیئے کہ صنعتی انقلاب نے ہمارے اقتصادی آزادی کے ابتدائی تصورات کو کڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس سے قومی دولت، محنت بچانے والے آلات اور کارگزاریوں کی پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ لیکن جوں جوں امریکی لوگ ملوں اور کارخانوں میں مزدوری پر کام کرنے کے لئے شہروں کی طرف امنڈ کر آنے لگے، ہمارا ذاتی اقتصادی آزادی کا پرانا نظریہ امریکہ کے بیشتر عوام کے لئے جدا ہوتا گیا۔

مجبوراً ہمیں صنعتی انقلاب کی چھینی ہوئی بعض اقتصادی آزادیوں کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے جمہوریت کے سب سے بڑے حریف یعنی سیاسی آزادی کو استعمال کرنا پڑا۔ ہم نے ۱۹۲۹ء سے بہت پہلے ایسا کرنا شروع کر دیا۔ ۱۸۹۰ء کی پوپلسٹ Populists تحریک تھیوڈور روزویلٹ کا سماجی انصاف کی تدبیر Square Deal اور وڈرو ولسن کی نئی آزادی New Freedom کی تحریکات کے ذریعہ ہم نے وسعت پذیر صنعتی مشین اور گھٹتی ہوئی اقتصادی آزادی کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۲۹ء کے حادثۂ عظیم کے بعد یہ بات ناگزیر ہو گئی کہ ہم سیاسی آزادی کی مدد لے کر لوگوں کو پھر سے کام پر لگائیں، بے روزگاری کے بیمہ نظام قائم کریں، مستقبل میں کسی عظیم اقتصادی بدحالی کا سدباب کرنے کی کوشش کریں۔ کسانوں کی آمدنی کو تباہ کن حد تک گرنے سے بچائیں اور امریکی عوام عوام کو بہتات کے دور میں بھوکوں مر جانے سے بچائیں۔

اسی زمانے میں ایک اور نمایاں تبدیلی بھی ظہور میں آ رہی تھی، جس نے ہمارے تصور آزادی پر گہرا اثر ڈالا۔ کوئی بھی شخص جس نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، گزشتہ ایک سو پچاس سال میں انسانی حقوق اور آزادی کے بارے میں معاشرے کے رجحانات کی اس عظیم تبدیلی پر متحیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میرا اشارہ خاص طور پر ہمارے اس بڑھتے ہوئے احساس کی طرف ہے کہ نسل، مذہب، اور اقتصادی حیثیت سے قطع نظر ہر مرد، عورت اور بچہ کو باعزت طور پر اور اپنی صلاحیت کے مطابق آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کے مواقع ملنا چاہیئے۔

جزوی طور پر اس تصور کی بنیاد بھی وہی ہے جو ہماری سیاسی آزادی کی ہے۔ اور اسے انہیں الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے جو ہمارے "فرمان آزادی" میں استعمال کئے گئے ہیں "تمام انسان پیدائشی طور پر مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ کہ ان کو خالق کائنات نے بعض جبلی اور ناقابل انتقال حقوق سے نوازا ہے، اور یہ کہ ان حقوق میں زندگی، آزادی اور مسرت کی جستجو شامل ہیں۔"

اس سلسلہ میں ہمارے عظیم مذاہب نے ہمیں جو تصور دیا ہے وہ بھی جزوی طور پر یہی ہے کہ ہم میں سے کمترین، حقیر، نادار اور بوجھ سے دبے ہوئے انسان بھی خدا کی نگاہ میں وقعت رکھتے ہیں

یہ احساس بھی جزوی طور پر انسانی ذہن اور شخصیت کے بارے میں ہمارے وسیع تر علم، فرد کے ارتقاء پر ہمارے ماحول نیز اقتصادی، سماجی اور نفسیاتی قوتوں کے اثرات کی تفہیم سے پیدا ہوا ہے۔

زیادہ سے زیادہ انسانی حقوق کے سلسلہ میں ایک انتہائی جدوجہد تمام امریکی بچوں کے لئے عام تعلیم کے انتظامات کی تحریک تھی۔ ایک صدی سے زیادہ کی بات نہیں کہ ہمارے بہت سے معزز شہری اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ "عوام الناس" کی تعلیم ناموزوں، غیر ضروری اور بڑی خطرناک ثابت ہو گی۔

بھلا ہو سیاسی آزادی کے تصور کا جس نے ہماری حکومت کو اکثریت کی رائے کے مطابق کام کرنے کے لیے مجبور کیا اور تعلیم کو تمام ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں عام کر دیا گیا۔ ہمارا عام تعلیم کا تصور ہنوز ترقی پذیر ہے اور اس میں تمام ذی استعداد طلباء کے لئے کالج کی تعلیم شامل کی جا سکتی ہے۔

وسیع تر انسانی حقوق کی اس جد وجہد کا ایک اور باب لوگوں کو انسانی بیماریوں سے نجات دلانے کی کوشش تھی۔ چنانچہ ہم نے یہ طے کیا کہ دماغ کے مریض، لنجے، نابیناؤں کے مریض اور دوسرے بیمار یا معذور اشخاص کو ناکارہ اور ناقابل علاج قرار نہیں دیا جائے گا

ہم نے اپنی سیاسی آزادی کو اپنی بلدیاتی یا ریاستی اور وفاقی حکومتوں کی مدد سے طبی تحقیق، آبادکاری، صحت عامہ اور ان لوگوں کے لئے طبی سہولیات فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ ہم ان کی آمدنی سے قطع نظر اپنے تمام شہریوں کے لیے جدید طب کی مدافعتی تدابیر بہم پہنچانے کے لئے بھی کسی عملی طریق کار پر متفق ہو جائیں گے۔

عوام الناس کے بارے میں ہماری بڑھتی ہوئی بیداری کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ ہم ان بوڑھے لوگوں کے لئے جنھیں اس سے قبل ایک سنگدل صنعتی معاشرہ نظرانداز کر دیا کرتا تھا کچھ نہ کچھ معقول درجہ کا تحفظ، وقار اور سہولیت — خصوصاً مزید انسانی آزادی دلانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اس کی ایک اور مثال شہر کے خستہ حصوں کی صفائی کے پروگراموں کی توسیع ہے، تاکہ ہمارے کچھ اور شہری جدید طرز کے عمدہ مکانوں میں اپنے خاندانوں کی پرورش کرنے کی آزادی حاصل کر سکیں۔

ہم جس بات کی کوشش کر رہے ہیں، وہ دولت کی مساوات نہیں ہے، بلکہ ہم زندہ رہنے اور کام کرنے، اور اپنی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق آگے بڑھنے کے مواقع کی مساوات کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ ہم خود اپنے اور اپنے بچوں کی اچھی تعلیم اور اچھی صحت کے لیے کوشش کر رہے ہیں یا کم سے کم بنیادی تحفظ کے حق کے لئے کوشش کر رہے ہیں یہ اس روز افزوں سیاسی اور شہری آزادیوں کے علاوہ ہے جو ہمیشہ سے امریکی حریت پسندی کی بنیاد رہی ہے۔

ہماری موجودہ نسل کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ "انسانی حقوق" کامیابی کے ساتھ اٹھارھویں صدی سے بیسویں صدی میں منتقل کئے جا سکتے ہیں۔

× × ×

۱۲ - انتقال وطن کی نئی پالیسی کی ضرورت

نومبر ۱۹۵۱ء کے "سرو ے" میگزین میں مسٹر باؤلز نے تارکین وطن سے متعلق ہماری "تنگ نظر اور امتیازی" پالیسی کی مذمت کی ہے اور مشورہ دیا دیا ہے کہ ہمیں قومیت سے قطع نظر تمام مستند امیدواروں کو مساوی حقوق دینے چاہئیں۔

امریکہ کو انتقالِ وطن سے متعلق ایک نئی پالیسی کی سخت ضرورت ہے۔ ہماری موجودہ پالیسی ہارڈنگ اور کولج کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ہم اپنی سادگی کی بدولت دنیا، اس کے مسائل اور اس کے لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ اس پالیسی کے اصول اب پرانے ہو چکے ہیں، ان سے امتیاز کی بو آتی ہے۔ اور ان جمہوری تصورات کی نفی کرتے ہیں جن پر ہمارے ملک کی تعمیر ہوئی ہے۔

"فرمان آزادی" پر دستخط ہونے کے وقت سے لے کر ۱۹۲۱ء تک امریکہ نے دنیا کے ہر حصے سے آنے والے تارکین وطن کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ جس کے نتیجہ میں تقریباً ۴ کروڑ مرد و زن اور بچے سمندر پار کر کے ریاست ہائے متحدہ میں آزادی اور مواقع سے بھرپور نئی زندگی بسر کرنے کے لئے آ پہنچے۔

اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا امریکہ آنا تاریخ میں انتقال آبادی کی عظیم ترین مثال ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں امریکہ میں آنے والے مرد و زن اور بچوں کی تعداد دس لاکھ سالانہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں ہماری اس وقت کی مجموعی آبادی کے ایک فیصدی سے زیادہ تھی بن ۱۹۱۰ء تک ریاست ہائے متحدہ میں چالیس فی صدی لوگ ایسے ہو گئے تھے جن کی یا تو خود کی پیدائش غیر ملکوں کی تھی یا جن کے ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں غیر ممالک کی پیدائش تھے۔

آج امریکہ کی قوت کا ایک حصہ اس حقیقت میں مضمر ہے کہ ایک مدت دراز کے اندر ہم نے یورپ اور پوری دنیا سے لے کر اپنی آبادی میں خوب اچھی طرح اضافہ کیا۔ ہمارے بعض بڑے بڑے صاحب علم، سائنس داں، سرکاری عہدیدار، تاجر اور مزدور رہنما پچاس سال پیشتر باہر سے آنے والوں کے بیٹے یا پوتے ہیں۔

۱۹۲۱ء میں انتقال آبادی پر پابندی لگانے کے لئے پہلا قانون بنایا گیا۔ اس قانون کی رو سے ترک وطن کر کے آنے والوں کی تعداد . . . . ۵ سالانہ مقرر کی گئی۔ اس تعداد میں مغربی منطقہ سے آنے والے لوگ شامل نہیں تھے، جنھیں خصوصی طور پر مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔

اس پابندی کا مقصد پہلی جنگ عظیم سے قبل ہماری ہمارے ملک میں آکر آباد ہونیوالوں کی تعداد گھٹا کر ایک تہائی کر دینا تھا۔ مشرقی اور جنوبی یورپ سے آنے والوں کے خلاف بھی اس قانون میں امتیاز برتا گیا۔

لیکن ۱۹۲۱ء کا ایکٹ محض ایک ابتدا تھی۔ ۱۹۲۴ء میں ایک نیا قانون بنا یا گیا جس کی رو سے سابقہ مقررہ تعداد کو گھٹا کر نصف کر دیا گیا۔ اور جنوبی مشرقی یورپ کے لوگوں کے سلسلہ میں اس امتیاز کو اور بڑھا دیا گیا۔ یہی قانون، جس میں ۱۹۲۹ء میں مزید ترمیم کر دی گئی تھی، تارکین وطن کے بارے میں آج بھی ہماری پالیسی کی بنیاد بنا ہوا ہے۔

اس تیس سال کے عرصہ میں ہماری ترک وطن کی پالیسی کا پہلا اور واضح مقصد ہمارے ملک میں آنے والوں کی تعداد کم کرنا رہا ہے۔ اور اس مقصد میں بڑی حد تک بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اگرچہ ۱۹۱۰ء کے مقابلہ میں ہماری آبادی میں ایک تہائی کا اضافہ ہو چکا ہے لیکن ۱۹۲۴ء کے قانون میں مقرر کردہ تعداد کی رو سے اس تعداد کے صرف چھٹے حصے کی اجازت دی گئی جو جنگ عظیم اوّل سے پہلے کے چودہ سال میں امریکہ آئی تھی۔

۱۹۲۴ء میں ہماری موجودہ پالیسی کے وضع کرتے وقت تارکین وطن کی تعداد میں اس درجہ تخفیف کرنا یقیناً ایک غلطی کرنا یقیناً ایک غلطی تھی۔ آج کی دنیا میں جب کہ کش مکش کا میدان اور زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ اس قسم کی انتہا پسندی اور بھی زیادہ غلط ہے۔ اس جدوجہد میں ہماری کامیابی کا انحصار ہماری قوم کی توانائی، تصورات اور صلاحیتوں پر ہے۔

اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ہم گزشتہ سو سال میں باہر سے آنے والے ان لاکھوں آدمیوں کی بدولت ہی آج ہم نہ صرف اقتصادی بلکہ روحانی اقدار کے اعتبار سے بھی انتہائی قوی ہیں۔

ہماری اس غلط کار پالیسی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس بات کو ضابطہ کے تحت لایا جائے کہ امریکہ کے "بہترین شہری" کس قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ہمارے تبدیلی وطن سے متعلق قانون اس بات پر زور دیتا ہے کہ لیویلیوں Levilles اور پیٹر فسکیوں PETROFSKYS کے مقابلہ میں براؤن Brown اور شوارزی SCHWARTZES زیادہ اچھے امریکی بنا سکتے ہیں۔

قومیت کی درجہ بندی کا یہ تصور یعنی لاکھوں امریکیوں کو کمتر درجے کے شہریوں کی فہرست میں رکھنے کی کوشش ہمارے جمہوری اصولوں کے منافی ہے۔ یہ بات صرف غیر جمہوری ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔

اس بات کا کیا کوئی ثبوت ہے کہ جنوبی یا مشرقی یورپ کی نسل کے امریکیوں نے ہمارے

ملک کی تعمیر میں مغربی اور شمالی یورپ کی نسل کے لوگوں سے کچھ کم حصّہ لیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ نیویارک، مساچوسٹس، رھوڈ آئی لینڈ، کنکٹیکٹ، نیوجرسی، پین سلوانیا، اوہیو اور مشی گن کی ریاستیں جن میں پولینڈ، اٹلی، یونان اور جنوبی اور مشرقی یورپ کے دیگر حصوں سے آئے ہوئے لوگ آباد ہیں، ہماری یونین کی سب سے زیادہ خوش حال ریاستوں میں ہیں، ترقی پسند قوانین میں بھی یہ پیش پیش ہیں۔

ذیل کے تقابل سے ظاہر ہوگا کہ ہمارے ۱۹۲۴ء کے قانون نے کس خوفناک حد تک امتیازات کو ہماری پالیسی کا جزو بنا دیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم سے صرف ایک سال قبل ۱۹۱۴ء میں اٹلی سے آکر آباد ہونے والوں کی کل تعداد ۲۹۶۰۰۰ تھی۔ ۱۹۲۱ء کے قانون نے اسے کم کرکے ۴۲۰۰۰ سالانہ کر دیا۔ موجودہ حد بندی نے جو ۱۹۲۴ء کے قانون میں مقرر کی گئی تھی، اٹلی سے آکر آباد ہونے والوں کی تعداد میں مزید کمی کر کے ۵۰۰۰ کر دیا ہے۔

۱۹۱۴ء میں پولینڈ سے ۰۰۰، ۱۷۴ نفوس امریکہ میں آکر آباد ہوئے۔ ۱۹۲۱ء کے قانون نے ان کا کوٹہ گھٹا کر صرف ۳۰۰۰۰ سالانہ کر دیا۔ اور ۱۹۲۴ء کے قانون میں صرف ۶۰۰۰ رہ گیا۔ یونان جس نے ۱۹۰۷ء میں ۴۶۰۰۰ لوگ ہمارے ملک میں بھیجے آج اس کا سالانہ کوٹہ صرف ۳۰۷ ہے۔

اس کے برخلاف ۱۹۲۱ء کے قانون میں برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ سے آنے والوں کی تعداد ۷۷۰۰۰ مقرر کی گئی جو کہ پچھلے تمام سالوں میں کسی بھی ایک سال کے اعداد و شمار سے تھوڑی ہی کم ہے۔ اس وقت بھی جب کہ ۱۹۲۴ء میں آکر بسنے والوں کی مجموعی تعداد نصف کر دی گئی تو برطانیہ کے حصے کو گھٹا کر صرف ۶۵۰۰۰ کیا گیا۔ اس قانون کے تحت جرمنی کا حصہ جنوبی یورپ کے تمام ممالک بشمول اٹلی، یونان اور پولینڈ کے مجموعی حصے سے کہیں زیادہ ہے۔

جنگ کے دباؤ کے ماتحت ۱۹۴۸ء میں کانگریس نے "بے وطن لوگوں" کے لئے جو قانون پاس کیا، اگرچہ اس کی رُو سے بہت سے پناہ گزینوں کو خاص طور پر سخت مصیبت زدگان کو یک لخت امریکہ آنے کا موقع مل گیا۔ لیکن اس نے ہماری بنیادی پالیسی میں وقت کے تقاضے کے ماتحت کوئی ترمیم نہیں کی۔ اس قانون کے ماتحت جو ۰۰۰، ۳۳۰ افراد ہمارے ملک میں آئے ان کو متعلقہ ممالک سے آئندہ سالوں کے کوٹے میں شمار کیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک موجودہ قانون میں ترمیم نہ ہو، جنوبی اور مشرقی یورپ کے ملکوں سے انتقالِ آبادی کا سلسلہ مستقبل میں کئی سال تک بند رہے گا۔ اس پابندی سے مخصوص صورتوں کی وہ تھوڑی سی تعداد مستثنیٰ رہے گی جس پر اس قسم کی پابندیوں کا اطلاق

نہیں ہوتا۔

جنوبی اور مشرقی یورپ کے ملکوں کے لوگوں کے خلاف اس نازیبا امتیاز کو بھی اس قانون سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ قومیت کی بنیاد پر کوٹوں کی اس تقسیم کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ اور نسل، رنگ، مذہب اور قومیت کے اعتبار سے تمام درخواست دہندگان کو مساوی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔

انتقالِ آبادی کے قانون کے ابتدائی زمانے میں قومیت وار کوٹے جلد پورے ہو گئے اور جنوبی اور مشرقی یورپ میں انتظار کرنے والوں کی تعداد کم ہو گئی۔ اور اس صدی کی پانچویں دہائی میں اس میں اور بھی تخفیف ہو گئی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۰ء تک برطانیہ والوں نے اپنے کثیر سالانہ کوٹے کا صرف ۵ فی صدی اور آئرلینڈ والوں نے صرف تین فی صدی استعمال کیا۔ تمام ممالک کا مجموعی اوسط ۲۲ فی صدی رہا۔ لہٰذا اس طرح جو کوٹے استعمال ہونے سے رہ گئے ہیں ہمیں انھیں پورا کرنا چاہیئے اور انھیں بلا لحاظ قومیت یکجا کر کے سب پر تقسیم کر دینا چاہیئے۔

میری رائے میں ہمیں تارکین وطن کی سالانہ تعداد اپنی آبادی کے ایک فی صدی کا $\frac{1}{10}$ حصہ مقرر کر دینا چاہیئے جنھیں مغربی نصف کرے کو چھوڑ کر قوم وار تقسیم کے بغیر تمام ممالک سے لیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تعداد اس سے زیادہ ہو جسے امریکہ کی داخلی افزائش کے حامی پسند کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ امریکہ کے لوگوں کی اکثریت اسے ایک موزوں تناسب کی حیثیت سے تسلیم کرے گی۔

ایسے قانون کے تحت کس قسم کے لوگ امریکہ آئیں گے؟ کیا وہ یہاں آنے کے بعد مستعد، محنتی، قانون کا احترام کرنے والے اور وفادار ثابت ہو سکیں گے؟ اس میں کمیونسٹوں، فاشسٹوں اور دیگر ناپسندیدہ عناصر کا کس حد تک خطرہ موجود ہے۔

پشت ہا پشت سے یورپ کے ہر قصبہ، گاؤں اور شہر میں سینکڑوں اور ہزاروں ایسے افراد موجود رہے ہیں جو امریکہ کو اپنے خوابوں کی سرزمین سمجھتے تھے۔ جس میں وہ ایک نہ ایک روز آباد ہونے کی آرزو رکھتے تھے۔ وہ مٹھی بھر لوگ جنھوں نے ہزاروں میل سمندر کا سفر کر کے اپنے خاندان والوں کو دور دراز کے ایک ملک میں لے جا کر آباد کرنے میں واقعی طور پر ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے وہی لوگ صحیح معنوں میں قوی ترین، قابل ترین اور انتہائی مستقل مزاج تھے۔

امریکہ بھر میں لاکھوں عورتیں اور مرد جو صرف ایک یا دو یا تین پشتوں پہلے اپنا وطن چھوڑ کر آئے تھے سینکڑوں طریقوں سے ہمارے اقتصادی، سماجی اور سیاسی نظام کے صحت مند ارتقا میں مدد کر رہے ہیں۔ ممکن تھا کہ ہمارے بہت سے پرانے خاندان اپنے شاندار ماضی پر فخر کرتے

ہوئے جمہوریت کو اپنی زندگی کا ایک جز سمجھتے رہتے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان نوواردوں میں سے بہت سے لوگ ہمارے پورے امریکی معاشرے کو نئی زندگی اور توانائی بخشتے رہے ہیں۔

ہر سال سمندر پار سے آنے والے ایسے چند ہزار نئے امریکیوں کا اضافہ، جن کا انتخاب صحت، کردار اور صلاحیت کی بنا پر کافی غور و فکر کے بعد کیا جاتا ہے، ہماری قومی ذہانت تخیل اور قابلیت میں اضافے کا باعث بنے گا۔ اور چونکہ ان نئے شہریوں کا انتخاب قومیت، نسل، مذہب سے بالاتر ہو کر کیا گیا ہوگا، اس لئے وہ اس بات کا زندہ ثبوت ہوں گے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ابتدائی دور کی طرح آج بھی جمہوریت محض نعرہ نہیں، اس سے زیادہ کوئی چیز ہے۔

جہاں تک کمیونسٹوں، فاشسٹوں اور دوسرے ناپسندیدہ عناصر کا تعلق ہے ریاست ہائے متحدہ کے ترک وطن سے متعلق ادارے نے ان کی چھان بین کرنے میں کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔ یکم جنوری ۱۹۵۰ء تک جن ۰۰۰۰۰ ۲۵ مردوں اور عورتوں کو "بے وطن لوگوں کے قانون کے تحت امریکہ میں بسایا گیا تھا، ان میں سے صرف تین کو کسی وجہ سے ملک بدر کیا گیا۔

لہٰذا ہمیں تبدیلیٔ وطن سے متعلق اپنے احمقانہ پابندیوں والے اور امتیاز برتنے والے قوانین کے چیلنج کو قبول کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کافی عرصہ پہلے قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

× × ×

۱۳ - ایک امریکی شہر اسیکس (کنکٹیکٹ) کا مرقع

۱۹۵۲ء کے اوائل میں ہندوستان میں سماجی فلاح کے کاموں سے دلچسپی رکھنے والے کچھ لوگوں کے سامنے مسٹر باؤلز نے اس امریکہ کا جو چھوٹے چھوٹے قصبات پر مشتمل ہے ایک واضح مرقع پیش کیا تھا۔ بعد میں اس خطبے کو ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں شائع کر کے بڑے پیمانہ پر تقسیم کیا گیا تھا۔

میں نے ہمیشہ اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک کو اس وقت تک صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا جب تک ان میں سے ہر ایک دوسرے ملک کے لوگوں کے رہن سہن، اندازِ فکر، خواہشات اور تمناؤں سے اچھی طرح واقف نہ ہوں۔

ہندوستان میں میرا سب سے زیادہ دلچسپ اور کارآمد طریقے پر جو وقت گزرا وہ تھا میرا چھوٹے چھوٹے گاؤں، دیہاتوں اور بڑے بڑے شہروں میں گھوم کر ان کے مضافات کو دیکھ کر یہ جاننے کی کوشش کرنا تھا کہ وہاں لوگ کس طرح رہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں اور اپنے بچوں کی

کس طرح پرورش کرتے ہیں۔

چونکہ میں آپ کو اپنے ملک سے روشناس کرانا چاہتا ہوں، اس لئے میں آپ لوگوں کو ایک چھوٹے سے قصبے اسیکس E S S E X کے بارے میں کچھ بتاؤں گا جو ریاست کنکٹیکٹ ہے اور جہاں میں رہتا ہوں۔

ریاست ہائے متحدہ کے شمالی حصے میں کنکٹیکٹ صرف بیس لاکھ آبادی کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ یہ ریاست سنہ ۱۹۳۵ء میں آباد ہوئی تھی۔ اور ہماری قدیم ترین ریاستوں میں سے ہے۔ آپ لوگوں کو یہ بہت نئی معلوم ہوتی ہوگی لیکن میرے ملک میں یہ بہت پرانی ہے۔

کنکٹیکٹ میں انگلستان کے لوگ آکر آباد ہوئے تھے۔ وہ زیادہ تر کاشتکار تھے اور اپنے ملک کے مذہبی جبر و تشدد سے بچنے کی غرض سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ تاکہ اپنی مرضی کے کے مطابق خدا کی عبادت کرسکیں، اور شخصی حکومت کے استبداد سے آزاد ہوکر اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

کنکٹیکٹ کی جس زمین میں وہ کاشت کرتے تھے۔ اس میں سے بیشتر بنجر اور پتھریلی تھی، سردی بھی شدید ہوتی تھی، اس لئے انیسویں صدی کے وسط میں جب انھوں نے مغربی امریکہ کی ان عمدہ نئی زمینوں کے بارے میں سنا جہاں کوئی بھی اور کسی بھی سمت میں ایک ایک میل تک ہل چلا سکتا تھا، جہاں کی مٹی زرخیز تھی اور آب و ہوا میں بھی اتنی شدت نہیں تھی تو پورے کے پورے گاؤں اور قصبے اٹھ اٹھ کر مغرب کی طرف چلے گئے۔

انیسویں صدی کے آخر میں یورپ سے ترک وطن کرکے آنے والوں کی کثرت سے کنکٹیکٹ ایک بار پھر آباد ہوا۔ آج ریاست کے دوسرے عظیم ترین شہر نیو ہیون میں ۶۵ فی صدی باشندے اطالوی ہیں، یعنی کل آبادی میں سے ۶۵ فی صدی لوگ ایسے ہیں جو یا تو خود اٹلی میں پیدا ہوئے تھے یا ان کے آبا و اجداد اٹلی میں پیدا ہوئے تھے۔ نیو برٹن میں تقریباً ۶۰ فی صدی پولینڈ کے لوگ ہیں اور ہارٹ فورڈ میں جو ریاست کا دارالسلطنت ہے ۴۰ سے ۵۰ فی صدی تک آئرش نسل کے لوگ آباد ہیں۔

کنکٹیکٹ میں سوائے اس کی آبادی کے اور قدرتی وسائل مفقود ہیں۔ اس میں نہ کانیں ہیں نہ تیل۔ تاہم صرف اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگ انتہائی ہنر مند ہیں، ریاست ہائے متحدہ میں کنکٹیکٹ کی فی کس آمدنی سب سے زیادہ ہے۔ ہماری سیکڑوں فیکٹریوں میں، بلکہ ہر قسم کے صنعتی کاموں میں یہ ہنر مند لوگ اونچی اجرتوں پر تعمیری کام انجام دیتے ہیں۔

ایک صدی پیشتر کنکٹیکٹ کا صرف ۱۵ فی صدی حصہ جنگل تھا۔ باقی زمین قابل کاشت

تھی۔ اب اگرچہ ریاست کی آبادی اس اس وقت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گنجان ہے جس میں بہت سے بڑے بڑے شہر ہیں، زمین کا تقریباً ۷۰ فی صدی حصہ جنگل میں تبدیل ہو گیا ہے جس نے بہت سے سابقہ کھیتوں کو گھیر لیا ہے۔

ریاست میں دو بڑی یونی ورسٹیاں ہیں۔ ییل یونی ورسٹی اور کنکٹیکٹ یونی ورسٹی۔ جن میں طلبا کی مجموعی تعداد تقریباً ۱۲ ہزار ہے۔ سات چھوٹے کالج ہیں اور ۴ مخصوص کالج اساتذہ کی تربیت کے لئے ہیں۔

ہمارے یہاں پبلک اسکولوں کا بہت اچھا انتظام ہے۔ لیکن پھر بھی اتنا اچھا نہیں ہو جتنا کہ ہمارے خیال میں ہونا چاہئے۔ ہم اس کو بہتر بنانے کی برابر کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس بات کی بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے کنکٹیکٹ کے بچوں کے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کالج جانا آسان ہو جائے۔ ہمارے قانون کی رو سے ہر لڑکے اور لڑکی کو سولہ سال کی عمر تک اسکول میں رہنا لازمی ہے۔

ثانوی یا "ہائی اسکول" سے فراغت حاصل کرنے کے بعد تقریباً ۳۰ فی صدی طلبا اور طالبات یونی ورسٹی میں جاتے ہیں۔

ہم اپنے رہائشی مکانات اور اسپتالوں کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں کافی پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ ہم ہر ممکن طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے تمام لوگوں کے لئے باعزت اور سیر حاصل زندگی کی بنیاد ڈال سکیں۔

اسیکس ESSEX کا قصبہ جہاں میں رہتا ہوں، اس کی کل آبادی ۳۵۰۰ ہے۔ یہ کنکٹیکٹ جیسے حسین اور عظیم الشان دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ اسیکس کے لوگ مختلف قسم کے پیشوں میں مصروف ہیں۔ اس میں پانچ چھوٹی فیکٹریاں ہیں جن میں سے سب سے بڑی میں دو سو آدمی کام کرتے ہیں۔ ہمارے بعض باشندے فیکٹری میں صرف ۲ سے لے کر چھ ماہ تک کام کرتے ہیں، اس کے بعد چار یا پانچ مہینے کھیتی کرتے ہیں اور پھر ایک ماہ تک ماہی گیری کا کام کرتے ہیں۔ ہر موسم بہار میں دریا میں بہت کافی مچھلیاں آجاتی ہیں۔ اور عام طور پر ان کی اچھی قیمت اٹھتی ہے۔

اسیکس کے لوگ کچھ زیادہ مالدار نہیں ہیں، کچھ زیادہ غریب ہیں۔ یہاں کے سات سو گھرانوں میں سے میرے خیال میں صرف پندرہ یا بیس گھرانے ایسے ہیں جن کے پاس ایک نوکر ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف ایک گھرانے کے پاس دو نوکر ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ امریکہ میں نوکروں کو اتنی زیادہ تنخواہ دینی پڑتی ہے کہ ہم میں سے بہت

ہی کم لوگ متحمل ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی اس بات کی ایک وجہ ہے کہ ہم لوگ گھریلو کام کاج کے لئے اتنی زیادہ برقی مشینیں کیوں رکھتے ہیں جن کے بارے میں ہمارے اکثر ہندوستانی دوست ہمیں طعنہ دیتے ہیں۔ ہم نے یہ گھریلو مشینیں خانگی نوکروں کی جگہ کو پُر کرنے کے لئے ایجاد کی ہیں۔

ہمارے چھوٹے سے قصبے کی حکومت کو "بلا واسطہ جمہوریت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اگر ایک نئے آگ بجھانے والے انجن یا ایک نئی سڑک یا ایک نئے اسکول کی ضرورت پیش آتی ہے تو ٹاؤن ہال میں ایک نوٹس چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ فلاں مسئلہ کو طے کرنے کے لئے فلاں فلاں رات کو اہالیان قصبہ کا ایک جلسہ ہو گا۔

قصبہ میں سے ہر شخص جو اپنی عمر کے اعتبار سے رائے دہندگی کا مجاز ہے اور جسے اس موضوع سے دلچسپی ہو، جلسے میں شریک ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ مل کر ایک ثالث چن لیتے ہیں جو اس جلسے کا صدر قرار پاتا ہے۔ اس طرح پورا شہر اسمبلی یا مجلس قانون ساز کی طرح کام کرنے لگتا ہے۔ ہر شخص ایک ووٹ دینے کا مجاز ہوتا ہے۔ اس رات جب ہم گھر جاتے ہیں تو ہم سڑک یا آگ بجھانے والے انجن یا اسکول، یا جو بھی معاملہ ہو، اس کے بارے میں ایک جمہوری فیصلہ کر چکے ہوتے ہیں۔

حکومت خود اختیاری کے لئے اسکیس میں قصبہ کی صرف یہ مجلس ہی کام نہیں کرتی بلکہ قصبہ کے تین عہدے دار بھی ہوتے ہیں جن کو سلیکٹ مین کہا جاتا ہے اور جن کا قصبے کے لوگ انتخاب کرتے ہیں۔ پہلے دو سلیکٹ مین اکثریت والی جماعت کے ممبر ہوتے ہیں۔ اور تیسرا سلیکٹ مین اقلیتی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کے ممبروں پر اس بات کی کڑی نگاہ رکھے کہ ہمارے مفادات کی ایمانداری کے ساتھ اور موثر طریقہ پر دیکھ بھال ہوتی ہے۔

ہمارے قصبے کے بہت سے لوگ صرف اپنے خاندان اور چرچ (گرجا) کے ارد گرد کی زندگی سے سروکار رکھتے ہیں۔ قصبے میں تقریباً ۱۲ مختلف گرجا گھر ہیں، جو کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور یہودی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لئے گھر اور چرچ ہی دو اہم ترین ادارے ہیں۔

سمندر پار سے آنے والے غیر ملکی لوگ ممکن ہے امریکہ کے چھوٹے قصبات جا کر یہ بات محسوس کریں کہ ہمارے بعض شہریوں کا اندازِ فکر محدود ہے۔ یہ درست ہے کہ ہم اکثر اپنے مسائل میں اس قدر اُلجھ جاتے ہیں کہ ہم میں سے بعض کو دنیا کے مسائل پر غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ لیکن صورتِ حال تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہی ہے۔ دوسرے امریکیوں کی طرح اسکیس کے لوگ بھی اس پیچیدہ اور باہم مربوط نئی دنیا کے مسائل کے بارے میں واقفیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں کی طرح وہ بھی ان مسائل کا، جو آج ہم سب کو درپیش ہیں، بہتر حل تلاش

کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میں جب بھی ہندوستان سے اپنے وطن واپس گیا ہوں تو مجھے ہندوستان کے موضوع پر تقریر کرنے کے لئے نصف درجن دعوت نامے ضرور ملے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ کیا سوچتے ہیں، آپ کس قسم کے لوگ ہیں، آپ کا رہن سہن کیسا ہے؟ غرضیکہ آپ کے بارے میں اس قسم کے بہت سے سوالات کرتے ہیں، آج کل ہر ہفتہ ایسے مختلف النوع موضوعات پر جلسے ہوتے رہتے ہیں جو آج سے دس پندرہ سال سے بیشتر ہی قطعاً عام دلچسپی کی چیز نہیں سمجھے جاتے تھے۔

اگر آپ مجھ سے سوال کریں کہ اسکس کے شہری دنیا میں سب سے زیادہ کس چیز کے خواہشمند ہیں تو میرا جواب ہوگا: کہ وہ عالمی امن کے خواہشمند ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسے مستقبل کا تصور کرنا چاہتے ہیں جو نفرت اور کدورت سے مبرا اور اس کش مکش سے قطعاً آزاد ہو جس سے ہم اپنی زندگی میں کافی خمیازہ بھگت چکے ہیں۔

اگر آپ اتوار کے روز اسکس کے گرجا گھروں میں جائیں تو آپ کو جگہ جگہ ایسے وعظ سننے کو ملیں گے جو ہر مذہب اور نسل کے لوگوں کے درمیان ادر مفاہمت کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ لوگ عبادت کے دوران امن عالم کے لئے اپنے سر بھی خم بھی کرتے ہیں۔

میرے یہ پڑوسی نہایت معقول قسم کے لوگ ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ہر شخص کے معقولیت سے کام لینے ہی کا نام امن ہے۔ اور ایک اعتبار سے وہ درست بھی ہیں۔ اگر ہر شخص کے معقولیت پسند اور مفاہمت پسند ہو، اگر ہر شخص دوسروں کے نقطہ نظر کو ذرا بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کرے، اگر ہم ایک ملک کو دوسرے سے جدا کرنے کے لئے درمیان میں آہنی پردے کھڑے نہ کریں تو امن کا حصول آسان ہو جائے گا۔

اگر آپ میرے ہم وطنوں سے میری طرح واقف ہوتے تو آپ دیکھتے کہ ان میں سے چند ہی لوگ ہوں گے جو کسی کے ساتھ صحیح معنوں میں دشمنی رکھتے ہوں گے۔ آپ ان کو اسی انداز میں سوچتے اور انھیں موضوعات کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے پائیں گے۔ جیسے کہ آپ لوگ ہندوستان میں سوچتے اور بولتے ہیں دوسری تمام چیزوں سے بڑھ کر ان کو اس بات کی امید ہے کہ ایسے طریقے دریافت کر لئے جائیں گے جو ان تمام پابندیوں کو توڑ دیں جو حقیقی عالمی مفاہمت کے راستہ میں کاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

میری خواہش ہے کہ ہندوستان کے بہت سے لوگ امریکہ جا کر میرے قصبے جیسے خاص قسم کے قصبات کو دیکھیں اور میرے پڑوسیوں جیسے خاص قسم کے لوگوں سے گفتگو کریں۔

میری یہ بھی خواہش ہے کہ بہت سے امریکی ہندوستان آکر ہندوستان کی زندگی — یعنی یہاں کی خاندانی زندگی، یہاں کے مضافات، اور دیہات کی زندگی کو دیکھیں تاکہ وہ ہندوستان

کے عوام کو بہتر طریقے پر سمجھ سکیں ۔ اور ان تمام چیزوں کو بھی جو آپ دنیا کو سکھا سکتے ہیں جس طرح کہ میں نے آپ کو سمجھا ہے ۔

× × ×

۱۴ ۔ حبشی گاندھی جی سے کیا سیکھ سکتے ہیں ؟

۱۹۵۳ء کے اواخر میں مہاتما گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی کے طرز پر منٹگمری (الاباما) کے مارٹن لوتھر کنگ بسوں کے بائیکاٹ کی ایک غیر معمولی تحریک کی کامیاب طریقے پر رہنمائی کی تھی ۔ یکم مارچ ۱۹۵۸ء کے سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ کے ایک مقالے میں مسٹر باڈلو نے مہاتما گاندھی کے طریق کار اور امریکہ کے نسلی بحران سے اس کے تعلق کا مختصر طور پر جائزہ لیا ہے ۔

" اب ہمیں پھر ایک بار اس پر عمل کرنا چاہیئے" حبشی مبلغ نے سامعین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا " میں ایک سفید فام شخص ہوں ' میں آپ کی بے عزتی کرتا ہوں ' آپ لوگوں کو دھکے دیتا ہوں ' ممکن ہے کہ میں آپ کو ماروں بھی ' اس صورت میں آپ کیا کریں گے ؟ "

فوراً ہی جواب ملا " میں تحمل کروں گا ، وہاں سے ہٹوں گا نہیں ، نہ لوٹ کر اس کو ماروں گا ، بلکہ اپنا دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دوں گا ۔"

یہ دسمبر ۱۹۵۶ء کی شام کا ایک واقعہ ہے ۔ ایک سال تک پیدل کام پر جانے اور اجتماعی طور پر منظم کی ہوئی سینکڑوں کاروں میں سفر کرنے کے بعد منٹگمری (الاباما) کے ...۲۰۰۰ ہزار حبشیوں نے غیر تفریقی بسوں میں سفر کرنے کا اپنا آئینی حق منوا لیا تھا ۔

اگلا کام کا دن شروع ہوتے ہی بسوں کے نئے قوانین کا نفاذ ہو جانا تھا ۔ اب وہ اطمینان کے ساتھ اپنے گرجاؤں میں احتجاجی اجتماعات میں شرکت کر رہے تھے ۔ گرجا کی نشستیں ان کے لئے بسوں کی نشستوں کی مانند تھیں اور وہ یہ سیکھنا چاہتے تھے کہ عیسائیت کے اصولوں کو انسانی تعلقات کے اس انتہائی اہم مسئلہ پر کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے ۔

ان کے سرداروں نے ان کو ہدایت کی " شور و غوغا نہ کرنا ، نہ سفید فام مسافروں پر کوئی دھونس جتانا ، تحمل اور احترام کا مظاہرہ کرنا ' ان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرنا جو تم چاہتے ہو کہ وہ تمھارے ساتھ کریں ۔"

آئندہ چند ہفتوں میں سفید انتہا پسندوں نے گولیاں چلائیں ، بم پھینکے اور حبشیوں اور ان کے رہنماؤں کو دھمکیاں دیں اور انھیں ہدف ملامت بنایا ۔ لیکن وہ کسی رنجش یا بد دماغی کا مظاہرہ کئے

بغیر اپنی جگہ پر مضبوطی اور وقار کے ساتھ قائم رہے۔
جب ان کو مکمل طور پر فتح حاصل ہو گئی تو بہت سے سفید فام شہری جو بسوں میں نسلی امتیاز کے ختم کئے جانے کی مخالفت کرنے والی تنظیم میں سرگرم رہے تھے بے دلی کے ساتھ کہنے لگے:
"ہمیں کبھی بھی یہ خیال نہیں تھا کہ حبشی اتنا کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، جو انھوں نے کیا ہے ہم کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہم حبشیوں کی عزت کریں گے، لیکن اب ہمیں یہ کرنا پڑے گا"۔
حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو اتنے عرصہ بعد یہ عملی جامہ پہننا کس طرح نصیب ہوا؟ وہ کونسا طریق کار تھا، جس کے ذریعہ یہ ممکن ہوا؟
منٹگمری پروگرام ان اعلیٰ روحانی قدروں کا حامل تھا جن کی جڑیں صرف عیسائیت میں ہی نہیں بلکہ ایشیا کے قدیم مذاہب میں بھی بڑی دور تک چلی گئی ہیں۔ ستائیس سالہ حبشی سردار مارٹن لوتھر کنگ نے، جو پروگرام کی کامیابی کے لئے سب سے زیادہ ذمہ دار تھا صاف طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے اس طریق کار کا ادراک براہ راست گاندھی جی سے کیا تھا جنھوں نے ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کو آزادی دلانے کے لئے اس طریق کار کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا تھا۔
خود گاندھی جی اپنی جگہ روسی مصنف ٹالسٹائی اور امریکہ کے تھورو سے متاثر تھے جسے نیوجی ٹوسیلو لا کی پر امن مزاحمت کی پاداش میں مساچوسٹ میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ تھورو کے مقالے "سول نافرمانی" ہی سے گاندھی جی نے یہ اصطلاح اخذ کی تھی جو ان کے پروگرام کے لئے عام طور پر استعمال کی جاتی تھی۔
بہت سے امریکی جو خود کو بہت سخت مزاج تصور کرتے ہیں منٹگمری کے ان واقعات کو بعض مخصوص حالات کا نتیجہ کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں اور اس خیال کا مضحکہ اڑا سکتے ہیں کہ ایسے طریقوں کی مدد سے اس شدید نسلی عناد کو ختم کیا جا سکتا ہے، جو بہت سی امریکی بستیوں کے لئے مصیبت کا باعث بنا ہوا ہے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے، ان کے یہ شبہات ان شبہات سے کچھ زیادہ نہیں ہیں جن کا اظہار گاندھی جی کے معاصرین ان کی آخری فتح سے چند سال بیشتر کیا کرتے تھے۔
منٹگمری کے اس بائیکاٹ اور گاندھی جی کی ابتدائی جدوجہد میں حیرت انگیز مشابہتیں موجود ہیں۔ منٹگمری کی تحریک ایک معمولی سے حادثہ سے شروع ہوئی تھی جس نے بعد میں بڑھکر ایک باقاعدہ جہاد کی شکل اختیار کر لی۔
ایک خاموش مزاج حبشی دوازن مسنر روسا پارکس کو کئی بار بس کے اندر اپنی سیٹ سفید فام اشخاص کے لئے چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ لیکن ایک روز کسی سبب سے جسے وہ خود بھی نہیں سمجھ سکی، اس نے اچانک یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی سیٹ نہیں چھوڑے گی۔ جب ڈرائیور نے پولیس طلب کرنے کی دھمکی دی تو اس نے کہہ دیا۔ "ہاں ضرور بلاؤ"!

مسز پارکس کو گرفتار کر لیا گیا۔ حبشی مذہبی رہنماؤں نے ایک روز کے لئے شہر بھر میں بسوں کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی۔ جب سفید فام انتہا پسندوں نے جواب میں شدید طرزِ عمل اختیار کیا تو یہ احتجاج بڑھ کر پورے شہر کے بس سسٹم پر اثر انداز ہو گیا اور منٹگمری کا ہر حبشی خاندان اس میں شامل ہو گیا۔

گاندھی جی کی تحریک بھی جس نے بالآخر ہندوستان کو آزاد کرایا کچھ اس طرح شروع ہوئی تھی ان کے معاملے میں جس چنگاری نے اسے بھڑکایا وہ ۱۸۹۳ء میں نسلی امتیاز برتنے والے جنوبی افریقہ جیسی دور دراز سرزمین پر ایک ریل گاڑی میں پیدا ہوئی تھی۔

گاندھی جی تیس سال کی عمر میں ایک وکیل کی حیثیت سے ایک ہندوستانی شہری کے عدالتی معاملے کی پیروی کرنے کے لئے جنوبی افریقہ آتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں ریل کے سفر کی پہلی ہی رات کو انھیں حکم دیا گیا کہ وہ ڈبے سے اُتر جائیں جو سفید فام اشخاص کے لئے مخصوص تھا۔ انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو انھیں اگلے اسٹیشن پر گاڑی سے باہر دھکیل دیا گیا۔

وہ صبح کی سردی میں کھڑے تھرا رہے تھے، ان کا اوورکوٹ اور دیگر سامان ہنوز گاڑی میں تھا جو تیزی کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت گاندھی جی نے خود سے یہ فیصلہ کن سوال کیا "کیا مجھے افریقہ میں ٹھیر کر اپنے اور دوسرے لوگوں کے حقوق کے لئے لڑنا چاہیئے یا اس معاملے کو نظر انداز کر کے مجھے ہندوستان چلا جانا چاہیئے؟"

ان کا بیان ہے کہ "میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستان واپس جانا بزدلی ہوگی" انھوں نے فیصلہ کیا کہ "حق پر عمل پیرا ہونے کی جرأت کرنا ہی سنہری اصول ہے۔"

بعد میں جب وہ پریٹوریا کے لئے ایک ڈاک گاڑی میں سوار ہوئے تو ان کو سامی کہہ کر پکارا گیا، ایک میلے کچیلے ٹاٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا بلکہ ایک سفید فام مسٹنڈے نے ان کو مارا بھی۔ جب وہ پریٹوریا پہنچے تو ہوٹلوں نے ان کو جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ ایک امریکی حبشی نے ان کی دست گیری کی اور کسی نہ کسی طرح ان کے لئے رہائش کا انتظام کرا دیا۔

اگلے روز گاندھی جی نے پریٹوریا کے ہندوستانیوں کا ایک جلسہ طلب کیا جس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ سب لوگ مل کر ان امتیازات کے خلاف جنگ کریں اور یہ بھی کہ یہ جنگ نئے اور تعمیری طریقوں سے لڑی جائے۔

گاندھی جی نے اس بات پر زور دیا کہ ان کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اچھے پڑوسیوں کی ایک بستی بنائی جائے۔ اس کے لئے تشدد کے بجائے تحریص و ترغیب کا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیئے۔ ہندوستانی اقلیت کو دل سے نفرت نکال دینی چاہیئے۔ انھیں اپنے سفید فام پڑوسیوں کے غیر منصفانہ امتیازی قوانین کی مخالفت کرتے ہوئے بھی انسان ہونے کی حیثیت سے ان کی عزت کرنی چاہیئے۔

وہ خود کو اس بات کے لئے آمادہ کرلیں کہ وہ مار پیٹ اور قید و بند کو خود دوسروں کی بے عزتی
اور مار پیٹ کئے بغیر مردانہ وار برداشت کرتے رہیں گے۔ انھیں اپنے الفاظ کے ذریعہ نہیں اپنے عمل
کے ذریعہ دوسروں کو ہموار کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اُن کی زندگی ان کے الفاظ کی عملی تفسیر ہونا چاہیئے۔
انھوں نے تجویز پیش کی کہ سب سے پہلے ہمیں ان شکایات پر غور کرنا چاہیئے جو سفید فام
لوگ ہم سے رکھتے ہیں۔ اور دیکھنا چاہیئے کہ وہ دلائل اور توجیہات جو سفید لوگ ان امتیازات کی
حمایت میں پیش کرتے ہیں کہاں تک درست ہیں۔
بہت سے ہندوستانی سوداگر جو گاندھی جی کی بات سننے آئے تھے، معاملات کی صفائی اور
لین دین کی سچائی کے لئے مشہور تھے۔ گاندھی جی نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ سچائی پر مضبوطی کے ساتھ
قائم رہیں اور اپنے طبقے کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی طرف خاص طور پر توجہ دیں۔
انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ہم اپنی تمام پریشانیوں کے سفید فام
لوگوں کو ہی مورد الزام قرار نہیں دے سکتے۔ اور نہ ہی ہم اس سارے افلاس کو دور کر سکتے ہیں جس میں ہماری
قوم مبتلا ہے۔ لیکن ہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنے گھروں کی صفائی کریں، ناخواندہ بالغ ہندوستانیوں کو
پڑھنا سکھائیں اور غریب بچوں کی مفت تعلیم کا انتظام کر دیں۔"
کافی کچھ آزمائش اور تجربے کے بعد گاندھی جی نے ایک نئے اور اچھوتے ڈھنگ کی سیاسی
جد و جہد کا پروگرام وضع کیا۔ محض قانونی کارروائی کرنے یعنی پارلیمنٹ میں ان امتیازی قوانین کو ختم
کرنے کی اپیل کی اور عدالتی یا انتخابی فتح کے حصول کی کوشش کرنے کی بجائے گاندھی جی نے ہندوستانیوں
کو سکھایا کہ ان امتیازی قوانین کی پُر امن مخالفت اور معاشرے کی تعمیری خدمت کو کس طرح یکجا کیا جا سکتا ہے۔
امتیازی قوانین کی عمداً خلاف ورزی کرنے کے لئے وہ ہزاروں ہندوستانیوں کا پُر امن جلوس لیکر
پوری ریاست میں پھرے۔ سینکڑوں لوگ پولیس کے ہاتھوں زخمی ہوئے اور ہزاروں کو جیل جانا پڑا۔
آخر کار وزیر اعظم اسمٹس کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ ان کے پاس گاندھی جی کے ساتھ مصالحت کے علاوہ
کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہم بیس ہزار ہندوستانیوں کو جیل میں نہیں رکھ سکتے۔"

× × ×

۱۹۱۵ء میں گاندھی جی نے ہندوستان آکر اپنی صلاحیتوں اور اپنے عدم تشدد کے نئے طریق کار
کو آزادی کی جد و جہد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ افریقہ کی طرح ہندوستان میں بھی ان کا پروگرام صرف
برطانوی اقتدار کے خلاف جد و جہد کی حدود سے آگے بڑھ گیا۔ ان کا مقصد ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر
کرنا تھا جو خود پر حکومت کرنے کے قابل ہو۔ اسی لئے انھوں نے جتنا وقت قومی آزادی کے حصول کی کوشش
میں صرف کیا اتنا ہی وقت دیہات میں تعمیری کام کرنے کے لئے اپنے ہم وطنوں کی تربیت میں لگایا۔

ہندوستان کی ترقی کے لئے ان کے تیرہ نکاتی پروگرام میں ہندوؤں کے اندر سے چھوت چھات کو ختم کرنا۔ ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارہ قائم کرنا۔ ہندوستان کے پانچ لاکھ دیہاتوں میں جہاں ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ رہتا تھا زراعت، خوراک، تعلیم اور صحت عامہ کے طریقوں کو بہتر بنانا بھی شامل تھا۔

گاندھی جی اپنے سیاسی تدبر سے کام لیتے ہوئے اپنی جد وجہد کے لئے ان مسائل کا انتخاب کرتے تھے جنھیں لوگ آسانی سے سمجھ پاتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کے نمک کے جلوس نے پوری جنگِ آزادی کو ہندوستانی دیہاتیوں کے ایک معمولی سے مطالبے یعنی نمک پر برطانوی ٹیکس اور دیسی نمک بنانے کی مخالفت کے خاتمہ پر مرکوز کر دیا تھا۔

جب گاندھی جی نے اعلان کیا کہ وہ دو سو میل پیدل چل کر بحیرۂ عرب کے ساحل تک جائیں گے تو پورے ہندوستان میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ جب وہ تیزی کے ساتھ گزرے جا رہے تھے تو لاکھوں دیہاتیوں نے سڑکوں کے کنارے جمع ہو کر ان کی تائید میں نعرے لگائے۔

۵ اپریل کی رات میں وہ سمندر پر پہنچے۔ انھوں نے کہا "خدا نے چاہا تو ہم صبح ساڑھے چھ بجے سول نافرمانی شروع کریں گے"۔ سورج نکلتے وقت انھوں نے حسب معمول پرارتھنا کی اور مقررہ وقت پر نمک کے ساحل سے مٹھی بھر نمک اٹھانے کے لئے پہنچ گئے۔

اس خبر کے ملک میں پھیلتے ہی جوش وخروش نے شدت اختیار کر لی یہاں تک کہ دور دراز کے دیہات بھی اس سے متاثر ہو گئے۔ نہرو اور ان کے ساتھ تقریباً ایک لاکھ افراد گرفتار کر لئے گئے۔

اس کے بعد گاندھی جی نے اعلان کیا کہ وہ نمک کے قریب ترین سرکاری دفتر پر پرامن احتجاجی جلوس لے کر جائیں گے۔ اگرچہ ان کو بھی فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن ان ڈھائی ہزار ہندوستانیوں نے جو یہ عہد کر چکے تھے کہ پولیس کے خلاف نہ ہاتھ اٹھائیں گے اور نہ آواز اٹھائیں گے، اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔

اگرچہ سینکڑوں لوگوں کے چوٹیں آئیں، لیکن جواب میں کسی نے بھی تشدد اختیار نہیں کیا۔ گاندھی جی کو جیل میں یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ شمال مغربی سرحد کے جنگجو مسلمان پٹھانوں نے بھی پورے ضبط وتحمل سے کام لیا ہے۔ اب ہر جگہ کے ہندوستانی کسی قدر سینہ تان کر کھڑے ہونے لگے تھے اور انھوں نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ فرد کی حیثیت سے ان کے بھی کچھ حقوق اور ذمہ داریاں ہیں اور ان کا بھی ایک مستقبل ہے۔

سیاسی موقع شناسی اور آخر کار فتح کے کامل یقین کے ساتھ گاندھی جی تیس سال تک پرامن سیاسی جد وجہد کے اپنے نئے انقلابی طریقوں کو ایک آزاد اور سماجی حیثیت سے بیدار ہندوستان کی تخلیق کے لئے استعمال کرتے رہے۔

بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی حاصل ہو گئی۔ یہ ایک نوآبادیاتی انقلاب کی کیسی عجیب

اور عظیم الشان فتح تھی! چالیس کروڑ ہندوستانیوں نے خود پر حکمرانی کا حق حاصل کر لیا تھا اور حیرانی کی بات یہ کہ کسی خون خرابے اور دشمنی کے بغیر یہ حق حاصل ہوا تھا۔ چونکہ برطانیہ نے خوش اسلوبی کے ساتھ یہ حق تسلیم کر لیا تھا، اس لئے دونوں ملکوں کے درمیان برطانوی دول مشترکہ کے رشتہ کی صورت میں مساوات اور باہمی احترام پر مبنی نئے تعلقات کی بنیاد پڑ گئی۔

کوئی عقلمند آدمی ہندوستان بلکہ منٹگمری (الاباما) میں بھی گاندھی جی کے طریق کار کے عملی طور پر موثر ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔

لیکن کیا یہ طریق عمل لٹل لارک، شکاگو، لیوی ٹاؤن اور نیو آرلینز میں بھی قابل عمل ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا یہ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں امریکیوں کو نسلی تعصب کی لعنت اور تین سو سال میں مسیحی اصولوں کے ساتھ لاشعوری طور پر مصالحت سے پیدا شدہ خطرات سے نجات دلا سکتا ہے؟

بے انصافی کے ساتھ جنگ کرنے کے گاندھیائی طریق کار کی کامیابی کا زیادہ انحصار اس بات پر بھی تھا کہ اسے ایک ایسے آئینی نظام میں برتا گیا تھا جو جمہوری عقائد کے مدعی لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے تحریر و تقریر کی بھی کافی حد تک آزادی دے رکھی تھی۔

مزید برآں یہ کہ گاندھی جی خود ایک قانون داں تھے اور انھوں نے کسی بھی حالت میں قانونی وقار کے احترام کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ انھوں نے اس بات کے تسلیم کئے جانے پر زور دیا کہ ریاست کو قانون بنانے اور ان کے نافذ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگرچہ وہ احتجاجاً اس وقت تک اپنی شخصیت اور آزادی کی قربانی دیتے رہے، جب تک جمہوری اصولوں کے منافی قوانین تبدیل نہیں کر دیئے گئے، وہ انسان کے خود ساختہ امتیازی قوانین کی جگہ اعلیٰ فطری قوانین یعنی اخلاقی قوانین کا نفاذ چاہتے تھے۔

بالکل اسی طریقے پر چل کر منٹگمری کے نہایت منظم حبشی باشندوں نے دانشمندانہ رہنمائی میں شہریوں میں امتیاز کے رجحان کو ختم کرایا ہے۔ پادری مارٹن لوتھر کنگ اور ان کے ساتھیوں کی رہنمائی میں ان کے عام جلسے اپنے مخالفین کے لئے دعا کے ساتھ شروع ہوتے تھے، اور وہ باقاعدہ عہد کرتے تھے کہ صرف محبت اور عدم تشدد کے ہتھیار ہی استعمال کریں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ "خدا کے ساتھ چل رہے ہیں۔" انھوں نے اپنی تحریک کا نام انجمن اصلاح منٹگمری رکھا تھا۔

گاندھی جی کی طرح ہی ڈاکٹر کنگ کا یہ کہنا تھا کہ وہ اور ان کے ساتھی منٹگمری کے سفید فام اور رنگ دار دونوں ہی لوگوں کی بہبود کے لئے کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر کنگ کہتے تھے کہ "سفید فام لوگ تفریق کے لئے جو دلائل دیتے ہیں ان پر غور کیا جائے اور جن الزامات کا ہم کچھ مداوا کر سکتے ہیں ہم کو خود ہی کر لینا چاہیئے۔"

اور پھر ڈاکٹر کنگ نے بڑی صفائی کے ساتھ حبشیوں میں ناجائز بچوں کی پیدائش کی شرح ان کے جرائم کی شرح، ان کے اپنے ذرائع سے بڑھ کر کاروں کی خریداری اور ان کے صحت کے گرتے ہوئے معیار کی ایک فہرست بنائی اور انجمن اصلاح منٹگمری غلامی کی ان نشانیوں؛ تفریق اور جبراً تھوپی ہوئی دوسرے درجہ کی شہریت کو ختم کرنے کے لئے دن رات کام کر رہی ہے۔

آج منٹگمری شہر اور فلاح و بہبود کے اعداد و شمار میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے حبشیوں کی شراب خوری، نوعمری کے جرائم اور طلاق میں کافی تخفیف ہوئی ہے۔

نسلی امتیاز کی پرامن مخالفت اور عوامی خدمات کا یہ ملا جلا پروگرام جب منٹگمری سے باہر جائے گا تو راستہ اور زیادہ کٹھن ہو جائے گا۔ خود گاندھی جی کے تجربے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تمام انسانوں کے مساوی احترام کے مسیحی عقائد کے حصول کا کوئی آسان اور بے جہد راستہ نہیں ہے۔

شروع شروع دوسرا گال پیش کر کے ہندوستانیوں نے انگریزوں کو محض طیش دلایا تھا۔ نہرو نے ایک بار کہا تھا کہ انھوں نے لوگوں کی آنکھوں میں اس سے زیادہ نفرت و حقارت کبھی نہیں دیکھی جتنی ان سپاہیوں کی آنکھوں میں جو اپنی لمبی آہنی شام چڑھی ہوئی لاٹھیوں سے لوگوں کو پیٹتے تھے اور وہ اپنے بچاؤ کے لئے ایک انگلی تک نہیں اٹھاتے تھے اور خاموش کھڑے رہتے تھے۔ کوئی شخص اپنے ضمیر کو ایسی سخت آزمائش میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرے گا۔

بہرکیف اہمیت آخری نتیجے کی تھی۔ ہندوستانیوں نے اپنی پرامن مدافعت کی صلاحیت کو ثابت کر دکھایا تو انگریزوں کو ان کا احترام کرنا پڑا۔ اتنی ہی اہم بات یہ تھی کہ وہ خود اپنا احترام کرنے لگے تھے۔ نہرو نے لکھا ہے "ہم اپنا خوف و ہراس دور کر کے انسانوں کی طرح چلنے پھرنے لگے تھے۔"

امریکہ میں قومی پیمانے پر اس پروگرام کی کامیابی کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ گاندھی جی محض ایک مخلص، بے لوث اور حوصلہ مند مذہبی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ ایک نہایت ذہین سیاست داں بھی تھے۔

امریکہ میں بھی اس قسم کی کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ حبشی رہنما سخت مشکلات میں اپنی دانشمندی اور یقین کو کس حد تک فروغ دے سکتے ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ اس کا انحصار ان کے مقلدین کی تعداد حوصلے اور بے لوثی پر ہوگا۔

صرف ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم امریکہ میں نسلی آہنگی کے خواہشمند ہیں تو ہمیں ایک ایسی اخلاقی قوت پیدا کرنی ہوگی جو ہمارے قومی شعور کو بیدار کر سکے۔

جلد یا بدیر جنوب بلکہ شمال مشرق اور مغرب سب ہی اس واحد مسیحی نظریے کے ساتھ اتفاق کرنے لگیں گے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ خدا کی ربوبیت اور انسان کی اخوت کا درس دینے کے لئے ہی دنیا میں آئے تھے اور یہ بتانے کے لئے کہ خدا کے نزدیک یہودی اور غیر یہودی، یونانی اور غیر یونانی نیز سیاہ اور سفید میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۱۵۔ حبشی حقوق کے لئے کام کرنے کا وقت

شمال اور جنوب کے مضافات میں رونما ہونے والی نسلی کشیدگی اس بات کی مقتضی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ میں ہمارے معاشرے کے اس اخلاقی ناسور پر فوری توجہ دی جائے۔ یہ مقالہ نیویارک ٹائمز مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۶۰ء اور دی نیوری پبلک مورخہ ۶ر جولائی ۱۹۵۹ء سے ماخوذ ہے۔

امریکہ میں نسلی امتیاز کو ختم کرنے کی اصل وجہ کمیونسٹ چیلنج نہیں ہے، نہ ہماری یہ ضرورت کہ ہم غیر ممالک میں دوست پیدا کریں اور لوگوں کو متاثر کریں۔ اس کا بنیادی مقصد صاف اور واضح طور پر یہ ہے کہ نسلی امتیاز ایک غلط چیز ہے۔

نسلی امتیاز ہمارے معاشرے کا ایک ناسور ہے۔ یہ ہمارے سیاسی اور مذہبی عقیدے کی مستقل اور مسلسل طریقے پر نفی کرتا ہے اور ہمارے قومی ضمیر کو پراگندہ کر رہا ہے۔

اصل مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ ہم بقیہ نوع انسانی کے ساتھ پرامن طور پر رہنے کے خواہشمند ہیں۔ جب تک ہم اپنے قومی ضمیر پر سے اس دھبے کو دور نہیں کر دیتے، ہم خود آپس میں امن و عافیت کے ساتھ رہنے کی توقع نہیں کر سکتے۔

ہمارے ملک میں مختلف نسل کے لوگوں کے درمیان جو کچھ پیش آتا ہے، وہ خواہ لٹل راک میں ہو یا منٹگمری میں، لیوٹاؤن میں ہو یا شکاگو میں، ہماری ہی بات ہے۔ امریکی ہونے کی حیثیت سے ہم سب پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

امریکہ کی کوئی بھی بستی ہو — خواہ مشرق کی ہو یا مغرب کی، شمال کی ہو یا جنوب کی — اپنے ضمیر کو ٹٹول کر اپنے آپ کو اس الزام سے بری قرار دے سکتی ہے۔؟

ہم میں سے کون شخص ہے جو روزمرّہ ہی رہائشی مکانوں، اسکولوں اور تفریح گاہوں کے ایسے علاقوں سے نہیں گزرتا جہاں رنگ دار نسل کے لوگوں کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو، خواہ بلا قصد ہی سہی، اس افسوسناک اقتصادی امتیاز میں شریک نہیں ہے؟

ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اب امریکی حبشی شمال میں بھی رہتے ہیں: نیو آرلینز کے مقابلہ میں ڈیٹرائٹ میں پانچ گنے اور میامی کے مقابلہ میں لاس اینجلز میں چھ گنے حبشی آباد ہیں۔

لیکن شمال کے بہت سے لوگ اب بھی تنگ دلی کے ساتھ نسلی امتیاز کو ایک ضمنی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اپنے خیال کے مطابق جنوب میں یکجہتی کی سست رفتاری کی مذمت کرتے ہیں اور ان کے اردگرد جو

روا رکھا جاتا ہے اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔
جنوب کے باہر کی ۲۹ ریاستوں میں سے صرف ۱۹ نے FAIR EMPOYMENT PRACTICE COMMISSION مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے بھی تین کے پاس اپنے فیصلوں کو نافذ کرانے کے اختیارات نہیں ہیں۔

بیس دوسری غیر جنوبی ریاستوں میں ملازمتوں میں امتیاز برتنے کے خلاف کوئی قانون نہیں ہے۔ جنوب کو چھوڑ کر صرف ۹ ریاستوں نے ان امتیازات کے خلاف قانون وضع کئے ہیں جن کا اثر سرکاری امداد سے تعمیر کئے جانے والے مکانات پر بھی پڑا ہے۔ دیگر تیس غیر جنوبی ریاستوں میں مکانات کے معاملے میں امتیاز کو ختم کرنے کے لئے کوئی سرکاری اقدام نہیں کیا گیا ہے۔

نیوہیونز اور پٹس برگ جیسے بعض شہروں میں تعمیر جدید کی طرف دور رس قدم اٹھائے گئے ہیں جن میں گندے علاقوں کی صفائی اور آبادکاری بھی شامل ہے لیکن شمال کے بیشتر شہروں میں مساوی تحفظ کے مبینہ دعوے' آبادی کی تفریق' اور مفلسی کے قدرتی انتخاب کے ذریعہ انتہا درجہ کے نسلی امتیاز پر پردہ ڈالتے ہیں' شمال کے بڑے شہروں میں سے بہت کم ایسے ہیں جن میں ۲۰ فیصدی سے زیادہ حبشی طلبا سفید فام بچوں کے ساتھ اسکولوں میں پڑھنے جاتے ہیں۔

شمالی حصے کا کوئی بھی طبقہ اگر خود اپنے نسلی تعلقات کا جائزہ لے تو وہ محسوس کرے گا کہ وہ خود ان عقائد سے کتنی دور ہیں' جن کے وہ مدعی ہیں جب ہم ایک بار یہ دیکھ لیں گے کہ خود ہمارے شہروں اور ریاستوں میں کیا خامیاں ہیں تو ہم محض میسن ڈکسن لائن کے اس پار جنوب میں بعض سفید فام انتہا پسندوں کے حماقت آمیز رویہ کی مذمت کرتے رہنے کو کافی نہیں سمجھیں گے۔ جنوب کے لئے یہ ترغیب کی اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ شمال کے وہ لوگ جو ہر دم نکتہ چینی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ خود اپنے درمیان ایک بہتر مثال قائم کر کے دکھلائیں۔

ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے آئین میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔ چودھویں ترمیم کا منشا یہ ہے کہ ہمارے عوامی زندگی کے تمام شعبوں سے نسلی امتیاز کو ختم کر دیا جائے۔ انسانی حقوق کا عالمگیر محضر بھی' جس کی دنیا بھر کے لوگوں نے پرجوش توثیق کی ہے نسلی مساوات کو عالمی امن و امان کی پہلی شرط قرار دیتا ہے۔

سپریم کورٹ نے بھی نسلی امتیاز کو ہر ممکن تیزی کے ساتھ ختم کرنے کا حکم دیا ہے' حبشی جماعتوں کو یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اس پر عملدر آمد کیا جائے گا۔ جدید نسل کا حبشی جو جنوب اور دیگر علاقوں میں ابھر رہا ہے اس مقصد کے لئے تمام ضروری اسباب مہیا کریگا خواہ اس کو روکنے کے لئے اس پر کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ڈالا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ کونسی جماعت برسر اقتدار ہے۔ بالآخر قانون کا احترام ہی غالب آئیگا۔

پھر یہ بھی ہے کہ قانون خود ایک زبردست معلم ہے ۔ مسلح افواج، مرکزی دارالحکومت اور بین الریاستی ریل گاڑیوں میں نسلی امتیاز کے خاتمے نے ان علاقوں میں یک جہتی کی معقولیت میں شک کرنے والوں کو جس قدر مطمئن کیا ہے کوئی دوسری بات نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے علاوہ عام طور پر لوگوں میں یہ رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ وہ وکیلوں اور ججوں پر تکیہ کر کے کہہ دیں کہ یہ قانونی مسئلہ بن گیا ہے۔ صدر آئزن ہاور نے بھی شاید اسی نظریہ کا اظہار کیا تھا۔ جب انھوں نے کہا تھا کہ" انھوں نے اس بارے میں کسی شخص حتیٰ کہ اپنی بیوی سے بھی نسلی امتیاز کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔

لیکن صرف عدالتی فیصلے لوگوں کے دل و دماغ کو نہیں بدل سکتے۔ ہمارا مقصد قانون کی ناگزیر قوت کو بددلی اور بے دلی کے ساتھ قبول کرنا نہیں ہے بلکہ ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ تاریخی ضرورت کا احساس ہر طبقے کے جملہ عناصر میں یک جہتی پیدا کرنے کی کوششوں میں اضافہ کرے گا۔

اگر اسکولوں میں یک جہتی قانون کا احترام اور اس کی بے توقیری کرنے والوں کے درمیان محض ایک قانونی مسئلہ ہوتی تو ایسا کوئی تنازعہ پیش نہ آتا جس کے باعث ۱۹۵۴ء میں سپریم کورٹ کو قدم اٹھانا پڑا۔ لیکن اس سے مسئلہ کی نوعیت بالکل الٹ ہو جاتی ہے۔ کورٹ کو اس لئے قدم اٹھانا پڑا کہ مساوات کا آئینی تحفظ اس قوم کے بنیادی سیاسی اصولوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ ایک اخلاقی مسئلہ تھا جس کی جڑیں ہمارے بل آف رائٹس اور عیسائی تہذیب میں بہت گہرائی تک چلی گئی ہیں۔

قانون کا احترام صرف اسی لئے نہیں ہے کہ یہ قانون ہے، بلکہ اس کو اس لئے حمایت حاصل ہوتی ہے کہ یہ معاشرے کے اخلاقی مقصد کا حامل ہوتا ہے اور سیاسی رہنماؤں کا کام، اور ان تمام لوگوں کا بھی جو مساوی حقوق منوانا چاہتے ہیں، صرف یہ نہیں کہ وہ عدالتی فیصلوں کی دہائی دیتے اور ان پر عمل درآمد کراتے رہیں، بلکہ ان کا کام یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دیں کہ یہ فیصلے درست ہیں۔

لہٰذا ہم اس وقت ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہیں جس کی نوعیت قومی بھی ہے اور اخلاقی بھی۔ اس لحاظ سے عالمی رائے عامہ سے ہماری واقفیت ہمیں وہ سب کچھ کرنے میں مدد دے سکتی ہے جو ہمیں ہر طور کرنا چاہئے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ عالمی تجربے سے ہمیں ان تین صورتوں میں اس سے بھی زیادہ مدد مل سکتی ہے۔

اوّل یہ کہ اس کی بدولت اس معاملہ میں ہماری ضرورت سے زیادہ زود رسی میں کمی آ جائیگی کیونکہ نسلی تعصب کے گناہ میں صرف ہم ہی ملوث نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمگیر گناہ ہے۔ یہ روئے زمین کی تمام تہذیبوں

میں رچا بسا ہے اور اس میں دنیا کے تمام انسان ملوث ہیں۔

دوسرے یہ کہ جس سمجھ داری اور ستائش کے ساتھ ایشیا اور افریقہ کے لوگوں نے سپریم کورٹ کے نسلی امتیاز سے متعلق فیصلہ پر عملدرآمد کراتے ہیں حبشی اور سفید فام قانون دانوں کی کوششوں کو سراہا ہے۔ اس سے ہمیں تقویت نصیب ہوئی ہے۔

تیسرے یہ کہ عالمی تجربے سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ترقی کی کنجیاں صرف قانون کے اندر ہی نہیں، بلکہ لوگوں کے دلوں میں بھی ہیں۔ ہم سب — سفید فام اور حبشی — یکساں طور پر دوسرے لوگوں کے عملی تجربے سے سبق حاصل کر سکتے ہیں، بشرطیکہ اپنی خامیوں کا اعتراف کرنے اور دوسروں سے مدد چاہنے کی ندامت گوارا کرنے کے لئے تیار ہوں۔

تعمیری کام کا سب سے بڑا موقع خود ہمارے پڑوس میں اور ملک کے دوسرے شہریوں کے ساتھ ہمارے روزمرہ تعلقات میں موجود ہے۔

اگر نسلی امتیاز کے بارے میں ہماری بڑھتی ہوئی توجہ قومی پیمانے پر اجتماعی پروگراموں میں لگا دی جائے تو آئندہ سالوں میں قابلِ دید ترقی ہو سکتی ہے۔

میسن ڈکسن لائن کے شمال و جنوب میں مختلف طبقوں کے شہریوں کی جانچ پڑتال کی فہرستوں میں مندرجہ ذیل سوالات شامل ہونے چاہئیں:

پولیس، آگ کے محکمہ، میونسپلٹی اور اسکول بورڈ میں کتنے کتنے حبشی ہیں؟

کیا حبشیوں کو ایسی ملازمتیں حاصل کرنے کے پورے مواقع میسر ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ان کو صرف ان کی صلاحیت اور کام کی بنا پر ہی ترقی دی جاتی ہے؟

سرکاری اور نجی طور پر حبشیوں کو کس قسم کی رہائش گاہیں اور کس قسم کی طبی سہولیات اور خدمات حاصل ہیں؟

کیا سرکاری رہائش گاہوں، یا تفریحی مقامات پر بالواسطہ یا بلا واسطہ کوئی امتیاز برتا جاتا ہے؟

نجی اداروں کی ملازمتوں کا کیا حال ہے؟ کیا حبشی کارکنان کو ایسے مناسب مواقع حاصل ہیں جہاں وہ اپنی ذہانت کا پورا پورا استعمال کر سکتے ہیں؟

کیا حبشیوں کو بلا روک ٹوک پیشہ ورانہ اور مخصوص تربیتی کورسوں میں داخل کر لیا جاتا ہے؟

کیا پولیس اور عدالتیں ان کے ساتھ ایسی ہی دیانت داری اور انصاف کے ساتھ کام لیتی ہیں جتنا کہ دوسرے فرقوں کے ساتھ؟

ہر شہر میں میئر اور دیگر سر کردہ شہریوں کی سرکردگی میں غیر سرکاری جماعتیں دیانداری

کے ساتھ ان مسائل کا تجزیہ کریں تو اس قسم کے سوالات کے جوابوں پر اجتماعی اتفاق رائے پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ اور ان حقائق کی بدولت جمہوری نوعیت کے تعمیری کام عمل میں لائے جا سکیں گے۔

اس مسئلہ پر گنر مردل GUNNAR MYRDAL کی معرکتہ الآرا تصنیف AN AMERICAN DILEMMA سے اس قسم کے عمل کے لئے ایک اہم نکتہ ہاتھ آتا ہے۔ یہ بات بڑی امید افزا ہے کہ ملازمتوں کے مساوی مواقع، مساوی اور مناسب سماجی تحفظ اور رہائش اور قانون میں مساویانہ برتاؤ ایسے حقوق ہیں جو سفید فام اشخاص بخوشی منظور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور یہی وہ حقوق بھی ہیں جن کے حصول کے لئے حبشی لوگ بہت زیادہ بےچین ہیں۔

یہ کہ آج بھی یہ سب کچھ کرنے کا وقت ہے۔ خود ہمارے حبشی شہریوں کے ضبط و تحمل کے غیر معمولی وصف کا نتیجہ ہے۔ ۱۸۵ سال پہلے کی بات ہے جب ہم نے اپنے "فرمانِ آزادی" میں اعلان کیا تھا کہ پیدائشی طور پر تمام انسان برابر اور آزاد ہیں۔ اس کے نوے سال بعد ہم غلاموں کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے اور یہ فیصلہ کرنے میں ہمیں مزید نوے سال لگے کہ اسکولوں میں حبشی اور سفید فام بچوں میں لازمی امتیاز غیر آئینی ہے۔

آج بہت سے امریکی جانتے ہیں کہ اب کہنے سننے کا وقت ختم ہو چکا ہے اور عمل کا وقت آگیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مختلف نسلوں اور عقائد کے لوگوں کو مساوی مواقع سے زیادہ عرصہ تک محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہماری عدالتیں اور ہمارا ضمیر ہم سے جس اونچی سطح پر عمل کا مطالبہ کرتے ہیں، ہم اس کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

× × ×

۱۶ - اخلاقی خلا

اسمتھ کالج کی ایک گریجویٹ کلاس کے سامنے، جس میں خود مسٹر باؤلز کی کی صاحب زادی بھی شامل تھیں، مسٹر باؤلز نے جدید امریکی معاشرے کے لئے ایک معقول اخلاقی ڈھانچہ تیار کرنے کے سلسلہ میں موجودہ نسل کی ناکامی کی مذمت کی ہے۔

(افتتاحیہ خطبہ ــــ اسمتھ کالج ۵ رجون ۱۹۶۰ء)

مجھے یقین ہے کہ تاریخ آپ میں سے بہت سے لوگوں کی نسبت آپ کے والدین کی نسل کے ساتھ زیادہ رواداری کا برتاؤ کرے گی۔ اگرچہ ہم یعنی آپ کے والدین اور میں اس دنیا کے لئے بالکل

غیر تربیت یافتہ تھے جس میں ہمیں زندگی بسر کرنا تھی بلکہ جس کا کاروبار بھی ہم ہی کو سنبھالنا تھا اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں میزان میں پورے اتریں گے۔

مثلاً میری نسل کے لوگوں نے عالمی معاملات میں ہماری علیحدگی پسندی کی ۱۳۰ سالہ روایت کو توڑ دیا۔ اس نے ہماری اقتصادی اور سماجی صعوبتوں کا ادراک کر کے ہمارے قومی اتحاد کو نئی معنویت اور گہرائی بخشنے کے لئے عملی قدم اٹھایا۔ مارشل پلان، ناٹو، پوائنٹ فور پروگرام اور ہیوجول سیکوریٹی پروگرام جیسے جرأت مندانہ اور تخلیقی تصورات پیش کر کے ہماری اس نسل نے جنگ کے بعد دنیا کی رہنمائی کی۔

ہمارے بہت سے دور اندیش ساتھی ہمارے بعض ٹیکنالوجیکل کارناموں کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری گائیں بہت زیادہ دودھ دیتی ہیں۔ اور ہماری نئی مشینیں بہت زیادہ فولاد پیدا کرتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری طرف سے بہت سے غور طلب امور میں کوتاہی بھی ہوتی ہے، جن میں سے ایک موٹی سی بات یہ بھی تھی کہ دنیا کے بھوکے بچوں کے لئے مزید دودھ مہیا کیا جائے۔

تاہم آپ کے والدین اور اپنی نسل کے باقی لوگوں کی طرف سے میں یہ امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ ہمارے معاملہ میں سختی سے کام نہیں لیں گے۔ یہ سچ ہے کہ ہم بہت بے طریقہ اور بے دلی کے ساتھ آمادہ ہوئے، .... لیکن بہرحال ہم آمادہ تو ہوئے، ایسے کاموں کے لئے جن کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ میری دعا ہے کہ ہمیں آنے والے برسوں میں جو کام انجام دینے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے خدا ہمارے اندر ضروری صلاحیت اور قوتِ ارادی پیدا کرے۔

پھر بھی آج موقع ہے کہ ہم صفائی اور دیانت داری کے ساتھ حالات کا تجزیہ کریں۔ غالباً ان تمام سالوں میں ہماری کارکردگی کے اہم ترین پہلو کمزور رہے ہیں۔ نئے اور غیر مانوس مسائل کی ایک طویل فہرست سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش میں ہم نے ان انسانی اقدار کی تہذیب و تربیت کو نظر انداز کر دیا جو ہمارے امریکی معاشرے کی صحت اور توانائی کے لئے نہایت ضروری تھیں۔

ہم نے چالاک اور جوڑ توڑ کرنے والے تاجروں کو نہ صرف معاف ہی کیا، بلکہ بالواسطہ طور پر ان کو عزت بھی بخشی۔ ہم نے اپنے قابلِ تحسین کاموں کی توضیح کے لئے مادیت اور ساز باز کی زبان اختیار کی۔ اس کا مطلب یہ کہ ہم نے کسی معقول بات کی تائید کے لئے یہ ثابت کرنا ضروری سمجھا کہ ہمارے افعال کے اصل اسباب ایسے معقول نہیں تھے جیسے کہ وہ بظاہر نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اب وقت آگیا ہے کہ حبشی شہریوں کو اول درجہ کی شہریت دی جائے۔ اور یہ اس لئے نہیں کہ وہ ایک سو اسی سال سے یعنی "فرمانِ آزادی" کے

وقت سے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ سب انسان پیدائشی طور پر برابر ہیں، انتظار کر رہے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں بنی نوع انسان کی رنگ دار اکثریت ہماری تاک میں بیٹھی ہے۔
اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اشد ضروری وظائف کے لئے عوام کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر ہم نے متعلقہ قانون کو نیشنل ڈیفنس ایجوکیشن ایکٹ کا نام دیا ہے۔ اس کا جوڑ اینٹی کمیونسٹ دعاوی اور وفاداری کے عہدوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔

غیر ملکی امداد کے پروگرام کو فخر کے ساتھ اس طرح پیش کرنے کی بجائے اس کی اصل غرض و غایت نئی قوموں کی عزت، جہالت اور بیماری کو دور کرنے میں مدد دینے کی کوشش ہے تاکہ وہ اپنی تہذیبی حدود میں رہتے ہوئے اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکیں۔ ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارا اصل مقصد اقوام متحدہ میں دوستوں اور ہمنواؤں کو خریدنا یا بے چین لوگوں کو دل سوز سوال پوچھنے سے باز رکھنا، یا اس بے ہودہ خیال کے تحت بھوکے لوگوں کے پیٹ بھرنا ہے کہ پیٹ بھرے غیر ملکی جاگیردارانہ معاشرے کی ناانصافیوں اور دل آزادیوں کو آسانی کے ساتھ برداشت کر لیں گے۔ اور موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنے میں ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

اس وقت بھی جب کہ عالمی معاملات میں ہم اس قسم کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں جیسے برطانوی سائیکلوں یا غیر ملکی پارچہ جات پر محصولات میں اضافہ وغیرہ — تو ہم کہتے ہیں کہ ہم یہ سب کچھ "قومی دفاع" کے لئے کر رہے ہیں۔

اس نئی پُر آشوب دنیا میں اپنے خوف اور ناکامیوں کے باعث ہم اس طرح کام کرنے لگے ہیں گویا ہمارا اصل مقصد انسانی وقار کے سلسلہ میں امریکی ذمہ داریوں کو نباہنا نہیں بلکہ روس کے ہر اقدام کی مخالفت اور مزاحمت کرنا ہے۔

جب ہم اپنے ملک سے باہر کمیونسٹوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری توجہ خود اپنے ملک میں کلبیت زدہ لوگوں پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ سیاست داں، صحافی، تاجر یہاں تک کہ ہمارے کالجوں کے پروفیسر صاحبان بھی — اپنی اعلیٰ ترین ذہنی سرگرمیوں کے لئے انتہائی عجیب و غریب دلائل پیش کرتے ہیں۔

ہم اپنے آپ کو قائل کرنے کے انداز میں مسکرا کر بیان کرتے ہیں کہ اعلیٰ سطحوں پر بدعنوانی اور اعلیٰ قومی مراتب کے غلط استعمال سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سیاست پھر سیاست ہی ہے۔

ملازمت کے متلاشی شمالی باشندے اپنے جنوب کے ساتھیوں کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ حبشی حقوق کے حق میں اپنے علاقے کے سیاسی دباؤ کی وجہ سے ہی ووٹ دیتے ہیں۔

تاجر جو طلبا کے موسم گرما کے کیمپوں کے فنڈ اور شفا خانوں کی تعمیر کے لئے رقمیں دیتے

ہیں، اپنی اعلیٰ خدمات کو یہ کہہ کر برباد کر دیتے ہیں کہ اس طرح ان کی تجارت کی اچھی پبلسٹی ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہ خرچ کو ٹیکس میں سے بچایا جا سکتا ہے۔

یہاں سے میں اپنے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ تاریخ کے اس موڑ پر جب کہ دنیا کی مقابلہ آرائی کی اصل نوعیت سامنے آ رہی ہے ہم خود کو اقدار کے ایک بحران میں مبتلا محسوس کر رہے ہیں۔ جن اخلاقی معیاروں میں اعتقاد رکھنا ہم پسند کرتے ہیں وہ ہماری غیر اخلاقی کارروائیوں مثلاً محصولات کی چوری، خرچ کے جعلی حسابات، فرضی اشتہارات، ملاوٹی اشیا اور تفریح طبع کے لئے تشدد کے استعمال وغیرہ سے بھری پڑی ہیں۔

قومی پیمانے پر اپنی اس کوشش میں کہ ہم کسی طرح سادہ لوح ظاہر نہ ہوں اور نہ کسی طرف کی نکتہ چینی کے سامنے کمزور پڑیں، اختلافات سے گریز کریں اور یہ ثابت کریں کہ ہم ایسے حقیقت پسند ہیں جو عجلت میں قدم نہیں اٹھاتے، ہم نے اپنے عقائد اور اپنے روزمرہ اعمال کے درمیان ایک اخلاقی خلا پیدا کر لیا ہے یہ اخلاقی خلا آزاد معاشرے کی حیثیت سے ہماری بقا کے لئے ایک عظیم خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک اور اہم سوال یہ بھی ہے کہ آیا ایک آزاد معاشرہ بیسویں صدی کی نیو کلیائی دہشت انگیزی کی فوجی ٹیکنالوجیکل اور نفسیاتی ضروریات کی موجودگی میں غیر معین عرصہ تک قائم رہ سکتا ہے؟

ہم میں آج بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو موجودہ کشیدگی اور تناؤ میں کسی قسم کی کمی ہونے کے مقابلے میں نیو کلیائی جمود، ہیبتناک مگر نامانوس خطرات میں خود کو زیادہ محفوظ تصور کرتے ہیں۔ ان کے لئے خط مستقیم پر ایک سمت میں چلنا آسان ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ یہ جانتے ہوں کہ یہ راستہ انھیں ایک عالمگیر جنگ کی طرف لے جا رہا ہے۔

ایسے لوگ ولیم بٹلر ییٹس کی پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرنے کا تہیہ کئے معلوم ہوتے ہیں، جنھوں نے کہا تھا "بہترین لوگوں کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا اور بدترین لوگ شدت کا شکار رہتے ہیں"۔ وہ اُلجھنوں سے، دشوار انتخابات سے، بیک وقت متبادل تدبیروں پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت سے، اور موجودہ دنیا میں توازن، ہنر مندی اور استقلال کے تقاضوں سے گھبراتے ہیں۔

بہرحال یہ لوگ اچھے ہیں جو محض ایک بٹن دبانے سے ہو جانے والی جنگ کے دور میں کنٹرول روم سے باہر رہنا چاہتے ہیں۔ بندوقوں اور مشین گنوں کی مدد سے لڑی جانے والی محدود جنگوں کے زمانے میں یہ لوگ کافی خطرناک ہوتے تھے۔ آج کی ایٹمی دنیا میں وہ ایک انقلابی رجحان رکھتے ہیں۔

آج امریکہ کی تعمیری قیادت کو ایک چیلنج کا سامنا ہے۔ صرف روس کا مقابلہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس بدلتی ہوئی دنیا کی فطرت کو سمجھنے، کمیونسٹ معاشرے میں جو قوتیں کارفرما ہیں ان کا جائزہ

لینے اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بسنے والے کروڑہا انسانوں کی خواہشات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کرہ ارض روس اور امریکہ کے درمیان بڑھتی ہوئی ناعاقبت اندیشانہ کش مکش کے لئے عرصہ کارزار بننے سے زیادہ اہم کام کے لئے ہے۔

اس چیلنج کو قبول کرنے سے پہلے ہمیں ایک بار ان الفاظ کو یاد کر لینا چاہئے جو وڈرو ولسن نے انا پولس کی گریجویٹ ہونے والی کلاس کے سامنے کہے تھے۔

ہماری طرح دنیا میں کچھ اور قومیں بھی متمول ہوئی ہیں، کچھ اور قومیں بھی اتنی طاقتور ہوئی ہیں کچھ اور قومیں بھی اتنی حوصلہ مند ہوئی ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہم یہ بات کبھی فراموش نہیں کریں گے کہ ہم نے اس قوم کو صرف اپنی خدمات کے لئے نہیں بلکہ نوع انسانی کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔ . . . . اس دنیا میں ایسی کوئی قوم پیدا نہیں ہوئی جس نے باقی دنیا کی بھی اسی طرح خدمت کی ہو جس طرح اس نے اپنی خدمت کی۔

امریکی معاشرے کی ہر سطح پر اس نظریہ کو پھر سے واپس لا کر ہم زمانہ قدیم کے اس اعتقاد کی حکمت و دانائی کا ادراک کر سکتے ہیں جو مدتوں کے بعد انجیل کے باب رومن میں ہم تک پہنچتی ہے۔ ۵-۳-۴ "ہم مصیبت پر فخر کرتے ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مصیبت استقلال پیدا کرتی ہے، اور استقلال، تجربہ، اور تجربہ، امید کو جنم دیتا ہے۔

X X X

چند الفاظ اور....

ٹامس جیفرسن نے ایک بار کہا تھا "جمہوریت ہی حکومت کی وہ تنہا شکل ہے جو انسانی حقوق کے ساتھ ظاہری یا خفیہ طور پر برسرِ پیکار نہیں رہتی" لیکن جمہوریت کو آج جس عظیم خطرے کا سامنا پڑ رہا ہے وہ اس سے پہلے اسے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔

یہ خطرہ جزوی طور طور جمہوریت دشمن نظریات میں مضمر ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر اس کا سبب ہماری روایتی بصیرت، تصورات اور انفرادی ذمہ داری کے احساس کا انحطاط ہے۔

ہم اپنا مشترک مقصد اپنے سابقہ اصولوں کی طرف رجوع کر کے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ جن حقائق کو ہمارے "فرمان آزادی" نے "بدیہی" قرار دیا تھا، وہ آج بھی ہر زمانے کے عظیم حقائق میں سے ہیں۔ یعنی یہ کہ تمام انسان پیدائش کے اعتبار سے برابر ہیں اور خالق نے ان کو بعض ناقابلِ تنسیخ حقوق عطا کئے ہیں جن میں زندگی، آزادی اور مسرت کی تلاش ہے۔"

ہماری نسل کا فرض ہے کہ وہ ہمارے آباؤ اجداد کے جذبے اور خلوص کے ساتھ اس نئی دنیا میں ان ہمہ گیر حقائق کے اکتساب کی کوشش کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخری نتیجہ کے لئے ہم میں سے ہر شخص انفرادی طور پر ذمہ دار ہے۔

لیکن ملک اور بیرون ملک میں ہمیں خود غرضی کے بجائے فیاضی، تشدد کے بجائے رحمدلی اور نفرت کے بجائے محبت کے ساتھ کام کرنے کا سبق حاصل کرنا چاہیئے تاکہ ہم اپنی ذات اپنے مستقبل اور اپنی مشترکہ اخوت میں اپنے مثبت عقیدے کی تردید کے بجائے اس کی پُر زور توثیق کریں۔

اس طریقے پر کاربند رہ کر ہی ہم ایک ایسے امریکہ کی تخلیق کر سکتے ہیں جو صرف مشترکہ دفاع کے لئے مادی وسائل کے اعتبار سے ہی طاقتور نہ ہو، بلکہ نوع انسانی کے وقار اور بنیادی حقوق کے سلسلہ میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کو نباہنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، اسی سے دائمی امن کی بنیادیں استوار ہو سکتی ہیں۔ نتیجہ کا انحصار میں سمجھتا ہوں، ہماری اپنی کوششوں پر ہے۔

× × ×

کچھ مصنّف کے بارے میں

چیسٹر باؤلز ایک تاجر، مصنف، سرکاری منتظم، گورنر، کانگریس کے رُکن اور سفیر رہ چکے ہیں۔ اب وہ افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ کے معاملات میں صدر کینیڈی کے خاص نمائندے اور مشیر کار ہیں۔ امریکہ کی عوامی زندگی میں کسی اور شخص کو اتنا وسیع تجربہ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

مسٹر باؤلز ۱۹۰۱ء میں اسپرنگ فیلڈ، ماچوسٹس میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا پہلا منصب ایک تجارتی ادارے کے انتظامی افسر کا تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو جانے کے بعد انھوں نے تجارت کو خیرباد کہہ دیا۔ اور صدر روزویلٹ کے تحت فیڈرل پرائس ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اور ان کے بعد صدر ٹرومین کے ساتھ اقتصادی استحکام کے ڈائریکٹر آف ایکانومک اسٹیبلائزیشن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

جنگ کے بعد مسٹر باؤلز اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل ٹرگوے لی کے معاون خصوصی مقرر کئے گئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ کنکٹیکٹ کے گورنر منتخب ہوئے۔ اور ۱۹۵۱ء میں صدر ٹرومین نے ان کو ہندوستان اور نیپال کے لئے ریاست ہائے متحدہ کا سفیر مقرر کیا۔

۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک کا زیادہ عرصہ عالمی سیاحت اور غیر ملکی معاملات کے بارے میں بولنے اور لکھنے میں گزرا۔ انھوں نے امریکہ کی بہت سی بڑی بڑی یونی ورسٹیوں میں لکچر دیئے ہیں، وہ سات کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے پانچ اسی دور میں لکھی گئی تھیں۔

۱۹۵۹ء وہ عوام کے نمائندے کی حیثیت سے کنکٹیکٹ سے کانگریس کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۰ء کی صدارتی مہم کے دوران مسٹر باؤلز نے ڈیموکریٹک نیشنل کنونشن کی پلیٹ فارم کمیٹی کے چیرمین اور سینیٹر کینیڈی کے غیر ملکی پالیسی کے مشیر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۶۰ء کے آخری دنوں میں مسٹر باؤلز کو محکمۂ خارجہ کا نائب سکریٹری مقرر کیا گیا جس پر وہ اپنے موجودہ منصب کے تقرر تک مامور رہے۔

مسٹر باؤلز ان دنوں سفیر امریکہ کی حیثیت سے ہندوستان میں مقیم ہیں۔ ان کے پانچ بچے ہیں۔

× × ×